

اساس اسلام

www.KitaboSunnat.com



(اسلامیات لازمی)

برائے امتحان مقابلہ مرکزی C.S.S

غلام احمد عریضی



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ
وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مَجْلِسُ التَّحْقِیْقِ الْإِسْلَامِیِّ
محدث البربری

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب و سنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مَجْلِسُ التَّحْقِیْقِ الْإِسْلَامِیِّ کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی
کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے
درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

✉ KitaboSunnat@gmail.com

🌐 www.KitaboSunnat.com

وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ
(اور جو اسلام کے سوا کوئی اور دین تلاش کرے گا اس سے وہ دین ہرگز قبول نہ کیا جائے گا)
(آل عمران - ۸۵)

اساس اسلام

(اسلامیاتی لازمی)

برائے

طلبہ امتحان مقابلہ مرکزی (C.S.S.)

مطابق نصاب جدید برائے ۱۹۸۶ء وما بعد

از

غلام احمد حریری

ایم۔ اے عربی (I) ایم۔ اے علوم اسلامیہ (I) ایم۔ او۔ ایل عربی (I)
فاضل السنۃ شرقیہ - فاضل درس نظامی

(سابق) صدر شعبہ علوم اسلامیہ

زرعی یونیورسٹی فیصل آباد - اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور
مندوب حکومت سعودیہ و ممبر مشاورتی بورڈ حکومت پاکستان

ناشر: پولیمیر پبلیکیشنز، اردو بازار - لاہور فون: ۵۸۶۶۶۱

www.KitaboSunnat.com

جمہور حقوق بنام پروفیسر غلام احمد حریری محفوظ

نام کتاب ————— اساس اسلام

مؤلف ————— پروفیسر غلام احمد حریری

ناشر ————— ضیاء الحق قریشی (ایم اے)

تعداد اشاعت ————— ۵۰۰

کتابیت ————— منشی علم الدین ۳۔ نزدیکی ٹاؤن فیصل آباد

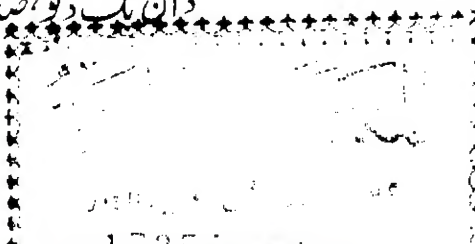
طباعت —————

قیمت ————— ۳۵ روپے

————— دستیاب از —————

کتاب مرکز بھوانہ بازار فیصل آباد

ڈان بک ڈپو، صدر بازار راولپنڈی



نصاب جدید اسلامیات لازمی

کل نمبر ۱۰۰

برائے امتحان S-S-C-۱۹۸۶ء و ما بعد

ایک پرچہ -۱۰ نمبر

باب اوّل: ۱۔ اسلام - معنی و مفہوم: اسلام کے تصور دین کا تعارف اور اس کی

امتیازی خصوصیات

۲۔ انسانی زندگی کے بنیادی مسائل اور اس کے مختلف حل - علم کے ذرائع - وحی کی حقانیت اور بالادستی -

۳۔ مذہب کی ضرورت اور انسانی زندگی میں اس کا مقام

۴۔ اسلامی فلسفہ حیات تصور کائنات تصور انسان - مقام انسانیت انسان کا منصب خلافت -

باب دوم: اسلام کے بنیادی عقائد:-

(الف) توحید: وجود باری تعالیٰ - وجود باری تعالیٰ پر قرآن کا استدلال - توحید کے دلائل - اسلام کا تصور اللہ - انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی پر توحید کے اثرات یعلقن باللہ اور اس کی بنیادیں

(ب) رسالت: انبیاء کی ضرورت - انبیاء کی بنیادی خصوصیات - بشریت -

وہبیت - تعلیمات من جانب اللہ - عصمت - منصب ریاست - قابل

اطاعت - شارح کتاب اللہ - معلم و مربی - پیشوا اور نمونہ تقلید - شارع

و قانون ساز، محمد رسول اللہ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں - ایمان، اطاعت

اتباع، محبت - اسوہ رسول اللہ -

(ج) آخرت: اسلامی تصور آخرت - مادہ پرستوں کا نقطہ نظر اور اس

کا علمی جائزہ - یہودیت، عیسائیت اور ہندومت کا تصور آخرت -

اسلام کے تصور آخرت پر عقل اور قرآنی دلائل - عقیدہ آخرت کے اثرات

انسانی زندگی پر -

باب سوم - اسلام کا تصور عبادت اور اسلامی عبادات

(الف) صلوٰۃ: دین میں اس کا مقام مقصد حیات کی یاد دہانی فیض شناسی،

- تعمیر سیرت، ضبط نفس، تقویٰ، اجتماعی فوائد
- (ب) زکوٰۃ: زکوٰۃ کا مقصد، تزکیہ نفس، امداد باہمی اور عدل اجتماعی۔ دین کی نصرت۔ زکوٰۃ کے مصارف اور اس کے اخلاقی و معاشی پہلو۔
- (ج) صوم: روزے کا مقصد اور مقام۔ احساس بندگی۔ اطاعت امر۔
- تعمیر سیرت۔ ضبط نفس۔ اجتماعی فوائد۔ تقویٰ اور پاکیزگی کی فضا۔ جماعتی احساس امداد باہمی کی روح۔
- (۵) حج: حج کی اہمیت اور اس کا مقصد۔ حج کی شان جامعیت۔
- باب چہارم: اسلامی نظام زندگی:-
- (۱) شریعت کے مآخذ۔ قرآن۔ سنت رسول۔ حجیت حدیث و سنت۔
- (۲) تہذیب اخلاق۔ تصویر اخلاق۔ اخلاق و ایمان کا باہمی تعلق، تعمیر سیرت کے اسلامی اصول اور طریقے۔
- (۳) تدبیر منزل: خاندان کا نظام۔ افراد خاندان کی ذمہ داری اور باہمی تعلق۔ نظام معاشرت۔ نظام بقا و عدل۔
- (۴) تعلیم: تعلیم کی اہمیت۔ تعلیم کا مقصد، تعلیم کے اسلامی اصول و مسلمانوں کی تعلیمی روایات۔
- باب پنجم
- (۵) اسلام کے معاشی اصول: تصویر معیشت۔ پیدائش اور صرف دولت کے اصول۔ کفالت عامہ۔ زکوٰۃ۔ سود۔ اسلامی ریاست کی معاشی ذمہ داریاں۔
- (۶) اُمت مسلمہ: ملت اسلامیہ کا مقصد اور منصب
- (۷) اسلامی ریاست کی ضرورت: اسلام کے اصول حکمرانی۔ قیام پاکستان کے محرکات۔ تاریخ تحریک پاکستان۔ نظریہ پاکستان اور اس کے تقاضے۔

فہرست مندرجات

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۵۲	انسان کا منصبِ خلافت	۳۰	مذہب کا ارتقاء	۱	افتتاحیہ
۵۴	اسلامی نظریہ کی افادیت	۳۱	مذہب کی اہمیت	۳	باب اول
۵۶	باب دوم	۳۲	فطری جذبہ	۴	۱۔ اسلام معنی و مفہوم
۵۷	اسلام کے بنیادی عقائد	۳۳	مذہبی جذبہ کی ہمہ گیری	۶	تصورِ دین کا تعارف
۵۹	اسلامی عقائد عقل کی کسوٹی پر	۳۴	مناظر قدرت میں تدبیر	۹	اسلام کی امتیازی خصوصیات
۶۲	۱۔ توحید	۳۵	انسان و حیوان میں فرق و امتیاز	۱۲	۲۔ انسانی زندگی کے بنیادی مسائل
۶۷	وجود باری تعالیٰ	۳۶	مشترکہ خصوصیات	۱۵	علم کے ذرائع
۷۳	وجود باری تعالیٰ پر قرآن	۳۷	مذہبی جذبہ کی تسکین	۱۸	آغازِ وحی
۷۴	کا استدلال	۳۸	مذہب ایک امدادی صداقت ہے	۱۹	حقیقتِ وحی
۷۷	توحید کے دلائل	۳۹	انسانی زندگی میں مذہب کا مقام	۲۰	انقطاعِ وحی
۸۲	اسلام کا تصورِ اللہ	۴۱	۳۔ اسلامی فلسفہ حیات	۲۱	وحی کی حقانیت
۸۵	صفات باری تعالیٰ	۴۳	تصورِ کائنات	۲۲	زندگی بنیادی مسائل اور اسلام
۸۶	عقیدہ توحید کے تقاضے	۴۴	اسلامی تصور کی توضیح	۲۳	کائنات کی حقیقت
۸۷	انفرادی زندگی پر توحید کے اثرات	۴۵	اسلام کا تصورِ انسان	۲۶	۳۔ مذہب کی ضرورت اور انسانی زندگی میں اس کا مقام
۹۰	عقیدہ توحید اور اجتماعی زندگی	۴۸	مقامِ انسانیت	۲۷	مذہب کی غرض و غایت
۹۲	۲۔ تعلق باللہ اور اس کی بنیادیں	۴۹	انسان کی عظمت کے وجوہ		
۹۳	دیگر اہل مذاہب کا زاویہ نگاہ	۵۰	عظمتِ انسان اور احادیثِ نبویہ		

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۵۵	نظم جماعت مساوات	۱۱۶	۳۔ اتباع	۹۴	تعلق باللہ اور اس کی بنیاد
۱۵۷	۲۔ زکوٰۃ	۱۱۷	۴۔ محبت	۹۴	پہلی بنیاد ایمان
۱۵۷	زکوٰۃ کی اہمیت	۱۱۸	اسوۂ رسول اللہ	۹۶	دوسری بنیاد اطاعت
۱۶۰	نصاب زکوٰۃ	۱۲۳	۴۔ اسلامی تصور آخرت	۹۷	تیسری بنیاد اخلاص و محبت
۱۶۱	اسلام کا اقتصادی نظام	۱۲۷	ہندومت کا تصور آخرت	۱۰۰	۳۔ رسالت
	اور زکوٰۃ	۱۲۹	یہود و نصاریٰ کا تصور آخرت	۱۰۰	انبیاء کی ضرورت
۱۶۳	اشترکیت کا علاج	۱۳۰	اسلامی عقیدہ آخرت	۱۰۳	انبیاء کی بنیادی خصوصیات
۱۶۴	اقتصادی فوائد	۱۳۳	قرآن کا طرز استدلال	۱۰۳	بشریت
۱۶۵	زکوٰۃ معاشی نقطہ نظر سے	۱۳۵	قرآنی دلائل	۱۰۴	وہبیت
۱۶۷	۳۔ صوم	۱۳۶	عقیدہ آخرت کے انسانی	۱۰۵	تعلیمات من جانب اللہ
۱۶۷	روزے کا مقصد		زندگی پر اثرات	۱۰۶	عصمت
۱۶۸	تعمیر سیرت	۱۴۱	باب سوم	۱۰۷	ہر قوم کے لئے نبی
۱۶۹	ضبط نفس			۱۰۷	منصب رسالت
۱۷۰	انفرادی اثرات	۱۴۲	اسلام کا تصور عبادت	۱۰۹	شارح کتاب اللہ
۱۷۱	اجتماعی فوائد	۱۴۷	۱۔ صلوٰۃ	۱۱۰	معلم و مربی
۱۷۲	امدادِ باہمی کی روح	۱۴۸	تعمیر سیرت	۱۱۱	پیشوا و نمونہ تقلید
	۴۔ حج	۱۴۹	ضبط نفس اور تقویٰ	۱۱۲	شارع اور قانون ساز
۱۷۴	تاریخ کعبہ	۱۵۰	اجتماعی فوائد	"	قاضی اور حکم
۱۷۷	مناسک حج	۱۵۲	مناسک کے معاشرتی و اخلاقی	۱۱۳	رسول اللہ سے ہمارے تعلق
۱۷۸	طواف - حجر اسود		حکم و مصالح		کی بنیادیں
۱۷۹	وقوف عرفہ	۱۵۳	طہارت و پاکیزگی		۱۔ ایمان
۱۸۰	حج کی حقیقت	۱۵۴	سحر خیزی - تربیت جہاد	۱۱۵	۲۔ اطاعت

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۵۱	۴۔ تعلیم	۲۲۲	قوتِ نافذہ میرکات	۱۸۱	سچ کی جامعیت
۲۵۱	تعلیم کا تصور اور اس کی اہمیت	۲۲۳	اخلاق و ایمان کا باہمی تعلق	۱۸۲	روحانی و اخلاقی فوائد
۲۵۳	مقصدِ تعلیم	۲۲۴	اسلامی تصور کی انیازی خصوصیات	۱۸۳	ارکانِ اسلام پر ایک نظر
۲۵۶	تعلیم کے اسلامی اصول	۲۲۹	تعمیرِ سیرت کے اسلامی اصول اور طریقے	باب چہارم	
۲۵۸	انفرادیت اور جماعتیت میں اتان	۲۳۰	رسول اکرم بحیثیت معلم اخلاق	۱۸۶	اسلامی نظامِ زندگی
۲۶۱	علم کی وحدت اور ہم آہنگی مسلمانوں کی تعلیمی روایات	۲۳۱	حضور کی سیرت کے اثرات	۱۸۷	۱۔ شریعتِ اسلامی کے ماخذ
۲۶۱	دورِ نبوی میں تعلیمی روایت	۲۳۳	نتائج صحابہ کرام کی ایمانی تربیت	۱۸۸	شریعت کا مقصد اور ہم گیری
۲۶۲	ادوارِ مابعد	۲۳۴	امانت و دیانت	۱۹۱	شریعتِ اسلامی کے مصادر
۲۶۴	بزرگوار، تعلیمی روایت کا ارتقاء	۲۳۵	۳۔ تدبیرِ منزل معاشرتی زندگی	۱۹۲	ماخذِ اول الکتاب
۲۶۱	باب پنجم	۲۳۶	خاندان کا نظام معاشرتی اصلاح	قرآن، موضوعات، مقصد اور اندازِ تنخاطب	
۲۶۲	۱۔ اسلام کے معاشی اصول	۲۳۷	رشتہ نکاح	۱۹۴	تدوینِ جمع و ترتیبِ حفاظت
۳۷۲	تصورِ معیشت	۲۳۸	افراد خاندان کی ذمہ داری	۲۰۱	ماخذ دوم السنہ
۲۷۴	پیدائش اور صرف و کف کے معاشی اصول	۲۳۹	نظامِ معاشرت کی بنیادیں	۲۰۲	حجیتِ حدیث و سنت
۲۷۵	مقصد و مقام	۲۴۰	۴۔ رشتہ نکاح	۲۰۳	اندرونی شہادت
۲۷۹	حلال و حرام کی تمیز	۲۴۱	حدود و تعزیرات	۲۰۴	اطاعت
۲۸۰	حرمتِ سود	۲۴۲	نظامِ قانون و عدل	۲۰۵	خارجی شہادت
۲۸۱	تجارتی اخلاقیات کا ضابطہ	۲۴۳	عدل و مساوات اور سلام	۲۱۲	کتابت، حفاظت
۲۸۲	باہمی رضامندی	۲۴۴	۲۔ تہذیبِ اخلاق	۲۱۸	اسلام کا تصورِ اخلاق

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۸۳	اسراف کی بندش	۲۸۳	شہادتِ حق	۳۰۶	۴۔ تاریخ تحریک پاکستان
۲۸۴	اِز نکازِ دولت کی ممانعت	۲۸۴	قوی شہادت	۳۰۷	اسلامی معاشرے کا قیام
۲۸۵	قانون وراثت	۲۸۵	عملی شہادت	۳۰۸	راجہ داہرہ کے منظم
۲۸۶	ملکیت و تصرف کا حق	۲۸۶	۴۔ اسلامی ریاست کی ضرورت	۳۱۰	۱۱۔ اشاعتِ اسلام اور صوفیاء
۲۸۸	۲۔ کفالت عامہ	۲۸۸	اسلام کے اصولِ حکمرانی	۳۱۸	مسلمانوں کا سیاسی انحطاط
۲۸۸	اسلامی ریاست کی معاشی	۲۸۸	اصولی اور نظریاتی ریاست	۳۱۸	۱۲۔ محمد بن الف ثانی کی تحریک
	ذمہ داریاں	۳۲۱	شورائی اور جمہوری ریاست	۳۲۱	اورنگ زیب عالمگیر کی تبلیغی سعی
۲۹۰	خلفاء کا طرزِ عمل	۳۲۷	فصلی ریاست	۳۲۷	۱۳۔ شاہ ولی اللہ اور مسلم معاشرے
۲۹۳	معاشی ترقی کا اہتمام	۳۳۲	معلم اور داعی ریاست	۳۳۲	کی تشکیل نو
۲۹۶	تقسیمِ دولت میں پائے جانے	۳۳۵	۱۴۔ قیامِ پاکستان کے محرکات	۳۳۵	۱۴۔ حضرت شاہ ولی اللہ کے افکار
	والے تفاوت کو کم کرنا	۳۳۵	جدوجہدِ پاکستان کی غرض	۳۳۵	۱۵۔ مسلم اقتدار کا خاتمہ
۳۰۲	۳۔ اُمتِ مسلمہ	۳۳۶	پاکستان کی اساس	۳۳۶	۱۶۔ مسلم ثقافت کی برابری
۳۰۴	ملتِ اسلامیہ کا مقصد اور	۳۳۷	قراردادِ مقاصد	۳۳۷	۱۷۔ نظریہ پاکستان اور اس کے تقاضے
	منصب	۳۳۹	نظریہ پاکستان	۳۳۹	

سلازمی غفر اہم بدلت
ازاد منہ جاوید بیا

افتتاحیہ

بنامِ انکشافِ حیرانِ جاہِ است
پیشِ جوہرِ زینبِ است

پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے جس کا مقصد وجود ہی اقامتِ دین ہے۔ مقامِ افسوس ہے کہ آغازِ قیام ہی سے اس مملکت کے اربابِ حق و عقد نے اس کی غایتِ تخلیق کو فراموش کئے رکھا۔ حتیٰ کہ چالیس سال کا طویل عرصہ گزرنے کے باوجود اس سمت ایک قدم بھی اٹھنے نہ پایا۔ دین اور اسلامی تہذیب سے سرد مہری بڑھتے بڑھتے اب ایک ایسے مزمینِ مرفض کی صورت کر چکی ہے کہ اگر اس کی تلافی جلد نہ کی گئی تو مملکت کی بقا و دشوار ہے۔ نہ ایمان پاس رہے گا نہ ملک، اور حصولِ حکومت سے جو مادی منافع بعض لوگوں کو حاصل ہوئے ہیں وہ تو حبابِ آساکھ دیر کے ہی مہمانِ ثابت ہوں گے۔ میتوں میں عزم اور زندگی کی خواہش ایمان سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر مقصدِ حیات ہی ضائع ہو جائے اور اس کی جگہ مالِ دولت کی ہوس لے لے تو پھر زندگی کے دن بھی لمبے نہیں ہوتے۔

پاکستان کی موجودہ حکومت کے ساری عاطفت میں اگرچہ کوئی قابلِ ذکر دینی و ملی کام نہیں ہوا تاہم یہی غنیمت ہے کہ اس کے دور میں علومِ اسلامیہ اور مطالعہ پاکستان کے مسابین لازمی حیثیت سے ڈگری کی سطح پر منظور کئے گئے۔ اگر پڑھانے والا ان مضامین کے مندرجات کی صداقت کو قلب و ذہن سے تسلیم کرتا ہو اور اس کی شخصیت میں بھی اس کی جھلک نمایاں ہو تو اس کی زبان حق نشان سے نکلا ہوا تیر کبھی خطا نہیں جاسکتا۔ بنا بریں یہ بات بھی حکومت اور بطور خاص پبلک سروس کمیشن کے اربابِ بست و کشاد کے فرائض میں شامل ہے کہ اسلامیات کے اساتذہ کا انتخاب کرتے وقت یہ بھی پیشِ نظر رکھیں کہ پیش ہونے والا امیدوار ذاتِ فطانت اور معلوماتِ عامہ کے پہلو بہ پہلو اس مضمون کے مشتملات کو دل سے مانتا بھی ہے یا نہیں اور اس کی شخصیت کہاں تک اس مضمون کی آئینہ دار ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پاکستان میں بھی موجودہ ہنگامہ دیش اور سابق مشرقی پاکستان کا طرزِ عمل دہرایا جاتا رہے، جہاں ہندو اساتذہ اسلامیات کی تعلیم دیتے تھے۔

سنٹرل سپیریئر سروسز آف پاکستان CENTRAL SUPERIOR SERVICES OF PAKISTAN کے

امتحان میں بھی اسلامیات لازمی کا ایک پرچہ شامل ہے جس کے جدید نصاب کے مطابق یہ کتاب تالیف کی جا رہی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے والے نوجوان آگے چل کر کلیدی اسامیوں پر فائز ہوں گے اور ملک کی عنانِ اقتدار انہی خوش نصیب اصحاب کو تفویض کی جانے والی ہے۔ لہذا ان اصحاب کا اگر عالم فاضل نہیں تو کم از کم دین اسلام کی مبادیات سے پوری طرح آگاہ و آشنا ہونا از بس ناگزیر ہے اور اگر اس ملک کی قسمت میں اقامتِ دین کا فریضہ مقدر ہو چکا ہے اور مستقبل قریب میں اس کی قسمت کا ستارہ جاگنے والا ہے تو پھر دین اسلام کے مبادیات اور عقائد و ارکان سے پوری واقفیت حاصل کئے بغیر ان کے لئے کوئی چارہ کار نہیں۔ بارہا مشاہدہ میں آچکا ہے کہ اس زمرہ کے بعض اصحاب ترقی کرتے کرتے انتہائی فمہ دار مناصب پر فائز ہو جاتے ہیں، مگر جب دین کے بارے میں انہیں گفتگو کرنا پڑ جاتی ہے تو ٹامک ٹوٹیاں مارنے لگتے ہیں اور غلط تلفظ کے باعث شدید مذمت سے دوچار ہوتے ہیں۔ ہماری سول سروس جس قدر دیندار صالح، امانت و دیانت، فرض شناسی اور اخلاق حسنہ کے اوصاف سے متصف ہوگی پس ایک اسی قدر ان سے اچھا اثر قبول کرے گا۔ اگر ”الْأَنسُ عَلَى دِينٍ مُّلُوكُهُمْ“ (لوگ اپنے بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں) کا مقولہ صحیح ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ پاکستانی عوام اپنے کام بالاکے رنگ میں نہ رنگے جائیں۔

یہ کتاب اسی مقصد کے پیش نظر تالیف کی جا رہی ہے۔ اس میں تصنیف کم اور تالیف و تدوین و اخذ و اقتباس کا عنصر غالب ہے۔ مقصد یہ ہے کہ طلباء کے ہاتھ میں ایک ایسی کتاب دے دی جائے جو مجوزہ نصاب کی جامع ہونے کے ساتھ ساتھ بھروسہ کے لائق ہو۔ جس کا مواد رطب یا بس اور ناقابلِ اعتماد ذرائع پر مبنی ہونے کے بجائے کتاب و سنت سے ماخوذ ہو کہ پڑھنے والا اس کی سچت پر پوری طرح اعتماد کر سکے۔ اکثر جگہ ماخذ کا نام تحریر کر دیا ہے۔ سلفی نظریہ صیانت سے التزام و استفادہ کیا جس کے لئے میں اس کے فاضل مرتب کا صمیم قلب سے پیاس گزار رہوں۔ بارگاہِ ربانی میں دعا ہے کہ اس حقیر کاوش کو شرف قبولیت سے نوازے۔ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللّٰهِ۔

غلام احمد خیریری

مکیم نومبر ۱۹۸۶ء

ڈی۔ ۶۱ پیپلز کالونی

فیصل آباد

فون نمبر ۵۸۸۹

باب اول

۱۔ اسلام معنی و مفہوم

۲۔ انسانی زندگی کے بنیادی مسائل اور اس کے مختلف حل

۳۔ مذہب کی ضرورت اور انسانی زندگی میں اس کا مقام

۴۔ اسلامی فلسفہ حیات

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

۱۔ اسلام

معنی و مفہوم | لفظ اسلام عربی زبان میں مصدر ہے جس کے معنی حسب ذیل ہیں:-

۱۔ اطاعت کرنا، جھکنا، سر تسلیم خم کرنا۔

۲۔ امن و آشتی اور سلامتی

۳۔ اپنے آپ کو کسی کی تحویل میں دے دینا۔

قرآن کریم اسلام کے بجائے ”الاسلام“ کا لفظ استعمال کرتا ہے جو اس کی خاص اصطلاح ہے اس مخصوص اصطلاحی لفظ سے اس کی مراد اللہ کے آگے جھک جانا، اس کی اطاعت قبول کرنا، اس کے مقابلے میں اپنی آزادی سے دست بردار ہو جانا اور اپنے آپ کو اسلام کے حوالے کر دینا ہے۔ اسلام وہ دین ہے جو اللہ کی حاکمیت کی بنیاد پر ایک پورا احاطہ زندگی پیش کرتا اور انسان سے مطالبہ کرتا ہے کہ اسے قبول کرے۔ اس لئے کہ اللہ کے آگے جھکنے اور اس کی اطاعت کرنے کا نام اسلام ہے۔ اس میں یہ حقیقت بھی پوشیدہ ہے کہ اللہ کی بندگی اور اطاعت کے نتیجے میں زندگی کا جو نقشہ قائم ہوگا وہ امن اور سلامتی کی نعمتوں سے مالا مال ہوگا۔ اس میں قلب کو اطمینان ہوگا، اور انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں حقیقی امن و سکون قائم ہوگا۔ نیز اس زندگی کے بعد بھی انسان کو اُس ابدی زندگی میں امن و سلامتی میسر آئے گی۔

اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اپنے آپ کو سپرد کر دینے کے معنی یہ ہیں کہ اس نے اپنے رسولوں کے ذریعہ سے انسان کے لئے جس طریق فکر و عمل کی طرف رہنمائی کی ہے اس کو قبول کرے اور اپنی آزادی فکری و عمل کو بھڑکے اس کی پیروی و اطاعت اختیار کرے۔ اسی چیز کو قرآن ”الاسلام“ تعبیر کرتا ہے۔ درحقیقت یہ کوئی جدید مذہب نہیں ہے جس کی بنا اب سے چودہ سو سال پہلے عرب میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈالی ہو۔ بلکہ جس روز پہلی مرتبہ اس کرۂ زمین پر انسان کا ظہور ہوا اسی روز اللہ نے انسان کو بتا دیا تھا کہ تیرے لئے صرف یہ ”الاسلام“ ہی ایک صحیح طرز عمل ہے۔ اس کے بعد دنیا کے مختلف گوشوں میں وقتاً فوقتاً جو پیغمبر بھی اللہ کی طرف سے انسانوں کی رہنمائی کے لئے مامور ہوئے ہیں اُن سب کی دعوت بھی بلا استثناء اسی ”الاسلام“ کی طرف رہی ہے جس

کی طرف بالآخر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا کو دعوت دی۔

یہ اور بات ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیروؤں نے بعد میں بہت سی مختلف چیزوں کی آمیزش کر کے ایک نظام یہودیت کے نام سے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروؤں نے ایک دوسرا نظام مسیحیت کے نام سے ایجاد کر لیا۔ اسی طرح ہندوستان، ایران، چین اور دوسرے ممالک کے پیغمبروں کی امتوں نے مختلف نظامات دوسرے ناموں سے بنائے ہوں لیکن حضرت موسیٰ و عیسیٰ اور دوسرے تمام انبیاء علیہم السلام جس دین کی دعوت دینے آئے تھے وہ خالص اسلام تھا۔

قرآن کریم میں فرمایا:-

”إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ“ (آل عمران ۱۹) (بے شک اللہ کے نزدیک تو اصل دین اسلام ہے)
 ”وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ“ (آل عمران ۸۵)
 اور جو اسلام کے سوا کوئی اور دین تلاش کرے گا اس سے وہ دین ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔
 قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ:

نوع انسان کے لئے اللہ کے نزدیک صرف ہی ایک صحیح طریق زندگی ہے کہ وہ اللہ کے آگے سر تسلیم خم کر دے اور فکرو عمل کی اس راہ پر چلے جس کی طرف اللہ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے رہنمائی کی ہے۔ ظاہر ہے کہ دنیا میں انسان کو زندگی بسر کرنے کے لئے بہر حال ایک طریق زندگی درکار ہے جسے وہ اختیار کرے۔ اس کو اپنے انتخاب سے خود ایک راہ اختیار کرنی پڑتی ہے جس پر چل کر وہ اپنے اور کائنات کے اُن بہت سے مسائل کو حل کرے جنہیں فطرت اس کے سوچنے والے دماغ کے سامنے پیش تو کرتی ہے مگر اُن کا کوئی حل واضح طور پر نہیں بتاتی۔ اس کو علم کی ایک راہ چاہیئے جس پر وہ ان معلومات کو منظم کرے جنہیں فطرت اس کے حواس کے ذریعے اس سے اس کے ذہن تک پہنچاتی تو ہے مگر انہیں بطور خود منظم کر کے اس کے حوالے نہیں کر دیتی۔ اس کا گھریلو زندگی کے لئے، خاندانی تعلقات کے لئے، معاشی معاملات کے لئے، ملکی انتظام کے لئے اور زندگی کے بہت سے دوسرے پہلوؤں کے لئے بھی ایک راہ درکار ہے جس پر وہ محض ایک شخص ہی سے نہیں بلکہ ایک جماعت، ایک قوم کی حیثیت سے بھی چلے اور ان مقاصد تک پہنچ سکے جو اگرچہ اس کے مقصود و مطلوب ہیں مگر فطرت نے تو ان مقاصد کو صریح طور پر اس کے سامنے نمایاں کیا ہے اور نہ اُن تک پہنچنے کا ایک راستہ معین کیا ہے۔

یہ ہے اس طریق زندگی یا نظام زندگی کی نوعیت جس کا انسان عاجز و ناتوان ہے۔ اب ہم دیکھنا چاہیئے کہ اگر انسان اللہ کی مدد سے بے نیاز ہو کر خود اپنے لئے اس نوعیت کا ایک دین بنا نا چاہے تو کیا وہ اس کوشش میں کامیاب ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب یقیناً نفی میں ہے۔ خود وہ لوگ

جو آج بڑے بڑے بلند بانگ دعووں کے ساتھ اپنے اپنے دین کو پیش کر رہے ہیں یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ان میں سے کسی کا پیش کردہ دین ان ضرورتوں کو پورا کرتا ہے جن کے لئے انسان ایک دین کا محتاج ہے۔ کسی کا دین نسلی و قومی ہے، کسی کا جغرافیائی، کسی کا طبقاتی، مگر ایسا کوئی دین نہیں جو تمام انسانی ضروریات کا کفیل ہو سکے۔

۲۔ اسلام کے تصور دین کا تعارف

استعمال کیا جاتا ہے :-

(۱) کسی صاحبِ اقتدار کا غلبہ و تسلط۔

(۲) صاحبِ اقتدار کے آگے جھکنے والے کی اطاعت اور بندگی۔

(۳) قاعدہ و ضابطہ جس کی پابندی کی جائے۔

اہل عرب اس لفظ کو انہی تصورات میں سے کبھی ایک کے لئے اور کبھی دوسرے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ قرآن آیا تو اس نے اس لفظ کو اپنے منشا کے مناسب پاکر اس کو اپنی مخصوص اصطلاح بنالیا۔ قرآنی زبان میں لفظ دین ایک پورے نظام زندگی کی نمائندگی کرتا ہے جس کی ترکیب چار اجزاء سے ہوتی ہے :-

(۱) حاکمیت و اقتدار اعلیٰ (۲) حاکمیت کے مقابلہ میں تسلیم و اطاعت۔

(۳) وہ نظام فکر و عمل جو اس حاکمیت کے زیر اثر بنے (۴) جزا و سزا جو اقتدار اعلیٰ کی طرف سے

اس نظام کی اطاعت کے صلے میں یا سرکشی کی پاداش میں دی جائے۔

قرآن کبھی دین کا اطلاق پہلے اور دوسرے معنی پر کرتا ہے، کبھی تیسرے اور چوتھے معنی پر۔ کہیں ”الدين“ بول کر یہ پورا نظام اپنے چاروں اجزاء سمیت مراد لیتا ہے۔

دین ایک جامع اصطلاح : یہاں تک تو قرآن اس لفظ کو قریب قریب انہی معانی میں

استعمال کرتا ہے، جن میں یہ اہل عرب کے یہاں بولا جاتا تھا لیکن اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ وہ لفظ

دین کو ایک جامع اصطلاح کی حیثیت سے استعمال کرتا اور اس سے ایک ایسا نظام زندگی مراد لیتا

ہے، جس میں انسان کسی کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کر کے اس کی اطاعت قبول کرے۔ اس کے احکام و قوانین

کے مطابق زندگی بسر کرے۔ اس کی اطاعت پر عزت، ترقی اور انعام کا امیدوار ہو اور اس کی

نافرمانی پر سزا سے ڈرے۔ دنیا کی کسی زبان میں کوئی اصطلاح ایسی جامع نہیں ہے جو اس پورے

نظام پر حاوی ہو۔

مندرجہ ذیل آیات میں دین سے پورا نظام زندگی اپنے تمام اعتقادی، اخلاقی اور عملی پہلوؤں

سمیت مراد ہے :-

(۱) هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ
وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ
كُلِّهِ (التوبة: ۳۳)
(۲) وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ
وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ (انفال: ۳۹)

وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسولوں کی صحیح
رہنمائی اور دین حق کے ساتھ بھیجا تا کہ وہ اس
ام کو پوری جس دین پر غالب کر دے۔
اور تم ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی
نہ رہے اور دین بالکل اللہ ہی کا ہو جائے۔

دنیا میں اس وقت مذہب کے تین مختلف تصور پائے جاتے ہیں :

(ا) ایک تو یہ کہ دنیا انسان کے لئے حقیقتاً ایک قید خانہ ہے۔ اس کا جسم اس کی روح کے
حق میں ایک نیچرے کی حیثیت رکھتا ہے۔ انسان نجات اسی وقت پاسکتا ہے، جب وہ
اس قید خانے کی دیواروں کو خود اپنے ہاتھوں سے توڑ ڈالے۔ یعنی وہ دنیا کو چھوڑ کر رب کیوں
سے دُور ایک گوشے میں بیٹھ کر اللہ سے لو لگائے۔ اور دنیا جہان کے سارے بکھیروں سے
آزاد ہو کر خدا کی جناب تک رسائی حاصل کرے۔ دین اور خدا پرستی کے اس نظریے کا نام
”رہبانیت“ یا ”یوگ“ ہے۔

(ب) دوسرے تصور کی رو سے انسان کو دنیا سے منہ موڑنے اور نفس کشی کی حاجت نہیں بلکہ اسے
دنیا کو برتنے ہوئے اور اپنی چلتی خواہشوں کو معقول حدود کے اندر پوری کرتے ہوئے خدا کی
عبادت کرنا چاہیے۔ جہاں تک دنیوی معاملات کا تعلق ہے انسان صرف انفرادی زندگی
میں دین کا پابند ہے لیکن اجتماعی زندگی میں وہ خود مختار ہے کیونکہ ”عبادت“ فرد
کا کام ہے جماعت کا نہیں۔ نیز دین انسان اور خدا کے درمیان ایک نجی معاملہ ہے۔
چنانچہ عام دنیاوی اور اجتماعی وسائل میں انسان آزاد ہے۔ یہ مذہب کا محدود تصور
ہے اور اسے ”ادھوری دین داری“ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

(ج) تیسرا تصور یہ ہے کہ دنیا سے کنارہ کشی اور نفس کشی دونوں غلط ہیں اور دین و بندگی
کو صرف نجی اور انفرادی معاملہ تصور کرنا بھی بالکل غلط ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ انسان
اپنی پوری انفرادی و اجتماعی زندگی میں دین کا پابند اور بندگی کا محتاج ہے اسے جتنی
قوتیں دی گئی ہیں وہ صرف بندگی کے لئے عطیہ ہیں۔ یعنی نہ انہیں بالکل آزاد چھوڑا جائے
نہ ان کو کچلا جائے۔ صحیح دین داری اور خدا پرستی یہ ہے کہ انسان زندگی کا ہر لمحہ احکام الہی
کے تحت گزارے اور دنیوی زندگی کا پورا نظام مالک حقیقی کا پسندیدہ ہو یہ اسلام
کا تصور دین ہے۔

اسلام کا یہ تصور دین رہبانیت سے کسی قسم کا لگاؤ نہیں کھاتا۔ انسان کے رب نے جو

حقیقی فرما روا اور قانون ساز بھی ہے، پوری زندگی کے لئے احکام و قوانین مقرر کئے ہیں۔ اس کے بنیادی عقائد و اعمال مثلاً نماز، حج اور زکوٰۃ وغیرہ کی ٹھیک ٹھیک ادائیگی کے لئے اجتماعیت کو ضروری قرار دیا ہے کیونکہ اجتماعی فضا سے ہٹ کر بطور خود نماز روزے کی ادائیگی سے وہ تمام فوائد و مصالح ہرگز نہ حاصل ہو سکیں گے جو شریعت میں مقصود ہیں اور اسلام کے پورے احکام کی بجا آوری اجتماعیت کے بغیر ممکن نہ ہوگی۔ نیز قرآن و حدیث میں اس سے صاف برأت کا اظہار کیا گیا ہے۔ مثلاً:

لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ | (اسلام میں کوئی رہبانیت نہیں ہے)

ایک دوسری حدیث میں ہے: ”ہمیں اللہ تعالیٰ نے رہبانیت کے بجائے آسان اور خالص دین بڑا ہی عطا فرمایا ہے۔“ اسی طرح قرآن میں ہے:

وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَأْتُمْ عَنْهَا مَا كُنْتُمْ عَلَيْهَا | (اور انہوں نے رہبانیت کی خود ساختہ راہ اختیار کر لی ہے نہ تو انہیں اس کا حکم نہیں دیا تھا۔) (الحمد - ۲۷)

گویا نہ صرف اسلام میں بلکہ خدا کی طرف سے آئی ہوئی کسی شریعت میں بھی رہبانیت کی تعلیم نہیں دی گئی۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ جس طرح دین کا مزاج رہبانیت کو برداشت نہیں کرتا اور اس کے بنیادی عقائد و اعمال اس کے مخالف ہیں، ٹھیک یہی حال اس کی تفصیلی تعلیمات کا بھی ہے اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر اس طرز عمل کی ممانعت فرمائی ہے جس میں رہبانیت کی بوکھسی اور یا اس کی طرف لے جانے والا تھا۔ مثلاً نکاح سے بچنا، ہمیشہ مسلسل روزے رکھنا، قوت گویائی معطل رکھنا، مسلسل شب بیداریاں یا وہ عبادت جس سے جسم آرام اور اہل و عیال اپنے حقوق سے محروم ہو جائیں وغیرہ

رہبانیت کی طرح دوسرا مذہبی تصور بھی، جسے ہم نے ”ادھوری دین داری“ سے موسوم کیا ہے، اسلام کے تصور سے بالکل مختلف ہے، کیوں کہ دین بندے اور خدا کا نجی معاملہ نہیں ہے اگر ایسا ہوتا تو اس کی تعلیمات انفرادی زندگی کے مسائل تک ہی محدود ہوتیں۔ وہ صرف مسجد کی باتیں کرتا، نماز روزے کا حکم اور اخلاقیات کی تلقین بس کافی تھی لیکن واقعہ اس کے برعکس ہے۔ اسلام کے نزدیک دین، ”انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر میدان میں مادی اور واجب الانباج ہے۔ اللہ کا ہر فرمان اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر ارشاد اسلام کا حصہ اور دین کا جزو ہے اور ان کے کسی بھی حکم کو دین سے زائد نہیں خیال کیا جاسکتا۔ یوں بھی سوچیے تو اس طرح کے خیال میں کوئی معقولیت نہ مل سکے گی۔“ اسلام کا مفہوم اگر اللہ تعالیٰ کی غیر مشروط اطاعت ہے تو اس کے کسی حکم کو آخر دائرہ اطاعت سے کس طرح باہر رکھا جائے گا۔

غرض اسلام نہ تو رہبانیت کو درست قرار دیتا ہے اور نہ اس کا دائرہ انفرادی زندگی کے مسائل تک محدود ہے۔ بلکہ وہ تو ایک مکمل ضابطہ زندگی اور ایک کامل اجتماعی مسلک ہے۔ اور ملت اسلامیہ یا امت مسلمہ وہ با اصول جماعت ہے جس کا مسلک اسلام کے دیئے ہوئے اصولوں پر اپنی زندگی کی پوری عمارت کی تعمیر ہے، یہ مسلک حیات فطرت کے مٹھوس حقائق پر مبنی ہے، عالم گیر اور جهانی ہے، زمان و مکان کی قیود اور قومی و جغرافیائی حدود سے ماورا ہے، غیر متبدل ہے اور انسانی علوم و افکار اور تجربات اس کی کسی ایک اصل میں بھی قطع و برید نہیں کر سکتے۔ مختصر یہ کہ وہ ایک ایسا مکمل نظام ہے جو انسانی زندگی کے اعتقادی، فکری، اخلاقی، روحانی اور عملی تمام پہلوؤں کو پوری طرح گھیرے ہوئے ہے بلکہ اسلام دراصل اللہ کی رضا کی خاطر جینے اور اسی کی خاطر مرنے کا نام ہے اور مسلمان وہ ہے جو اپنی نظریں ہمیشہ آخرت پر جمائے رکھے اور اس کے مفاد پر دنیا کے مفاد کو ہرگز مقدم نہ ہونے دے۔

اب اس میں تو کسی کو اختلاف نہ ہوگا کہ اسلام کا قبول کر لینا نجات اخروی کا باعث ہے اور آخرت کی ساری فلاح و کامرانی ایک ”مسلم“ کے لئے مقرر ہو چکی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے۔

ہاں جس نے اپنا رخ اللہ کی طرف کر دیا یعنی اسلام قبول کر لیا، اور وہ نیکو کار ہوا تو اس کے لئے اس کے پروردگار کے ہاں اس کا ثواب ہے۔ اور ان داسلام قبول کر لینے والوں کو نہ کوئی خوف ہی ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرٌ عِنْدَ رَبِّهِ مَلِيًّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ؕ
(البقرة - ۱۱۲)

سابقہ ابواب کے مطالعہ سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آگئی کہ ”اسلام“ دوسرے تمام مذاہب سے ممتاز ہے۔ صرف اسلام ہی ہر حیثیت سے کامل دین ہے۔ سارے انسانوں کے لئے، اللہ کا آخری پیغام ہے اور نجات کے لئے اس کی پیردی ضروری ہے۔ اللہ کے آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام کی جو دعوت پیش کی وہ مکمل اور ایسی جامع تھی جس کے بعد کسی اور تعلیم کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ اور یہ ہدایت ہمیشہ کے لئے، ہر زمانے اور ہر قوم کے لئے کافی و شافی ہے۔

۱۔ عالمگیر رسالت :- سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت عالمگیر ہے۔ آپ کسی زمین کے خاص خطے یا کسی ایک قوم کے لئے نبی بنا کر نہیں بھیجے گئے ہیں۔ بلکہ ساری دنیا کے لئے اور تمام انسانوں کے لئے بھیجے گئے ہیں۔

قرآن کریم میں فرمایا ہے۔

”وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ | (اے محمد ہم نے تمہیں تمام لوگوں کیلئے خوشخبری شانے
بَشِيرًا وَنَذِيرًا“ (سبا- ۲۸) والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔)

حضورؐ نے خود بھی حکم خداوندی اس کا اعلان کیا تھا۔

”يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ | (لوگو! میں تم سب لوگوں کے لئے اللہ
إِلَيْكُمْ جَمِيعًا“ (الاعراف- ۱۵۸) کا رسول ہوں۔

یہ ایک ایسی بات ہے جو آپ کے ساتھ خاص ہے۔ آپ سے پہلے جو انبیاء آئے تھے ان میں سے کسی کی حیثیت یہ نہ تھی چنانچہ ایک حدیث میں فرمایا :

۲۔ خاتم الانبیاء

”كَانَ النَّبِيُّ يَبْعَثُ إِلَى قَوْمِهِ | محمدؐ سے پہلے کا ہر نبی مخصوص طور پر اپنی ہی قوم
خَاصَّةً وَبَعَثَ إِلَى النَّاسِ عَامَّةً“ (صحیح بخاری و مسلم) کے پاس نبی بنا کر بھیجا جاتا تھا لیکن میں تمام
لوگوں کیلئے نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

حضورؐ کی نبوت جس طرح عالمگیر ہے اُسی طرح ہمیشہ کے لئے بھی ہے۔ آپ کے ساتھ وحی و رسالت کا سلسلہ اپنی آخری حد تک پہنچ کر ختم ہو گیا اور اب قیامت تک کوئی رسول نہ آئے گا۔
”وَلَكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ“ (الاحزاب- ۴۰) (بلکہ وہ اللہ کے رسول اور سارے نبیوں کے
سلسلے کو ختم کرنے والے ہیں)

نور حضورؐ کے اپنے الفاظ ہیں :-

”خُتِمَ فِي الْبُيُوتِ وَخُتِمَ فِي الرَّسُلِ“ (مجھ سے نبوت کی عمارت مکمل ہو گئی اور میرے
ذریعے رسولوں کا سلسلہ ختم ہو گیا) (صحیح بخاری و مسلم)

اس کے مقابلے میں دوسرے انبیاء کی رسالت کا معاملہ کسی شرح و بیان کا محتاج نہیں۔

۳۔ تکمیل دین

پھر جیسا کہ قبل ازیں کہا گیا آپؐ جو دین و شریعت لے کر آئے وہ ہر پہلو سے کامل ہے۔ جب کہ
پچھلے تمام دینوں میں سے کسی کو یہ اعزاز نہ ملا تھا۔ یہ شرف اللہ نے صرف اسلام کے لئے مخصوص کر رکھا
تھا کہ وہ دین کامل ہو۔

”الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَآمَنْتُمْ | (آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر
عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَاصْنُوا لَكُمْ الْإِسْلَامَ | اپنی نعمت پوری کر دی اور دین کی حیثیت سے
دِينًا۔ (المائدة- ۳) تمہارے لئے اسلام کو پسند کر لیا۔

حقیقت یہ ہے کہ پہلے جو دین بھی آیا وہ اس قوم اس زمانے اور اس علاقے کی اصلاح و ہدایت

کے لئے مخصوص تھا اور جس طرح اس کی مخاطبت کا دائرہ محدود تھا اسی طرح اس کی تعلیمات کا مجموعہ بھی مختصر تھا لیکن جب اللہ کی حکمت کا فیصلہ یہ ہوا کہ اب ایسا نبی بھیجا جائے جو سب کے لئے ہو اور ہمیشہ کے لئے ہو تو اس فیصلے کا فطری تقاضا تھا کہ اس نبی پر نازل ہونے والے دین کا مزاج بین الانسانی ہو اور اس کی تعلیمات ہر زمانے، ہر ملک اور ہر طرح کے انسانی مسائل پر حاوی ہوں قرآن کی مذکورہ بالا آیت اس فطری تقاضے کی تکمیل کا اعلان کر رہی ہے۔

۴۔ محفوظ کتاب

اسلام کا یہ بھی امتیاز ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جو کتاب نازل ہوئی وہ بھول کی توں محفوظ ہے اور قیامت تک محفوظ رہے گی، جس پر خود قرآن، حدیث اور تاریخ گواہ ہیں۔ اور یہ کتاب ایک ایسی زبان میں ہے جو زندہ ہے۔ کروڑوں آدمی اسے بولتے ہیں اور دنیا کے گوشے گوشے میں اس کے جاننے، سمجھنے اور پڑھنے پڑھانے والے بے شمار انسان موجود ہیں۔ اس کے مقابلے میں کوئی ایک کتاب بھی ایسی نہیں جو ان صفات کی حامل ہو۔

امتیازی حیثیت کے تقاضے | رسالت محمدی کی اس امتیازی حیثیت کے پیش نظر کچھ لازمی تقاضے پیدا ہو جاتے ہیں:-

پہلے اس کا پہلا فطری اور لازمی تقاضا یہ ہے کہ دوسرے تمام مذاہب منسوخ ہو چکے ہیں۔ اور اب اللہ کے نزدیک منظور شدہ دین صرف اسلام ہے۔

”إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ“ (بے شک اللہ کے نزدیک مقبول دین تو صرف اسلام ہے) | آل عمران - ۱۹

۱۔ تمام مذاہب منسوخ ہو چکے ہیں:-

اس لئے ضروری ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے اور ہر قوم، ہر ملک اور ہر زمانے کا انسان اسی

کی پیروی کرے ورنہ:

”وَمَنْ يَتَّبِعْ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ“ (آل عمران - ۵۵) | اور جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہوگا تو اللہ کے یہاں اس کی طرف سے یہ دین ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔

کیوں کہ جب یہ دین ساری دنیا کا دین اور اس کا لائے والا پیغمبر پوری نوع انسانی کا پیغمبر قرار دیا دیا گیا ہے تو اب کسی اور دین اور کسی اور پیغمبر کا زمانہ باقی نہیں رہ سکتا۔ رسول تو آتا ہی اس لئے ہے کہ جن لوگوں کی طرف وہ بھیجا گیا ہے وہ اسے اللہ کا رسول تسلیم کریں اور اس کی غیر مشروط پیروی کریں۔

”وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ“ (النساء - ۶۴) | (ہم نے جو رسول بھیجا صرف اسی لئے بھیجا کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے)

اس لئے حضورؐ کا سارے انسانوں کی طرف مبعوث ہونا اور پھر آخری رسول ہونا اس کا کھلا تقاضا کرتا ہے کہ ہر انسان اور ہر زمانے کا انسان آپ پر ایمان لائے اور آپ کے لئے ہوئے دین کو اپنا دین مان کر لازماً اس کی پیروی کرے۔ اگر کوئی شخص آپ کی نبوت کو نہیں مانتا اور آپ کے لئے ہوئے دین کا حلقہ اپنی گردن میں نہیں ڈالتا تو یہ آپ کے نہیں بلکہ اس حاکم حقیقی کے خلاف بغاوت ہے جس نے آپ کو پوری دنیا کا ہادی اور آخری نبی بنا کر بھیجا ہے۔

۲۔ اسلام ہی کی پیروی ضروری ہے!

اس بات کا ثبوت کہ اسلام ہی کی پیروی ضروری ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل میں بھی موجود ہے۔ اگر یہ بات قرآن کے نزدیک بھی صحیح ہوتی کہ سارے دین پتے ہیں اور کسی ایک رسول کی پیروی کافی ہے تو اس کا بالکل منطقی یہ تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہود اور نصاریٰ کو اسلام کی دعوت دیتے کیوں کہ وہ خود صاحب کتاب تھے اور اگر دعوت دیتے بھی تو کم از کم اسلام لانے کے مطالبے پر اصرار تو کسی طرح نہ کرتے۔ اس کے برخلاف آپؐ ان سے صرف یہ کہتے کہ محض تورات اور انجیل کی مخلصانہ پیروی کرو۔ لیکن ساری دنیا جانتی ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ آپؐ نے انہیں بھی اسی طرح اسلام کی دعوت دی جس طرح عرب کے مشرکوں کو دی تھی اور ان کے لئے بھی اپنی پیروی کو ویسا ہی ضروری قرار دیا جیسا کہ ان مشرکوں کے لئے ضروری قرار دیا تھا۔

نہ صرف یہ کہ آپؐ نے انہیں اسلام لانے کی دعوت دی بلکہ ان میں سے جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا انہیں صاف لفظوں میں ”کفر“ کا مرتکب قرار دیا۔ حتیٰ کہ بعض مقامات پر تو ان کے اس انکار کو صرف کفر ہی نہیں بلکہ ”بدترین کفر“ اور انہیں صرف کافر ہی نہیں ”پکا کافر کہا گیا۔ قرآن میں فرمایا:۔ ”جو لوگ اللہ کے اور اس کے رسولوں کے ساتھ کفر کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کر دیں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض رسولوں کو مانیں گے اور بعض کو نہ مانیں گے اور اس طرح کفر و ایمان کے درمیان کی کوئی راہ اختیار کر لینا چاہتے ہیں وہ پتے کافر ہیں اور ایسے کافروں کے لئے ہم نے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔“ (النساء: ۱۵۰-۱۵۱)

دعوت اسلام کے جواب میں وہ جو کچھ کہتے تھے وہ ٹھیک وہی فلسفہ تھا جو آج وحدتِ ادیان کے نظریے کی بنیاد ہے۔ یعنی یہ کہ جب ہمارے پاس بھی اللہ ہی کا بھیجا ہوا دین ہے تو کیا اس پر ایمان رکھنا اور اس کی پیروی کرنا کافی نہیں ہے؟ آخر پھر کسی اور چیز کو اپنانا ہمارے لئے کیوں ضروری ہوا؟ وہ اپنی جگہ حق ہے اور یہ اپنی جگہ حق ہے۔ لیکن ان کے اس فلسفے کو اللہ تعالیٰ نہ صرف یہ کہ صحیح نہیں کہتا بلکہ اُسے صاف طور سے ”کفر“ کا فلسفہ قرار دیتا ہے۔ اور انہیں ”یہ بھی حق ہے وہ بھی حق“ کہنے کے باوجود اصل حق کا منکر دکا فر، ٹھہراتا ہے۔

اس کے علاوہ جب قرآن کے سوا اس کوئی دوسری کتاب بھی ایسی نہیں رہ گئی ہے جو پوری طرح محفوظ ہو اور جس کی اصل زبان دنیا کی مُردہ زبانوں میں شامل نہ ہو چکی ہو تو دوسری کتابوں اور شریعتوں کی ٹھیک ٹھیک پیروی ممکن بھی کیسے ہو سکتی ہے؟ یہ صورت حال تو گویا خود ان کتابوں اور شریعتوں کا اقرار ہی بیان ہے کہ اب ہمارا زمانہ ختم ہو چکا ہے اور ہمیں منسوخ قرار دیا جا چکا ہے۔

اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب ہر شخص کے لئے اسلام ہی کی پیروی ضروری ہے اور اب کوئی اور دین اللہ کے حضور منظور شدہ اور قابل قبول نہیں رہ گیا ہے تو اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ اسلام ہی شرط نجات ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی جن شریعتوں کو اب خود منسوخ اور ناقابل قبول ٹھہرا چکا ہے ان کی پیروی پر وہ کوئی اجر کیسے دے گا؟ چنانچہ ”وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ“ فرمانے کے بعد وہ اپنے اس فیصلے کا بھی اعلان کر چکا ہے کہ

”وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ“ (اور ایسا شخص آخرت میں قطعاً ناکام رہے گا) (آل عمران - ۸۵)

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس فیصلہ خداوندی کی توضیح کرتے ہوئے فرمایا:-

”قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے اس اُمتِ دُگرُوہِ انسانی میں سے جس کسی بھی شخص تک (مثلاً یہودی یا نصرانی تک) میری نبوت کا پیغام پہنچا اور اس کے باوجود وہ میرے لئے ہوئے دین پر ایمان لائے بغیر مر گیا تو وہ جہنمی ہوگا۔“ (صحیح مسلم)

اس فیصلہ ربانی کے تحت جس طرح یہود و نصاریٰ آتے ہیں اسی طرح دوسری قومیں آتی ہیں۔ بلکہ ایک حیثیت سے دوسری قوموں اور ملتوں کا معاملہ اور زیادہ اہم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ دنیا کی ساری قوموں میں سے صرف یہود اور نصاریٰ ہی وہ دُگرُوہ ہیں جن کو قرآن نے صاف و صریح لفظوں میں ”اہل کتاب“ کہا ہے۔ اور جن کو کسی نبی کا اُمتی اور کسی آسمانی شریعت کا حامل قرار دیا ہے۔ اب اگر ایسی ملتوں کے افراد کے لئے بھی رسالتِ محمدی کی پیروی شرطِ نجات ہے تو عقل کہتی ہے کہ ان قوموں اور ملتوں کے لئے اس کا شرطِ نجات ہونا اور زیادہ ضروری ہوگا، جن کو قرآن نے صاحبِ کتاب و شریعت کے نام سے یاد نہیں کیا ہے۔

غرض جہاں تک اسلام کے اپنے فیصلے کا تعلق ہے وہ بالکل دو لوگ انداز میں اپنی پیروی کو سارے انسانوں کے لئے ضروری اور شرطِ نجات قرار دیتا ہے۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جس تک اسلام کا پیغام ہی نہ پہنچا ہو اور اس پیغام کو پوری انسانیت تک پہنچانے کی ذمہ داری اُمتِ مسلمہ کی ہے۔ انفرادی اور اجتماعی طور پر مسلمان اس امر کے ذمہ دار ہیں کہ دنیا کے سامنے اس حق کی شہادت دیں۔

www.KitaboSunnat.com

۲۔ انسانی زندگی کے بنیادی مسائل اور اس کے مختلف حل

انسان کی لوحِ ذہن پر چند بنیادی سوالات ابھرتے ہیں جن کے حل پر انسانی زندگی کا مدار و انحصار ہے۔ وہ بنیادی سوالات یہ ہیں :-

- (۱) اس دنیا کا آغاز و انجام کیا ہے؟
 - (۲) کیا اس زندگی کے بعد کوئی اور زندگی بھی ہے؟
 - (۳) اگر ہے تو کس قسم کی ہے اور اس کے لئے موجودہ زندگی میں کیا کرنا چاہیئے؟
 - (۴) یہ کائنات بحیثیت مجموعی کیا ہے اور اس کو ایک خاص نظام کے مطابق چلانے والا کون ہے؟
 - (۵) اُس ذات کی صفات کیا ہیں اور اس کا انسانوں کے ساتھ کیا تعلق ہے؟
 - (۶) اس کائنات میں انسان کی حیثیت کیا ہے اور کیا وہ خود مختار ہے یا کسی کا ماتحت؟
- یہی سوالات ہیں جن کا جواب مذہب دیتا ہے۔ یہی پیاس ہے جس کے پانی کی تعبیر دین سے کی جاتی ہے، یہی بھوک ہے جس کی خوراک مذہب کے یہاں سے مل سکتی ہے۔ انہی سوالات کا حل کرنا مذہب کی اصلی غرض و غایت ہے۔ تاہم فلسفہ بھی انہی مسائل سے بحث کرتا ہے اور تمدن بھی انہی بنیادوں پر اپنی عمارت قائم کرتا ہے۔ ان سوالات کا جواب دیئے بغیر نہ ہم زندگی کا کوئی حقیقی مسئلہ حل کر سکتے ہیں، نہ تمدن کا کوئی نقشہ بنا سکتے ہیں۔ ہر تمدن خواہ کتنا ہی سطحی ہو ان سوالات کا کوئی نہ کوئی جواب ضرور رکھتا ہے جو اس کی عمارت کے لئے بنیاد کا کام دیتا ہے۔ اسی سرچشمے سے اس کی زندگی کی ساری نہریں بچھتی ہیں اور اُن کے رخ متعین ہوتے ہیں۔ سیاست ہو یا معاشرت، تہذیب و شنائستگی ہو یا علم و فلسفہ غرض اندونی و بیرونی زندگی کے تمام مناظر و مظاہر اس بنیادی تصور کا عکس ہوتے ہیں۔

جہاں ان سوالات کا جواب دینا اہل فلسفہ اور عقلا کا مشغلہ ہے وہاں ان کے حل سے متعلق کوئی نہ کوئی رائے قائم کرنا ہر خاص و عام کے لئے ضروری ہے۔ جب تک کوئی شخص ان سوالات کے حل سے متعلق کوئی رائے قائم نہ کر لے، اس کے لئے کوئی عمل ممکن نہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ زندگی اور موت کے متعلق کوئی رائے قائم نہ کریں اور اس کے باوجود آپ کے امتحان منطقی ربط اور عملی حکمت پر مشتمل ہوں۔ آپ اگر اپنی مرضی سے کوئی کام انجام دے رہے ہیں تو یقیناً اس کا کوئی نہ کوئی مقصد

ہوگا۔ یہ مقصد یا تو آخری نجات ہوگا یا محض دنیوی فلاح و کامرانی پہلی صورت میں ضروری ہے کہ زندگی بعد از موت پر آپ کا ایمان ہو اور دوسری صورت میں اس کو نفاذ اور بے کا خیال کریں۔

یہی وجہ ہے کہ معاشرے کا ہر فرد ان مسائل کا ایک جواب اپنے ذہن میں ضرور رکھتا ہے۔ یہی حال معاشرتی زندگی کے مختلف شعبہ جات کی بنیاد بنتا ہے۔ چنانچہ اگر ہمیں معلوم ہو جائے کہ فلاں معاشر نے ان سوالات کا فلاں حل قبول کیا تو اس معاشرے کے سیاسی، معاشی اور دیگر سماجی نقطہ نظر کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں یا اگر ہمیں اس کے سیاسی، معاشی اور سماجی کارناموں کا علم ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس نے مسائل کے حل میں فلاں پہلو اختیار کیا ہوگا۔ یہ اس لئے کہ کسی قوم کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ ان مسائل کے حل کے سلسلے میں ایک پہلو پر ایمان رکھے اور عملی طور پر اس کا متحمل اس کے برعکس ہو۔

علم کے ذرائع | ہم کو اس موقع پر دیکھنا یہ ہے کہ ان مسائل کے حل کے لئے ہمارے پاس کیا ذرائع ہیں اور ان سوالات کو کس کس طرح حل کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ہم کو اپنی قوتوں کا جائزہ لینا ہوگا جن سے بظاہر ہم ان مسائل کے حل میں مدد لے سکتے ہیں۔

۱۔ حواس: حواس سے مراد وہ پانچ مشہور قوتیں ہیں جنہیں باصرہ، سامعہ، لامسہ، شامہ اور ذائقہ کہا جاتا ہے۔ یہی حواس ہمارے علم کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ یقینی ذریعہ ہیں۔ دنیا سے متعلق جس قدر محسوسات کا ہم کو علم ہے ان سب کی بنیاد یہی حواس ہیں۔ ان ہی کی بناء پر ہم تجربہ اور مشاہدہ کے بعد طبعی قوانین دریافت کر کے اپنے سائنسی علوم ترتیب دے سکتے ہیں لیکن حواس اپنی اس وسعت کے باوجود محدود ہیں۔ یہ ہمیں صرف ان اشیاء سے متعلق علم فراہم کرتے ہیں، جن کا محسوس کیا جانا ممکن ہے لیکن ہر موجود کے لئے ضروری نہیں کہ وہ محسوس بھی ہو۔ مثلاً زندگی ایک ایسی حقیقت ہے جس کا ادراک محض حواس سے ممکن نہیں۔ ہم زندگی کے مظاہر کا مشاہدہ کر کے زندگی کا قیاس تو کر سکتے ہیں، لیکن کسی دوسرے کی زندگی کو بلا واسطہ طور پر محسوس نہیں کر سکتے۔ چنانچہ معلوم یہ ہٹا کہ حواس سے صرف مادی اشیاء کا علم ممکن ہے اور وہ بھی صرف ان اشیاء کے آثار اور حواس کی حد تک۔ مگر جن مسائل سے ہم بحث کر رہے ہیں وہ سب مابعد الطبیعیات ہیں۔ مثلاً زندگی کا مبدا اور منتہا ایسی چیزیں ہیں جو نہ ہماری آنکھوں سے دیکھی جاسکتی ہیں اور نہ ہمارے کانوں سے سنی جاسکتی ہیں۔ اس لئے حواس کے ذریعے ہم ان مسائل کا حل دریافت نہیں کر سکتے۔

۲۔ عقل: عقل انسان کو جانوروں سے ممتاز کرتی ہے۔ انسانی علوم میں ترتیب اور ربط۔ اسی کی بنا پر ہے۔ لیکن جب ہم اس بات کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں کہ کیا عقل زندگی کے بنیادی مسائل کا حل بھی دریافت کر سکتی ہے۔ تو نتیجہ نفی کی صورت میں نکلتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عقل حصول علم کے لئے تنہا کافی نہیں۔ اس کو اپنے علاوہ اپنے سے کمتر

چیزوں سے مدد لینی پڑتی ہے کسی ایسی چیز تک پہنچنے کے لئے جس کو وہ ابھی تک نہیں جانتی، ان معلومات سے کام لینا پڑتا ہے جو اس کو پہلے سے حاصل ہوتی ہیں۔ یہ مقدمات محسوسات ہی ہوتے ہیں۔ تمام عقلی علوم کا تجزیہ کیجئے اور عقل کا دلچسپ و طویل سفر نامہ سنئے تو معلوم ہوگا کہ حقائق کی ان نئی دنیاؤں تک پہنچنے اور لاعلمی کے بڑے بڑے سمندروں کو عبور کرنے میں اس کا زاد سفر حقیقی محسوسات اور ابتدائی معلومات تھے۔ پس جہاں جو اس کام نہ کرتے ہوں وہاں عقل اسی طرح بے بس ہوتی ہے جیسے طیارہ بغیر ہوا کے نہیں اڑ سکتا۔ لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ زیر بحث مسائل مابعد الطبیعیاتی ہیں اور اس لحاظ سے جو اس کی گرفت سے باہر ہیں اور جب جو اس کی گرفت سے باہر ہیں تو عقل کی رسائی سے بھی ماورا ہیں۔ ۲

نکل جا عقل سے آگے کہ یہ نور

چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے

لیکن عقل کی اس نارسائی کے باوجود انسان نے اپنے تجسس اور خود فریبی کی بنا پر ان سوالات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ ایسی کاوش کے حاصل کا نام فلسفہ ہے۔ فلسفہ خواہ مذہب کی مخالفت میں ہو یا موافقت میں، اپنی اصلیت اور اساس کے لحاظ سے ایک ہی ہے۔ خدا کی حقیقت اس کی صفات، اخلاقی قوانین کا مقام وغیرہ ایسے مسائل ہیں جو ہمارے ادراک سے باہر ہیں اور اس لئے واحد فیصد جو عقل ان سے متعلق صادر کر سکتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کی حقیقت مدرک اشیاء سے مختلف ہے۔ لیکن یہ واقعہ دلچسپ ہے کہ ہر اس فلسفے کے نزدیک کہ جس نے ان مسائل کے حل تفصیلی انداز سے پیش کرنے کی کوشش کی، یہ اشیاء عام، مدرک اشیاء ہی کی مانند ہیں اور اس طرح یونانی فلسفہ اور علم کلام دونوں ہی تجسیمیت کا شکار ہو گئے۔

۳۔ وجدان یا اشراق سے مراد وہ مفروضہ عقلی بینی ہے جو جو اس اور عقل کی مدد کے بغیر عالم ثانی اور غیبی حقیقتوں کے علم کا ذریعہ ہے۔ وہ لوگ جو اس ذریعے کی صحت پر ایمان رکھتے ہیں ان کے نزدیک حسی مشاہدہ اور عقلی استدلال اس نورِ باطن کے حق میں زیرِ ہر قائل ہے۔ صداقت کے یقینی حصول کے لئے شرط ہے کہ تزکیہ نفس کیا جائے اور ان کے تئیں تزکیہ نفس نام ہے ترک دنیا، نفس کشی، ریاضت اور مراقبہ کا۔

ہمارے نزدیک یہ بات توضیح ہو سکتی ہے کہ انسان کچھ ایسی مخفی قوتیں رکھتا ہے جن کو بیدار کر کے وہ کچھ ایسی معلومات حاصل کر لے جو جو اس کے ذریعے ممکن نہیں، لیکن یہ قوتیں بہر حال انسانی قوتیں ہیں اور عقل و جو اس کی طرح نہ بھی محدود اور خطا پذیر ہیں۔ یہ حقیقت اس واقعے سے ثابت ہوتی ہے کہ اہل اشراق عالم ثانی کی جو تصاویر کھینچتے ہیں ان میں سے ہر ایک مختلف

ہے۔ اگر اشراق خطا پذیر نہ ہوتا تو یہ اختلاف بھی ممکن نہ تھا۔

درحقیقت انسان کی قوت عقلی ہو یا قوت روحانی کوئی بھی اس کے خواہ اور خارجی موثرات کے اثر سے بالکل آزاد نہیں۔ اس کے ماحول، اس کے افکار و عقائد اور ان مقدمات کا، جو اس کے یا اس کی جماعت اور قوم کے نزدیک مسلم ہیں، اس کی تحقیقات اور مشاہدات پر ضرور اثر پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اشراقیوں کو اپنے کشف و مشاہدے میں کبھی یونانی و مصری اوہام کی تائید نظر آتی ہے اور کبھی فلسفہ یونان کے بہت سے مفروضات حقیقت نظر آنے لگتے ہیں۔

پھر اگر اس حاسہ کی صحت پورے طور پر تسلیم بھی کر لی جائے تو سوال یہ ہے کہ اس حاسہ کے محسوسات کیا ہیں؟ اس سے کن چیزوں کا احساس ہوتا ہے؟ اہل کشف کہتے ہیں کہ ایک نیا عالم نظر آتا ہے، نئی صورتیں اور نئے رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن ان نئی صورتوں اور نئے رنگوں سے نہ تو زندگی اور موت کا مسئلہ حل ہوتا ہے نہ خدا کی صفات معلوم ہوتی ہیں، اور نہ ہی کائنات و انسان کا باہمی تعلق واضح ہوتا ہے۔ گویا بنیادی سوالات جوں کے توں رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اہل اشراق نہ تو ان مسائل کا کوئی واضح جواب دے سکے اور نہ کوئی مفصل اور مثبت نظام زندگی پیش کر سکے۔ خود اپنی زندگی گزارنے کے لئے بھی انہیں اپنے ہی زمانے کے نظام کی اقتدار مستعار لینا پڑیں۔ چنانچہ پراکلس اگر مصری رسوم دینی اور مذہبی تقریبات کا پابند تھا تو بولین رومی بت پرستی کا۔ ویسے دونوں کا شمار اہل کشف میں کیا جاتا ہے۔

اس مختصر بحث کا حاصل یہ ہے کہ انسان کی تمام ظاہری اور باطنی قوتیں، اس کے خواہ، اس کی عقل اور اس کا حاسہ باطنی، اس کی زندگی کے اہم اور بنیادی سوالات کا صحیح جواب دینے سے قاصر ہیں۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ ان سوالات کے جواب کی کوئی راہ ہی نہیں۔ ان سوالات کا حل پیش کرنے کا دعوے دار ایک ایسا گروہ بھی ہوتا ہے جو اپنے آپ کو رسول اور نبی کہتا ہے اور اپنا ذریعہ علم وحی بتاتا ہے۔ چنانچہ آئیے، وحی اور رسول کی روایات کو بھی پرکھ کر دیکھیں کہ ان کا کیا مقام ہے۔

۴۔ وحی: وحی نام ہے اس علم کا جو خداوند تعالیٰ اپنے برگزیدہ بندوں پر انسانوں کی ہدایت و معرفت کے لئے منکشف کرتا ہے۔ دوسرے تمام انسانوں تک یہ علم روایت اور نقل کے ذریعے سے پہنچتا ہے چنانچہ وحی یا یہ الفاظ دیگر رسالتی علم سے متعلق تین باتیں خصوصی ہیں:-

(۱) اس سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ عام طور پر ان اشیاء سے متعلق ہوتا ہے جو ظاہری خواہ سے مخفی ہیں۔

(ب) اس علم کا ذریعہ عام ذرائع علم سے مختلف ہوتا ہے۔ اس میں نہ ادراک حسی ہوتا ہے اور

نہ استدلال منطقی، بلکہ ایک ناقابل بیان پیرائے میں نبی یک یک نئے حقائق سے ہم کنار ہو جاتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ ان حقائق سے ہم کنار ہو جاتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ ان حقائق سے زیادہ واضح ہوتے ہیں جن کا ہم اپنے حواس سے ادراک کرتے ہیں۔

(ج) الہامی علوم انشراقی علوم کی طرح بے معنی اور معاشرتی زندگی سے بے تعلق نہیں ہوتے بلکہ وہ زندگی ہی کی ہدایت اور شرح کے لئے ہوتے ہیں اور اس لحاظ سے وہ ایک عملی نظام حیات کی بنیاد بنتے ہیں۔ آئیے اب ان تینوں باتوں کو ذہن میں رکھ کر یہ غور کریں کہ ان میں سے کون سی خلاف عقل اور غیر منطقی ہے، کیا وحی کا محوراً بعد الطبیعیات اشیاء ہیں، جیسا کہ عقل عام اشارہ کرتی ہے اگر ایسا ہوگا تو پھر ان سے متعلق علم بھی یقینی ہوگا۔ کیا وحی کا ایک خاص طریقہ پر وارد ہونا غیر منطقی ہے؟ ہم دیکھتے ہیں کائنات میں ہر جانب انسان کی ضرورتوں اور آسائشوں کی تکمیل کا سامان بکھرا ہوا ہے۔ اس کی چھوٹی سے چھوٹی خواہش اور حقیر سے حقیر حاجت بھی ایسی نہیں جو اس دنیا میں پوری نہ ہو سکے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک مہربان آقا نے انسان کی تمام ضروریات اس کائنات میں جمیا کر رکھی ہیں۔ لیکن اس دنیا میں عام انسان کی سب سے اہم ضرورت۔ زندگی کے بنیادی مسائل کا حل۔ بظاہر موجود نہیں عقل اشارہ کرتی ہے اور فہم مطالبہ کرتا ہے کہ وہ مہربان آقا جس نے ہر ضرورت کا سامان تکمیل بخشا، یہ نہیں کر سکتا کہ اس عظیم ضرورت کو تشدد تکمیل چھوڑ دے اور چونکہ ضرورت عام طریقہ سے پوری نہیں کی جا رہی ہے اس لئے یقیناً اس کے لئے کوئی خاص طریقہ مخصوص کیا گیا ہے۔ پھر کیا یہ بات خلاف عقل ہے کہ الہامی علوم نظام زندگی کی بنیاد ہیں؟ جب وحی متعلق ہی ان اشیاء سے ہے، جو عین حیات ہیں تو پھر ظاہر ہے کہ وحی کا انکشاف کردہ علم بھی زندگی کی ہدایت و قیادت کے لئے ہوگا۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ الہامی علوم عملی طور پر بعض معاشروں کے نظامات زندگی کی بنیاد رہ چکے ہیں۔

آغاز وحی | قرآن مجید وحی الہی ہے۔ وحی کے لغوی معنی ”چھپا کر اطلاع دینا ہے“۔ شرعی اصطلاح میں وحی سے مراد وہ خالص غیبی طریقہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ کسی نبی تک کوئی بات پہنچاتا ہے۔ اس میں کسی شخص کے غور و فکر اور تجربہ و استدلال کو قطعاً کوئی دخل نہیں۔ محض فضل الہی ہے، ذاتی محنت و کاوش سے یہ مقام حاصل نہیں کیا جاسکتا ہے۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح کرنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تنہا اپنے گھر میں تشریف لے جاتے اور کئی کئی راتیں وہاں مقیم رہ کر عبادت میں مشغول رہتے۔ جب کھانے پینے کا سامان ختم ہو جاتا تو گھر سے لے جاتے۔ اسی حالت میں ایک نوجوان آئے اور آپ سے کہا ”اقتراء“ (پڑھئے) آپ نے فرمایا، میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ فرشتے نے آپ کو زور سے دیا۔ پھر چھوڑ

فرمایا پڑھ! آپ پھر وہی جواب دیا۔ تین مرتبہ ایسا ہوا۔ فرشتے نے تیسری مرتبہ پکڑ کر دایا اور چھوڑنے کے بعد کہا:

”اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ“ (سورۃ العلق) (پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا)

یہ پہلی وحی تھی جو آپ پر نازل ہوئی۔ اس وقت آپ کی عمر چالیس برس تھی۔ زندگی کے اس نئے تجربہ سے آپ (صلی اللہ وسلم) ڈر گئے۔ گھر واپس لوٹے اور حضرت خدیجہؓ سے ماجرا بیان کیا۔ حضرت خدیجہؓ نے کہا: آپ کو اپنے چچا زاد ور قہ بن نوفل کے پاس لے گئیں، ور قہ بن نوفل مذہبِ عیسائی اور تورات و انجیل کا ماہر تھا۔ اس نے ماجرا سن کر کہا یہ وہی فرشتہ ہے۔ جو اللہ کے حکم سے حضرت موسیٰؑ پر نازل ہوا کرتا تھا۔ اس کے بعد وحی کا آنا چند روز کے لئے بند ہو گیا۔ یہ فترت وحی (وحی کی رکاوٹ) کا زمانہ کہلاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس عرصہ میں بہت افسردہ رہا کرتے تھے۔ اس کے بعد وحی کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔ اور یہ آیات نازل ہوئیں۔

يَا أَيُّهَا الْمَدَّثِرُ ۖ قُمْ فَأَنذِرْ ۚ
رَبَّنَا فَكَيْفَ (المدثر۔ ۱-۳)

(اے کسلی والے اٹھ اور لوگوں کو خبردار کر اور اپنے رب کی عظمت بیان کر)

اس کے بعد وحی کا سلسلہ تاحیات جاری رہا۔

حقیقت وحی | آیتوں کی تعداد کے لحاظ سے قرآن مجید سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر مختلف حدیثوں سے نازل ہوتا رہا۔ کبھی پانچ دس آیات اور کبھی اس سے زیادہ یا کم آیتیں نازل ہوتیں جس واقعہ یا ضرورت کے پیش نظر کوئی سورت یا آیت نازل ہوئی اس واقعہ کو مفسرین کی اصطلاح میں ”شان نزول“ کہتے ہیں۔ نزول وحی کے وقت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جایا کرتی تھی، جبرہ مبارک سرخ ہو جاتا، سانس پھول جاتا، شدید ترین سردی میں بھی پیشانی پسینہ سے شرابور ہو جاتی۔ آپ یوں محسوس فرماتے جیسے بھاری بوجھ تلے دبے ہوں، اگر آپ نزول وحی کے وقت کسی اونٹنی وغیرہ پر سوار ہوتے تو جانور بوجھ کر بیٹھ جاتا تھا۔ اس حالت میں آپ کو کلام الہی سنائی دیتا تھا۔

وحی کی صورتیں | کوئی بشرانی جسمانی ساخت کے اعتبار سے یہ طاقت نہیں رکھتا کہ رب العزت اس کے سامنے آکر اس سے کلام فرمائے اور وہ برداشت کر سکے۔ اس کے کسی انسان سے ہم کلام ہونے کی یہ تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔

پہلی صورت | اللہ تعالیٰ فرشتے کے واسطے سے کلام فرمائے مگر فرشتہ مجسم ہو کر آنکھوں کے سامنے نہ آئے۔ بلکہ براہ راست نبی کے دل پر نزول کرے، اور نبی کو دل سے ہی فرشتے اور اس کی آواز کا ادراک ہو۔ اس طریق وحی میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پہلے ایک گھنٹی کی سی

سنائی دیتی اور پھر حضرت جبرائیل وحی الہی کے ساتھ آپ کے قلب مبارک پر نزول فرماتے۔ یہ طریق وحی حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے احساس پر شدید گزرتا تھا اور بیشتر وحی قرآنی اسی صورت میں آتی تھی۔

دوسری صورت | اللہ تعالیٰ بلا واسطہ نورانی پردے کے پیچھے سے کلام فرماتے۔ نبی کی قوت سامعہ کلام سے براہ راست لذت اندوز ہوتی لیکن آنکھوں کے آگے تخلیقات حائل رہتیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کوہ طور پر اسی انداز کی وحی میں کلام ہوا۔ خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ بھی معراج کی رات اسی انداز میں کلام ہوا۔ بلکہ آپ کے سامنے نور کے جلوے کے سوا اور کوئی پردہ نہ رہا تھا۔

تیسری صورت | نزول وحی کی تیسری صورت یہ ہے کہ فرشتہ مجسم ہو کر نبی کے سامنے آکر اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچائے۔ جیسے ایک آدمی دوسرے سے خطاب کرتا ہے۔ اس صورت میں آنکھیں فرشتے کو اس کی ظاہری صورت میں دیکھ سکتی تھیں۔ کان اس کی آواز کو سن سکتے تھے۔ بلکہ پاس بیٹھنے والے بھی گفتگو سن لیتے اور بات کو سمجھ سکتے تھے۔

وحی کی ان تینوں صورتوں میں سے دوسری صورت بہت نادر تھی اور صرف شب معراج میں پیش آتی تھی۔ قرآن کریم کا اکثر حصہ پہلی اور تیسری صورت کے مطابق نازل ہوتا رہا۔ ائمہ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے کئی دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نہایت سردی کے دن وحی اترتی محسوس کی۔ جب اس کا دباؤ آپ سے اترتا تھا تو آپ کی پیشانی مبارک سے پسینہ ٹپک رہا ہوتا تھا۔ (صحیح بخاری)

انقطاع وحی | نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تقریباً تیس سال کے عرصہ میں اپنے مشن کی تکمیل کی یہاں تک کہ حجۃ الوداع کا تاریخی دن آیا۔ عرفات کے میدان میں نساؤں کا مویں مارتا ہوا سمندر بھیل اٹھا۔ اسی موقع پر آیت کریمہ نازل ہوئی۔

”الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَارْتَمَيْتُمْ عَلَيَّكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمْ الْإِسْلَامَ دِينًا“ (المائدہ-۳)

آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کر دیا اور میں نے تمہارے لئے اسلام کا دین ہونا پسند فرمایا ہے

یہ آخری وحی تھی جو آپ پر نازل ہوئی اس کے بعد وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

”قد انقطع الوحي و تمم الدين“ (مشکوٰۃ ص ۵۵) (وحی منقطع ہو گئی اور دین مکمل ہو گیا)۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ بھی یہی اعلان فرمایا:

ان الوحي قد انقطع (بخاری ج ۱ ص ۳۶) (بے شک وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہے)

(ابن ماجہ ص ۱۱۹)

بعض اہل علم کے نزدیک سورہ بقرہ کی یہ آیت آخری وحی تھی:-
وَالْقَوْلُ يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ (البقرہ - ۲۸۱)
اس دن سے ڈر جاؤ جب تمہیں اللہ کی طرف لوٹایا جائے گا۔

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باختلاف روایات کیا لٹی یا کتیس^۱ یا سات دن زندہ رہے۔ اس طرح ہجرا سے جس داستان ہدایت کا آغاز ہوا تھا اس کا آخری باب مکمل ہوا۔

۳۔ وحی کی حقانیت اور بالادستی | کسی طوطا پر بھی خلاف عقل و دانش نہیں تو ایک

عقل و دانش مند کے لئے یہی مناسب ہے کہ وہ الہامی علوم کی اسی طرح پرکھ کرے جیسے دیگر روایتی علوم کی جاتی ہے اور اگر یہ علوم پرکھنے پر صحیح ثابت ہوں تو ان پر ایمان لائے۔

جب کسی شخص کے قول کی تصدیق یا تکذیب کرنی مقصود ہوتی ہے تو ہمارے پیش نظر دو باتیں ہوتی ہیں۔ ایک قول نقل کرنے والے کی شخصیت اور دوسرے قول کے معنی۔ آئیے ابھی دو کسوٹیوں پر ہم رسول کے دیئے ہوئے علم کو بھی پرکھیں۔

کسی قول کی صحت کے لئے ضروری ہے کہ وہ انسانی تجربے اور مشاہدے کے خلاف نہ جاتا ہو۔ اگر کوئی شخص ماضی کو ہوا میں اڑتا اور جیل یا کبوتر کو پانی کی سطح کے نیچے تیرا بتاتا ہے تو اس کا قول قابل اعتبار نہیں، اس لئے کہ عام انسانی مشاہدہ اس کے خلاف ہے لیکن نبی جو چیزیں بتاتا ہے وہ یا تو مابعد الطبیعیاتی ہیں اور اس لحاظ سے تجربے اور مشاہدے کی قمر و سے باہر ہیں، یا عقل و حواس کے عین مطابق ہیں۔ رسالت کی پوری تاریخ میں کسی نبی نے کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں کہی جو خلاف عقل ہو۔ ہاں ماورائے عقل بہت سی باتیں کہی گئیں۔

قول کی صداقت کا دوسرا معیار یہ ہے کہ ایک گروہ کے افراد جو ایک ہی قسم کی اشیاء سے متعلق علم فراہم کرتے ہوں، ان کے اقوال آپس میں ٹکراتے نہ ہوں۔ انبیائے کرام کی تعلیمات اس بات کی شاہد ہیں کہ ان میں تضاد نہیں۔ تفصیلات میں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن اصول و مبادی ایک ہی ہیں۔

قول کی صحت کا تیسرا معیار یہ ہے کہ اس کو عمل زندگی میں اپنانے سے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں ان کا جائزہ لیا جائے۔ اگر یہ نتائج خوشگوار اور انسانیت کے حق میں مفید ہیں تو گمان غالب ہے کہ قول صادق ہوگا اور یہ صورت دیگر باطل۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب کبھی بھی انبیاء کی تعلیمات کو قبول حاصل ہوا، یکایک انسانی معاشرہ

کی بیشتر خبریاں دور ہو گئیں اور وہ بہت جلد عدل و انصاف کی نعمتوں سے ہم کنار ہو گیا۔
 قول کو جانچ لینے کے بعد قول نقل کرنے والے کی باری آتی ہے۔ ان دیکھی چیز سے متعلق
 قول کی تصدیق یا تکذیب کرنے کے لئے راوی کی شخصیت کی پرکھ اور بھی ضروری ہے۔ قول کی صداقت
 پر دو صورتوں میں اثر پڑ سکتا ہے ایک شعوری اور دوسرے لاشعوری۔ قول کو غیر معتبر سمجھ جانے
 کی ایک صورت وہ ہے کہ جب راوی بد دیانت اور بد کردار ہو۔ ایسا شخص اپنے ذاتی منافع
 کے لئے یا تو اقوال گھڑ سکتا ہے۔ یا ان کو مسخ شدہ صورت میں پیش کر سکتا ہے، لیکن انبیاء کے
 بارے میں ان کے دشمنوں کو بھی اس بات کا اقرار ہوتا ہے کہ وہ بلند کردار اور راست گو ہیں۔
 قول کا مسخ ہو جانا لاشعوری طور پر بھی ممکن ہے۔ یہ اس وقت ہو سکتا ہے جب کہ راوی کے
 حواس درست نہ ہوں۔ لیکن انبیاء کے بارے میں یہ حقیقت بھی مسلم رہی ہے کہ وہ سلیم العقل،
 صمیم الدماغ اور صائب الرائے ہوتے ہیں۔

لاشعوری تسخیر و تبدیلی کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ قول راوی کے زمانے کے تکنیکی علوم
 سے متاثر ہو۔ لیکن ہر نبی اگرچہ تمام اشیاء سے تعلق رکھتا ہے، معلومات رکھتا ہے، لیکن وہ تکنیکی اور
 ادبی علوم سے ناواقف ہوتا ہے۔ یہ امر اس بات کی ضمانت ہے کہ اس کی تعلیمات اس کے اپنے
 یا کسی دوسرے زمانے کے علوم کا نتیجہ نہیں بلکہ حقیقتاً کسی غیر معمولی ذریعے سے اس پر منکشف ہوئیں
 اور بغیر کسی تبدیلی کے اس کی زبان سے جاری ہو گئیں۔

سابقہ بیانات سے معلوم ہوا کہ
زندگی کے بنیادی مسائل اور اسلام | کہ محض حواس، عقل یا اشراق

ایک مکمل اور متوازن معاشرہ قائم کرنے میں کس طرح ناکام رہے ہیں۔ آئیے اب معلوم کریں کہ وحی و الہام
 کس طور پر ایک ایسا معاشرہ ترتیب دینے میں کامیاب ہوتے ہیں جو عدل و انصاف سے معمور ہو۔ الہامی
 معاشرے کی اساس وہ حل ہوتا ہے جو انبیاء کرام زندگی کے بنیادی مسائل سے متعلق پیش کرتے
 ہیں۔ چنانچہ الہامی تمدن کے مطالعہ سے پیشتر ان تعلیمات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ انبیاء
 کرام کی تعلیمات، جو قرآن پاک میں محفوظ ہیں، زندگی کے بنیادی مسائل کا مندرجہ ذیل حل پیش
 کرتی ہیں۔

(الف) انسان اور اس کی زندگی : انسان اور اس کی زندگی سے متعلق چار اہم نکات
 واضح کئے گئے ہیں۔

اول۔ انسان اللہ کی مخلوق اور اس دنیا میں خدا کا نائب ہے۔

محکم دلائل سے مزین و اشرف المخلوقات ہے، لہذا محض حیوان ناطق نہیں بلکہ دیگر مخلوقات پر اخلاقی برتری

رکھنا ہے۔ سوئم، انسان کی زندگی خدا کی عبادت کے لئے ہے۔ یعنی انسان کی تخلیق کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ وہ زندگی کے تمام شعبوں میں خدا کی دی ہوئی ہدایتوں پر عمل پیرا ہو، خواہ یہ سجود و قیام ہو خواہ تجارت و سیاست۔

چہارم، انسان کی موجودہ زندگی کے بعد ایک اور زندگی آنے والی ہے جس میں موجودہ زندگی کے اعمال کی جزایا سزا دی جائے گی۔

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ
وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ

پس جس نے ذرہ بھر بھلائی کی وہ دیکھ لے گا۔
اور جس نے ذرہ بھر برائی کی وہ بھی دیکھ لے گا۔

اب، کائنات کی حقیقت: کائنات سے متعلق تین نکات قرآن پاک میں واضح کئے گئے ہیں۔

اول۔ انسان کی طرح ہر شے اللہ کی تخلیق کردہ ہے، دوئم۔ اس کائنات کا نظام اللہ کے تعین کردہ اصول (سنت اللہ یا فطرت) کے مطابق چل رہا ہے۔ سوئم۔ یہ دنیا انسان کے استعمال اور تصرف کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اور اس طرح انسان کیلئے آزمائش کا سامان بھی ہم پہنچاتی ہے۔ (ج) اللہ اور اس کی صفات: اللہ اور اس کی صفات سے متعلق قرآن پاک کے صفحات بھر ہوئے ہیں، جن کا احاطہ اس مختصر باب میں ممکن نہیں صرف چند صفات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

اول: اللہ وہ ہستی ہے جو اس کائنات کی واحد خالق، مدبر و آقا ہے، اللہ نہ جسم رکھتا ہے اور نہ جسمانی حاجات۔ چونکہ اس کی مثال موجود نہیں اور اس کی ذات کا ادراک حواس کے لئے ممکن نہیں، اس لئے اللہ کا کوئی واضح تصور کوئی ذہن انسانی ترتیب نہیں دے سکتا۔

اللہ خالق و آقا ہونے کے ساتھ عادل و رحیم بھی ہے۔ اس کی صفات ربوبیت عدل اور رحم ہی کی بناء پر کائنات میں تنوع کے ساتھ ساتھ توازن و اعتدال ہے۔ وہ جس طرح جسمانی زندگی کا رب ہے، اسی طرح اخلاقی و روحانی زندگی کا بھی رب ہے، اس لئے اس کی صفت ربوبیت کا اور صفت عدل کا بھی تقاضا تھا کہ وہ اپنے بندوں کو راہ ہدایت دکھاتا، چنانچہ اس نے وحی کے ذریعہ یہ راہ منکشف کی اور صفت عدل کی بناء پر یوم آخر میں اچھے اور برے کام کا بدلہ دے گا۔

اب ذرا اس الہامی تمدن کے عناصر ترکیبی کا تجزیہ کر کے دیکھیے کہ ان کا انسان کی عقلیت و نفسیت اور اس کے اخلاق و اجتماع پر کیا انقلاب انگیز اثر پڑتا ہے۔

سب سے پہلے اس عالم کے متعلق یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ نہ تو بے بادشاہ کی سلطنت

ہے اور نہ چند بادشاہوں کی مشترک سلطنت، بلکہ اس کا ایک ہی مالک ہے، جو اس کا خالق و صانع بھی ہے اور مدبر و حاکم بھی۔ اس کا سب سے پہلا اثر ذہن انسانی پر یہ ہوتا ہے کہ ایک ہی خدا کے بندے ہونے کی حیثیت سے قبائل اور اقوام کی تقسیم ظاہری اور سطحی معلوم ہونے لگتی ہے اور انسانیت کے ایک وحدت ہونے کا یقین راسخ ہو جاتا ہے۔ اس عالم میں زندگی کے با مقصد ہونے کا خیال اور آخرت کا احساس عمل کی اصلاح کا عظیم ذریعہ بنتے ہیں۔ انسان کو اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ قیمتی معلوم ہوتا ہے۔ عیش و تفریح میں وقت ضائع کرنا برا معلوم ہوتا ہے، ظلم و نا انصافی سے طبیعت گہراتی ہے۔ احساس ذمہ داری بڑھ جاتا ہے۔ انسان کا قتل تو بہت بڑی چیز ہے معمولی ایذا رسانی ضمیر پر بار گزرتی ہے۔

خلافت اور نیابت کا تصور حاکم کو من مانی کارروائی سے باز رکھتا ہے، وہ اپنے کو مخلوق خدا کا مالک اور آقا نہیں بلکہ خدا کا امین اور بندوں کا خادم سمجھتا ہے۔ وہ ہر لمحہ اسی فکر میں رہتا ہے کہ کہیں اس کے ملک میں ظلم و زیادتی راہ نہ پاجائیں۔ عدل و انصاف کے نفاذ کے لئے وہ ہمت مند اور ہمد وقت مصروف رہتا ہے۔ خلافت اور آخرت کے تصور سے جو احساس ذمہ داری انسانی ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کی چند مثالیں الہامی تمدن کے دوا دار سے پیش کی جاتی ہیں۔

ایک جلیل القدر خلیفہ، جو اپنے زمانے کے سب سے بڑے حکمران تھے، موٹا جھوٹا پہننے اور روکھا سوکھا کھاتے۔ اگر کوئی شخص کوئی لذیذ کھانا پیش کرتا تو پوچھتے کہ کیا سب مسلمان یہ کھاتے ہیں یا کھا سکتے ہیں؟ جب جواب نفی میں ملتا تو کھانا واپس کر دیتے۔

کسی گھوڑ دوڑ میں ایک مصری نے کہا ”واللہ میرا گھوڑا آگے ہے“۔ قریب ہی گورنر مصر کا ایک بیٹا گھوڑا دوڑا رہا تھا، اُس نے مصری کے یہ کہنے پر ایک طمانچہ مارا اور کہا ”لو ایک شریف زادے کا یہ طمانچہ، اُس مصری نے مدینہ پہنچ کر خلیفہ سے شکایت کی۔ خلیفہ نے گورنر اور اس کے بیٹے کو مدینہ طلب کیا۔ جب وہ آگئے تو مصری کے ہاتھ میں کوڑا دیا اور کہا ”مار اس شریف زادے کو“۔ جب وہ لڑکے کو مار چکا تو کہا ”اب میری کوڑا باپ کے سر پر گھما، اس لئے کہ اس لڑکے نے تجھ کو جو طمانچہ مارا تھا۔ وہ اسی کی وجہ سے مارا تھا“۔ پھر آپ نے گورنر سے کہا ”تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنایا حالانکہ وہ اپنی ماؤں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوئے تھے“

ایک اور خلیفہ کی احتیاط کا یہ حال تھا کہ سرکاری کام کے لئے جو شمع جلتی تھی اس کی روشنی سے ذاتی کام نہ لیتے۔ اگر کوئی ذاتی گفتگو چھیڑ دیتا تو فوراً اس کو گل کر دیتے اور اپنا ذاتی چراغ منگوا لیتے۔

یہ ہے وہ مختصر سا خاکہ جس پر الہامی تمدن قائم ہوتا ہے۔ اس میں نہ حسی تمدن کی اغراض

پسندی ہوتی ہے اور مشرقی تمدن کا ترک دنیا۔ نفع پرستی کے بجائے پند متقل اخلاقی اصول ہیں جو وسیع تر انسانیت کے حق میں ہر طرح سے مفید ہیں۔ اور جن کی پابندی ہر صورت میں ضروری ہے خواہ حالات سازگار ہوں یا ناسازگار۔ اس کی تعلیم یہ نہیں کہ
 ”زمانہ باتو نہ سازد تو باز زمانہ بساز“

بلکہ یہ ہے کہ ”زمانہ باتو نہ سازد تو باز زمانہ ستیز“
 ترک دنیا اسلام کی نظر میں ایسا ہی بُرا ہے جیسا دنیا کی مصروفیات میں غرق ہو جانا اور خدا کو بھول جانا۔ اسلام معاشرتی زندگی کی اصلاح چاہتا ہے، اس کی بیخ کنی نہیں۔ اس لئے اس نے صاف طور سے اعلان کیا کہ ”لا رہبانیۃ فی الاسلام“ (اسلام میں رہبانیۃ نہیں)۔ چنانچہ اسلامی معاشرہ ان تمام برائیوں سے محفوظ رہتا ہے جو نفس کشی اور آسم بیزاری کا لازمی نمونہ ہیں۔

اوپر کی ساری بحث سے ہم بجا طور پر یہ نتیجہ اندک کر سکتے ہیں کہ :
 (۱) عقلی تنقید سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ زندگی کے بنیادی مسائل کا حل صرف وحی اور رسالت کے ذریعے ممکن ہے اور :-
 (۲) ان مسائل کے مختلف جوابات پر تمدن کی عمارات تعمیر ہوتی ہیں ان میں سب سے مستحکم اور صحت مند اور لیاقت بخش وہ تمدن ہے جس کی بنیاد وحی و ایمان پر ہے۔

۳۔ مذہب کی ضرورت اور انسانی زندگی میں اس کا مقام

۱۔ مذہب کا مفہوم | مذہب کا لفظ عربی زبان میں اسم ظرف ہے اور ذہاب مصدر سے نکلا ہے۔ ذہاب کے معنی ہیں جانا۔ مذہب اس جگہ کو کہتے ہیں جس پر چلا جائے یعنی راستہ اور سڑک وغیرہ۔ ایک اصطلاح کی حیثیت سے مذہب اس راستے کہتے ہیں جس پر چل کر انسان اپنے مقصدِ حیات میں گامِ حاصل کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرے دوسرے الفاظ میں مذہب قوانین کا وہ مجموعہ ہے جس پر عمل کر کے انسان حجاجِ کمال تک پہنچ جائے۔ انسان اپنی زندگی کے نصبِ العین کو پہچان لے اور حیاتِ انسانی کے تاریک طوفانوں میں انسانیت کی دھمکائی ہوئی کشتی کو ان قوانین پر عمل کر کے ساسل مراد پر پہنچا سکے۔

قرآن کریم نے مذہب کے مفہوم کو ظاہر کرنے کے لئے دین کا لفظ استعمال کیا ہے۔

قرآن عزیز میں فرمایا:-

"إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ" (آل عمران ۱۹) (دین تو اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے)

دوسری جگہ فرمایا:

"أَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ" (المائدہ ۳) (آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا)

تیسرے فرمایا:

لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينَ (الکافرون) (تمہارے لئے تمہارا دین اور میرے لئے میرا دین)

۲۔ مذہب دین اور شریعت | مذہب کا لفظ قرآن میں کہیں بھی استعمال نہیں ہوا۔ مذہب کے مقابلہ میں دین کا لفظ وسیع تر معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

ہے۔ دین کے معنی ہیں "نظامِ زندگی" ضابطہ حیات اور زندگی کا وہ کامل و اکمل دستور جس پر چل کر انسان فلاح دارین حاصل کر سکے۔ اس ضمن میں شریعت کا لفظ بھی استعمال کیا جاتا ہے شریعت عربی میں پانی کی نالی کو کہتے ہیں شریعت سے ہر نبی کا خصوصی طریقہ مراد ہے جس پر وہ اپنی زندگی میں گامزن رہا۔ آغازِ انسانیت سے دین اسلام ایک ہی رہا۔ مگر انبیاء کی شریعتیں بدلتی رہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ دین اسلام کے مرکزی اور اساسی اصول و ضوابط بحال رہے مگر ہر نبی کی شریعت میں حسبِ زمان و مکان کچھ جزوی قسم کی تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ اس اعتبار سے دین کے مقابلہ میں شریعت کا لفظ

بھی محدود ہے۔ شریعت کے لفظ کو انبیاء کی طرف منسوب کیے شریعت موسوی اور شریعت عیسوی کہا جاتا ہے۔

۳۔ مذہب کی غرض غایت | مذہب کا فائدہ اور مقصود یہ ہے کہ انسان اخلاق اور روحانیت کی منزل طے کرے۔ اخلاق کا عظمیٰ معلوم

کرے، حقوق العباد کی اہمیت کو سمجھے اور ان کی ادائیگی کا خیال رکھے۔ اس میں سیرت کی پاکیزگی، بلند خیالی، احساس مسدات اور ہمدردی پیدا ہو جائے۔ اس کی زندگی حسن عمل کی زندہ مثال بن جائے۔ مختصر یہ کہ مذہب کے معنی سچی اور صحیح راہ عمل ہیں، اور وہ فطرت انسانی کو ایسی روش پر چلنے کی ہدایت کرتا ہے جس سے انسان اپنے وجود کے حقیقی مقصد میں کمال حاصل کر سکے اور دنیا میں امن و سکون کی ایک عالمگیر فضا پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائے۔

انسان کی اپنی زندگی کا مقصد مقرر کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اسے یہ مقام حاصل نہیں کہ وہ اپنا مقصد حیات متعین کر سکے کیوں کہ اسے اپنی زندگی پر کوئی اختیار نہیں ہے۔ نہ وہ اپنی مرضی سے اس دنیا میں آتا ہے اور نہ اپنی مرضی سے جاتا ہے وہ ایک مخلوق ہے اور اپنے خالق کی مرضی کا تابع ہے جس خالق و مالک کے ہاتھ میں اس کی موت و حیات ہے وہی اس کی زندگی کا مقصد متعین مقرر کر سکتا ہے۔ خالق کائنات نے تخلیق انسانی کا مقصد اپنی معرفت و عبادت قرار دیا۔

قرآن میں فرمایا:

”وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِي“ (الذاریات- ۵۶) کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔

جتنے دانس کی غرض تخلیق یہی ہے۔ دنیا کے کسی مذہب کو اس سے اختلاف نہیں ہے اور دنیا کا ہر مذہب صحیح یا غلط طریقہ سے عبودیت حقیقی کا قرب تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

مقصد زندگی کا حصول مذہب کو اپنا کرنا ہے یعنی مذہب اس کے حصول کے مختلف طریقے بیان کرتا اور ہر قسم کے نشیب و فراز سے آگاہ کر کے صحیح راستہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

۴۔ مذہب کی تعریف | انگریزی میں مذہب کے لئے (RELIGION) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جو لاطینی سے ماخوذ ہے اور جس کے معنی عقیدے

اور پوجا پاٹ کے ایک نظام کے ہیں۔ دنیا میں بے شمار مذاہب موجود ہیں۔ ہر ایک نے اپنے اپنے خیال کے مطابق مذہب کی تعریف کی ہے۔ چند تعریفات ملاحظہ ہوں۔

میتھیو آرنلڈ لکھتے ہیں:-

”مذہب سے مراد صداقت سے متاثر اخلاقی تعلیم ہے۔“

سرای۔ بی۔ ٹیلر نے مذہب کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی ہے:-

”مذہب روحانیت میں یقین رکھنے کا نام ہے۔“
فرید وجدی لکھتے ہیں :-

”مذہب ان معقول خیالات کے مجموعہ کا نام ہے جن کا مقصد یہ ہے کہ تمام افراد انسانی ایک رشتہ میں منسلک ہو جائیں اور وہ جماعتی فوائد سے اس طرح بہرہ یاب ہوں جس طرح قوت عقلیہ سے۔ مذہب نوع انسان کے لئے ایک ابدی چیز ہے۔“
شوینہار لکھتا ہے :-

”مذہب موت کے تصور سے وابستہ ہے۔“
برونائٹ ہیڈن لکھتا ہے :-

”مذہب اعتقاد کی اس قوت کا نام ہے جس میں یہ قوت ہوتی ہے کہ وہ انسانی سیرت و کردار میں انقلاب پیدا کر دیتی ہے۔ بشرطیکہ اسے غلو کے ساتھ قبول کیا جائے اور بصیرت کے ساتھ سمجھا جائے۔“

کال وارٹن کا کہنا ہے کہ ”انسان نے اس قوت کو مذہب کا نام دیا ہے جس کا معنی ”یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ وہ اس سے کائنات کو مسخر کرے گا“ برگسٹن نے موت کو مذہب کا سینا کرنے کا باعث قرار دیا ہے۔

الغرض مختلف علماء نے اپنے اپنے خیال میں مذہب کی تعریف کی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مذہب قدیم ترین چیز ہے اور انسان نے تاریخ کے ہر دور میں اس کو اپنایا ہے۔

مذہب کی ضرورت کے دو وجوہ اسباب مذکور ذیل ہیں :-
(الف) انسان ناقص العقل پیدا ہوا ہے۔ اس

کمی کو پورا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ بندوں پر روحی کے ذریعہ احکام نازل کئے تاکہ انسان اپنی مشکلات کا ازالہ کر سکے اور عقل کی کوتاہی کی وجہ سے قعر ہلاکت میں نہ گر پڑے۔ دنیا کے بڑے بڑے فلاسفروں نے عقل کی کوتاہ مینی اور فکر کی نارسائی کا اعتراف کیا ہے۔ سقراط کا یہ مقولہ مشہور ہے کہ ”ہم اتنا بھی نہیں جانتے کہ نہیں جانتے۔“

جب انسان ناقص العقل ہے تو یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ وہ جن پیچیدہ مسائل کو حل کرے گا وہ صحیح ہوں گے۔ فلسفہ یونان کے جو بنیادی نظریات تھے وہ صدیوں تک دنیا میں مقبول رہے۔ مگر آج جدید فلسفہ یورپ نے ان کو بالکل باطل قرار دیا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ہمارے سائنس دان عقل کے زور سے جن نظریات کی عمارت تعمیر کر رہے ہیں وہ مستقبل میں بھی کھڑی رہے گی۔ لہذا ہدایت الہی یعنی مذہب زندگی کے ہر شعبہ میں انسان کے لئے ضروری ہے تاکہ وہ ہر قسم کی

غلیظیوں اور زخموں سے محفوظ رہ کر سیدھی راہ پر گامزن رہے۔

(ب) انسان کو مدنی الصبح (SOCIAL ANIMAL) کہا جاتا ہے اس کی فطرت اس

بات کی منتہی ہے کہ وہ دوسرے انسانوں سے مل کر رہے۔ کیوں کہ وہ ان کی مدد کے بغیر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ صنعت و حرفت تجارت و زراعت اور دیگر امور تنہا ایک آدمی انجام نہیں دے سکتا اور یہ تمام چیزیں اس کی زندگی کا لازمی جزو ہیں۔ تاکہ وہ آرام و آسائش کی زندگی بسر کر سکے۔ اور تمام چیزوں کے حصول کے بعد بھی اسے کسی زبردست قوت کی ضرورت ہے جس کے ذریعہ سے لوگ اپنے اپنے کام بطریق احسن سرانجام دے سکیں۔ ایک دوسرے کے مفاد آپس میں نہ ٹکرائیں۔ وہ ایک دوسرے پر ظلم و تعدی نہ کرے۔ پائیں۔ اور وہ سب مل جل کر اچھی زندگی گزار سکیں۔ ایسی قوت بادشاہت میں ہو سکتی ہے۔

چونکہ مذہب میں انسان اپنے عبور حقیقی کو مطلق العنان شہنشاہ سمجھتا ہے۔ اس لئے اسکو ماننا اور اس کی اطاعت کرنا انتہائی ضروری ہے اور یہ راہ صرف مذہب ہی دکھاتا ہے۔ دنیاوی بادشاہت انسانوں کے بیم و کفر پر عمل کرتی ہے لیکن حقیقی بادشاہت روحانیت کا درس دیتی ہے جب تک رُوح و جسم پاکیزہ نہ ہوں انسانی زندگی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کامیاب زندگی گزارنا مذہب کے بغیر ناممکن ہے۔

(ج) مذہب انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ قدرت نے انسان کو ایک ایسی قوت عطا فرمائی ہے جس کے ذریعہ سے وہ اپنی ضروریات مہیا کرتا ہے اور طرح طرح کی مشکلات کا حل سوچتا ہے۔ اسے تسکین دیتا ہے۔ انسان اس کے ذریعہ تنگی و بدی میں تیز کر رہا ہے۔ لیکن بعض اوقات عقل انسانی پر تیرا حشرات افسانہ کا اس قدر غلبہ ہوتا ہے کہ وہ بالکل بیکار ہو جاتی ہے۔ ایسا انسان اپنے معاشرہ کے لئے انتہائی طور پر خطرناک ثابت ہوتا ہے۔

حرص و طمع اس کو آمادہ کرتی ہے کہ وہ اپنے بیگانے اور دوست دشمن سب کے مال پر قبضہ کر لے اور ساری دنیا کا عیش و آرام اپنے ہی لئے مخصوص کر لے۔ تمام دنیا کی گردنیں اس کے سامنے جھک جائیں۔ ایسے موقع پر ایک روحانی جذبہ انسان کو صحیح راستہ دکھاتا ہے۔ یہی پاکیزہ جذبہ ضمیر کی آواز ہوتا ہے جو فوراً ایمان ہے یہی مذہبی جذبہ ہے جو انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ اس لئے انسان کسی نہ کسی طرح مذہب کو اپنانے کی کوشش کرتا ہے۔

۴۔ **مذہب کا آغاز** | مذہب بھی انسان کے ساتھ پیدا ہوا۔ جب سے انسان وجود میں آیا اسی وقت سے مذہب بھی عالم ہستی میں جلوہ گر ہے۔ کیوں کہ وہ ایک فطری لازمہ ہے۔ جس طرح فطری جذبات انسان سے کبھی علیحدہ نہیں ہو سکتے اسی طرح

مذہب کا یقین و اعتقاد بھی اس سے علم شدہ نہیں ہو سکتا۔

قرآن کریم میں فرمایا:

”رَبُّنَا الَّذِي أَعْطَى كُلَّ شَيْءٍ حَلْقَهُ ثُمَّ هَدَىٰ“ (سورہ طہ - ۵۰) فطرت پر پیدا کیا اور پھر اس کو راستہ دکھایا

آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ خالق کائنات نے انسان کو پیدا کر کے ساتھ ہی حقیقی راہ عمل بھی بتا دی ”ہدای“ سے قانون حیات یا قوانین فطریہ مراد ہیں۔ کائنات کی کوئی چیز اس قانون سے انحراف نہیں کر سکتی۔ اس کا مشاہدہ ہم دن رات کرتے ہیں۔ چاند سورج ستاروں اور سیاروں کے لئے جو راستہ مقرر کیا گیا ہے وہ اس کے خلاف کبھی نہیں چلتے۔ پہاڑوں کو ساکن رہنے کا حکم دیا گیا ہے کبھی یہ نہیں دیکھا گیا کہ ایک ملک کے پہاڑ چل کر دوسرے ملک میں آگئے ہوں یا بہتے ہوئے دریا جم جائیں اور ان میں مچنے کی خاصیت باقی نہ رہے۔

دنیا کی ہر چیز ایک خاص قانون کی پابند ہے۔ اسی طرح انسان کی پیدائش بھی تخلیق کائنات کے ساتھ ہوئی جس طرح سے کائنات کے ذرے ذرے کو ایک خاص ڈیوٹی سونپ دی گئی۔ اسی طرح سے انسان کو بھی فطری طور پر یہ شعور دیا گیا ہے کہ وہ اپنے خالق کو پہچاننے کی کوشش کرے۔ لیکن وہ اس راہ پر قائم رہتا ہے اور کبھی اس سے بھٹک جاتا ہے۔ ذہن انسانی کے ساتھ ساتھ مذہب بھی مختلف منازل سے گزرا۔ علماء اس ضمن میں مختلف خیالات ہیں۔ ہم ان کے خیالات کے مطابق ارتقاء مذہب سے بحث کرتے ہیں۔

۷۔ مذہب کا ارتقاء | قدیم انسانی زندگی کی بود و باش جنگلوں تک محدود تھی۔

اس کی ضروریات و حاجات بھی بہت کم تھیں۔ قدرت کے عطا کردہ بیش بہا نعمات اس کی کفالت کرتے رہے۔ البتہ ایک خوف اس کے دل میں ہر وقت موجزن رہتا تھا کہ فطرت کی بڑی بڑی طاقتیں کہیں اس کو فائدہ دینا بند نہ کر دیں۔ یا وہ خوفناک مخلوق جو اس دنیا میں اس کے ساتھ ساتھ موجود ہے اسے نقصان نہ پہنچائے پیلیم حلہ پر اس نے ان کا گرویدہ بننے کے لئے ان کی پرستش شروع کر دی۔ وہ چاند تاروں اور سورج کو اس لئے پوجتا کہ وہ بے شمار منافع جو ان کے وجود سے حاصل ہیں کہیں سلب نہ کر لئے جائیں۔ دریاؤں سمندروں اور بادلوں کی اس لئے پرستش کرتا کہ کہیں وہ سب سے قابو ہو کر اسے ملیا میٹ نہ کر دیں۔ شیر سانپ اور اسی قسم کے دیگر جانور درندے جو اسے ہر وقت خوف زدہ رکھتے ہیں۔ اس نے ان کی بھی پوجا شروع کی تاکہ وہ اس سے خوش رہیں اور اسے تکلیف نہ دیں۔

اس کے بعد جب انسانی شعور میں مزید بیداری پیدا ہوئی تو اس نے یہ سوچا کہ فطرت کی یہ طاقتیں کسی کے تابع ہیں۔ اس نے پھر ان طاقتوں کے بت بنائے اور ان کی پرستش کرنے لگا۔ مقصد یہ تھا کہ وہ امن و سکون کی زندگی بسر کرے۔ لیکن اس کے بعد بھی بجلیاں اس پر گرتی رہیں۔ دریاؤں کا سیلاب اسے نقصان پہنچاتا رہا۔ زہریلے ناگ اسے ڈستے رہے۔ پھر اس نے سوچا کہ یہ تمام چیزیں ضرور کسی کے کنٹرول میں ہیں۔ اب اس کی تلاش میں حیران و سرگرداں پھر کیا طرح طرح کی ریاضتیں کیں۔ اس طرح اسے عبودیت حقیقی کا نشان ملا۔ ایسے لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغام ہدایت حاصل کر کے پوری دنیا میں پہنچایا۔ اس طرح پوری دنیا مذہب اور اس کی حقیقت سے آشنا ہوئی۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دنیا میں تخلیق انسانی کے ساتھ ہی صحیح راستہ کی طرف رہنمائی بھی کی گئی۔ کچھ لوگوں نے اسے اپنایا۔ کچھ نے جھٹلایا۔ یہاں تک کہ مذہب ایک گورکھ دھندہ بن کے رہ گیا۔ کسی نے درختوں کی پوجا کی اور کسی نے آگ کی۔ کسی نے بتوں کی پرستش کی اور کسی نے فطرت کی طاقتوں کی۔ بہر حال کسی نے کسی مذہب کو اپنایا۔ اس سے مقصد صرف یہ تھا کہ وہ اپنے معبود کی خوشنودی حاصل کرے۔ خدا کی مخلوق اس طرح حقیقت سے دُور ہوتی چلی گئی۔ جب کسی جگہ ضلالت و جہالت کے آثار نمودار ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے وہاں فوراً کوئی نہ کوئی مادی و رہنما بھیجنا تاکہ لوگ راہِ راست پر آجائیں اور ان کی زندگی عیش و مسرت سے گزرنے لگے۔ جن لوگوں نے شیواؤں کی پیروی کی وہ بلند اخلاق ثابت ہوئے اور ہر لحاظ سے کامیاب و کامران رہے۔

۸۔ مذہب کی اہمیت | انسانی زندگی کے لئے مذہب کا ہونا انتہائی ضروری ہے۔ انسانی زندگی سے مذہب کا تعلق بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ موٹر کا تعلق اپنے ڈرائیور سے۔ اگر ڈرائیور اسے صحیح سمت کی طرف لے جائیگا تو وہ منزل پر پہنچ جائے گی۔ اور اگر وہ ڈرائیور لاپرواہی سے بھی کام لیتا ہے تو اس کی معمولی لغزش موٹر کو تباہ و برباد کر سکتی ہے۔ مذہب چونکہ ایک فطری چیز ہے اس لئے صحیح مذہب انسان کو اعلیٰ زندگی گزارنے کے طریقوں سے آشنا کرتا ہے۔

مذہب ان وسائل و ذرائع کی طرف رہنمائی کرتا ہے جن سے خالق کا قرب حاصل ہوتا ہے اور اس کی جان پہچان ہوتی ہے۔ اس کی راہ میں جس قدر رکاوٹیں اور حجاب ہوتے ہیں، مذہب ان کو دُور کرتا ہے۔ جس سے انسان اپنی زندگی کے مقصد کو آسانی سے پاسکتا ہے۔ مذہب نجات کے لئے فطرتِ صحیحہ کے مطابق تعلیم دیتا ہے۔ مذہب کی اولین غرض و غایت ہی یہ ہے کہ انسان خدا کا قرب حاصل کرے۔ پھر یہ کہ اسے زندگی میں راحت و سکون میسر آئے اور حوادث و آلام سے نجات ہو۔

مذہب مکمل اخلاقی تعلیم دیتا ہے۔ نیک اخلاق اختیار کرنے اور برائیوں سے باز رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ اخلاق حسنہ و ذمہ کا معیار مقرر کرتا ہے۔ نہ صرف برائیوں اور گناہوں کے نقصانات سے روشناس کراتا ہے۔ بلکہ ان کی جڑ کاٹتا اور ان کے ذرائع کو مسدود کرتا ہے۔ تاکہ انسانی زندگی کامیاب سے کامیاب تر ہو۔ اخلاق کو انسانی زندگی میں بہت اہمیت حاصل ہے اور یہ مذہب کا جزو اعظم ہے۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں بھیجنے کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ آپ لوگوں کے اخلاق درست کریں۔ جس قوم و معاشرہ کے لوگ اخلاق حسنہ پر عامل ہوں گے وہ ہمیشہ کامیاب و کامران ہوں گے۔ یہ قانون قدرت اور فطرت انسانی ہے۔ لہذا بہترین زندگی گزارنے کے لئے صحیح ترین مذہب کو اپنانا ضروری ہے۔ قوموں کے عروج و زوال کا انحصار مذہب پر ہے۔ اسی سے تمدن و معاشرت سنورتے ہیں۔ اگر اس میں نقص پایا جائے تو اس کی بناء پر قوموں کی بربادی اور افراد انسانی کی ہلاکت ظہور میں آتی ہے اس لئے صحیح مذہب کو اپنانا ملک و قوم کی معراج ہے۔

۹۔ فطری جذبہ | قرآن کریم میں مندرمایا:

”فَاقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَةَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّا أَكْثَرُ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ“ (الرّوم- ۳۰)

اینا منہ سب کی طرف سے منہ موڑ کر دین کی طرف کرو یہ خدا کی وہ فطرت ہے جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ خدا کی خلقت میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہی ٹھیک دین ہے لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں۔

مذکورہ حدیث کریمہ اس درختان حقیقت کی آئینہ داری کرتی ہے کہ مذہب کا جذبہ انسان کی فطرت میں رکھا گیا ہے یعنی جس طرح انسان میں ہمدردی محبت نفرت و عداوت یا شجاعت و سخاوت کے قدرتی جذبات پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح مذہبی رجحان و میلان بھی ایک قدرتی اور فطرتی چیز ہے۔ جس طرح دیگر قدرتی جذبات انسان میں کیساں نہیں پائے جاتے۔ بلکہ کسی شخص میں کم اور کسی میں زیادہ ہوتے ہیں۔ مذہبی جذبہ کا بھی یہی حال ہے۔ خداوند کریم نے اس آیت میں مذہبی رجحان کو ایک ناقابل تبدیل فطرت قرار دیا ہے جو کسی زمانہ میں تبدیل نہیں ہوتی۔ رنگ و نسل یا جغرافیائی حدود و قیود بھی اس پر انداز نہیں ہو سکتیں۔ مقلد سے ملحد انسان کے دل کے کسی گوشہ میں بھی غیر شعوری طور پر مذہبی احساس ضرور پوشیدہ ہوتا ہے۔ اسی حدیث کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث ”ہَمَّازٌ مَّا مَوْلُودٌ إِلَّا يُؤَكَّدُ عَلَى الْفِطْرَةِ“ (بخاری ص ۱۲۸) (ہر بچہ فطری مذہب پر پیدا ہوتا ہے)

میں بیان فرمایا۔ یہ حدیث مذکورہ آیت کی توضیح کرتی ہے۔

جب کائنات ارضی کے محسن اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ظلمت کدہ خاکی کو اپنی سرپا نور و ہدایت ہستی سے زینت بخشی تو وہ قوم جس میں آپ تشریف لائے ہر طرح کے عیوب و نقائص اور اخلاق ذمیمہ سے بھرپور مغمور تھی شراب نوشی، بدکاری جو بازی لڑکیوں کو زندہ درگور کرتا۔ غارت گری اور خون ریزی ان کے محبوب مشاغل تھے۔ شاید اس خطۂ ارضی کی کوئی قوم ان سے زیادہ در ماندہ و سپماندہ نہ تھی مگر گمراہ ہونے کے باوجود مذہبی جذبہ سے بالکل عاری نہ تھے۔

قرآن کریم میں فرمایا:

”وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ“ (العنکبوت - ۶۱)

اور اگر آپ ان (اہل عرب) سے دریافت کریں کہ آسمان و زمین کس نے پیدا کئے اور آفتاب مانتا کس نے تابع کیا تو وہ (عرب) کہیں گے اللہ نے

اس آیت سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ عرب کے رہنے والے لاکھ جاہل و بے دین تھے مگر وہ خدا کی ذات کو جانتے اور مانتے تھے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ وہ عرب جن کو آدمی کہا جاتا ہے۔ جب کشتی پر سوار ہوتے اور باد مخالف کے پھیڑوں سے کشتی ہچکولے کھانے لگتی تو وہ لات منات کو منہول جاتے اور بارگاہ ربانی میں دست بدعا ہوتے کہ اگر اب کے تیرے ہمیں نجات سے بھنا کر کر دیا تو ہم خالص موحدين جاہل گے۔ (العنکبوت - ۶۵)

مشہور مؤرخ مسعودی لکھتے ہیں:-

”عرب میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو اللہ تعالیٰ کو خالق مانتے تھے اور حشر و نشر کے بھی قائل تھے وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو اجر و نیک بگارش کو سزا دے گا ان میں سے جو لوگ بتوں کے پرستار تھے وہ برملا یہ کہتے تھے کہ

”مَا تَعْبُدُوْهُمْ اِلَّا لِيُقْرِئُوْنَا اِلٰی“ (الزمر - ۳)

ہم تو ان کو صرف اس لئے پوجتے ہیں کہ وہ ہم کو خدا کا مقرب بنا دیں

اگرچہ عربوں میں ملحد اور دہر پرست کے لوگ بھی تھے مگر صحیح العقیدہ لوگوں کی کمی تھی۔

(مروج الذهب للمسعودی)

۱۰۔ مذہبی جذبہ کی ہمہ گیری

مذہب کی ضرورت انسانی تاریخ کے ہر دور میں مسلم رہی ہے۔ یہ درست ہے کہ مختلف زمانوں میں نوع انسان نے مختلف مذاہب اختیار کئے مگر بحیثیت مجموعی انسانوں نے مذہب کی ضرورت سے کبھی انکار نہیں کیا۔ اس سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ مذہبی جذبہ ایک ہمہ گیر ازلی اور فطری جذبہ ہے۔ اس کی حد یہ ہے کہ وہ خطہ یا نئے

ارضی جن کو ہم ماضی اور دور حاضرین حد درجہ پس ماندہ غیر مہذب اور ناشائستہ مانتے چلے آئے ہیں وہاں بھی کسی نہ کسی مذہب کا سکہ جاری ہے۔ افریقہ کے وحشی انسانوں سے لے کر نام نہاد سفید فام جہذب اقوام تک کسی نہ کسی مذہب کے قائل ضرور ہیں۔

خداوند تعالیٰ نے اس کائنات ارضی پر ان گنت اور غیر محدود نعمتوں کا سلسلہ جاری کر رکھا ہے۔ ان کو دیکھ کر ایک حد درجہ ناشکرا انسان بھی حمد باری کے ترانے الاپنے لگتا ہے اور اس کے جسم کا ہر رگ وریشہ مجسم حمد بن جانا ہے تشکر و امتنان کا یہی جذبہ فطریہ احساس کو جنم دیتا ہے۔ مذکورہ صدر بیان اس حقیقت کی آئینہ داری کرتا ہے کہ مذہب دیگر انسانی جذبات کی طرح ایک جذبہ ہے اور ہر انسان دانستہ یا نادانستہ بخوشی یا ناخوشی کسی مذہب کو تسلیم کرنے کے لئے مجبور ہے۔ بعض لوگ بظاہر مذہب کے منکر کہلاتے ہیں مگر بعض چیزوں کو مافوق الفطرت مانتے ہیں۔ گویا وہ اس چیز کو وہی درجہ دیتے ہیں جو مذہب خدا کو دیتا ہے۔ اس طرح وہ لامذہب ہونے کے مدعی ہونے کے باوجود غیر شعوری طور پر ایک مذہب کو اختیار کر لیتے ہیں۔

۱۱۔ مناظر قدرت میں تدبیر و تفکر | مذہبی جذبہ کو قبول عام کی جو سند ملی ہے اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ انسان جب

گرد و پیش پر غور و فکر کرتا ہے تو بڑی آسانی سے اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ کائنات عالم کا یہ طویل و عریض سلسلہ کسی خالق و صانع کے بغیر عالم وجود میں نہیں آگیا۔ جب چھوٹی سی چیز اپنے وجود کے لئے کسی صناعت کی صنعت گری کی مرہون مدت ہے تو اتنی بڑی کائنات از خود کیوں کر صفحہ ہستی پر جلوہ گر ہو گئی؟ اس کے پہلو پہ پہلو یہ امر بھی قابل غور ہے کہ ظہور پذیر ہونے کے بعد یہ کارخانہ قدرت خود بخود قائم نہیں رہ سکتا۔ بلکہ اپنی بقائے لئے ایک قیوم (قائم رکھنے والا) کا محتاج ہے۔ یہی اندازہ شکر انسان میں مذہب کے اساس کے جنم دیتا ہے، فلسفہ بھی اسی کی پیداوار ہے۔

قرآن کریم اسی نقطہ نظر پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتا ہے :-

”بے شک آسمان اور زمین کے پیدا کرنے میں اور شب و روز کے بدلتے رہنے میں اور کشتیوں میں جو دریاؤں میں چلتی ہیں لوگوں کے کام کی چیزیں لے کر اور پانی میں جسے اللہ نے آسمان سے اتارا۔ پھر زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کیا اور اس میں سب قسم کے جانور پھیلانے اور ہواؤں کے بدلنے میں اور بادل میں جو زمین اور آسمان کے درمیان اس کے حکم کا تابع ہے۔ ان سب چیزوں میں عقلمندوں کیلئے نشانیاں ہیں۔

(البقرہ :- ۱۶۶)

اس آیت کریمہ میں مناظر قدرت کو ہستی باری تعالیٰ کے ثبوت میں پیش کیا گیا ہے کہ یہ طویل

و عریض کائنات ارضی جو دنیا کے ہر جسم سے بڑھ کر حیرت انگیز اور سائنس کے ہر شعبہ سے عجیب تر ہے۔ نہ اپنے آپ وجود دیں آسکتی ہے۔ نہ خود بخود قائم رہ سکتی ہے۔ جب تک کوئی صاحب شعور صاحب ارادہ قادر مطلق ہستی اس کی صانع و خالق نہ ہو۔ ان سارے مظاہر قدرت کا تسلسل و استمرار ان کی یک رنگی و ہم آہنگی ان کا نظم و ضبط ہر صاحب عقل سلیم کو یہ ماننے پر مجبور کرتا ہے کہ ان کے پیچھے ایک صاحب اختیار افعال کا ہاتھ کار فرما ہے کسی شاعر کا قول ہے:

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ عَبْدُهُ وَآلُهُ ۖ
مَدَدُ كُلِّ شَيْءٍ بِيَدِهِ ۖ

دہر چیز ہر اس (خداوند عالم) کی ایک نشانی پائی جاتی ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وہ ایک ہستی ہے۔

ظاہر ہے کہ مذہب کا منکر ان مظاہر قدرت کو دیکھتے ہوئے ان کے خالق و صانع سے انکار کر کے کس قدر بڑی صداقت سے روگردانی اختیار کرتا اور کتنی بڑی جسارت کا ثبوت دیتا ہے۔

۱۲۔ انسان و حیوان میں فرقی و امتیاز] سے دیکھا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی

ہے کہ حیوان اپنی ضروریات کا سامان اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ ان کا لباس ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ دشمنوں سے مقابلہ کرنے کے لئے پنچے اور ناخن جیسے ہتھیار ان کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔ انسان کا یہ حال ہے کہ جب پیدا ہوتا ہے تو کسی قسم کا سامان اس کے پاس نہیں ہوتا۔ دشمن سے حفاظت کے لئے سینگ یا پنچے نہیں ہوتے۔ ہاتھ پاؤں کمزور ہوتے ہیں۔ جسم پر کوئی لباس نہیں ہوتا۔ اس کے آس پاس عتی چیزیں ہیں سب اس کی دشمنی نظر آتی ہیں۔ آفتاب کی گرمی جاتروں کی سردی ہادی کی جھڑی ہر چیز اس کی دشمن ہے۔

ان مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لئے قدرت نے انسان کو کوئی جہانی ہتھیار نہیں دیا۔ قدرت نے اس کو ان ہتھیاروں کے عوض ایک ایسی عام قوت عطا کی ہے جس کے ذریعے اس نے ہر قسم کے دشمنوں کے مقابلہ کے لئے ہر قسم کے لباس اور مکانات بنائے۔ جانوروں کے مقابلہ کے لئے تیغ و خنجر اور بندوق تیار کی۔ دریاؤں پر پل باندھے۔ پہاڑ تراشے اور اس طرح پوری کائنات کو اپنے پیچھے اقتدار میں لے لیا۔

اس قوت کا نام عقل انسانی ہے۔ چونکہ قدرت کو میسر نظر تھا کہ انسان ہمیشہ ترقی پذیر رہے اور کسی مرض پر بھی آکر اس کی ترقی رکنے نہ پائے اس لئے قدرت اس کے مخالفوں کو نت نئے ہتھیار دیتی جاتی ہے۔ جس سے انسان پر نئے نئے حملے کئے جاتے ہیں۔ جن بیماریوں کا علاج معلوم ہو جاتا ہے ان کے علاوہ نئے امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ دنیا کا جغرافیہ جس قدر معلوم ہو چکا،

اس کے علاوہ نئی آبادیوں کا پتہ لگتا ہے اور وہاں نئی نئی ضروریات پیش آتی ہیں۔ آرام آسائش کے جو سامان جیتا ہو چکے تھے راحت طلبی کا مادہ بڑھ کر وہ سامان بے کار ہو جاتے ہیں۔ محبوبہ انسان ان نئے مخالفوں کے مقابلہ کے لئے نئی نئی تیاریاں کرتا ہے اور ترقی کی جس حد تک پہنچ چکا تھا اس سے آگے نکل جاتا ہے۔ کائنات اور انسان کی یہ باہمی کش مکش ہی وہ چیز ہے جو انسان کی تمام ترقیوں کی جڑ ہے جس کی بدولت آج ہزاروں ایجادات ہو رہی ہیں اور ان میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

لیکن ان بیرونی دشمنوں سے زیادہ سخت اور خطرناک دشمنوں کا ایک گروہ ہے جو خود انسان کے اندر موجود ہے اور جس سے انسان ہمیشہ برسرِ پیکار رہتا ہے۔ دشمنوں کا وہ گروہ اخلاقِ قبیہ میں جو ہر لحاظ انسان کو گھیرے رہتے ہیں۔ حرص و آز، کینہ پروری، جاہ طلبی اور اس قسم کے بے شمار دشمن انسان کے درپے آزار دہتے ہیں۔ ان دشمنوں سے بچانے کے لئے عقل بڑی حد تک کام کرتی ہے، وہ بتاتی ہے کہ اگر تم کسی کی آبرو کا قصد کرو گے تو وہ بھی تمہیں ذلیل کرنے کی کوشش کرے گا۔ اگر تم دوسروں کی عزت نہیں کرو گے تو وہ تمہاری عزت نہیں کریں گے۔ مگر اس درجہ کی عقل خاص خاص تعلیم یافتہ اشخاص میں ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے ایسے مواقع پیش آتے ہیں۔ جہاں اس قسم کے انتقام کا مطلق اندیشہ نہیں ہوتا۔ حکومت کا خوف، جاسوسی کا ڈر، بدنامی کا احتمال، انتقام کا خطرہ بالکل نہیں ہوتا۔ ایسے مواقع پر عقل ان دشمنوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ بلکہ ایک دوسری قوت انسان ان دشمنوں کے حملوں سے بچاتی ہے۔ اس قوت کا نام فوراً ایمان ضمیر یا اخلاق ہے۔ یہی چیز مذہب کی بنیاد ہے۔ یہ قوت انسان کی اصلی فطرت میں داخل ہے۔ عالم و جاہل شاہ و گدا اعلیٰ و ادنیٰ سب اس میں برابر کے حصہ دار ہیں۔

اس سے واضح ہوا کہ انسان و حیوان کے مابین جو چیز حدِ فاصل کی حیثیت رکھتی ہے اور دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے۔ وہ مذہب اور صرف مذہب ہے۔ جب انسان مذہبی حدود سے تجاوز کر جاتا ہے تو اس میں اور حیوانات میں کچھ فرق و امتیاز باقی نہیں رہتا۔

۱۳۔ مشترکہ خصوصیت کائناتِ ارضی میں بسنے والے انسانوں میں مختلف قسم کے امتیازات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً رنگ و نسل، زبان، تہذیب اور شکل و صورت کے اعتبار سے اقوام عالم میں خاصا فرق پایا جاتا ہے۔ مگر ان میں بعض باتیں مشترک بھی ہیں۔ مثلاً اولاد کی محبت، دشمن سے نفرت، جذبہ انتقام، کمال کی قدر دانی، ان اوصاف کو اس لئے فطری سمجھا جاتا ہے کہ یہ دنیا کے تمام انسانوں میں یکساں طور پر پائے جاتے ہیں۔

نظر میں جب ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں ہر نسل ہر طبقہ کوئی نہ کوئی مذہب رکھتا ہے تو اس سے یہ

حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ مذہب فطری چیز ہے۔ علاوہ ازیں مذہب کے اصول عموماً تمام مذاہب میں یکساں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً خدا کی ہستی کا اقرار۔ اس کی عبادت کا تصور، اعمال کی جزا و سزا، رحمتی و سزا دہی، صداقت بیانی کا قابل تعریف ہونا اور جھوٹ، بدکاری اور چوری وغیرہ کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنا سب مذاہب کی اصل و اساس ہے۔

خانی کائنات نے افراد انسانی میں بے انتہا فرق مراتب رکھا ہے۔ دولت و مال۔ جاہ و حشم و فضل و کمائی۔ ذہانت و لطافت کے عطا کرنے میں ایک طرف تو یہ فیاضی ہے کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں۔ رازی و نزاری، ابن تیمیہ اور ابن رشد اسی فیاضی کے نمونے ہیں۔ دوسری طرف یہ حال ہے کہ انسان اور بندہ میں بہت کم فرق باقی رہتا ہے۔ اس کی حد یہ ہے کہ ڈارون جیسے سائنسدان کو یہ فرق نظر تک نہیں آتا۔ اس کے باوجود جن چیزوں پر انسانی زندگی کا مدار و انحصار ہے۔ وہ سب انسانوں کو پوری فیاضی کے ساتھ عطا کی ہیں۔ افریقہ کا باہل سے باہل وحشی بھی اسی طرح چلتا پھرتا، کھاتا پیتا، سوتا جاگتا اور بولتا پلتا ہے۔ جس طرح بڑے سے بڑا غلامی اور غافل ان ضروریات کو انجام دیتا ہے۔

اس سے صداقت ثابت ہوتا ہے کہ مذہب کا اس قدر حصہ جو تمام قوموں میں مشترک ہے لازمہ انسانی ہے اور اسی نے تاریخ نے ان تمام موقعوں کو یکساں عطا کیا۔ فلاسفہ یونان بہت سے دلائل کے بعد اس نتیجہ تک پہنچے کہ سچائی دینا خدا کی پاکدامنی اور علم اچھی چیزیں ہیں۔ لیکن افریقہ کا ایک وحشی کسی دلیل و برہان کے بغیر خود بخود ان چیزوں کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

۱۴۔ مذہبی جذبہ کی تسکین | اس میں شبہ نہیں کہ مذہب ایک جذبہ ہے مگر اس میں اور دیگر جذبات میں گہرا فرق و امتیاز پایا جاتا ہے۔

جس طرح خالق کائنات نے انسان کے تمام جذبات کی تسکین کا سامان ہم پہنچایا ہے اسی طرح اس نے مذہبی جذبہ کی تسکین کا بھی اہتمام کیا ہے۔ قرآن کریم اور تاریخ کے مطالعہ سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ ہر زمانہ میں انبیائے کرام تشریف لاکر انسانوں کو خدا کا پیغام پہنچاتے رہے۔ اس کائنات ارضی پر انبیاء کا ورود و مسعود اس امر کا ثبوت ہے کہ انسان طلب حق کے لئے کس قدر بیتاب ہے۔ انبیاء کو مبعوث کیا۔ اگر اس خاکدان ارضی پر انبیاء تشریف نہ لاتے تو نبی آدم زلیخا آدمیت سے عاری رہتے۔ پیغمبروں نے انسان کو شرف انسانیت بخشا۔ اس کی ہستی کی تکمیل کی اور ان کو مذاہب سے آگاہ و آشنا کیا۔

مذکورہ صدر بیان اس حقیقت پر روشنی ڈالتا ہے کہ انسان میں طلب حق کا جو جذبہ جو جن تھا اس کی تسکین کے لئے خداوند عالم نے انبیائے عظام کے ذریعہ جو ہدایت بھیجی اس کا نام مذہب ہے۔ مذہب انسان کو ایک ہمہ گیر زاویہ نگاہ دیتا ہے جو انسان کی پوری زندگی کو محیط ہے۔ اس تصور کا نتیجہ یہ

ہوتا ہے کہ اس کائنات ارضی کی ہر چھوٹی بڑی چیز انسان کے لئے مظہرِ بوحیثیت بن جاتی ہے اور وہ ہر چیز میں خداوندی جلال و جمال کا نظارہ کرنے لگتا ہے۔ اس نقطہ نگاہ کے نتائج بڑے دور رس ثابت ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ پوری انسانی زندگی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ مثلاً سیاست و معاشرت ہو یا معیشت و صلح و جنگ ہو یا الفت و عداوت ان تمام شعبہ ہائے حیات پر اسی نظریہ کی حکمرانی ہوتی ہے۔

۱۵۔ مذہب ایک ابدی صداقت ہے | یہ تحقیقت ہے کہ منکرینِ مذہب کا اعلانِ ثابت نہیں کر کے منکرینِ مذہب یہ نہیں کہہ

سکتے کہ خدا کا تصور پیدا نہیں ہوتا۔ اہلِ یورپ نے مذہب کے خلاف جو جدید فلسفہ ایجاد کیا تھا۔ حتیٰ یہ ہے کہ وہ مذہب کی تردید نہ کر سکا۔ بخلاف ازیں جدید دور کے تقریباً ہر چھوٹے بڑے فلسفی نے اپنی اپنی دانست میں خدا کے وجود اور مذہب کی ضرورت پر دلائل فراہم کئے ہیں۔ اس سے حلیم ہوتا ہے کہ جدید فکریں مذہب کی ضرورت کے قائل ہیں۔

مذہبِ صدرِ رحمانی اس بات کی آئینہ داری کرتا ہے کہ مذہب کی ضرورت و اہمیت تاریخِ انسانی کے ہر دور میں مسلم رہی ہے۔ مغرب کے جو علماء مذہب کی مخالفت کرتے ہیں، ان کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ مذہب علم و عقل کا مخالف ہے۔ چنانچہ فرانس کا مشہور عالمِ فہم کاٹان اکتا ہے۔

"مذہب جن بنیادوں پر قائم ہوا ہے وہ علم کے مخالف ہیں۔ اس لئے قطعی بات ہے کہ تمام مذاہب کو ختم کر دینا چاہیئے۔"

مگر جو دین (دینِ اسلام) دنیا میں علم و عقل کا علمبردار ہو کر آیا ہو اور جس کا مقصد وجودِ ہی یہ ہو کہ دنیا میں علم کی ہر ممکن اشاعت کی جائے۔ جو ہر قدم پر عقل و فکر سے کام لینے کی تاکید کرتا ہو۔ اس کی صداقت و حقانیت سے کس کو مجالِ انکار ہو سکتی ہے؟ دینِ اسلام تو وہ ہے جس نے رسالت و نبوت کے قافلہ سالار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیگر مناصبِ جلیلہ کے ساتھ ساتھ معلمِ اعظم کا منصب عطا کیا۔ ان کی پیروی میں مسلمانوں نے اس ظلمتِ کدۂ ارضی کو علم و عقل کی روشنی سے بقیعہ نور بنا دیا اور امام غزالی، رازی، ابن تیمیہ، ابن سینا اور ابن رشد جیسے لوگ پیدا کئے۔ ایسا مذہب علم و عقل کا دشمن کیسے ہو سکتا ہے؟ اگر عقل کے اندھوں کو یہ روشنی نظر نہ آئے تو اس میں اسلام کا کیا تصور ہے؟ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔

گر نہ بیند بروزِ شپترہ چشم - چشمہ آفتاب را چہ گناہ

ایک دوسرے شاعر نے کیا خوب کہا ہے

آنکھ والا تیری قدرت کا تماشا دیکھ : چشم بے نور کو کیا آئے نظر کیا دیکھ

۱۶۔ انسانی زندگی میں مذہب کا مقام | ساقیہ بیانات میں ہم علم و عقل کی روشنی میں دیکھ چکے ہیں کہ مذہب

انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر انفرادی زندگی پرانگنہ اور اجتماعی زندگی فتنہ و فساد کی آماجگاہ بنی رہتی ہے۔ اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مذہب انسانی زندگی کے کن کن گوشوں کو متاثر کرتا ہے؟ یہ اثرات کس طرز و انداز کے ہوتے ہیں اور ان میں کس حد تک پائیداری پائی جاتی ہے۔

سب سے پہلے یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ مذاہب عالم میں کچھ حقائق مشترک حیثیت رکھتے ہیں مثلاً جملہ مذاہب میں سچائی، دیانتداری، راست بازی، رحم و کرم اور اس قسم کے دیگر اخلاقی جملہ کو پسندیدہ نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ دنیا میں کوئی مذہب ایسا نہیں جو چوری، سینہ زوری اور بدکاری و ناجائز کاری کو پسند کرتا ہو۔ اسی طرح چند ایک مذاہب کو چھوڑ کر تو جہد کے مسئلہ میں بھی تقریباً سب مذاہب متفق ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ مذاہب عالم کے یہ متفقہ و مشترک حقائق انسانی پر خوشگوار اور پائدار اثر ڈال رہے ہیں کسی مذہب سے تعلق رکھنے والا شخص اپنی عملی زندگی میں اس پائدار پیر آزاد شخص کی طرح لا پرواہ نہیں ہو سکتا جو سرے سے کسی مذہب کو تسلیم ہی نہ کرتا ہو۔ لہذا مذہب انشخص صرف مذہب ہی سے عاری نہیں ہوتے بلکہ وہ ہر قسم کی اخلاقی حدود و قیود سے بھی آزاد ہوتے ہیں۔

اس حقیقت کا بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اسلام کے سوا دیگر مذاہب میں بھی ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جن پر اپنے مذہب کی گہری چھاپ ہوئی ہے اور وہ سیرت و کردار اور اخلاق و معاملات کے اعتبار سے بڑے پایہ کے لوگ ہوتے ہیں۔ تقسیم ملک سے پہلے ہم نے ہندوؤں اور سکھوں میں اس کی نظیریں اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں۔ جدید مشرقی پنجاب کے مسلمان اپنا وطن عزیز زندگی کا بیش قیمت سرمایہ اور اثاثہ تو چھوڑ ہی رہے تھے اپنی آبر و اور ناموس کو بھی خطرہ میں دیکھتے تھے۔ اس وقت بعض نیک نیت سکھوں اور ہندوؤں نے اپنی بلند اخلاقی اور انسان دوستی کا جو عملی ثبوت ہم پہنچایا وہ مشرقی پنجاب سے آنے والے مسلمانوں کو ابھی تک نہیں بھولا۔ انہوں نے نہ صرف مسلمانوں کو کج فہمت تمام پاکستان کی سرحد تک پہنچایا بلکہ مسلم خواتین کو اپنی بھینٹیوں کی طرح عزیز رکھا اور انہیں پاکستان کی حدود میں داخل کر کے واپس لوٹے۔ اس کا عملی مشاہدہ ہم کر چکے ہیں۔

قرآن حکیم نے غیر مذاہب کے پاکیزہ خصال نیک نہاد اور مذہب دوست شرفاء کی مدح و ستائش میں نخل سے کام نہیں لیا۔ بلکہ بڑی کشادہ دلی سے ان پر تعریف و توصیف کے پھول بچھا دیے ہیں۔ قرآن کریم میں پروردگار تعالیٰ کے اعمالِ قہیمہ و افعالِ شنیعہ کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ قابلِ توصیف لوگوں کے حق میں کلماتِ تحسین بھی وارد ہوئے ہیں۔

ارشاد فرمایا:

” سب اہل کتاب برابر نہیں ہیں۔ ان میں ایسے لوگوں کی ایک جماعت موجود ہے جو راتوں کو خدا کی آیات پڑھتے اور بارگاہ ایزدی میں سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ اور روز قیامت پر ایمان رکھنے، اچھی باتوں کا حکم دیتے، بُرے کاموں سے روکتے اور نیک کاموں میں عجلت سے کام لیتے ہیں۔ اور یہی لوگ نیک نصیب ہیں۔ ایسے لوگ جو نیک کام بھی کریں گے۔ اس کی ہرگز ناقدری نہیں کی جائے گی۔ اللہ پرہیزگاروں کو بانٹتا ہے۔“ (آل عمران — ۱۱۳)

۴۔ اسلامی فلسفہ حیات

سابقہ ابواب میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ انسان کی سب سے بنیادی ضرورت مذہب ہے۔ اس کے بغیر انفرادی زندگی پر آگندہ اور اجتماعی زندگی فتنہ و فساد کی آماجگاہ بنی رہتی ہے۔ مختلف مذاہب اور اجتماعی تحریکات کا جائزہ لے کر ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ آج کے مسائل کو صرف اسلام ہی حل کر سکتا ہے۔ اب ہم اسلام کے فلسفہ زندگی کو اس کے دلائل کے ساتھ پیش کریں گے۔ آگے کی بحث کو سمجھنے کے لئے چند باتیں ذہن میں رہنی چاہئیں۔

۱۔ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں نظم و ترتیب اُس وقت رونما ہوتی ہے جب اس کی ایک مستقل اور تعین سیرت بن جائے۔ ایک مستقل سیرت کے بغیر انسان کی زندگی پر انتشار اور پرآگندگی کا غلبہ رہتا ہے اور وہ اپنا کوئی مستقل رنگ پیدا نہیں کر پاتا بلکہ مرغ بادشاہ کی طرح ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ اپنا رخ بھی بدل لیتا ہے۔

۲۔ جس طرح فرد و واسطہ کی زندگی کو پرآگندگی سے بچانے اور اس میں ضبط اور نظم پیدا کرنے کے لئے ایک مستقل سیرت کی ضرورت ہے اسی طرح بہت سے اشخاص اور ایک معاشرہ کو انتشار اور تفرقہ سے بچانے اور اسے ایک منظم اور متحد جمعیت بنادینے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی اساس مشترک اقدار پر ہو، اس پر ایک ہی رنگ غالب ہو اور ایک ہی رشتہ اتحاد میں سب جڑے ہوئے ہوں۔

۳۔ انفرادی اور اجتماعی سیرت کی بنیاد ان تصورات پر قائم ہوتی ہے جو ذہن میں پوری قوت کے ساتھ راسخ ہو جائیں۔ اور اتنا غلبہ حاصل کر لیں کہ انسان کی ساری عملی قوتیں انہی کے زیر اثر رہ کر کام کریں۔ اس رسوخ کا اصطلاحی نام ”ایمان“ ہے اور اس طرح راسخ ہو جانے والے تصورات کو ”ایمانیات“ یا ”عقائد“ کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں انسانی سیرت کی ذہنی بنیاد کا نام ”ایمان“ ہے۔ ایمان کا لفظ ”امن“ سے نکلا ہے۔ ”امن“ کے اصل معنی نفس کے مطمئن اور بے خوف ہو جانے کے ہیں۔ اسی سے ”امانت“ ہے جو ضد ہے ”خیانت“ کی، یعنی امانت وہ ہے جس میں خیانت کا خوف نہ ہو۔ امین کو امین اس لئے کہتے ہیں کہ اس کی نیک معالگی پر دل کو اطمینان اور وثوق ہوتا ہے کہ وہ بد معالگی نہیں کرے گا۔ جو انسانی غریب اور مطیع ہوتی ہے اُس کو

کا ساتھ دے سکیں، اور جن سے انسانی سیرت کی تشکیل اس طرح پر ہو کہ وہ بیک وقت اعلیٰ درجہ کا دیندار بھی ہو اور دنیا دار بھی، بلکہ اس کی دنیا داری میں دینداری ہو اور دین داری میں دنیا داری۔

۴۔ جس قوم کا مذہب اور تہذیب ایک ہوں اس کا ایمان محض مذہبی ایمان نہیں ہوتا بلکہ بعینہ دنیوی ایمان بھی ہوتا ہے۔ اس کے ایمان کا متزلزل ہونا اس کے مذہب اور اسکی تہذیب دونوں کے لئے غارت گر ہے اور اس کی دنیا اور اس کے دین دونوں کیلئے تباہ کن ہے۔

۱۔ تصور کائنات

کائنات سے متعلق انسان کے نظریات میں عظیم تضاد رہا ہے کسی کے نزدیک یہ محض ایک اتفاقی حادثہ کا نتیجہ ہے۔ اس میں جو تنظیم یا ترتیب نظر آتی ہے وہ بھی اتفاقی ہے۔ ورنہ بحیثیت کل نہ اس کا کوئی مقصد ہے اور نہ اس میں ہمہ گیر نظم پایا جاتا ہے۔ انسان خود بھی ایسے ہی ایک اتفاقی حادثہ کا نتیجہ ہے، اس کا بھی کوئی مقصد نہیں، اس کی زندگی میں بھی ترتیب اور اخلاقی نظم کی حاجت نہیں۔ لہذا وہ تعلق جو کائنات اور انسان کے مابین قائم ہوتا ہے یہ ہے کہ انسان چند طبعی خواہشات رکھتا ہے اور کائنات ان خواہشات کی تکمیل کا سامان بہم پہنچاتی ہے، اور اس طرح حیات طبعی کے قیام میں مدد دیتی ہے۔ پھر چونکہ کائنات ممکن نظم و انتظام سے عاری ہے اس لئے کبھی زندگی کے قیام کے بجائے زندگی کے اختتام کا سبب بنتی ہے۔ چنانچہ کبھی وہ طوفانوں کے ذریعہ انسانی بستیوں کو تباہ کرتی ہے، کبھی زلزلوں کے ذریعہ زندگی کو نیست و نابود کرتی ہے اور کبھی آتش فشاں کے ذریعہ انسانی آبادیوں کو خاکستر کرتی ہے۔

کسی کے نزدیک یہ کائنات محض ایک وجود کی منظر ہے۔ درخت، دریا، پہاڑ، چاند، سورج اور خود انسان اُسی ایک واحد الوجود کے جلوہ نما ہیں۔ ان کا اپنا نہ کوئی وجود ہے اور نہ کوئی حیثیت، ان کا عمل خدا کا عمل، ان کی حرکت خدا کی حرکت اور ان کا ارادہ خدا کا ارادہ ہے۔ چونکہ حقیقتاً یہ سب ایک ہی وجود کے مظاہر ہیں اس لئے کسی ترتیب یا نظم کے ہونے یا نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ترتیب ایک سے زائد اشیاء ہی میں ہو سکتی ہے۔ پھر چونکہ انسان بذات خود کوئی ارادہ نہیں رکھتا اس لئے جو کچھ وہ کرتا ہے اس کا ذمہ دار وہ خود نہیں۔ اور چونکہ اس کا اپنا کوئی مقصد نہیں اس لئے اس کے اور کائنات کے درمیان کسی مستقل رشتہ کا تعین ممکن نہیں۔ انسان کائنات میں اپنی منفعت کی خاطر تصرف کرتا ہے تو، اس کو خواہ مخواہ تباہ کرتا ہے تو، اس سے بلا وجہ اجتناب کرتا ہے تو اس

کو خواہ مخواہ نباہ کرتا ہے تو اس سے بلا وجہ بقتلاب کرتا ہے تو یا خود اس کا شکار ہوتا ہے تو سب ٹھیک ہے اس لئے کہ جس وقت جو کچھ بھی ہوا اسی واحد الوجود کے ارادے اور رضا سے ہوا۔ کسی اور کے نزدیک کائنات کی ہر وہ شے ایک آگ ہے جو کسی قوت کی حامل یا کسی منفعت کا مسبب ہے۔ چنانچہ دریا اگر بہاے جانے کی قوت رکھتا ہے تو معبود ہے، آگ اگر جلا سکتی ہے تو پرستش کے قابل ہے، سانپ اگر ڈس لیتا ہے تو لائق تعظیم و معبودیت ہے۔ غرض کائنات کی ہر شے محذوم اور انسان ان کا خادم ہے۔

ان کے علاوہ کائنات اور انسان سے متعلق کچھ نظریات ہیں لیکن انتہا پرندی اور کج روی ان سب کا خاصہ ہے۔ اسلام ہی ایک ایسا نظام فکرو عمل ہے جو کائنات و انسان سے متعلق ایک متوازن و معقول نظریہ ہے۔

۲۔ اسلامی تصور کی توضیح | اسلام کا نقطہ نظریہ ہے کہ یہ سارا عالم پرست اور خدائے انسان کے گرد و پیش جھیلنا ہوا ہے توئی اتفاقاً منگ مارے ہیں، بلکہ منظم،

باعنا بط سلطنت ہے۔ اللہ اس کو بنایا، وہی اس کا مالک اور وہی اس کا حاکم ہے یہ ایک نظام کمالی ہے جس میں تمام اختیارات مرکزی اقتدار کے ماتھے میں ہیں۔ اس مندرجہ ذیل کے سوا یہاں کسی اور کا حکم نہیں چلتا۔ تمام قوتیں جو نظام عالم میں کام کر رہی ہیں اسی کے زیرِ حکم ہیں اور کسی کی ممانعت نہیں ہے کہ اس کے حکم سے سرِ تابی کر سکے۔ اس ہمہ گیر نظام میں کسی کی خود مختاری اور غیر ذمہ داری کے لئے کوئی جگہ نہیں، اور نہ فطرتاً ہو سکتی ہے۔

پھر نظام برائیا محسوس ہوتا ہے کہ سلطنت عالم کا سارا کاروبار ایک نظم کے ماتھے میں ہے۔ مگر نہ خود سلطان نظر آتا ہے اور نہ اس کے کارپرداز کام کرنے دکھائی دیتے ہیں اور ایک سرِ تابی خود مختاری انسان اپنے اندر محسوس کرتا ہے کہ جس طرح چاہے کام کرے، مالکانہ روش بھی اختیار کر سکتا ہے اور اصل مالک کے سوا دوسروں کے سامنے بھی اطاعت و بندگی میں سر جھکا سکتا ہے۔ ہر صورت میں اس کو رزق ملتا ہے، وسائل کا نہ کم پہنچتے ہیں اور بغاوت کی سزاؤں کا نہیں دی جاتی ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ انسان کی صلاحیتیں بروئے کار آئیں اور وہ مادی، اخلاقی اور روحانی ترقی کے مدارج طے کر سکے، اس نے اس کو سمجھ بوجھ، انتخاب کی آزادی اور ایک طرح کی خود مختاری عطا کر کے چھوڑ دیا ہے۔

یہ عالم جس میں ہم اس وقت ہیں دراصل عالم طبعی ہے نہ کہ عالم اخلاقی جن قوانین پر کائنات کا موجودہ نظام چل رہا ہے وہ اخلاقی قوانین نہیں بلکہ طبعی قوانین ہیں۔ اس لئے موجودہ نظام کائنات میں اعمال کے اخلاقی نتائج پوری طرح مرتب نہیں ہو سکتے، اور اگر وہ مرتب ہو سکتے ہیں

تو صرف اس حد تک جس حد تک قوانین طبیعی ان کو مرتب ہونے کا موقع دیں، ورنہ جہاں تو انہیں طبیعی ان کے طور پر کے لئے سازگار نہ ہوں وہاں ان کا ظاہر ہونا محال ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص کسی کو قتل کر دے تو اس فعل کا اخلاقی نتیجہ مرتب ہونا موقوف ہے اس امر پر کہ قوانین طبیعی اس کا سراغ لگنے اور اس پر جرم ثابت ہونے اور اس پر اخلاقی سزا کے نافذ ہونے میں مددگار ہوں۔ اگر وہ مددگار نہ ہوں تو کوئی اخلاقی نتیجہ سرے سے مرتب ہی نہ ہوگا اور اگر وہ سازگار نہ کریں پس تب بھی اس فعل کے پورے اخلاقی نتائج مرتب نہ ہو سکیں گے کیونکہ مقتول کے عوض قاتل کا محض قتل کر دینا جانا اس فعل کا پورا اخلاقی نتیجہ نہیں ہے جس کا ارتکاب اس نے کیا تھا۔ اس لئے یہ دنیا دار الجبر انہیں سچے اور نہ ہو سکتی ہے۔ چنانچہ یہاں جو کچھ دیا جاتا ہے لازم نہیں کہ وہ کسی عمل، نیک کا انعام ہی نہ۔ وہ اس بات کی علامت نہیں کہ اللہ تم سے خوش ہے یا جو کچھ تم کر رہے ہو وہ درست ہے۔ بلکہ دراصل وہ محض امتحان کا سامان ہے۔ مال، دولت، اولاد، خدام، حکومت، اسباب زندگی، یہ سب وہ چیزیں ہیں جو تم کو امتحان کی غرض سے دی جاتی ہیں تاکہ تم ان پر کام کر کے دکھاؤ اور اپنی اچھی یا بری قابلیتوں کا اظہار کرو۔ اسی طرح جو تکلیفیں، نقصانات، مصائب وغیرہ آتے ہیں وہ بھی لازماً کسی عمل بد کی سزا نہیں ہیں بلکہ ان میں سے بعض قانون فطرت کے تحت آپ سے آپ ظاہر ہونے والے نتائج ہیں، بعض آزمائش کے ذریعے آتے ہیں اور بعض اس وجہ سے پیش آتے ہیں کہ حقیقت کے خلاف رائے قائم کر کے جب تم ایک راہ اختیار کرتے ہو تو لامحالہ چوٹ لگتی ہے۔ بہر حال یہ دنیا دار الجبر انہیں بلکہ دارالامتحان ہے۔

۳۔ اسلام کا تصور انسان | انسان کو ابتداء سے ہی کائنات کی طرح اپنے متعلق بھی بڑی غلط فہمی ہیں ہے اور اب تک اس کی یہ غلط فہمی باقی ہے۔

کبھی وہ افراط پر اترتا ہے تو اپنے آپ کو دنیا کی سب سے بلند سستی سمجھ لیتا ہے، غرور و تکبر اور سرکشی کی ہوا اس کے دماغ میں پھرتی ہے، کسی طاقت کو اپنے سے بالاتر کیا اپنے مد مقابل بھی نہیں سمجھتا، اپنے آپ کو غیر ذمہ دار اور غیر جواب دہ سمجھ کر جبر و قہر کا دیوتا، ظلم و جور اور شر و فساد کا مجسمہ بن جاتا ہے۔ کبھی تفریط کی طرف مائل ہوتا ہے تو اپنے آپ کو دنیا کی سب سے ذلیل سستی سمجھ لیتا ہے۔ درخت، پتھر، دریا، پہاڑ، ہوا، آگ، پانی، بجلی، پہاڑ، سورج، تارے، غرض ہر اُس چیز کے سامنے گردن ٹھکا دیتا ہے جس کے اندر کسی قسم کی طاقت یا سترت یا منفعت نظر آتی ہے۔ اور خود اپنے جیسے آدمیوں میں بھی کوئی فرق دیکھ کر اپنے قوانین کو بھولتا ہے اور حاکم مطلق مانا لینے میں تامل نہیں کرتا۔

اسلام نے ان دونوں انتہائی تصورات کو باطل کر کے انسان کی اصل حقیقت اس کے سامنے پیش کی ہے:

يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّبَكَ بِرَبِّكَ
الْكَرِيمِ الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوِّكَ
فَعَدَلَكَ ۖ فِي أَيِّ صُورَةٍ مَّا شَاءَ
رَبَّكَ ۚ (الانفطار)

(۱) اے انسان! کس چیز نے تجھے اپنے رب کریم سے غور کر دیا؟ اس رب سے جس نے تجھے پیدا کیا۔ تیرے اعضاء درست کئے تیرے قویٰ میں اعتدال پیدا کیا اور جس صورت میں چاہا تیرے عناصر کو ترکیبی (

اس اور اسی قسم کی دوسری آیات میں انسان کے غور و فکر کے بتوں کو توڑا گیا ہے۔ اسے اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ ذرا اپنی حقیقت کو دیکھ! خدا تجھے کن حقیر اجزاء سے پیدا کرتا ہے۔ پہلے رحم مادر میں ایک گوشت کا ٹکڑا بناتا ہے، پھر اپنی قدرت سے اس کو ٹکڑے میں جان ڈالتا ہے، اس میں حواس پیدا کرتا ہے اور ان آلات اور ان قوتوں سے اس کو مسلح کرتا ہے جن کی انسان کو دنیوی زندگی میں ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح تو دنیا میں آتا ہے مگر تیری ابتدائی حالت یہ ہوتی ہے کہ تو ایک بے بس بچہ ہوتا ہے جس کو اپنی کوئی حاجت پوری کرنے کی قدرت حاصل نہیں ہوتی۔ خدا ہی نے اپنی قدرت سے ایسا سامان کیا ہے کہ تیری پرورش ہوتی ہے، تو بڑھتا ہے۔ جوان ہوتا ہے، طاقت ور اور قادر ہوتا ہے۔ پھر تیری قوتوں میں انحطاط شروع ہوتا ہے تو جوانی سے ٹھہراپے کی طرف جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک وقت میں تجھ پر بھروسہ بے بسی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو بچپن میں تھی۔ تیرے حواس جواب دے دیتے ہیں، تیری قوتیں ضعیف ہو جاتی ہیں، تیرا علم نسبتاً منسباً ہو جاتا ہے۔ اور آخر کار تیری شمع حیات بجھ جاتی ہے۔ مال املاک، عزیز، دوست، اقارب سب کو چھوڑ کر قبر میں جا بیٹھتا ہے۔ اس مختصر عرصہ حیات میں تو ایک لمحہ کے لئے اپنے آپ کو زندہ رکھنے پر قادر نہیں۔

تجھ سے بالاتر ایک اور قوت ہے جو تجھ کو زندہ رکھتی ہے اور جب چاہتی ہے تجھ کو دنیا چھوڑنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ پھر جتنی مدت تو زندہ رہتا ہے، قوانین قدرت سے جکڑا رہتا ہے۔ یہ ہوا، یہ پانی، یہ روشنی، یہ حرارت، یہ زمین کی پیداوار، یہ قدرتی ساز و سامان جن پر تیری زندگی کا انحصار ہے، ان میں سے کوئی بھی تیرے بس میں نہیں نہ تو ان کو پیدا کرتا ہے نہ یہ تیرے احکام کے تابع ہیں۔ یہی چیزیں جب تیرے خلاف آمادہ پیکار ہو جاتی ہیں تو تو اپنے آپ کو ان کے مقابلے میں بے بس بناتا ہے۔ ایک ہوا کا جھکڑ تیری بستیوں کو تہ و بالا کر دیتا ہے۔ ایک پانی کا طوفان تجھے غرقاب کر دیتا ہے۔ ایک زلزلے کا جھٹکا تجھے پیوند خاک کر دیتا ہے۔ تو خواہ کتنے ہی آلات سے مسلح ہو، اپنے علم سے (جو خود بھی تیرا اپنا پیدا کیا ہوا نہیں

ہے) کیسی ہی تدبیریں ایجاد کر لے، اپنی عقل سے (جو خود بھی تیری حاصل کردہ نہیں ہے) کیسے ہی سامان بنایا کر لے، قدرت کی طاقتوں کے سامنے یہ سب دھڑکی کی دھڑکی رہ جاتی رہ جاتی ہیں۔ اس بل بوستے پر اکڑتا ہے، پھولا نہیں سماتا، کسی طاقت کو خاطر میں نہیں لاتا فرعونیت اور غروریت کا دم بھرتا ہے۔ جبار و قہار بنتا ہے، ظالم و سرکش بنتا ہے، خدا کے مقابلے میں بغاوت کرتا ہے خدا کے بندوں کا معبود بنتا ہے اور خدا کی زمین میں فساد پھیلاتا ہے۔ اس تکبر شکنی کے بعد اسلام وہ اعلیٰ مقام بھی متعین کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں انسان کو عطا فرمایا ہے۔ وہ نوع بشر کو بتاتا ہے کہ وہ اتنا ذلیل بھی نہیں ہے جتنا اس نے اپنے آپ کو سمجھ لیا ہے، وہ کہتا ہے :

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْوُجُوْدِ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلاً ؕ (نبی اسرائیل - ۷)

ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور ان کو خوشی اور تری میں سواریاں دیں اور ان کو پاک چیزوں سے رزق عطا کیا اور بہت سی ان چیزوں پر جو ہم پیدا کی ہیں ان کو ایک طرح کی فضیلت عطا کی ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُم مَّا فِی الْاَرْضِ - (الحج - ۹)

اے انسان! کیا تو دیکھتا نہیں کہ اللہ نے ان چیزوں کو جو زمین میں ہیں تیرے لئے مطیع بنا دیا ہے۔

ان آیات میں اور ایسی ہی بہت سی دوسری آیات میں انسان کو یہ بتایا گیا ہے کہ زمین میں جتنی چیزیں ہیں وہ سب تمہارے فائدے اور خدمت کے لئے مسخر کر دی گئی ہیں۔ اور آسمان کی بھی بہت سی چیزیں کا یہی حال ہے۔ یہ درخت، یہ دریا، یہ سمندر، یہ پہاڑ، یہ جانور، یہ رات اور دن، یہ تاریکی اور یہ روشنی، یہ چاند، یہ سورج، یہ تارے غرض یہ سب چیزیں جن کو تم دیکھ رہے ہو تمہاری خدام ہیں اور دراصل تمہاری منفعت کے لئے ہیں۔ تمہارے لئے انہیں کار آمد بنایا گیا ہے۔ تم ان سب پر فضیلت رکھتے ہو۔ تم کو ان سب سے زیادہ عزت دی گئی ہے تم کو ان کا مخدوم بنایا گیا ہے۔ پھر کیا تم اپنے خادموں کے آگے سر جھکاتے ہو؟ ان کو اپنا حاجت روا سمجھتے ہو؟ ان کے آگے دست سوال دراز کرتے ہو؟ ان سے اپنی مدد کی التجائیں کرتے ہو؟ ان سے ڈرتے اور خوف کھاتے ہو؟ ان کی عظمت و بزرگی کے گیت گاتے ہو؟ اس طرح تو تم اپنے آپ کو ذلیل کرتے ہو، آپ اپنا مرتبہ گراتے ہو، خادموں کے خدام، غلاموں کے غلام خود بن جتنے ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسان نہ اتنا عالی مرتبہ ہے جتنا وہ بزرگ خود اپنے آپ کو سمجھتا

ہے اور نہ اتنا پست و ذلیل ہے جتنا اس نے خود اپنے آپ کو بنایا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ انسان کا صحیح مرتبہ کیا ہے؟

اس کا جواب اسلام یہ دیتا ہے کہ وہ اس زمین پر خدا کا خلیفہ (نائب) ہے۔

مقام انسانیت

"اور جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ (نائب) بنانے والا ہوں تو انہوں نے عرض کیا، کیا تو زمین میں اس کو نائب بناتا ہے جو وہاں فساد پھیلانے کا اور غور و ریزیاں کرے گا، حالانکہ ہم تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح اور تیری تقدیس کرتے ہیں، اللہ نے فرمایا، میں وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے، اور اس نے آدم کو سب چیزوں کے نام سکھا دیئے، پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا، اگر سچے ہو تو ان چیزوں کے نام مجھے بتاؤ، انہوں نے کہا، پاک ذات ہے تیری ہم اس کے سوا کچھ نہیں جانتے جو تو نے ہم کو سکھا دیا ہے۔ تو ہی علم رکھنے والا ہے اور تو ہی حکمت کا مالک۔

خدا نے کہا، اے آدم ان فرشتوں کو ان چیزوں کے نام بتاؤ، پس جب آدم نے ان کو اشیاء کے نام بتائے تو خدا نے کہا، کیا میں تم سے نہ کہتا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی سب مخفی باتیں جانتا ہوں اور جو کچھ تم چھپاتے ہو اور ظاہر کرتے ہو اس سب کا علم رکھتا ہوں، اور جب ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو ان سب نے سجدہ کیا، مگر ابلیس کے کہ اس نے انکار اور تکبر کیا اور نافرمانوں میں سے ہو گیا۔ اور ہم نے آدم سے کہا کہ اے آدم تو اور تیری بیوی دونوں جنت میں رہو اور اس میں جہاں چاہو یہ فراغت کھاؤ۔ مگر اس درخت کے پاس بھی نہ بھٹکو کہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے، مگر شیطان نے ان کو جنت سے اکھاڑ دیا اور وہ جس خوشحالی میں تھے ان کو وہاں سے نکلوا دیا۔ (البقرہ - ۲)

اس مضمون کو مختلف طریقوں سے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو خدا نے زمین میں اپنا نائب بنایا، اس کو فرشتوں سے بڑھ کر علم دیا، اس کے علم کو فرشتوں کی تسبیح و تقدیس پر ترجیح دی، فرشتوں کو حکم دیا کہ اس کو سجدہ کریں، فرشتوں نے اس کو سجدہ کر لیا اور اس طرح ملکوتیت اس کے آگے جھک گئی مگر ابلیس نے انکار کیا اور اس طرح ملکوتیت کے آگے نہ جھکا۔

اس کی فضیلت کو تسلیم کیا اور اس کے آگے جھک گئے لیکن شیطان نے اس کو تسلیم نہ کیا۔ اس جرم میں شیطان پر لعنت بھیجی گئی مگر اس نے قیامت تک کے لئے مہلت مانگ لی کہ انسان کو بہکانے کی کوشش کرے۔ چنانچہ شیطان نے انسان کو بہکا کر جنت سے نکلوا دیا۔ اور اس وقت سے انسان اور شیطان میں کشمکش برپا ہے۔ خدا نے انسان سے کہہ دیا کہ بڑھدایت میں تجھے بھیجوں اس کو مانے گا تو جنت میں جائے گا، اور اپنے دشمن شیطان کا حکم مانے گا تو دوزخ تیرا ٹھکانہ ہوگا۔

۵۔ انسان کی عظمت کے وجوہ

انسان کی عظمت کو ثابت کرنے کے لئے اسلام نے بڑا عقلی انداز اختیار کیا ہے قرآن نے تین اہم سوالات اٹھا کر انسانی عظمت کا اثبات کیا ہے۔ وہ سوالات یہ ہیں :

- ۱۔ کائنات کیا ہے ؟
- ۲۔ کائنات کا بنانے والا کون ہے ؟
- ۳۔ انسان کو کیا حیثیت حاصل ہے ؟

اسلام نے ان تینوں سوالات کا تفصیلی جواب دیا ہے چونکہ ہمارے موضوع کا تعلق صرف آخری سوال سے ہے۔ اس لئے ہم اس پر تفصیلی روشنی ڈالیں گے۔

۶۔ انسان اور کائنات

مختلف مذاہب میں مذاہب قدرت کی پرستش کا سبب ہی یہ ہے کہ انسان اور کائنات کے درمیان کوئی تعلق سمجھا گیا۔ انسان کائنات کی مختلف چیزیں دیکھ کر ان کے سامنے جھکنے لگتا ہے حالانکہ اس کے لئے ایسا کرنے کی کوئی گنجائش نہیں اسلام آتے ہیں بتاتا ہے کہ کائنات کی مختلف اشیاء انسان کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ وہ اس کی خدمت کے لئے مامور ہیں اور وہ ان سے کام لے سکتا ہے۔ اسے ان کے سامنے سجدہ سیکھنا ہی ضرورت نہیں۔ قرآن پاک میں اسے بڑے دلشیز انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

”خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا“
(البقرہ - ۲۹)

جو کچھ بھی زمین میں موجود ہے اس نے سب کا سب تمہارے فائدے کیلئے پیدا کیا ہے۔ اور اس نے تمہارے لئے رات اور دن اور سورج اور چاند کو مسخر بنایا اور ستارے بھی اس کے حکم سے مسخر ہیں۔

”وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّیْلَ وَالنَّهَارَ
وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنَّجْمُ
سَخَّرَاتٌ بِاَمْرِی“ (النحل - ۱۲)

قرآن پاک انشاء کائنات کے اللہ ان کے لئے نائے خدمت گزار اور حاضر قرار دے گا

ہے۔ ان کے سامنے سربسجود ہونا اور ان سے حاجت روائی کی دعا کرنا اس کی کم فہمی اور ناقص اندیشی ہے۔ دنیا میں اسلام پہلا مذہب ہے جس نے انسان کو اشرف المخلوقات قرار دیا اور اس کو پوری کائنات پر فضیلت و برتری عطا فرمائی۔

”وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَ
حَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَرَزَقْنَاهُمْ
مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى
كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا“
(بنی اسرائیل - ۷۵)

اور ہم نے بنی آدم کو بزرگی اور برتری عطا کی اور
خشکی و تیزی کی طائفتیں اس کے تابع کر دیں جو اس
کو اٹھائے پھرتی ہیں اور پاکیزہ چیزیں اس کے
کھانے کو دیں اور بہت سی مخلوقات پر ہم نے
اس کو فضیلت و برتری دی۔

زمین، آسمان، چاند، سورج، دریا، سمندر، خشکی و تری، سب انسان کے انتفاع کے لئے
پیدا کی گئی ہیں۔ اس کی عبادت و پرستش کے لئے نہیں۔ اقبال نے بہت خوب کہا ہے
نہ تو زمین کے لئے ہے نہ آسمان کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کیلئے
ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
نہ گنبدِ افلاک یہ خاموش فضا میں
یہ کوہ یہ صحرا یہ سمندر یہ فضا میں
تھیں پیش نظر کو تو فرشتوں کی ادا میں
آئینہ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

قرآن کریم میں فرمایا:
”لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي
أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ“ (التین - ۴)

ہم نے انسان کو بہت خوبصورت سا پنچے
میں ڈھالا۔

متعدد احادیث نبویہ سے عظمت انسان کا اثبات ہوتا ہے
حضورؐ نے فرمایا:

۱۔ خَلَقَ اللَّهُ آدَمَ عَلَى صُورَتِهِ ذِكْرُهُ ۖ
۲۔ إِذَا أَصْرَبَ أَحَدُكُمْ خَادِمَهُ فَلْيَتَّقِ
الْوَجَدَ - (صحیح بخاری ج ۲ ص ۵۵ مطبوعہ مصر)

اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔
جب تم میں سے کوئی اپنے خادم کو سزا دے تو چہرے
پر مارنے سے احتراز کرے۔

۳۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ یوں نہ کہو خدا
تیرے چہرے کو بگاڑے اس لئے کہ خدا نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے۔ (الادب المفرد للبخاری ص ۱۰۷)

مذکورہ صندریات و احادیث میں انسانی عظمت و فضیلت کو بیان کیا گیا ہے ایسی فضیلت
جس میں اور کوئی مخلوق اس کی شریک نہیں۔ انسان کے چہرے کی تعظیم اس کی فضیلت کے سبب انسان
کی صورت کی خدائی صورت سے تشبیہ بھی دراصل بیان فضیلت ہی کا ایک انداز ہے۔

انسانی فضیلت کی اصل اس کی نامانہ حیثیت میں ہے۔ انسان نائب خدا ہے۔ اس لئے وہ صاحبِ فضیلت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی شان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا تھا فرشتوں کے اقرار میں کرنے پر انسان کی حمایت میں فرمایا:

”إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ“ (البقرة: ۳۱) (جو کچھ میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے)

کائنات کی کوئی اور مخلوق اس فضیلت میں انسان کی شریک نہیں۔ انسان کے سوا کوئی بھی خلافت کا اہل نہیں۔ اس لئے اسے امانت قرار دیا ہے اور انسان کو اس کا ریز میں شریک ٹھہرایا کیونکہ باقی مخلوق نے بارِ امانت اٹھانے سے انکار کر دیا۔ مگر انسان نے اُسے اٹھا لیا۔

آسمان بارِ امانت تو انست کشید

قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

۸۔ غلط فہمی کا ازالہ | اسلام نے اگرچہ انسانی عظمت کا مدار تقویٰ کو قرار دیا ہے لیکن مطلق مخلوق ہونے کے لحاظ سے اسلام بھی اس کی فضیلت کا اعتراف کرتا

ہے۔ اسلام میں عظمت انسان کا حقیقی تصور گوشت پوست یا نسل و خون سے وابستہ نہیں ہے۔ اسلام تو انسانیت کی برتری اور فضیلت کا علمبرار ہے نسل و خون سے وابستہ تصور غلط ہے اس غلط احساسِ عظمت نے دنیا کو ظلم کدہ بنا دیا ہے۔ قرآن نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

”ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ“ (الروم: ۴۱) تری میں فساد رونما ہو گیا۔ لوگوں کے کرتوتوں کی وجہ سے خشکی اور

اسلام انسانی شرف کے لحاظ سے سب کو مساوی قرار دیتا ہے کسی شخص کو اظہارِ فضیلت کا ایسا کوئی حق نہیں جس سے فساد پیدا ہو۔ آنحضرتؐ نے فخر و غرور کو ملعون قرار دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حاکم و محکوم، آقا و غلام اور ادنیٰ و اعلیٰ کی تیز مٹھ گئی اور انسان اپنے اصل مقام پر آ گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”جو لوگ اپنے مرے ہوئے آباء پر فخر کا اظہار کرتے ہیں۔ انہیں باز آ جانا چاہیئے وہ فقط دوزخ کے کوٹھے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے نجاست کے کپڑے سے بھی زیادہ ذلیل ہو گئے، جو نجاست کو ناک سے دھکیلتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تم سے جاہلیت کی سخت اور آباء پر فخر کو دور کر دیا تو وہ مؤمن متقی ہوتا ہے یا بد بخت فاجر ہوتا ہے سب لوگ آدمؑ کی اولاد ہیں اور آدمؑ مٹی کے تھے۔“ (مشکوٰۃ کتاب الادب)

ایک دوسری حدیث میں فرمایا ”کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت نہیں اور نہ کسی گورے کو کسی کالے پر سوائے تقویٰ کے۔“ (مسند احمد)

ان تمام احادیث میں فضیلت کے غلط تصور کو مٹا دیا گیا ہے۔ ہر انسان سیدائشی طور پر

دوسرے کے برابر ہے۔ فرق صرف اخلاق و تقویٰ کا ہے۔ اس قدرتی اور الٰہی فرق کے سوا ہر تفریق مصلحتی ہے اور سب انسان کے لئے باعثِ ہلاکت۔

۹۔ انسان کا منصب خلافت

اس بیان سے چند امور معلوم ہوتے ہیں :-
اولاً یہ کہ انسان خلیفہ ہونے کی حیثیت سے صرف خدا ہی کا ماتحت ہے۔ اس کا درجہ تمام چیزوں سے افضل اور اعلیٰ ہے۔ دنیا کی تمام چیزیں اس کی خادم ہیں اور اس لئے ہیں کہ وہ ان کو استعمال کرے اور اپنے آقا کے بتائے ہوئے طریقہ پر ان سے خدمت لے۔ ان ماتحتوں کے آگے جھکنا اس کے لئے ذات ہے۔ اگر جھکے گا تو اپنے اوپر ظلم کرے گا اور گویا نبات الہی کے منصب سے خود دستبردار ہوگا

دوسرے یہ کہ نائب کا کام یہ ہے کہ وہ جس کا نائب ہے اس کی اطاعت کرے۔ اسے اس بات کا اختیار نہیں کہ اپنے آقا کی رعیت اور اس کے نوکروں اور نادموں کو خود اپنی رعیت، اپنا نوکر اور اپنا خادم بنالے کہ ایسا کرے گا تو باغی قرار پائے گا۔ اس کو جس جگہ نائب بنایا گیا ہے وہاں اپنے آقا کی املاک کو استعمال کر سکتا ہے، اس کی رعیت پر حکومت کر سکتا ہے، اس سے خدمت لے سکتا ہے، ان کی نگرانی کر سکتا ہے، مگر اس حیثیت سے نہیں کہ وہ خود آقا ہے بلکہ اس حیثیت سے کہ وہ اپنے آقا کا نمائندہ ہے اور جتنی چیزیں اس کے زیر حکم ہیں ان پر اپنے آقا کا امین ہے۔ اس بنا پر وہ سچا اور پسندیدہ اور مستحق النعام نائب اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ وہ اپنے آقا کی امانت میں خیانت نہ کرے۔

اس امانت میں نہ صرف دنیا کی ہر چیز شامل ہے بلکہ خود انسان کا اپنا نفس بھی اس کا ایک حصہ ہے۔ لہذا جس طرح بقیہ اشیاء کا وہی تصرف مناسب ہے جو آقا کی مرضی کے مطابق ہو اسی طرح خود انسان کا جسم اور اس کی جان بھی خدا کی برائیات کے مطابق استعمال ہونی چاہئیں۔ خدا نے اپنی مرضی وحی و الہام کے ذریعے انسانوں تک پہنچا دی اور خدا کا مربوط اور مفصل قانون کتاب و سنت میں محفوظ ہے۔ انسان کا کام یہ ہے کہ وہ اس کو سمجھ کر اپنے اعمال و افعال خدا کی مرضی کے مطابق ڈھالے۔

تیسرے یہ کہ نہ صرف انسان کا عمل خدا کے دیئے ہوئے قانون کے مطابق ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ یہ مطابقت اتفاقی نہ ہو۔ نائب کا کام یہی نہیں کہ وہ ایسے افعال انجام دے جو آقا کی نظر میں پسندیدہ ہوں بلکہ یہ بھی ہے کہ نائب یہ افعال آقا کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کر کے اس کی رضا کی خاطر کرے۔ اگر ایسا نہ کرے گا تو نہ اپنے نائب ہونے کی حیثیت کو سمجھ سکیگا، نہ

اپنے اہل بیت کے منصب کا کوئی صحیح تصور اس کے ذہن میں پیدا ہوگا، نہ اپنے ذمہ دار اور جواہر ہونے کا احساس کر سکے گا، اور نہ اس امانت میں جو اس کے سپرد کی گئی ہے اپنی ذمہ داریاں اور اپنے فرائض صحیح طور پر ادا کرنے کے قابل ہوگا۔ اول تو یہ ممکن نہیں کہ کسی دوسرے شخص کے تحت انسان وہ طرز عمل اختیار کر سکے جو نیابت و امانت کے تحت وہ اختیار کرے گا۔ اور اگر فیض محال اس کا طرز عمل ویسا ہو بھی تو اس کی کوئی قیمت نہیں کیونکہ آقا کی فرمانروائی تسلیم کرنے سے انکار کر کے تو وہ پہلے ہی باغی ہو چکا ہے۔ اب اگر اس نے اپنے نفس یا کسی اور کے اتباع میں اچھے عمل کئے بھی تو اس کا اجر اس سے طلب کرے جس کا اس نے اتباع کیا ہے۔ اس کے آقا کے ہاں اس کے وہ اعمال بے کار اور بے وزن ہیں۔

چوتھے اسی لفظ خلافت و نیابت سے ایک اہم نکتہ یہ بھی نکلتا ہے کہ نائب کا اصل کمال یہ ہے کہ وہ اپنے آقا کی املاک میں اس کی جانشینی کا حق ادا کرنے کی کوشش کرے اور جہاں تک ممکن ہو ان میں اسی شان کا تصرف کرے جس شان کا وہ حقیقی مالک کرتا ہے۔ بادشاہ اگر اپنی رعیت پر کسی شخص کو اپنا نائب بنائے تو اس کے لئے اپنے منصب نیابت کے استعمال کا بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ رعیت کی خبر گیری، شفقت، مہربانی، حفاظت، عدل اور حسب موقع سختی کرنے میں وہی سیرت اختیار کرے جو خود بادشاہ کی سیرت ہے اور بادشاہ کی املاک اور اس کے اموال میں وہی ہی حکمت، تدبیر، دانائی اور احتیاط سے تصرف کرے جس سے خود بادشاہ ان میں تصرف کرتا ہے۔ پس انسان کو بھی نائب خدا ہونے کی حیثیت سے وہی روش اختیار کرنی چاہیئے جو خود خدا کی روش ہے۔ مخلوق کی ویسی ہی خبر گیری، وہی رحمانی و رحیمی، وہی عدل، وہی رحم و کرم، ویسا ہی قہر و جبر جو خود خدا کے اخلاق میں شامل ہے، انسان کو چاہیئے کہ اپنے کردار میں بھی راسخ کرے۔ یہی مفہوم ہے جو ”تخلقوا باخلاق اللہ“ کے حکیمانہ جمل میں ادا کیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ انسان اپنے میں یہ صفات اس حد تک پیدا نہیں کر سکتا جس حد تک خدا کی ہیں، کہ درجہ نیابت درجہ خداوندی کے آگے بچ ہے، لیکن اپنی حد تک ان صفات میں زیادہ سے زیادہ ملکہ پیدا کرنا بھی صحیح اسلامی زندگی ہے۔

پانچویں یہ کہ انسان جب تک زمین میں ہے اور جب تک مٹی کے پتلے (جسم انسانی) اور خدا کی چھونکی ہوئی روح میں تعلق باقی ہے اس وقت تک وہ خدا کا نائب ہے۔ یہ تعلق منقطع ہوتے ہی وہ خلافت ارضی کے منصب سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔ اس کے زمانہ نیابت کے افعال و اعمال کی جانچ پڑتال ہونی چاہیئے۔ اس کے سپرد جو امانت کی گئی تھی اس کا حساب کتاب ہونا چاہیئے۔ اس پر نائب ہونے کی حیثیت سے جو ذمہ داریاں عائد کی گئی تھیں، ان کی

تحقیقات ہوتی چاہئے کہ اس نے کس طرح انجام دیں۔ اگر اس نے غبن، خیانت، نافرمانی، بغاوت اور فرس نانشاسی کی ہے تو اس کو سزا ملنی چاہیئے اور اگر ایمان داری، فرض شناسی اور اطاعت کو شئی سے کام کیا ہے تو اس کا انعام بھی ملنا ضروری ہے۔

چھٹے یہ کہ ہر انسان نائب ہونے کی حیثیت سے اپنے اچھے بُرے اعمال کا خود ذمہ دار ہے نہ یہ امید باقی رہنے دی گئی ہے کہ کوئی ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں کا کفارہ ادا کرے گا، نہ اس توقع کی کوئی گنجائش چھوڑی گئی ہے کہ کسی کے تعلق اور کسی کے واسطے سے ہم اپنے جرائم کے نتائج اور ان کی سزا سے بچ جائیں گے۔ اور نہ اس کا کوئی خطرہ باقی رکھا گیا ہے کہ کسی کا جرم ہمارے حسن عمل پر اثر انداز ہوگا۔ یا خدا کے سوا کسی کی خوشی کو ہمارے اعمال کی مقبولیت و نامقبولیت میں کوئی دخل ہے۔ لہذا دنیا برتنے میں ہر شخص کو اپنی پوری ذمہ داری کا احساس ہونا چاہیئے اور دنیا و مافیہا سے قطع نظر کر کے یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کرنی چاہیئے کہ اپنے ہر عمل کا ذمہ دار میں خود ہوں۔

۱۰۔ اسلامی نظریہ کی افادیت | دنیا اور انسان کے متعلق یہ نظریہ جو اسلام نے پیش کیا ہے ایک مکمل نظریہ ہے۔ اس کے تمام اجزاء میں منطقی ربط ہے کوئی جز دوسرے جز کے متناقض نہیں ہے۔ اس سے تمام واقعات عالم کی پوری توجیہ اور تمام آثار کائنات کی پوری تعبیر ملتی ہے۔ کوئی ایک چیز مشاہدہ یا تجربہ میں ایسی نہیں آتی جس کی توجیہ اس نظریہ سے نہ کی جاسکتی ہو۔ لہذا یہ ایک علمی نظریہ ہے۔ ”علمی نظریہ“ کی جو تعریف بھی کی جائے وہ اس پر صادق آتی ہے۔

پھر کوئی مشاہدہ یا تجربہ آج تک ایسا نہیں ہوا جس سے یہ نظریہ ٹوٹ جاتا ہو، لہذا یہ اپنی جگہ پر قائم ہے۔ ٹوٹے ہوئے نظریات میں اس کو شمار نہیں کیا جاسکتا۔ پھر نظام عالم کا جو مشاہدہ ہم کرتے ہیں اس سے اس نظریہ کی صداقت اور برتری پر روشنی پڑتی ہے۔ کائنات میں جو زبردست تنظیم پائی جاتی ہے اس کو دیکھ کر یہ کہنا زیادہ قرین عقل ہے کہ اس کا کوئی ناظم ہے بہ نسبت اس کے کہ کوئی ناظم نہیں ہے۔ اسی طرح اس تنظیم کو دیکھ کر یہ نتیجہ

SCIENTIFIC THEORY

سے کسی زمانے کے کچھ علمی نظریات کا بلکہ ہر اس کے خلاف ہونا اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ یہ نظریہ ٹوٹ گیا۔ ایک علمی نظریہ کو صرف حقائق توڑ سکتے ہیں نہ کہ نظریات۔ لہذا جب تک یہ نہ بتایا جائے کہ ایسیا کے پیش کئے ہوئے اس تصور کائنات و انسان کو کس ثابت شدہ حقیقت نے غلط ثابت کر دیا ہے اس کو ٹوٹے ہوئے نظریات میں شمار کرنا قطعاً ایک غیر علمی اور متعصبانہ دعویٰ ہے۔

نکالنا زیادہ معقول ہے کہ یہ مرکزی نظام ہے اور صرف ایک ناظم کے ماتحت چل رہا ہے۔ اسی طرح جو حکمت کی شان اس کائنات کے نظام میں علانیہ محسوس ہوتی ہے اُسے دیکھ کر یہ رائے قائم کرنا زیادہ قریب از عقل ہے کہ یہ حکیمانہ اور بامقصد نظام ہے نہ نسبت اسکے کہ بے مقصد ہے اور محض ایک بچے کا کھیل ہے۔ پھر جب ہم اس حیثیت سے غور کرتے ہیں کہ اگر واقعی یہ نظام کائنات ایک سلطنت ہے اور انسان اس نظام کا ایک جز ہے تو یہ بات ہم کو سرسری معقول معلوم ہوتی ہے کہ اس نظام میں انسان کی خود مختاری وغیر ذمہ داری کے لئے کوئی جگہ نہ ہونی چاہیئے اور اس کا صحیح مقام رعیت ہی کا ہونا چاہیئے۔ اس لحاظ سے یہ ہم کو نہایت معقول نظر میں معلوم ہوتا ہے۔

پھر جب عملی نقطہ نظر سے ہم دیکھتے ہیں تو یہ بالکل ایک قابل عمل نظریہ معلوم ہوتا ہے۔ زندگی کا پورا نظام اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ اس نظریہ پر بنتا ہے۔ فلسفہ اور اخلاق کے لئے، علوم و فنون کے لئے، ادب اور ہنر کیلئے، سیاست اور انتظام مملکت کے لئے، صلح و جنگ اور بین الاقوامی تعلقات کے لئے، غرض زندگی کے ہر پہلو اور ضرورت کے لئے یہ ایک مستقل بنیاد فراہم کرتا ہے اور کسی شجہ زندگی میں بھی انسان کو اپنا رویہ متعین کرنے کے لئے اس نظریہ سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

سوالات متعلقہ باب اول

- ۱۔ اسلام کا معنی و مفہوم بیان کرتے ہوئے اُس کے تصور دین کا تعارف کرائیے۔
- ۲۔ اسلام کی امتیازی خصوصیات پر ایک فاضلانہ مقالہ سیر قلم کیجئے۔
- ۳۔ اسلام نے انسانی زندگی کے بنیادی مسائل کا کیا حل پیش کیا ہے
- ۴۔ وحی کی حقیقت دلائل و براہین کی روشنی میں ثابت کیجئے۔
- ۵۔ مذہب کو انسانی زندگی میں کیا مقام حاصل ہے اور کیوں؟
- ۶۔ اسلامی فلسفہ حیات پر ایک عالمانہ شدہ قلمبند کیجئے۔
- ۷۔ دین اسلام کی نگاہ میں کائنات اور انسان کا کیا تصور ہے، تفصیلاً لکھئے۔
- ۸۔ انسان کیوں کہ منصب خلافت پر فائز ہے اور خلیفۃ اللہ ہونے کے اعتبار سے اس پر کیا فرائض عائد ہوتے ہیں۔

باب دوم

اسلام کے بنیادی عقاید

۱۔ توحید (وجود باری تعالیٰ توحید کے دلائل، عقیدہ توحید کے اثرات)

۲۔ تعلق باللہ اور اس کی بنیادیں

۳۔ رسالت

۴۔ آخرت

باب دوم

اسلام کے بنیادی عقاید

۱۔ اسلام میں عقیدہ کی اہمیت | اسلام کے دائرہ میں داخل ہونے کے لئے چند باتوں کو جاننا اور ماننا ضروری ہے۔ اسی کا نام ایمان یا عقیدہ ہے۔

انسان کے تمام افعال و اعمال کا مرکز و محور اس کے خیالات ہیں، یہی اس کو بناتے اور بچاتے ہیں۔ انہی اصولی و بنیادی خیالات کو عقائد کہتے ہیں۔ یہی وہ نقطہ ہے جس سے انسانی عمل کا ہر خط نکلتا ہے اور اسی کے دائرہ حیات کا ہر خط اُسی پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ ہمارے تمام افعال و حرکات اور ہمارے ارادہ کے محرک ہمارے خیالات اور جذبات ہیں اور ہمارے خیالات و جذبات پر ہمارے اندرونی عقائد حکومت کرتے ہیں۔ عام بول چال میں اُن کو ”دل“ کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انسان کے تمام اعضاء میں اس کا دل ہی نیکی اور بدی کا گھر ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:

”انسان کے بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے اگر وہ درست ہے تو تمام بدن درست ہے

اور اگر وہ بگڑ گیا تو تمام بدن بگڑ گیا۔ ہاں! وہ ٹکڑا دل ہے۔“ (صحیح بخاری کتاب الایمان)

غرض یہ کہ ہمارے دل کا ارادہ اور نیت ہی ہمارے اعمال کی محرک ہے۔ اسی بھاپ کی طاقت سے اس مشین کا ہر پرزہ چلتا اور حرکت کرتا ہے۔ اسی لئے آپ نے فرمایا: ”إِنَّمَا

الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ“ (تمام کاموں کا دار و مدار نیت پر ہے) (صحیح بخاری)

لہذا صحیح اور صالح عمل کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم چند اصول و ضوابط کو اپنے دل و دماغ میں اس طرح جگہ دیں کہ ان کی صداقت میں شبہ باقی نہ رہے اور اسی صحیح یقین اور مضبوط عقیدہ کے تحت ہم اپنے تمام کام انجام دیں۔ اسی عقیدہ کو ایمان کہتے ہیں۔ ایمان کے بغیر کوئی عمل مقبول نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے ایمان کا ذکر ہمیشہ ”عمل صالح“ کے ذکر سے پہلے لازمی طور سے کیا ہے اور ایمان کے بغیر کسی عمل کو قبول کے قابل نہیں سمجھا ہے۔

عبداللہ بن جدعان ایک قریشی تھا جس نے ظہور اسلام سے قبل بہت نیکی کے کام کئے تھے۔ تاہم وہ مشرک تھا حضرت عائشہ نے ایک دفعہ دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! عبداللہ بن جدعان نے جاہلیت

میں جو نیکی کے کام کئے کیا اس کو ان کا ثواب ملے گا؟ فرمایا ”نہیں اے عائشہ“ کیونکہ کسی دن اس نے یہ نہیں کہا کہ خداوند امیر سے گئی ہوں کو قیامت کے دن معاف فرمادے۔

(مسند احمد بن حنبل ج ۶ ص ۱۴۹)

قرآن پاک نے ان لوگوں کے کاموں کی مثال جو ایمان سے محروم ہیں اس راکھ سے دی ہے جس کو ہوا کے جھونکے اڑا اڑا کر فنا کر دیتے ہیں اور ان کا کوئی وجود نہیں رہتا۔ اسی طرح اس شخص کے کام بھی جو ایمان سے محروم ہے۔ بے کار اور بے بنیاد ہیں۔

قرآن میں فرمایا:

”جنہوں نے اپنے پروردگار کا انکار کیا ان کے کاموں کی مثال راکھ کی ہے جس پر آندھی والے دن زور سے ہوا چلی۔ وہ اپنے کاموں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ یہی سب سے بڑی گمراہی ہے۔

(سورۃ ابراہیم - ۱۸)

حاصل بحث یہ ہے کہ ایمان کے بغیر عمل کی بنیاد کسی بلند تخیل پر قائم نہیں ہو سکتی۔ ایمان ہمارے تمام اعمال کی اساس ہے جس کے بغیر ہر عمل بے بنیاد ہے۔ وہ ہماری سیرانی کا اصلی سرچشمہ ہے اس کے نہ ہونے سے ہمارے کاموں کی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں رہتی کیونکہ وہ دیکھنے میں تو کام معلوم ہوتے ہیں مگر روحانی اثر و فائدہ سے خالی اور بے نتیجہ ہوتے ہیں۔ خدا کی رستی اور جزا سزا کا یقین اس کی رضامندی کا حصوں ہائے اعمال کی غرض و غایت ہے۔ یہ نہ ہو تو ہمارے تمام کام بے نظام اور بے مقصد ہو کر رہ جائیں۔ ایمان ہمارے دل کا نور ہے۔ وہ نہ ہو تو پوری زندگی تاریک ہو جائے اور ہمارے تمام کاموں کی بنیاد ریا، نمائش اور شہرت طلبی جیسے پست جذبات اور محرکات پر ہو۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم نے ایمان اور عمل دونوں کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے عمل ایمان کا نمونہ ہے۔ ایمان کا پتہ عمل ہی سے چلتا ہے۔ اس لئے عمل کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اسلام میں عقائد کی طویل فہرست نہیں پائی جاتی۔ اسلام نے عقائد کے اتنے ہی حصے کو ضروری قرار دیا جو دل کی اصلاح کرے اور اخلاق و عبادت کی بنیاد قرار پاسکے چند سیدھے سادے اصول جو تمام ذہنی سچائیوں اور واقعی حقیقتوں کا جوہر اور خلاصہ ہیں۔ ان کا نام عقیدہ اور ان پر یقین کرنے کا نام ایمان رکھا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صریح الفاظ میں عقائد کے صرف پانچ اصول بیان فرمائے۔

(۱) ایمان باللہ (۲) ایمان بالرسول (۳) ایمان بالکتاب (۴) ایمان بالمالک (۵) ایمان بالیوم الآخر۔

یہ تمام وہ حقائق ہیں جن پر دل سے یقین کرنا اور زبان سے اُن کا اقرار کرنا ضروری ہے۔ ان کے بغیر نہ کوئی عمل خالص ہو سکتا ہے نہ مقبول۔

۲۔ اسلامی عقاید عقل کی کسوٹی پر

اوپر کے صفحات میں جن پانچ بنیادی عقاید کا ذکر کیا گیا ہے، وہ سب امور غیب کی قبیل سے ہیں

اور عالم آب و گل سے باور۔ اس لئے یہ مذہبی و روحانی ایمانیات ہیں، لیکن ان کی خصوصیت یہ ہے کہ اسلام نے ان پر پندرہ حافی نظام ہی کی بنیاد رکھی، بلکہ اخلاقی و سیاسی اور تمدنی نظام کی بنیاد بھی رکھی ہے۔ اس نے دین و دنیا دونوں کو ملا کر ایک ایسا نظام وضع کیا ہے جس کے تحت انسانی زندگی کے تمام شعبے حرکت کرتے ہیں۔ اس نظام کو اپنے قیام و بقا اور اپنے تصرفات کے لئے عقلی طاقت کی ضرورت ہے۔ وہ سب انہی پانچوں ایمانیات سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ اس کے لئے قوت کا ایک لامتناہی سرچشمہ ہیں جس کی رسد کبھی بند نہیں ہوتی۔

اب ہم کو دیکھنا چاہیے کہ جن ایمانیات سے انشا بڑا کام لیا گیا ہے وہ عقلی حیثیت سے کیا پایہ رکھتے ہیں؟ اور ان میں ایک ہمہ گیر اور ترقی پذیر نظام کے لئے اساس اور منبع قوت بننے کی صلاحیت کہاں تک موجود ہے؟

اس سوال کی تحقیق میں قدم آگے بڑھانے سے پہلے ہم کو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اسلام ایک ایسی تہذیب کی بنیاد رکھنا چاہتا ہے جو صحیح معنوں میں انسانی تہذیب ہو یعنی اس کا تعلق کسی خاص ملک یا نسل کے لوگوں سے نہ ہو، نہ کوئی مخصوص رنگ رکھنے والی یا مخصوص زبان بولنے والی قوم اس کے ساتھ اختصاص رکھتی ہو، بلکہ تمام نوع انسانی کی فلاح اس کا مقصد ہو اور اس کے زیر اثر ایک ایسا نظام اجتماعی قائم ہو سکے۔ جس میں ہر اس چیز کو پروان چڑھایا جائے جو انسان کے لئے بحیثیت انسان ہونے کے خیر و صلاح ہے اور ہر اس چیز کو مٹایا جائے جو اس کے لئے شر اور فساد ہے۔ ایک ایسی خالص انسانی تہذیب کی بنیاد ان ایمانیات پر نہیں رکھی جاسکتی جو محض عالم آب و گل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ مادیات اور محسوسات دو حال سے خالی نہیں ہیں۔ یا تو وہ ایسے ہیں جن کے ساتھ تمام انسانوں کا تعلق یکساں ہے مثلاً 'سورج' چاند، زمین، ہوا، روشنی وغیرہ، یا ایسے ہیں جن کے ساتھ تمام انسانوں کا تعلق یکساں نہیں ہے، مثلاً وطن، نسل، رنگ، زبان وغیرہ۔ پہلی قسم کی چیزوں میں تو ایمانیات بننے کی صلاحیت ہی نہیں ہے کیوں کہ ان کے نفس وجود پر ایمان لانا تو محض بے معنی ہے اور ان پر اس حیثیت سے ایمان لانا کہ وہ انسان کی اصلاح میں کوئی اخیار یا تاثیر رکھتے ہیں از روئے علم و عقل غلط ہے۔

علاوہ بریں ان پر کسی حیثیت سے بھی ایمان لانے کا کوئی نفع انسان کی روحانی، اخلاقی اور عملی زندگی میں مترتب نہیں ہوتا۔ رہیں دوسری قسم کی چیزیں تو ظاہر ہے کہ مشترک انسانی تہذیب کے لئے اساس نہیں بن سکتیں کیوں کہ وہ بناٹے تفریق و تقسیم ہیں نہ کہ بناٹے جمع و تالیف۔ لہذا

یہ قطعاً ناگزیر ہے کہ اس قسم کی تہذیب کی بنیاد ایسے ایمانیات پر رکھی جائے جو مادیت و محسوسات سے ماورا ہوں۔

لیکن ان کا محض مادیات و محسوسات سے ماورا ہونا ہی کافی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ضرورت ہے کہ ان میں چند اور خصوصیات بھی پائی جائیں۔

(۱) وہ خرافات اور اوہام نہ ہوں بلکہ ایسے امور ہوں جن کی تصدیق پر عقل سلیم مائل ہو سکتی ہو۔

(۲) وہ دور از کار باتیں نہ ہوں بلکہ ہماری زندگی سے ان کا گہرا تعلق ہو۔

(۳) ان میں ایسی معنوی قوت ہو جس سے تہذیب کا نظام انسان کے قوائے فکر و عمل پر تسلط قائم کرنے میں پوری طرح مدد حاصل کر سکے۔

اس لحاظ سے جب ہم اسلام کے ایمانیات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان تینوں آزمائشوں میں پورے اترتے ہیں۔

اولاً، اسلام نے اللہ، ملائکہ، وحی، رسالت، اور یوم آخر کا جو تصور پیش کیا ہے اس میں کوئی استحالہ عقلی نہیں ہے جس کا صحیح ہونا غیر ممکن ہو، نہ کوئی ایسی بات ہے جس کو ماننے سے عقل سلیم انکار کرتی ہو۔ اس میں شک نہیں کہ محض عقل ان کا احاطہ نہیں کر سکتی لیکن ہمارے اہل علم و حکمت نے اب تک جتنے مجردات کی تصدیق کی ہے ان سب کا یہی حال ہے۔ تو انائی حیات، جذب و کشش، نشو و ارتقا ایسے ہی دوسرے امور کی تصدیق ہم نے اس بنا پر نہیں کی ہے کہ ہم ان حقیقتوں کو پوری طرح سمجھ چکے ہیں، بلکہ اس بنا پر کہ ہم نے جن مختلف قسم کے مخصوص آثار کا مشاہدہ کیا ہے ان کی توجیہ و تعلیل کے لئے ہمارے نزدیک ان امور کا موجود ہونا ضروری ہے اور ظواہر اشیاء کے باطنی نظام کے متعلق جو نظریات ہم نے قائم کئے ہیں وہ ان امور کے موجود ہونے کا اقصا کرتے ہیں۔ پس اسلام جن مجردات پر ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے ان کی تصدیق کے لئے بھی یہ ضروری نہیں ہے کہ ہماری عقل ان کی حقیقتوں کو پوری طرح سمجھ لے اور ان کا احاطہ کر لے بلکہ اس کے لئے عقلی طور پر صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ کائنات اور انسان کے متعلق جو نظریہ اسلام نے پیش کیا ہے، وہ خلاف عقل نہیں ہے، اس کا صحیح ہونا اغلب ہے اور وہ ان پانچوں امور کے وجود کا مقتضی ہے جو اسلام نے ایمانیات کے طور پر پیش کئے ہیں۔

اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ (۱) کائنات کا نظم ایک قادر مطلق ہستی کا قائم کیا ہوا ہے اور وہی اس کو چلا رہی ہے (۲) اس قادر مطلق ہستی کے ماتحت بے شمار دوسری ہستیاں ہیں جو اس وسیع کائنات کی تدبیر میں اس کے احکام کو نافذ کر رہی ہیں۔ (۳) انسان کے

وجود میں اس کے خالق نے خیر و شر دونوں کے میلانات رکھے ہیں۔ دانائی اور نادانی، علم و جبل و ذل کا اس کے اندر اجتماع ہے۔ غلط اور صحیح دونوں طرح کے راستوں پر وہ چل سکتا ہے۔ ان تضاد قوتوں اور متخالف میلانات میں سے جس کا غلبہ ہوتا ہے، اس کی پیروی کرنے لگتا ہے۔

(۴) اس تنازع خیر و شر میں خیر کی قوتوں کو مدد پہنچانے اور انسان کو سیدھی راہ دکھانے کے لئے اس کے خالق نے خود ہی نوع انسان ہی میں سے چند بہترین آدمیوں کا انتخاب کیا ہے اور ان کو علم صحیح عطا کر کے لوگوں کی ہدایت پر مامور کیا۔ (۵) انسان کوئی غیر ذمہ دار اور غیر مسئول ہستی نہیں ہے۔ وہ اپنے تمام انتہائی اعمال کے لئے اپنے خالق کے سامنے جوابدہ ہے۔ ایک دن اس کو ذرہ ذرہ کا حساب دینا ہو گا۔ اور اپنے اعمال کے اچھے یا بُرے نتائج دیکھنے ہوں گے۔

یہ نظریہ خدا، ملائکہ، وحی، رسالت، یوم آخر، پانچوں امور کے وجود کا مقتضی ہے۔ اس میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو عقلاً محال ہو۔ نہ اس کی کسی چیز کو وہمیات و خرافات سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ برعکس اس کے ہم اس پر جس قدر زیادہ غور کرتے ہیں اسی قدر اس کی تصدیق کی ہمانب ہمارا میلان بڑھتا جاتا ہے۔

خدا کی حقیقت خواہ ہماری سمجھ میں نہ آئے مگر اس کا وجود تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔ یہ ایک ایسی ضرورت ہے جس کے بغیر کائنات کا مسمک کسی طرح حل نہیں ہوتا۔

ملائکہ کے وجود کی کیفیت ہم متعین نہیں کر سکتے مگر ان کے نفس و وجود میں شک کی گنجائش نہیں ہے۔ تمام اہل علم و حکمت نے ان کی ہستی کو کسی نہ کسی طور پر تسلیم کیا ہے۔ اگرچہ وہ ان کو اس نام سے یاد کرتے ہیں جس سے قرآن انہیں موسوم کرتا ہے۔

قیامت کا آنا اور ایک نہ ایک دن دنیا کے نظام کا درہم برہم ہونا قیاسات کی رو سے اغلب بلکہ قریب بہ یقین ہے۔

انسان کا اپنے اللہ کے آگے جوابدہ ہونا اور اس کا اپنے اعمال کے لئے مستوجب جزا و سزا ہونا خواہ کسی قطعی دلیل سے ثابت نہ کیا جاسکے، مگر عقل سلیم اس حد تک تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ انسان کی موت اور موت کے بعد کی حالت کے متعلق جتنے نظریے قائم کئے گئے ہیں ان میں سب سے بہتر نتیجہ اور اقرب الی القیاس نظریہ وہی ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے۔

رہا وحی اور رسالت کا مسئلہ تو یہ ظاہر ہے کہ اس کا کوئی مادی ثبوت پیش نہیں کیا جاسکتا۔

مگر جن کتابوں کو وحی الہی کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ ان کے معانی، اور جن لوگوں کو اللہ کا رسول کہا گیا ہے ان کی سہ توں پر غور کرنے سے ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ نوع انسانی کے افکار و اعمال پر ان کے برابر گہرے، وسیع، پائدار اور مفید اثرات کسی اور نے نہیں ڈالے۔ یہ بات اس

امر کا یقین کرنے کے لئے کافی ہے کہ ان میں کوئی غیر معمولی بات ضرور تھی جو نہ انسانی تصنیفات کو نصیب ہے اور نہ عام انسانی لیڈروں کو۔

اس بیان سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کے ایمانیات عقل کے خلاف نہیں ہیں عقل کے پاس ان کی تادیب کے لئے کسی قسم کا مواد نہیں ہے۔ ان میں کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ علمی اور عقلی ارتقا کے کسی مرتبہ پر پہنچ کر انسان کو رد کر دینے پر مجبور ہو جائے بلکہ اس کے برعکس عقل ان کی اعلیٰیت کا حکم لگاتی ہے۔

ثانیاً، طبیعیات میں سے بیشتر امور ایسے ہیں جن کی حیثیت محض علمی ہے، یعنی ان سے ہمارے عمل زندگی کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ مثلاً ایشیہ بیوٹی، صورت مطلقہ، مادہ، قدرت اور قانون علت و معلول، اور ایسے ہی ایسیور، علمی مسلمات یا مفروضات ہیں کہ ان کے ماننے یا نہ ماننے کا ہماری زندگی کے معاملات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لیکن اسلام نے جن امور غیب پر ایمان لانے کی دعوت دی ہے وہ ایسے نہیں ہیں۔ ان کی حیثیت محض علمی ہی نہیں ہے بلکہ ہماری اخلاقی اور علمی زندگی سے ان کا گہرا تعلق بھی ہے۔ ان کی تصدیق کو اصل الاصول قرار دینے کی وجہ یہی ہے کہ وہ محض تصدیق نہیں ہیں بلکہ ان کا صحیح علم اور ان پر کامل ایمان ہمارے نفسانی اوصاف و خصائل پر ہمارے شخصی اعمال پر اور ہمارے اجتماعی معاملات پر شدت کے ساتھ اثر انداز ہوتا ہے۔

ثالثاً، اسلام کے نظام تہذیب کو مختلف عقلی اور علمی مراتب رکھنے والی وسیع انسانی بادیوں پر ان کی زندگی کے مخفی اور جزئی سے جزئی شعبوں تک میں اپنی حکومت قائم کرنے اور اپنی گرفت مضبوط رکھنے کے لئے جس قوت کی ضرورت ہے وہ صرف ان ہی ایمانیات سے حاصل ہو سکتی ہے جن کی تصدیق کا اسلام نے مطالبہ کیا ہے۔ یہ یقین کہ ایک سمیع و بصیر، قادر و غالب اور رؤف و رحیم اللہ ہمارے اوپر حکمران ہے، اس کے بے شمار شکر ہر جگہ ہر آن موجود ہیں، پیغمبر اسی کا بھیجا ہوا ہے، جو احکام اس نے ہم کو دیئے ہیں وہ اُس نے خود نہیں گھڑے ہیں بلکہ سب کے سب خدا کی طرف سے ہیں اور اپنی اطاعت یا سرکشی کا اچھا یا برا نتیجہ ہم کو ضرور دیکھنا پڑے گا۔ اپنے اندر وہ زبردست اور ہمہ گیر طاقت رکھتا ہے جو اس کے سوا کسی اور ذریعے سے حاصل نہیں کی جاسکتی۔ مادی طاقتیں صرف جسم کو جکڑ سکتی ہیں، تربیت اور تعلیم کے اخلاقی اثرات انسانی معاشرے کے صرف اعلیٰ طبقوں تک پہنچ سکتے ہیں، قانون صرف وہاں کام کر سکتا ہے جہاں اس کے کارندوں کی پہنچ ہو۔ مگر یہ وہ قوت ہے جو دل اور روح پر قبضہ کرتی ہے۔ عوام اور خواص، جاہل اور عالم، دانشمند اور بے دانش سبھی کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے جنگل کی تنہائیوں اور رات کی تاریکیوں تک

میں اپنا کام کرتی ہے۔ جہاں گناہ سے روکنے والا، اس پر ملامت کرنے والا، حتیٰ کہ اس کو دیکھنے والا بھی کوئی نہیں ہوتا، وہاں اللہ کے حاضر و ناظر ہونے کا یقین، پیغمبر کی دی ہوئی تعلیم کے برحق ہونے کا یقین، قیامت کی باز پرس کا یقین، وہ کام کرتا ہے، جو نہ کوئی پولیس کا سپاہی کر سکتا ہے، نہ عدالت کا حاکم، نہ پروفیسر کی تعلیم، پھر جس طرح اس یقین نے معمورۂ ارضی پر پھیلے ہوئے بے شمار مختلف متفاد انسانی عناصر کو جمع کیا، ان کو ملا کر ایک قوم بنایا، ان کے تخلیقات، اعمال اور اطوار میں غایتِ درجہ کی یکجہتی پیدا کی، ان کے اندر اختلافِ ظہور و احوال کے باوجود ایک تہذیب پھیلانی اور ان میں ایک اعلیٰ مقصد کے لئے فداکاری کی دہانہ روح پھونکی، اس کی مثال کہیں دھونڈنے نہیں مل سکتی۔ یہاں تک جو کچھ ثابت کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کی اصطلاح میں ایمان سے مراد اللہ ملائکہ، کتب، رسل اور یوم آخر پر ایمان لانا ہے۔ پھر عقلی تنقید کر کے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اسلام جس قسم کی تہذیب قائم کرنا چاہتا ہے اس کے لئے صرف یہی امور ایمانیات بن سکتے ہیں اور ان ہی ایمانیات کی اس کو ضرورت ہے۔ نیز یہ کہ ان میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو عقلی و علمی ترقی کا ساتھ نہ دے سکتی ہو۔

اب تک کی بحث سے جو چند امور غیر مشتبہ طور پر ثابت ہوئے ہیں وہ یہ ہیں :-

- (۱) ایمان، نظام اسلام کا سنگ بنیاد ہے، اسی پر اس نظام کی عمارت قائم کی گئی ہے۔ اور کفر و اسلام کا امتیاز صرف ایمان و عدم ایمان کے بنیادی فرق پر مبنی ہے۔
- (۲) انسان سے اسلام کا پہلا مطالبہ یہ ہے کہ وہ ایمان لائے۔ اس مطالبے کو قبول کرنے والا دائرہ اسلام میں داخل ہے، اور تمام اخلاقی احکام اور مدنی قوانین اسی کے لئے ہیں اور جو اس مطالبہ کو رد کرے وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ اس سے نہ کوئی اخلاقی حکم متعلق ہوتا ہے اور نہ کوئی مدنی قانون۔

(۳) اسلام کے نزدیک ایمان ہی عمل کی جڑ ہے۔ صرف وہی عمل اس کی نگاہ میں قدر و قیمت رکھتا ہے جو ایمان کی بنیاد پر ہو، اور جہاں سرے سے یہ بنیاد ہی موجود نہ ہو وہاں تمام اعمال بے اصل اور بے وزن ہیں۔

(بحوالہ اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی)

۱۔ توحید

عقیدہ توحید کی توضیح

جو شخص بھی دنیا کے مختلف الہامی مذاہب اور بالخصوص اسلام کا مطالعہ کرے گا اسے اس بات کا اندازہ کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی کہ ان مذاہب نے اپنی تعلیمات میں سب سے زیادہ اہمیت جس چیز کو دی ہے وہ اللہ پر ایمان لانا ہے۔ جو شخص کفر کی حالت کو چھوڑ کر مسلمان ہونا چاہتا ہے، اسے سب سے پہلے کلمہ شہادت ادا کرنا پڑتا ہے، اور اسی کلمے کی بناء پر وہ شخص ملت کفر سے کٹ کر ملت اسلام میں داخل ہو جاتا ہے۔ اگر یہ شخص اللہ پر ایمان کے تقاضے پورا کرے گا تو آخرت کے اعتبار سے اجر و ثواب کا مستحق اور بصورت دیگر عذاب کا مستوجب ہوگا۔ یہ الفاظ دیگر اسلام کے نزدیک محض اس اقرار یا ایمان سے انسان کی دنیوی اور آخری زندگی یکسر بدل جاتی ہے۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محض ایک مابعد الطبیعی ہستی کے وجود یا عدم وجود کے اقرار سے انسانوں میں اتنا بڑا فرق نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن اگر ہم ہر نگاہ غائر اس مسئلے کا مطالعہ کریں، جیسا کہ ہم اس باب میں کریں گے، تو ہمیں محسوس ہوگا کہ اس اقرار و انکار کے بڑے اہم نتائج نکلتے ہیں۔ یہ نتائج فکری بھی ہیں اور عملی بھی۔ انفرادی بھی ہیں اور اجتماعی بھی۔ اس لئے وجود باری تعالیٰ اور توحید کے مسئلے کو محض ایک علمی اور کلامی مسئلہ سمجھنا، جس کا تعلق محض فلاسفہ اور متکلمین کی موشگافیوں سے ہو، درست نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان و کائنات کے باہمی تعلق کے بارے میں ہر شخص کو ایک نقطہ نظر رکھنا پڑتا ہے ضروری نہیں کہ یہ نقطہ نظر سوچ سمجھ کر ہی اختیار کیا گیا ہو، بلکہ (جیسا کہ اکثریت کا قاعدہ ہے) بلا سوچے سمجھے بھی ایک نقطہ نظر رکھا جاسکتا ہے اور یہ انسان اور معاشرے، دونوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اسلام چونکہ افراد کی اصلاح کا آغاز بالکل بنیاد سے کرتا ہے اس لئے وہ اس بات کو پیش نظر رکھتا ہے کہ عمل صالح سے پہلے ایمان پر زور دیا جائے۔ بنیاد اگر صحیح نہ ہو تو دیوار ٹیڑھی اور کمزور رہے گی اور ”تاشریامی رود دیوار کج“ کا نقشہ ہوگا۔ ایسی دیوار میں اگر کچھ ظاہری حسن ہے بھی تو وہ بے کار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نیک اعمال اگر صحیح عقائد اور صحیح نیت کے ساتھ نہ ہوں تو اللہ تعالیٰ کے یہاں بے معنی ہیں۔

اسلام کے پورے اعتقادی اور عملی نظام میں پہلی اور بنیادی چیز ایمان باللہ ہے۔ باقی جتنے اعتقادات و ایمانیات ہیں سب اسی ایک اصل کے تکمیلی فروغ ہیں اور جتنے

اخلاقی احکام اور تمدنی قوانین ہیں سب اسی مرکز سے قوت حاصل کرتے ہیں۔ یہاں جو کچھ بھی ہے اس کا مصدر اور مرجع اللہ کی ذات ہے۔ ملائکہ پر اس لئے ایمان ہے کہ اللہ کی نازل کی ہوئی ہیں۔ رسولوں پر اس لئے ایمان ہے کہ وہ اللہ کے بھیجے ہوئے ہیں۔ یوم آخر پر اس لئے ایمان ہے کہ وہ اللہ کے انصاف کا دن ہے فرائض اس لئے فرائض ہیں کہ اللہ نے ان کو مقرر کیا ہے حقوق اس لئے حقوق ہیں کہ وہ اللہ کے حکم پر مبنی ہیں۔ اوامر کا امتثال اور نواہی سے اجتناب اس لئے ضروری ہے کہ وہ اللہ کی جانب سے ہیں۔ غرض ہر چیز جو اسلام میں ہے، خواہ عقیدہ ہو یا عمل، اس کی بنا صرف ایمان باللہ پر قائم ہے۔ اس ایک چیز کو الگ کر دیجئے، پھر نہ ملائکہ کوئی چیز ہیں نہ یوم آخر، نہ رسول اتباع کے مستحق ٹھہرتے ہیں، نہ ان کی لائی ہوئی کتابیں، نہ فرائض و طاعات میں کوئی معنویت باقی رہ جاتی ہے نہ حقوق و فرائض میں، نہ اوامر و نواہی کسی قوت و نفاذ کے حامل رہتے ہیں اور نہ ضوابط و قوانین۔ اس ایک مرکز کے بٹننے ہی یہ سارا کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے بلکہ سرے سے اسلام ہی کسی چیز کا نام نہیں رہتا۔

یہ عقیدہ جو اس عظیم الشان فکری و عملی نظام میں مرکز اور منبع قوت کا نام دے رہا ہے، محض اسی قدر نہیں ہے کہ ”اللہ تعالیٰ موجود ہے“ بلکہ وہ اپنے اندر اللہ تعالیٰ کی صفات کا ایک مکمل اور صحیح تصور (جس حد تک انسان کے لئے ان کا تصور ممکن ہے) رکھتا ہے، اور انہی صفات کے تصور سے وہ قوت حاصل ہوتی ہے جو انسان کی تمام فکری اور عملی قوتوں پر محیط اور حکمران ہو جاتی ہے۔ محض ہستی باری کا اثبات وہ چیز نہیں ہے جسے اسلام کی امتیازی خصوصیت کہا جاسکتا ہو۔ دوسری ملتوں نے بھی کسی نہ کسی طور سے باری تعالیٰ کے وجود کا اثبات کیا ہے۔ البتہ جس چیز نے اسلام کو تمام مذاہب و ادیان سے ممتاز کر دیا ہے کہ وہ یہی ہے کہ اس نے صفات باری کا صحیح علم بخشا ہے، اور پھر اسی علم کو ایمان بلکہ اصل ایمان بنا کر اس سے تزکیہ نفس، اصلاح اخلاق، منظم اعمال، بشریت و منع شر، اور بناء تمدن کا اثنا بڑا کام لیا ہے جو دنیا کے کسی مذہب و ملت نے نہیں لیا۔

ایمان باللہ کی مجمل صورت، جس کے اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب کو دخول اسلام کی پہلی اور لازمی شرط قرار دیا گیا ہے، کلمہ ”لا الہ الا اللہ ہے، یعنی دل سے اس امر کی تصدیق اور زبان سے اس امر کا اعتراف کہ ”الہ“ بجز اس ایک ہستی کے اور کوئی نہیں ہے جس کا نام اللہ ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ”الوہیت“ کو عالم وجود کی جملہ اشیاء سے سلب کر کے صرف ایک ذات کے لئے ثابت کیا جائے اور ان تمام جذبات، تخیلات، اعتقادات اور عبادات و طاعات کو جو ”الوہیت“ کے لئے مخصوص ہیں، اسی ایک ذات سے متعلق کر دیا جائے۔ اس مجمل کلمہ کے اجزائے ترکیبی یہ ہیں :-

ایک، اُلُوہِیَّت کا تصور۔

دوسرے، تمام اشیاء سے اس کی نفی۔

تیسرے۔ صرف اللہ کے لئے اس کا اثبات

قرآن مجید میں خدا کی ذات و صفات کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے، وہ سب انہی تینوں امور کی تفصیل ہے۔

اولاً اس نے اُلُوہِیَّت کا ایک ایسا مکمل اور صحیح تصور پیش کیا ہے جو دنیا کی کسی کتاب

اور کسی مذہب میں نہ ملتا۔ اس میں شک نہیں کہ تمام قوموں اور ملتوں میں یہ تصور کسی نہ کسی طور پر موجود ہے، لیکن ہر جگہ غلط یا نامکمل ہے۔ کہیں اُلُوہِیَّت نام، جس شخص اُلُوہِیَّت اور واجبیّت کا کہیں اس سے مراد اولیٰ گئی ہے۔ کہیں اس کو قوت اور طاقت کا ہم معنی سمجھا گیا ہے۔ کہیں وہ

محض رت اور عہدہ کی چیز ہے، کہیں وہ صرف محبت کا موضوع ہے، کہیں اس کا مفہوم محض نفع حاجت اور حمایت و حمایت ہے۔ پھر کہیں وہ قابلِ تجزیہ و تقسیم ہے، کہیں اس کو تجلیم اور تشبیہ اور تشاکل سے آلودہ کیا گیا ہے کہیں وہ آسمانوں پر ٹنکن ہے اور کہیں وہ انسانی جیسے بدل کر زمین پر

اُتر آئی ہے، ان تمام غلط یا ناقص تصورات کی تصحیح اور تکمیل جس کتاب نے کی ہے وہ صرف قرآن ہے۔ اسی کتاب نے اُلُوہِیَّت کی تقدیس و تجوید کی ہے۔ اسی نے بتایا ہے کہ الہ صرف وہی ہو سکتا ہے جو بے نیاز، صمد اور قیوم ہو جو ہمیشہ سے ہو اور ہمیشہ رہے۔ جو قادر مطلق اور حاکم علی الاطلاق ہو،

جس کا علم سب پر محیط، جس کی رحمت سب پر وسیع، جس کی طاقت سب پر غالب ہو، جس کی حکمت میں کوئی نقص نہ ہو، جس کے عدل میں ظلم کا شائبہ تک نہ ہو، جو زندگی بخشنے اور وسائل حیات پیدا کرنے والا ہو، جو نفع و ضرر کی ساری قوتوں کا مالک ہو، اس کی بخشش اور نگہبانی کے سب

محتاج ہوں، اسی کی طرف تمام مخلوقات کی بازگشت ہو، وہی سب کا حساب لینے والا ہو اور اسی کو جزا اور سزا کا اختیار ہو۔ پھر یہ اُلُوہِیَّت کی صفات نہ تجزیہ و تقسیم کے قابل ہیں کہ ایک وقت میں بہت سے "الہ" ہوں اور وہ ان صفات یا ان کے ایک ایک حصہ سے متصف ہوں، نہ یہ وقتی اور

۱۔ یعنی یہ سمجھنا کہ اللہ تعالیٰ بھی ہماری (مادی اشیاء کی) طرح ایک جسم رکھتا ہے۔

۲۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو کسی مادی شے سے تشبیہ دی جائے۔

۳۔ یعنی اللہ تعالیٰ بھی انسان و حیوان کی طرح صاحب نسل اور صاحب اولاد ہے۔

۴۔ ذات باری تعالیٰ تصور الہ ہونا۔

۵۔ بے نیاز، صمد، بلند مرتبہ، (وہ جس کی طرف ہمہ باشند کاموں میں رجوع کیا جائے)

۶۔ بہت بڑا قائم ہونے والا۔ بے مثال تھا منے والا۔

زمانی ہیں کہ ایک ”اللہ“ کبھی تو ان سے منصف ہو، اور کبھی نہ ہو، نہ یہ قابل انتقال ہیں کہ آج ایک ”اللہ“ میں پانی جائیں اور کل دوسرے میں۔

اُلوہیت کا یہ کامل اور صحیح تصور پیش کرنے کے بعد قرآن اپنے انتہائی زور بیان کے ساتھ ثابت کرتا ہے کہ کائنات کی جتنی اشیاء اور جتنی قوتیں ہیں ان میں سے کسی پر بھی یہ مفہوم راست نہیں آتا تمام موجودات عالم محتاج ہیں، مسخر ہیں، مخلوق ہیں، نافع و ضار ہونا تو درکنار خود اپنی ذات سے ضرر کو رفع کرنے پر قادر نہیں ہیں۔ ان کے احوال اور ان کی تاثیرات کا سرچشمہ ان کی اپنی ذات میں نہیں ہے بلکہ وہ سب کی سب کہیں اور ہے قوت وجود، قوت فعل، اور قوت تاثیر حاصل کرتی ہیں۔ لہذا کائنات کی کوئی شے ایسی نہیں جو ”اُلوہیت“ کا شاہد بھی، اپنے اندر رکھتی ہو اور جس کو ہماری نیاز مندگیوں میں سے کسی ایک حصہ کا بھی حق پہنچتا ہو۔

اس نئی کے بعد وہ ایک ذات کے لئے ”اُلوہیت“ ثابت کرنا کہ جس کا نام ”اللہ“ ہے اور انسان سے مطالبہ کرتا ہے کہ سب کو چھوڑ کر، کسی پر ایمان لاؤ، اسی کے آگے جھکنا، اسی کی تعظیم کرو۔ اسی سے محبت کرو، اسی سے خوف کرو، اسی سے امید رکھو جو کچھ مانگو اسی سے مانگو۔ میراث میں اسی پر توکل کرو، اور ہمیشہ یاد رکھو کہ ایک دن اس کے پاس بنانا ہے، اس کو حساب دینا ہے، اور تمہارا اچھا یا بُرا انجام اسی کے فیصلہ پر منحصر ہے۔

آئندہ صفحات میں توحید کی حقیقت اور اس کے اقداری پیغام کے بارے میں علمی اور عقلی بحث کی بجائے اور اس سلسلہ میں اسلام جو فطری طرز امت لال اختیار کرتا ہے اسے پیش کیا جائے گا۔ اس موضوع کی اچھی طرح تفصیل کے لئے مندرجہ ذیل چیزوں کو سمجھنا ہوگا۔

- ۱۔ کائنات کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے بلکہ اس کا کوئی خالق اور حاکم ہے۔
- ۲۔ یہ خالق اور حاکم ایک اور صرف ایک ہے اور اس کی حکمرانی اس کائنات میں ہر طریقہ کار فرما ہے۔
- ۳۔ توحید کے نظریہ کے تحت خدا کا ایک مکمل تصور واضح ہوتا ہے اور اسلام کے پورے نظام فکر و عمل کی بنیاد اسی توحید کے تصور پر ہے۔
- ۴۔ توحید کے اثرات انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کیا مرتب ہوتے ہیں اور اس نظریہ کے تحت کیسا انسان اور کیسا معاشرہ وجود میں آتا ہے۔
- آئندہ صفحات میں انہی مباحث سے بحث کی گئی ہے۔

۲۔ وجود باری تعالیٰ | سب سے پہلا سوال جس سے ہمیں سابقہ درپیش ہے وجود باری تعالیٰ کا ہے۔ فلاسفہ اور اہل سائنس نے اس پر بہت کچھ لکھا ہے اور خصوصیت سے پچھلے دو تین سو سال میں تو موافق اور مخالفت دلائل کا ایک طومار لگ گیا ہے،

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اہل فلسفہ کی ساری موٹسگافیاں انسان کی کوئی واضح رہنمائی کرنے میں قطعاً ناکام رہی ہیں۔ بقول اکبر: ۷۶

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں

ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سر املتا نہیں

اس بحث میں اہل سائنس نے کچھ اور بھی نیکھے انداز سے شرکت کی۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے مادیت پرست سائنسدان اس دعوے کے ساتھ میدان میں اترے کہ خدا کا کوئی وجود نہیں۔ لاپ لیس نے نظام شمسی پر اپنی کتاب میں خدا کا نام تک نہ لیا اور جب نپولین نے اس سے تعجب سے پوچھا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ میں تمہاری کتاب میں خدا کا ذکر نہیں پاتا ہوں، تو اس نے شاہ فرانس سے کہا ”حضور والا ہمیں اس کی کوئی ضرورت نہیں“ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ لے کچھ اور بڑھتی گئی اور بالآخر انیسویں صدی میں یہ کہا جانے لگا کہ سائنس نے خدا کے تصور کو ختم کر دیا ہے اور کائنات کی ایک ایسی توجیہ کر دی ہے جس میں کسی مدبر اعلیٰ اور خالق کل کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ لیکن یہ ایک خام خیالی تھی اور حالات نے جلد ہی بتا دیا کہ انسان بہت سی آراء تمام کرنے میں بڑا جلد باز ہے۔

وجود باری تعالیٰ کے موضوع پر کسی بحث سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ خدا کا وجود حسی اور مادی نہیں ہے بلکہ مابعد الطبیعی ہے۔ عام طور پر کسی چیز کے وجود کو جاننے کے لئے ہمارے پاس جو ذرائع و مسائل ہیں وہ حواس ہیں۔ سائنس اپنا علم انہی حواس کے ذریعہ حاصل کرتی ہے لیکن حواس سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ محض مادی اور حسی دنیا تک محدود ہے، جو چیزیں ان سے ماوراء ہیں یعنی طبعی کی بجائے مابعد الطبیعی ہیں، ان کو جاننے کے لئے حواس ناکافی ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں حواس مجبور اور لاچار ہیں اور اس کے حقائق کو جاننے کے لئے حواس ہمارے معین و مددگار نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ کہ خدا کے معاملے میں اس طرح کے دلائل طلب کرنا جو حسی دنیا سے متعلق ہوں یا جو اس کے معیار کے مطابق ہوں ایک غیر عقلی اور غیر سائنٹیفک مطالبہ ہے۔

مادیت پرست سائنسدان جس غلطی کا شکار ہوئے وہ یہ تھی کہ انہوں نے خود سائنس کی حدود کو نہ سمجھا اور اس زعم میں مبتلا ہو گئے کہ سائنس زندگی کے ہر عقدہ کو حل کر سکتی ہے۔ جس طرح خشکی کی سواری پانی پر بے کار ہو جاتی ہے۔ اسی طرح طبعی دنیا کا مطالعہ کرنے والی سائنس مابعد الطبیعی حقائق کا ادراک نہیں کر سکتی۔ سائنس اپنے مخصوص دائرہ میں بڑی مفید خدمت انجام دے رہی ہے لیکن اس کے نام پر کسی ایسی دنیا کی بات پیش کرنا جو اس کے دائرہ سے باہر ہے اور جس کے متعلق وہ کوئی علم نہیں رکھتی، ایک غیر سائنٹیفک بات ہے۔ اور ایسے دعوے کی کوئی وقعت نہیں ہو سکتی

سائنس کی صورت یہ ہے کہ:

۱۔ اس کا دائرہ کار حسی اور طبیعی دنیا تک محدود ہے ۔ اس سے باہر کے بارے میں وہ خاموش ہے اور کچھ نہیں کہہ سکتی۔

۲۔ طبیعی دنیا میں بھی سائنس کا مطالعہ جزوی ہے کئی نہیں۔ وہ ایک خاص پہلو یا جزو کا مطالعہ کرتی ہے پوری حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتی۔

۳۔ اس کا طریق مطالعہ مشاہدہ اور تجربہ پر مبنی ہے اور ایک خاص طریق عمل کے ذریعہ اس کی حاصل شدہ معلومات سے قوانین، نظریات اور طبیعی نظام کے بارے میں تصورات قائم کئے جاتے ہیں۔ یہ ساری معلومات قطعی ہوتی ہیں، انہیں درجہ یقین حاصل نہیں ہوتا۔ ابتدائی درجہ میں مبتلا یقین کا عنصر سب سے زیادہ ہوتا ہے اور جوں جوں نظریات اور تعبیرات کا حصہ بڑھتا جاتا ہے ظن و تخمین کا عنصر بھی بڑھتا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر ایک دور کے سائنسی تصورات دوسرے دور کے سائنسی تصورات کی تکذیب کر دیتے ہیں اور سرسبز جیسے جیسے کے بقول سائنس کا دریا اُلٹے رخ پر بہنے لگتا ہے۔

۴۔ سائنس کے مختلف شعبوں کے حاصل کردہ نتائج ایک دوسرے سے متصادم بھی ہوتے ہیں اکثر ایسا ہوا ہے کہ فرکس اگر ایک سمت میں رہنمائی کرتی ہے تو بیا لوجی ایک دوسری سمت میں اور سائنکالوجی ایک تیسری سمت میں۔ اس لئے کسی ایک کو سائنس کہنا اور دوسرے کو نظر انداز کر دینا غیر حقیقت پسندانہ رویہ ہے۔

ان دہوہ کی بناء پر یہ کہنا کہ سائنس خدا کے وجود کی نفی کرتی ہے، ایک بے سرو پا اور غیر عقلی دعویٰ ہے۔ یہ سوال ہی سائنس کے دائرہ کار سے باہر ہے۔ وہ اس کے بارے میں بجز خاموشی کے اور کوئی موقف اختیار نہیں کر سکتی۔ فرانسیسی سائنس دان پرو فیسر لیتر نے سچ کہا ہے کہ:

”کائنات کے آغاز و انجام تک مشاہدے کی رسائی نہیں ہے۔ اس لئے ہمارا مقصد

یہ نہیں ہے کہ کسی ازلی یا ابدی وجود کا انکار کریں۔ اس طرح ہمارا کام یہ بھی

نہیں ہے کہ ہم اس کو ثابت کریں۔ ہمارا کام نفی و اثبات دونوں سے الگ ہے۔“

یہ تو ہے فطری صورت، لیکن اگر خود سائنسی فکر کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے

کہ بیسویں صدی میں پرانی سائنسی مادیت کے خلاف ایک شدید رد عمل رونما ہوا ہے اور سائنس

کا نیار حمان مذہب اور خدا کے وجود کے خلاف ہونے کے بجائے اسی سمت میں اشارہ کر رہا

ہے۔ عکس ریز کی دریافت سے سائنس میں جو نیا فلسفیانہ رجحان شروع ہوا ہے اور نظریہ اضافیت

اور نظریہ کوانٹم کے زیر سایہ جس نے پرورش پائی ہے، وہ سائنس کو مذہب کے حقائق

سے اُترے۔ بالآخر بولے ان سے قریب تر لے آیا ہے۔ عام فضا کی یہ تہریلی بڑی فکر انگیز ہے۔ ڈاکٹر کی کاسٹے ڈولوائے نے تو اپنی کتاب ”تقدیر انسانیت“ اس دعوے کے ساتھ پیش کی ہے کہ :

” اگر سائنس کے جمع شدہ سرمایہ کا تنقیدی مطالعہ کریں اور اس سے منطقی اور عقلی نتائج مستنبط کریں تو یہ نتائج لازمی طور پر ہمیں خدا تک لے آتے ہیں۔“

پروفیسر سولپلے نے جوئی کے سائنسدانوں کے افکار کا جو کچھ پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ :
 ” ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نئی دریافتیں سائنس میں مذہبی نقطہ نظر بھی اتنی ہی حجت و صداقت کا حامل ہیں جتنی سائنسی نقطہ نظر بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس نئی سائنسی دنیا کے سبب سے بڑے خلاق (یعنی البرٹ آئن سٹائن) کی نظریں تو مذہبی فکر ہی سائنسی نقطہ نظر کا ماخذ اور رہبر ہیں۔“
 اور پروفیسر جوڈی بیان تک کہہ گیا ہے کہ :

” سترہویں صدی اور سترہویں صدی کے کتب میں بتائی ہیں کہ بیسویں صدی کی فزکس نے طبیعی دنیا کے بارے میں انیسویں صدی کے تصورات میں انقلاب برپا کر دیا ہے اور یہ انقلاب مذہب سے مصالحت اور دوستداری کی سمت میں ہے۔ آج سائنس اور مذہب کائنات کی حقیقت کے بارے میں ایک ہی طرح کی بات کہہ رہے ہیں۔ گو اپنے نتائج تک پہنچنے کے لئے دونوں کے طریقے تحقیق و مطالعہ جدا ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج سائنس نے خدا کے تصور کا اثبات کر دیا ہے۔“

جدید سائنسی فکر کے یہ رجحانات صحت مند ہیں اور ہوا کے نئے رخ کا پتہ دیتے ہیں۔ جہاں تک خالص سائنسی نقطہ نظر کا سوال ہے وہ اپنی مجبوریوں کی وجہ سے حقائق کی اس دنیا کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا جس کا تعلق مابعد الطبیعیات سے ہے۔ کیوں کہ خدا کے وجود کا ادراک حواس کے ذریعہ سے نہیں کیا جاسکتا لیکن اس کے باوجود عقل سلیم کی رہنمائی کے لئے انفس و آفاق میں بے شمار شواہد موجود ہیں اور خود سائنس کی فراہم کردہ معلومات میں لاتعداد نشانیاں موجود ہیں جو ایک مدبر اور صاحب امر ہستی کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو دیکھنے والی آنکھ اور سوچنے والا دماغ رکھتا ہو اس کائنات کے حقائق کو دیکھ

ملاحظہ فرمائیے کہ انیسار دی آبزور (THE OBSERVER) مورخہ ۱۳ اپریل ۱۹۳۰ء -

۱۴۰ - اللہ ملاحظہ ہو جوڈی کی کتاب GOD AND EVIL صفحہ ۱۴۰ -

کر بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ یہ کارخانہ رنگ و بویکے نظم اور دانا خالق اور فرمانروا کے بغیر نہ وجود میں آسکتا تھا اور نہ قائم رہ سکتا ہے۔ زمین سے لے کر آسمان تک ساری کائنات ایک مکمل نظام ہے اور پورا نظام ایک زیر دست قانون کے تحت چل رہا ہے جس میں ہر طرف ایک ہم گیر اقتدار، ایک بے عیب حکمت، ایک بے خطا علم کے آثار نظر آتے ہیں۔ یہ آثار اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ نظام کا ایک فرمانروا ہے نظم کا تصور ایک ناظم کے بغیر قانون کا تصور ایک حکمران کے بغیر حکمت کا تصور ایک حکیم کے بغیر، علم کا تصور ایک عالم کے بغیر اور سب سے بڑھ کر خلق کا تصور خالق کے بغیر آخر کس طرح آسکتا ہے۔ یہ کائنات ایک منصوبہ کے تحت کام کر رہی ہے۔ کیا یہ منصوبہ ایک منصوبہ کار کے بغیر ہی جاری و ساری ہو گیا ہے؟ اس کائنات میں کمال درجہ کا حسن و توازن ہے۔ یہ حسن و توازن کے ایک مستطعم کے بغیر کیسے ممکن ہے؟ اس میں ایک ہمہ گیر اخلاقی قانون کا فرمان ہے جو خیر کے قائم رکھنا اور شر کو ختم کرنا ہے۔ یہ اخلاق انتخاب ایک صاحب ارادہ ہستی کے بغیر کیسے ممکن ہے؟ یہ کائنات ایک مسلسل، مربوط اور معنی خیز ناول کی مانند ہے۔ کیا اس ناول کا کوئی مصنف نہیں؟ مسٹر آر تھر کی تھ نے سچ کہا ہے:

”انسانی دماغ ان عظیم سوالات کو حل کرنے کے لئے ایک حقیقت سرا آگ ہے۔ ہمیں اس کی مجبوریوں کا اعتراف کر لینا چاہیئے لیکن پھر بھی یہ ہمہ وقت اس امر کا ادراک کر رہا ہے کہ کائنات کی ہر چیز کس قدر منظم اور مربوط ہے اور فطرت کی نئی نئی ایجادات کیسی حیران کن ہیں۔ ہر سمت میں ایک مقصد کا فرمان ہے۔ خواہ ہم عامی ہوں یا سائنسدان، ہمیں کائنات کے لئے ایک حاکم اعلیٰ کو ماننا پڑے گا۔ جو نام چاہے اس کو دے دو اور جو شکل چاہے اس کی تجویز کر دو مگر اس کو ماننے سے مفر نہیں ہے۔“

اسی طرح اگر ہم اس کائنات کے آغاز پر غور کریں تو ہمیں محسوس ہوگا کہ اس کے لئے کسی خالق کی موجودگی ضروری ہے۔ علت و معلول کا سلسلہ جہاں تک بھی چلا جائے، ایک نقطہ آغاز یقیناً ماننا پڑے گا۔ اس سلسلے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں۔ ایک وہ جو خدا کو نہ ماننے والے کہتے ہیں یعنی یہ کہ آغاز مادے سے ہوا، دوسرا وہ جو خدا کے ماننے والے کہتے ہیں۔ یعنی یہ کہ آغاز ایک ذی شعور اور صاحب ارادہ ہستی سے ہوا۔ ان دونوں کے دلائل کا جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں مفروضے میں، کوئی تجرباتی یا مشاہداتی دلیل کسی ایک کے حق میں نہیں پیش کی جاتی۔ البتہ جو بات خدا کے وجود کے حق میں کہی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ انسان ذی شعور ہستی ہے اور

مادہ شعور سے محروم ہے۔ سوال یہ ہے کہ شعور سے ایک محروم چیز یعنی مادہ۔ ایک صاحب شعور کو کیسے جنم دے سکتا ہے؟ اس لئے کہ شعور مجرد مادے سے بہت بلند ہے۔ لیکن اگر خدا کو، جو خود صاحب شعور ہے تسلیم کر لیا جائے تو یہ مشکل رفع ہو جائے۔ اسی طرح مادہ کو نقطہ آغاز مان کر تمام کائنات کے تمام حقائق کی توجیہ نہیں کی جاسکتی لیکن ایک باختیار و صاحب ارادہ ہستی کو مبدا ماننے کے بعد کوئی الجھن باقی نہیں رہتی اور تمام مسائل آپ سے آپ حل ہو جاتے ہیں۔

حیاتیات کا مطالعہ کرنے والے کو اس مضمون کی بے شمار مثالوں سے سابقہ پڑتا ہے جہاں محسوس ہوتا ہے کہ سب کچھ اندھے اتفاقات سے نہیں بلکہ سوچے سمجھے منصوبے کے پیش نظر ہوا ہے۔ نظریہ ارتقاء ابتداً دو سائنس دانوں نے پیش کیا تھا۔ ایک چارلس ڈارون اور دوسرا الفرڈ رسل ولاس۔ لیکن بعد میں الفرڈ رسل ولاس نے اپنی کتاب شائع نہ کی اور نظریہ ارتقاء کا سہرا ڈارون کے سر بندھا، لیکن ڈارون کے نظریات کے برعکس ولاس کا کہنا تھا کہ محض فطری قوتوں کے ذریعے انسانی وجود کی تشریح نہیں کی جاسکتی۔ اس کا خیال یہ تھا کہ ”حیاتیاتی دنیا میں کم از کم تین ایسے مقامات آتے ہیں جہاں کسی نئی قوت یا علت کی مداخلت لازمی ہوتی ہے۔ ایک وہ وقت جب کہ پہلے جان دار خلیے کی تشکیل ہوئی، دوسرا وہ مقام جہاں سے حیواناتی اور نباتاتی زندگی جدا ہوئی، اور تیسرا وہ وقت جب انسان عالم وجود میں آیا“ یہ بات کہنے سے ولاس کا مقصد بھی یہی ہے کہ کم از کم تین ایسے نمایاں مقامات آتے ہیں جہاں بات کو اتفاقات کا سہارا لے کر نہیں ٹالا جاسکتا اور کسی بلند تر قوت کے وجود کو ماننا پڑتا ہے۔

ارتقاء کے کائنات کے مسئلہ پر جتنا غور کیا جائے ایک خالق اور رب کی ضرورت کا احساس اتنا ہی شدید ہوتا جاتا ہے۔ نظریہ ارتقاء سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات میں زندگی کے ظہور سے قبل بے شمار غیر معمولی اور ہمہ گیر تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ زمین نے ایک خاص ہیئت اختیار کی، ہوا اور پانی کی ایک مخصوص شکل قائم ہوئی۔ موسم کا نظام اور پھر پھر زندگی کے قیام اور بقا کے لئے سازگار ہوئے۔ ان گنت تبدیلیوں کے بعد یہ زمین انسان کا مستقر بننے کے لئے تیار ہوئی اور پھر زندگی کا ظہور ہوا۔ سوال یہ ہے کہ اتنی منظم، مرتب اور منضبط تبدیلیاں آپ سے آپ کیسے واقع ہو سکتی ہیں؟ ہر چیز ایک دوسرے سے پیوست ہو اور تمام تبدیلیوں کے تعاون و توافقی سے زندگی کے آئندہ مراحل طے ہونے کے لائق بنیں۔ کیا ایک ہمہ گیر حکمت کے بغیر یہ سب متناسب تبدیلیاں واقع ہو سکتی ہیں؟ کیا عقل اسے ماننے کے لئے تیار ہے کہ یہ سب محض ایک حادثہ اور اتفاق کی بناء پر ہو گیا۔ اگر اس کا نام ”حادثہ“ اور ”اتفاق“ ہے تو پھر لغت میں ان الفاظ کے معنی تبدیل کرنے پڑیں گے۔ کیا کبھی ایسا ”اتفاق“ بھی واقع ہوا ہے کہ حروف کو ایک ڈبے میں ڈال کر بلایا گیا ہو تو ان

سے ایک مربوط عبارت بن گئی ہو؟ کیا کبھی ایسا "حادثہ" بھی پیش آیا ہے کہ غالب یا اقبال کے کسی شعر کے الفاظ الٹ پلٹ کر کسی جاہل کو دیئے گئے ہوں اور وہ الفاظ آگے پیچھے رکھ کر ترتیب دے اور غالب یا اقبال کا شعر نکل آئے، حالانکہ حروف الفاظ، جملے سب وہی ہوں؟ اگر اس طرح ایک شعر نہیں بن سکتا تو یہ پوری کائنات اور جو کچھ اس میں ہے کس طرح بن سکتے ہیں؟ بے شک:

صَنَعَ اللَّهُ الَّذِي اتَّقَنَ كُلَّ شَيْءٍ (النمل - ۸۸)

خدا نے ہر چیز کو پیدا کیا، پھر اس کا ایک اندازہ محسوس کیا۔ (نظام پر) بنایا۔

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدْ دَعَا تَقْدِيرًا (قرآن حکیم)

خدا نے ہر چیز کو پیدا کیا، پھر اس کا ایک اندازہ محسوس کیا۔

حیات و کائنات کی ان چند مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سائنسی تجربات اور عقل سلیم دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ ہم اس دنیا کو محض اتفاقات کا نتیجہ قرار نہیں دے سکتے۔ اس کی ہر شے زبان حال سے پکار رہی ہے کہ کسی صاحب حکمت اور ذی اختیار ہستی نے اسے وجود بخشا ہے۔ وہی اس کی خالق ہے اور وہی اس کی حاکم اور فرمانروا ہے۔

۳۔ وجود باری تعالیٰ پر قرآن کا استدلال

وحی محمدی کا سب سے پہلا دعویٰ یہ ہے کہ اس ایک قادر مطلق خالق عالم اور

صانع کائنات ہستی کا اعتراف انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ تمدن سے تمدن اور وحشی سے وحشی قوم میں بھی اس اعتراف کا سراغ ملتا ہے۔ آثار قدیمہ کی تحقیقات نے سینکڑوں مردہ اور گنہگار قوموں کی تاریخ کا سراغ لگایا، جس میں سامان تمدن، اعلیٰ خیالات اور علوم کی لاکھ کی محسوس ہوتی ہو، مگر مذہبی عقیدت اور کسی خدا کے اعتراف کی کمی بالکل نظر نہیں آتی۔ ان کی عمارتوں کے منہدم کھنڈروں میں جو چیز سب سے پہلے ملتی ہے وہ کسی معبد کی چہار دیواری ہوتی ہے۔ آج بھی دنیا کے مختلف گوشوں میں جو بالکل وحشی قومیں ملتی ہیں وہ بھی کسی نہ کسی شکل میں عالم کے خالق اور کائنات کے صانع کے تخیل سے بہرہ ور ہیں۔ غرض، جماعت انسانی کا کوئی حصہ زمین کا کوئی گوشہ، زمانہ کا کوئی عہد اس تخیل سے خالی نہیں ملتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اعتراف بھی انسان کے فطری تصورات اور وجدانی جذبات میں داخل ہے، اس لئے وحی محمدی نے اس کو فطرت سے تعبیر کیا ہے:-

اپنا منہ سب طرف سے پھیر کر دین کی طرف کر، یہ خدا کی وہ فطرت ہے، جس پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا خدا کی خلقت میں تبدیلی نہیں

فَاقِم وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ

الْقِيمَةُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۳۰﴾
 (روم - ۳۰)

یہی سیدھا اور ٹھیک دین ہے، لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

كل مولود يولد على الفطرة - | ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔

اسی لئے خدا کا اعتراف روز ازل کا وہ عہد و پیمان ہے جو خالق و مخلوق کے درمیان ہوا تھا۔ اور یہ اسی عہد و پیمان کا احساس ہے جو انسان کی رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے کہ ہزار انکار کے بعد بھی کسی نہ کسی رنگ میں وہ اعتراف نمایاں ہو جاتا ہے۔ انسان کا یہ جذبہ فطرت کبھی کبھی خارجی اثرات سے دب جاتا ہے۔ وحی محمدی نے بار بار انسان کے اسی دبے ہوئے جذبہ کو ابھارا ہے اور اسی زیر خاکستر آگ کو ہوا دی ہے اور انسان کو اس کا بھولا ہوا وعدہ یاد دلایا ہے۔ وہ انسانوں سے پوچھتی ہے:-

أَفِي اللَّهِ شَكٌّ فَأُطِرَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ | کیا آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے خدا میں شک ہے؟
 (ابراہیم - ۱۰)

کیا وہ آپ ہی آپ بن گئے یا وہی اپنے خالق ہیں یا انہوں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے (یہ کوئی بات نہیں) بلکہ ان کو یقین نہیں ہے۔

ایک اور مقام پر اس نے کہا:
 أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ عَزَّ أَمَهُمْ
 أَلْخَالِقُونَ ۚ أَمْ خُلِقُوا السَّمَوَاتِ
 وَالْأَرْضِ ۚ بَلْ لَا يُوقِنُونَ ۚ
 (طور - ۳۵-۳۶)

دنیا اور کائنات جس میں انسان بھی شامل ہے، اور جو اپنی عقل اور فہم کی بنا پر سب سے بالاتر ہے، بہر حال موجود ہے، اور اس کے اس وجود میں کوئی شک بھی نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کسی کے بن بنائے وہ آپ سے آپ بن گئی ہے، یا خود اس نے اپنے آپ کو بنا لیا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ دونوں صورتیں باطل ہیں۔ نہ آپ سے آپ کوئی چیز بن سکتی ہے اور نہ کوئی مفعول آپ فاعل آپ ہو سکتا ہے، اگر کوئی بے وقوف یہ کہے کہ نرو مادہ مل کر اپنا بچہ پیدا کرتے ہیں تو اس سے پوچھا جائے گا کہ سلسلہ توالد و تناسل کا آغاز کیوں کر ہوا اور اولین نرو مادہ کا اور مادہ تخلیق و روح کا خالق کون ہے؟

یہ گونا گوں عالم، یہ رنگارنگ کائنات، یہ تاروں بھرا آسمان، یہ یو قلموں زمین، یہ سورج، یہ چاند، یہ درخت، یہ سمندر، یہ پہاڑ، لاکھوں جاندار اور بے جان اشیاء، یہ علل و اسباب کا تسلسل، یہ تغیر و انقلاب کا نظام، یہ کائنات کا نظم، اور اس کے ذرہ

ذرہ کا قاعدہ و قانون، انسان کے اندرونی قویٰ اور ان کی باہمی ترتیب، موت و حیات کے اسرار، خواص و قویٰ کے رموز و انسان کی خیالی بلند پروازی، اور عملی عجز و در ماندگی، یہ تمام باتیں ایک خالق و صانع کے اعتراف پر مجبور کرتی ہیں۔ یہ نیلگوں آسمان کی چھت، یہ زمین کا سبزہ زار فرش، اور ایک ہی حرکت سے شب و روز کا انقلاب ایک خالق کل کا پتہ دیتا ہے۔

انَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ
وَإِخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي
الْأَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾ (آل عمران - ۱۹۰)

یہ شب و روز کا نور و ظلمت، یہ سورج اور یہ چاند کی روشنی، ان کی مقررہ رفتار، اور باقاعدہ طلوع و غروب اس کی دلیل ہے کہ اس اہل ایمان پر کوئی سوار ہے جس کے ہاتھ میل س کا سیاہ و سپید ہے۔

وَمِنْ آيَاتِهِ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ
وَالْقَمَرُ ﴿۱۹۱﴾ (فصلت - ۱۹۱)

آسمان و زمین کی عجیب و غریب خلقت کے ساتھ خود انسان کی پیدائش کی حکایت کتنی عجیب ہے:- بیشک آسمانوں اور زمین میں ایمان والوں کے لئے نشانیاں ہیں اور خود تمہارے اور ان حیوانات کے پیدا کرنے میں جبکہ زمین میں پھیلا رکھا ہے، یقین کرنے والوں کے لئے دلیلیں ہیں۔

إِنَّ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ
لِّلْمُؤْمِنِينَ ۝ وَفِي خَلْقِكُمْ وَمَا يَبْتِثُّ
مِنْ دَابَّةٍ آيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ ۝
(الجماعہ - ۳-۴)

سورہ انعام میں نباتات اور ان کی نیرنگیوں کو اپنی ہستی کی دلیل میں پیش کیا۔ یہ کتنے اچھے کی بات ہے کہ ایک ہی زمین نہ ہے جس میں سے وہ اُگتے ہیں، ایک ہی پانی ہے جس سے وہ سنبھے جاتے ہیں، ایک ہی ہوا ہے جس میں وہ سانس لیتے ہیں، مگر کتنے رنگ برنگ کے پھل پھول، میوے اور درخت لگتے ہیں، جن میں سے ہر ایک کا رنگ، ہر ایک کا مزہ، ہر ایک کی تہ، ہر ایک کا قد و قامت، ہر ایک کے خواص اور فائدے، دوسرے سے بالکل الگ ہوتے ہیں۔

سورہ روم میں پہلے مٹی سے انسان کی پیدائش کو، پھر اس میں عورت مرد کے جوڑے ہونے کو، اور ان کے درمیان ہر و محبت کے جذبات کے ظہور کو اپنی ہستی کی دلیل بتایا ہے۔ پھر اپنی قدرت کے دوسرے عجائبات کو، جو آسمان سے زمین تک پھیلے ہیں، ایک ایک کر کے پیش کیا ہے، اول تو خود انسانوں کی پیدائش، پھر ان میں عورت مرد ہونا اور ان کے درمیان جذبات کی لہر، پھر مختلف قوموں کی بولیوں، شکلوں اور رنگوں کو دیکھو کہ ایک ایک سے الگ ہے پھر انسانوں

کے اندر کے اعمال کو دیکھو، ایک نیند ہی کی حقیقت پر غور کرو، یہی تمہاری آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہے۔

سورہ لقمان میں آسمانوں کے، بلا کسی نظر نہ آنے والے سہارے کے، کھڑے ہونے اور زمین کے اپنی جگہ پر ٹھہرے ہونے کا ذکر ہے، یہ نظر نہ آنے والا سہارا، قوت کشش ہی سہی، لیکن وہ بھی تو اسی کے اسرار میں سے ہے۔ اس کے بعد ایک جامد اور بے حیات مردہ زمین کے اندر سے پانی برسنے کے ساتھ انواع و اقسام کی زندگی کے نمونوں کا ابھر آنا کتنا حیرت انگیز ہے۔ یہ بھی اسی کا کرشمہ ہے۔

سورہ سجدہ میں انسان کی پیدائش کا مٹی سے آغاز، پھر قطرہ آب (نطفہ) کے ذریعہ توالد و تناسل، پھر اس کے سڈول جسم کا بن جانا، پھر اس مٹی کے مردہ قالب میں دفن کیا گیا، اور اس میں روح بھیک جانا اور اس علم و حواس کے حیرت انگیز آلات کا پیدا ہو جانا ان سب کو اپنی صفت میں پیش کیا ہے۔

مردہ زمین کے اندر کیا کیا قوتیں ودیعت ہیں، اور خود انسانوں کے جسم و جان میں عجائبات کا کتنا خزانہ رکھا ہے، لیکن کوئی صاحب نظر نہیں دیکھتا۔ انسان کی زندگی، اس کے اندر و بیرونی جذبات، حواس، ذہنی قوی اور دماغی حرکات، ان میں سے ہر شے عمدہ ہے۔

<p>۱۱ اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لئے نشانیوں ہیں، اور خود تمہاری جانوں کے اندر کیا تم نظر نہیں کرتے؟</p>	<p>وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ ۝ وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ۝</p>
---	---

(ذاریات - ۲۰ - ۲۱)

جانوروں کے جسموں کے اندر جو عجیب و غریب نظام ہے۔ وہ بھی غور کے قابل ہے۔ ایک ہی گھاس بھوس کی غذا ان کے پیٹ میں جاتی ہے، پھر اسی کا کچھ حصہ لید اور گوبر، کچھ خون اور کچھ دودھ بن جاتا ہے۔ اور اسی لید اور گوبر کے باہر آنے کے راستوں اور سرخ خون کی رگوں کے درمیان سے خالص سپید شیریں دودھ کی دھاروں کا نکلنا کتنا عجیب ہے۔

ایک ہی قسم کے پھل ہیں۔ اگر ان کو ایک طرح سے کھاؤ تو تمہاری عقل اور قوت کو بڑھاتے ہیں، اور دوسری طرح کھاؤ (یعنی منشیات بنا کر استعمال کرو) تو اس کو ضائع کر دیتے ہیں۔

زمین اور زمین پر کی مخلوقات کو چھوڑ کر آسمان کی طرف نظر اٹھاؤ، سورج کا روشن چراغ اور چاند کی خوشنما قندیل کتنی عجیب ہے، پھر سورج کو دیکھو کہ سال کے بارہ مہینوں میں آسمان کے بارہ برج طے کر کے کس طرح زمین میں مختلف موسموں اور زمانوں کو نمایاں کرتا ہے۔

ان ہی چند چیزوں تک اس کی قدرت کے عجائبات محدود نہیں، بلکہ ہر شے اپنی خلقت،

اپنی حکمرانوں اور اپنے قانون فطرت سے اس کی گواہی دیتی ہے:-
 صُنِعَ اللّٰهُ الَّذِیْ اَلْفَنَ كُلَّ شَیْءٍ ۝
 (انمل - ۸۸)
 اس کی صنعت ہر قسم کے عیب سے پاک ہے۔ اس میں مستحکم نظم و نسق کی بندش نظر آتی ہے۔
 (نظام پر) بنایا۔

مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفْوُتٍ فَاَرْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ۝
 (الملک - ۳)
 تجھے مہر والے خدا کی بناوٹ میں کوئی بے برابری نظر آتی ہے؟ پھر نگاہ کر کیا کوئی فطور دکھائی پڑتا ہے پھر دہرا کر دوبارہ نظر کر تیری نگاہ بھٹک کر تجھ تک پلٹ آئے گی (مگر کوئی نقص نہ پایا سکے گی)

اس قسم کی اور سیکنٹروں آئیں ہیں جن کا ذکر بھی مشکل ہے ان آیتوں میں تین قسم کے دلائل ہیں:-

۱۔ قدرت کے عجائبات اور نیزنگیاں اور پھر ان کا ایک قانون کے ماتحت ہونا۔

۲۔ عالم کا نظم و نسق اور اس کا مرتب سلسلہ۔

۳۔ کائنات اور سلسلہ عالم کی ہرگز میں بے انتہا مصلحتوں، حکمتوں اور فائدوں کا ہونا۔

ان مقدمات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کائنات اور اس کے یہ عجائبات اور اس کے یہ منظم علل و اسباب، خود بخود بخت و اتفاق سے نہیں بن گئے، بلکہ کسی حکیم و دانا اور قادر مطلق صانع نے اپنی قدرت اور ارادہ سے ان کو بنایا ہے۔

۴۔ توحید کے دلائل | اس سے پہلے ہم دیکھ چکے ہیں کہ عقل و وجدان اس بات پر متفق ہیں کہ اس کائنات کی تخلیق کے لئے کسی ذی شعور اور صاحب اختیار ہستی کی ضرورت ہے۔ اب ہم یہ دیکھیں گے کہ عقل کی رو سے اس کائنات کا وجود و بقا محض ایک ہستی کا رہن منت ہے عقلی طور پر ایک سے زیادہ خالق و مالک مستیوں کا وجود ممکن نہیں ہے۔

اس سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہر اجتماعی نظم اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ حاکمیت غیر منقسم ہو۔ ہم اپنی اجتماعی زندگی میں کسی سیاسی تنظیم کا تصور اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک حاکمیت کو کسی ایک خاص مرکز میں مرکوز نہ کریں۔ تمام سیاسی تنظیمات میں جمہوریت وہ نظام ہے جس نے حاکمیت کو ایک وسیع دائرے میں پھیلانے کی کوشش کی ہے، تاہم اس میں بھی ایک نقطہ لازماً تسلیم کرنا پڑتا ہے جہاں اس کی پھیلی ہوئی حاکمیت سمٹتی اور مجتمع ہوتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کا نراج کے طوفان میں منتشر ہو جانا لازمی ہے۔ بہر حال یہ امر بالکل قطعی ہے کہ حاکمیت کی تقسیم کے ساتھ کسی اجتماعی تنظیم کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اب ذرا سوچئے کہ یہ دنیا اتنے بے شمار اجزاء پر مشتمل ہونے کے باوجود نہ صرف قائم ہے بلکہ پورے استحکام کے ساتھ قائم

اس میں مختلف قوتوں کا تصادم بھی ہے، اسناد کی آویزشیں بھی ہیں، خیر و شر کے معرکے بھی ہیں، لیکن دنیا کی کشتی ہے کہ ان موجوں کے تلاطم کے اندر سنے بجتی سنبھلتی اور کتراتی ہوئی چلی جا رہی ہے۔ ان اسناد کے باوجود دنیا کی بقا محض اس بنا پر ہے کہ اس دنیا میں کئی حکمران نہیں بلکہ صرف ایک حکمران ہے، جس کا اختیار سب سے بالاتر ہے اور وہ ان سب کو سنبھالے ہوئے ہے۔

ایک اور اہم پہلو اس کائنات کے مختلف اجزاء کا باہمی توافقی اور ان کی باہمی سازگاری ہے، اسی طرح کی موافقت اور سازگاری جیسی کہ زمین میں نظر آتی ہے عورت اور مرد اپنی خصوصیات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن اس کے باوجود اگر عورت نہ ہو تو مرد کی قابلیتوں اور قوتوں کا بڑا حصہ بالکل بے معنی ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر مرد کو معدوم فرض کر لیا جائے تو عورت کی خصوصیات و صفات کی سرے سے توجیہ ہی ناممکن ہو جائے گی۔ ٹھیک یہی حال اس کائنات کے تمام اجزائے مختلفہ کا ہے۔ زمین و آسمان شب و روز، گرمی و سردی، نور و ظلمت، حرارت و برودت سب زمین کا سا اختلاف اور سب انہی کا سا شدید اتصال رکھتے ہیں۔

توافق کا یہ پہلو صرف صدیقین ہی میں نہیں۔ بلکہ اس کائنات کے نظام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ایک ہمہ گیر توافق اور سازگاری ہے، ہر چیز اپنی ہستی کی بقا اور اپنے وجود کی نشوونما کے لئے اس بات کی محتاج ہے کہ یہ پورا کارخانہ اس کے لئے سرگرم کار رہے۔ گیہوں کا ایک پودا وجود میں آکر اس وقت تک اپنے کمال کو نہیں پہنچ سکتا جب تک اس کائنات کے تمام عناصر اس کی پرورش و نگہداشت میں اپنا اپنا حصہ پورا نہ کریں، زمین اس کے لئے گہوارہ مہیا کرے۔ ابر اس کے لئے رطوبت فراہم کرے، سورج اس کو گرم رکھے، شبنم اس کو ٹھنڈک پہنچائے، ہوائیں اس کو لولیاں دیں اور جب یہ سب کچھ ایک نظم و ضبط کے ساتھ مکمل ہوئے۔ تب گیہوں کا ایک دانہ کھیت سے خرمن تک پہنچتا ہے۔ یہی حال دنیا کی ایک ایک چیز کا ہے۔

جو انسان اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ زمین و آسمان اس توافق و ہم آہنگی کے ساتھ اس کی خدمت میں سرگرم ہیں، زمین اس کے لئے بستر کی طرح کھچی ہوئی ہے اور آسمان شامیانہ بن کر اس پر تنا بٹوا ہے، پھر آسمان سے پانی برستا ہے اور زمین اس سے اپنے پھل پیدا کرتی ہے۔ اور وہ پھل انسان کے لئے لذت اور بقائے زندگی کا ذیائے بنتے ہیں۔ وہ انسان یہ کیسے تصور کر سکتا ہے کہ آسمان کے دیوتا الگ ہیں اور زمین کے دیوتا الگ ہیں، بارش کوئی لاتا ہے اور پھل کوئی پیدا کرتا ہے؟ ان اسناد اور عناصر مختلفہ کی یہ سازگاری تو اسی وقت ممکن ہے جب ان سب کو ایک ہی کارفرما اور مدبر، قوت، حکمت و رحمت کے ساتھ ایک خاص مقصد کے لئے تصرف میں لائے۔

قرآن اس عالم کی ہمہ گیر آہنگی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ بادلوں سے پانی برستا ہے، اس سے زمین بلبلا اُٹھتی ہے۔ اس کی نباتات کو چوپائے چرتے ہیں۔ اس سے ان کے اندر دودھ بنتا ہے۔ پھر آلائشوں اور خون کے اندر سے سفید دودھ کی دھاریں نکلتی ہیں اور یہ دودھ پینے والوں کے لئے نہایت لذیذ اور قوت بخش غذا کا کام دیتا ہے۔ پھر اس بارش کے پرورش کئے ہوئے انگور اور کھجور کے پھلوں سے انسان اپنی لذت اور ضرورت کی طرح طرح کی چیزیں پیدا کر لیتا ہے۔ پھر شہد کی مکھیاں ہیں جو پہاڑوں کی بلندیوں پر درختوں پر، انگور کی ٹٹیوں میں اپنے چھتے بنا لیتی ہیں، جس کے رنگ بھی مختلف اور مزے بھی مختلف۔ انسان اس کو بیتا ہے، اس سے لذت بھی حاصل کرتا ہے اور بیماریوں میں شفا بھی۔ ان مناظر کو جو بھی دیدہٴ عبرت سے دیکھے گا کس طرح باور کر سکتا ہے کہ یہ دنیا اور اس کے یہ تمام حیرت انگیز مناظر بالکل ایک اتفاقی حادثہ کے طور پر ظہور میں آگئے ہیں یا یہ کہ یہ آسمان وزمین اور ان کے مختلف طبقے مختلف دیوتاؤں کی کار فرمائیوں کے کرشمے ہیں؟ جو دنیا اتنے بعید اجزا کی کشاکشوں کے اندر بھی توافقی و سازگاری کے اتنے پہلو رکھتی ہے وہ نہ تو اتفاقی حادثہ ہو سکتی ہے اور نہ مختلف ارادوں کی رزم گاہ ہو سکتی ہے۔ ظاہر میں نگاہیں صرف موجوں کے تلاطم کو دیکھتی ہیں، موجوں کے اندر کے صدف اور صدف کے اندر پرورش پانے والے گوہر تک ان کی رسائی نہیں ہوتی۔ اور یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن مجید بار بار توجہ دلاتا ہے کہ اس کائنات کے صرف اضداد کو نہ دیکھو بلکہ ان مصالح نتائج کو دیکھو جو ان اضداد کی کشاکش کے اندر پیدا ہو رہے ہیں، اور اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ ایک ہی حکم کا ہاتھ اس کائنات پر متصرف ہے۔

کھاری پانی کے ایک سمندر اور شیریں پانی کے ایک دریا میں کتنا کھلا ہوا تضاد ہے تاہم دیکھو، یہ دونوں کس طرح ایک مشترک مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ کس طرح ان دونوں سے انسان اپنے لئے غذا کا ذخیرہ حاصل کر لیتا ہے۔ کس طرح یہ جہاز رانی اور تجارت کے نہایت آسان ذرائع فراہم کرتے ہیں۔

پھر شب کی ظلمت اور دن کے نور پر غور کرو، دونوں اپنی صفات و خصوصیات میں کس قدر ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئے ہیں لیکن ایک دوسرے کی ضد ہونے کے باوجود، پوری ہم آہنگی اور سازگاری کے ساتھ ایک دایہ کی طرح اس کائنات کی پرورش اور اس کے اندر بسنے والے حیوانوں، انسانوں اور نباتات کی خدمت میں سرگرم ہیں۔ سورج دن میں طلوع ہوتا ہے اور گرمی اور دھوپ کا سرچشمہ ہے۔ چاند شب میں نمودار ہوتا ہے اور روشنی اور خشکی کا منبع ہے، بظاہر دونوں ایک دوسرے سے کس قدر مختلف ہیں لیکن دیکھتے ہو کہ اس دنیا کا ایک ایک

وجود ان سے متمتع ہو رہا ہے اور یہ انسان کو بالواسطہ اور بلاواسطہ فیضِ رسانی پر مامور ہیں کیا یہ سب کچھ اتفاقی ہے؟ کیا یہ نظم، یہ ہنایہ کی پابندی، یہ سازگاری، یہ فیضِ رسانی سب کچھ آپ سے آپ ہو رہی ہے؟ ان مشاہدات کے باوجود جو لوگ دنیا کے اتفاقی حدوث پر اصرار کرتے ہیں ان کا یہ اصرار محض "نہ ماننے کی خواہش" پر مبنی ہے۔ علم و تحقیق سے اس ذہنیت کو کچھ سروکار نہیں ہے۔

پھر جو چیز ہماری نظر کو متوجہ کرتی ہے وہ اس کائنات کا حسن و جمال ہے جو اس کے ہر گوشہ میں جلوہ آ رہا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس دنیا کی کوئی چیز بھی سادہ بے رنگ نہیں ہے۔ آسمان سے لے کر زمین تک کوئی ایسا چہ نہیں ہے جہاں سے انسان غافل اور بے پروا گزر سکے، ہر جگہ اس کے دل کو کھینچنے، اس کی آنکھوں کو بیدار کرنے اور اس کے کانوں کے کھولنے کے لئے دل فریب ساز، بے حجاب جلوے، اور شیریں نغمے موجود ہیں اور ساتھ ہی انسان کے اندر حسن کا نہایت گہرا احساس ودیعت کر دیا گیا ہے۔ اس وجہ سے جب وہ اپنے ارد گرد حسن و جمال کے یہ بوقلموں جلوے دیکھتا ہے تو دفعتاً اس کے اندر ان کے صانع کے متعلق سوال پیدا ہو جاتا ہے، کیوں کہ وہ یہ تصور کرنے سے بالکل قاصر ہے کہ اتنی دلنریبیوں سے یہ معور دنیا خود بخود وجود میں آگئی اگر اس کے دل و دماغ پر پردہ نہ پڑا ہو تو وہ بے اختیار پکار اٹھتا ہے۔

قَتَبَلَرَاكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ | بڑا ہی خیر و برکت والا ہے جو تمام صنائع سے بڑھ کر ہے۔ (المومنون - ۱۳)

یعنی صرف اس بات کا احساس نہیں ہوتا ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے بلکہ اس کے آگے بڑھ کر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ وہ خالق بہترین خالق ہے۔ یکسر خیر و برکت ہے، اس نے جو چیز بنائی ہے وہ کمال قدرت، کمال صنعت، اور کمال خیر و برکت کا کامل نمونہ ہے:

الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ (السجۃ) | جس نے جو چیز بنائی خوب بنائی۔

ظاہر ہے کہ دنیا اپنی بقا کے لئے ان تمام رنگا رنگ حسن آرائیوں کی محتاج نہ تھی۔ یہ ممکن تھا کہ یہ زمین ہوتی لیکن اس میں یہ باغ و چین یہ نشیب و فراز، یہ وادی و کوہسار نہ ہوتے۔ ممکن تھا یہ فضا ہوتی لیکن اس میں نسیم کے جھونکے اور چڑیوں کے چہچہے نہ ہوتے، ممکن تھا یہ آسمان ہوتا مگر ستاروں کی یہ بزم آرائیاں، شفق کی جلوہ کاریاں اور قوس قزح کی رنگا رنگیاں نہ ہوتیں لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ دنیا ان تمام جلووں سے معور ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ یہ اس لئے ہے کہ انسان کے جس باطن کو بیدار کرے اور اس میں یہ بصیرت پیدا ہو کہ ایسی حسین و جمیل دنیا بغیر کسی خالق کے وجود میں نہیں آسکتی اور وہ خالق

صرف خالق ہی نہیں ہے بلکہ کمال قدرت، کمال صنعت و حکمت، اور کمال خیر و برکت کی تمام صفات سے متصف ہے۔

یہ رنگا رنگ جلوے، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، صرف ایک علت العلل کی شہادت نہیں دیتے، جیسا کہ ہمارے متکلمین کہتے ہیں۔ بلکہ ایک ایسے خالق کی شہادت دیتے ہیں جو تمام صفات جمال و کمال سے متصف ہے۔ کیوں کہ ہم صرف ہی نہیں دیکھتے کہ یہ دنیا بنی ہے بلکہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جو چیز بنی ہے، خوب بنی ہے جس سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ کامل ہے، حکیم ہے، قدير ہے، عليم ہے، جہاں ہے، کریم ہے۔ اس نے ہمیں جیسا تیسا پیدا نہیں کر دیا ہے بلکہ بہترین ساخت پر، بہترین قویٰ اور قابلیتوں اور نہایت اعلیٰ فطرت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ صرف خلق نہیں ہے بلکہ کمال خلق اور کمال قدرت ہے، صرف بخشا نہیں ہے بلکہ کرم و بخشش اور رحمت و عنایت کے ساتھ بخشتا ہے۔ صرف زندہ رکھنا نہیں ہے بلکہ اس طرح پالنا ہے جو کمال ربوبیت و پروردگاری کی شان ہے۔

یہ وہ نتیجہ ہے جو اس کائنات کے اجزاء کے حسن و جمال کے مشاہدہ سے ہمارے سامنے آتا ہے۔ لیکن جب ہم ان اجزاء کے انفرادی وجود سے گذر کر ان سے ترکیب پائی ہوئی اس حسین و جمیل وحدت یعنی اس مجموعی دنیا کے حسن و جمال کو دیکھتے ہیں تو ہم پر ایک اور حقیقت روشن ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ اس کائنات کا خالق و مدبر ایک ہی ہے کوئی اور اس کا شریک و سہم نہیں ہے۔ یہ کائنات آسمان سے لے کر زمین تک سچی سجائی بزم ہے جس کی ہر چیز اپنی اپنی جگہ سے مجموعہ کے حسن و جمال میں اضافہ کر رہی ہے جس طرح ہم ایک حسین متناسب الاعضاء اور خوبصورت چیز کو دیکھتے ہیں تو لازماً اس سے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ ایک ہی خوش ذوق اور کارفرما ہاتھ کی کارگیری کا کرشمہ ہے۔ اگر اس کے مختلف اعضاء و اجزاء کی تشکیل مختلف ارادوں کے ماتحت عمل میں آتی تو یہ تناسب اور حسین و جمال اس میں پیدا نہ ہو سکتا۔ اسی طرح اس مجموعی دنیا کے حسن و جمال کا جو شخص مشاہدہ کرتا ہے وہ لازماً اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ صرف ایک ہی کی پسند اور ایک ہی کا ارادہ ہے جو ان تمام رنگا رنگیوں کے اندر کارفرما ہے۔ اگر مختلف پسندیں اور مختلف ارادے اس میں کارفرما ہوتے تو اولاً تو اس کا قیام ہی ناممکن تھا اور اگر اس کا قیام فرض بھی کر لیا جائے تو یہ ایک آراستہ بزم کی جگہ ایک مال گودام بلکہ کسی کباڑیے کی دوکان کی شکل میں ہوتی اور ایک حسین وحدت کی جگہ ہم اس کو نہایت بھیانک صورت میں دیکھتے جہاں ہر چیز بے قربانہ بے ربط اور بے بوڑ ہوتی کیوں کہ مختلف ارادوں اور مذاقوں کے تصادم کے ساتھ تناسب کا وجود محال ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ سب کچھ آپ سے آپ ہو رہا ہے یا اس کے پیچھے ایک مدبر ہستی ہے جو ان اجزائے مختلف کے اندر توافقی و سازگاری پیدا کرتی اور اس کو پروان چڑھاتی ہے؟ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ دنیا ایک اتفاقی واقعہ ہے، آپ سے آپ وجود میں آگئی ہے اور اس کے مختلف اجزاء کا ارتقا بھی آپ سے آپ ہو رہا ہے تو کیا اس کے اجزائے مختلف کے اندر توافقی و سازگاری کا پیدا ہو جانا بھی ایک امر اتفاقی ہے؟ کیا اس کا جمال اور حسن بھی محض ایک حادثہ ہیں؟ کیا نتائج کی یکسانی اور نظام کی وحدت بھی بلا منصوبہ ہیں؟ کیا عقل انسانی اس قسم کے حیرت انگیز اتفاقات کو ایک لمحے کے لئے بھی تسلیم کر سکتی ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ یہ صورت حال اس امر کا نہایت قوی ثبوت ہے کہ اس کائنات کے پیچھے ایک حکیم و قوی ارادہ ہے جو اس کو وجود میں لایا ہے اور وہ اپنے علم و حکمت اور بلا شرکت غیر سے مکمل اختیارات کی وجہ سے مختلف اجزاء میں ربط و اتصال پیدا کرتا ہے۔ اگر آسمان و زمین میں اس کی قوت میں کوئی شریک ہوتا یا یہاں بہت سے ارادوں اور ذہنوں کی کار فرمائی ہوتی تو کائنات میں توافقی و متناسب ہرگز نہ ہوتا۔ (حقیقت توحید مولانا امین احسن اصلاحی)

۵۔ اسلام کا تصور اللہ مختلف اقوام و مذاہب نے اللہ کو جن جن صفات کے ساتھ پیش کیا ہے، ان کے تصور نے ان مذاہب کے پیروؤں کی سیرت و کردار پر بڑا اثر ڈالا ہے۔ اللہ کا ایک تصور انسان کو ڈرپوک اور بزدل بنادیتا ہے، دوسرا ظالم اور سنگ دل۔ ایک تصور انسان کو کشمکش حیات سے مفروز کر کے پہاڑوں اور جنگلوں میں جاڑاتا ہے، دوسرا اسے ناچ و نگہ کے جلسوں میں بٹھا دیتا ہے۔ اسی طرح ایک تصور اللہ انسان کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ آگ، پانی، پہاڑ، جنگل جیسی اشیاء کے سامنے گھٹنے ٹیک دے اور دوسرا اسے غلیغۃ اللہ بنا کر غنا و مروت کی تسخیر پر مامور کرتا ہے۔ ذیل میں ہم دیکھیں گے کہ اسلام نے اللہ کا کیا تصور پیش کیا ہے۔

بہت سے جدید معاشروں میں اللہ کا تصور یہ رہا ہے کہ اگرچہ وہ آخری اقتدار کا مالک ہے لیکن اسے اپنے بندوں کی زندگی اور ان کے مسائل سے کوئی خاص دلچسپی نہیں، اس نے محض تخلیق کا ایک کلیل رچا رکھا ہے اور اس سے اسی طرح لطف اندوز ہو رہا ہے۔ جیسے کوئی بچہ پھل پھری چھوڑ کر مزا لیتا ہے۔ زندگی اور موت، صحت و بیماری، قحط و خوشحالی، مسرت و کلبت اس کی قدرت کے تماشے ہیں جن سے اس کی مخلوق کو واسطہ پڑتا ہے، لیکن اس کی تقدیر کا دریا اپنے بہاؤ کی رومیں مگن ہے، نہ اس کی فکر کہ کون ڈوبتا ہے، نہ اس سے واسطہ کہ کون بچتا ہے، خدا کو نہ ہمارے دکھ درد سے واسطہ ہے، نہ ہمارے خیر و شر سے، وہ ہمارے آنسوؤں اور

تیسوں سے بے پرواہ اور ہمارے نیر و شر سے بے نیاز ہے۔
 اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ تصورات انسان کے ناقص شعور کے مظہر ہیں قرآن ہمیں بتاتا ہے
 کہ اللہ تعالیٰ اپنی پوری مخلوق اور خصوصاً انسانی زندگی کی فلاح و بہبود سے براہ راست دلچسپی رکھتا
 ہے۔ وہ محض موجودات کا خالق اور تقدیر ساز ہی نہیں، باری و رہنما بھی ہے:-

الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّىٰ ۖ وَالَّذِي
 قَدَّرَ فَهَدَىٰ ۖ (الاعلا ۲۲)

وہ (رب تو وہی ہے) جس نے ہر شے کو پیدا کیا پھر اس
 کو درست بنایا اور جس نے ایک اندازہ بنایا اور جو
 (کیا) پھر ہدایت عطا فرمائی۔

اس نے انسان کو جب حیات ارضی کے لئے میدان میں اتارا تو اسے اطمینان بھی دلادیا کہ تم
 کو اندھیرے میں نہیں چھوڑا جا رہا۔ تمہاری رہنمائی کی جائے گی:-

فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مَتًى هُدًى فَمَنْ
 تَبِعَ هُدَايَ فَلا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ
 وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (البقرہ - ۳۸)

پھر جب میری طرف سے کوئی ہدایت (دین و شریعت)
 آئے تو جو شخص میری اس ہدایت کی پیروی کرے گا
 تو ایسے لوگوں کو نہ تو کچھ خوف و اندیشہ ہوگا اور
 ایسے لوگ غمگین ہوں گے۔

قرآن نہیں بتاتا ہے کہ اللہ اپنے بندوں کو روزمرہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ایک
 ایک معاملے سے اتنا گہرا اور قریبی واسطہ رکھتا ہے کہ انہیں پھوٹی پھوٹی باتوں پر بھی ٹوکتا ہے، مختلف
 سرگرمیوں کے بھلے اور بُرے پہلو نمایاں کرتا ہے، قدم قدم پر ہدایت دیتا ہے۔ وہ کہیں عدل، آسمان
 اور اقربا سے محبت کی نصیحت کرتا ہے، کہیں نفاق اور بزدلی اور مفاد پرستی سے روکتا ہے۔ کہیں
 وہ مرد و زن کو گھر کی پاکیزہ فضا کو قائم رکھنے کا سبق دیتا ہے، کہیں رخصت اور میراث کے
 معاملات میں ان کو پریشانیوں سے نکالتا ہے۔ کہیں آداب مجلس سکھاتا ہے۔ کہیں مرد و عورت پر
 اور قوانین متعین کرتا ہے۔ الغرض دیکھو درد میں وہ ساتھی اور مشکلات میں شفیق ترین استاد ہے۔
 وہ اپنے بندوں کو کہی بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا۔ ایسے خدا کو ماننے سے جو اتمام الیقین اور
 پختہ شعور حاصل ہوتا ہے وہ کہیں اور نہیں ملتا۔

یہ اللہ سب کچھ جاننے اور دیکھنے والا ہے۔ کوئی آڑ نہیں جو بیچ میں حائل ہو، کوئی مغالطہ
 نہیں جس کا وہ شکار ہو جائے، وہ دلوں کے بھید اور نیتوں کے ہر گوشے سے واقف ہے۔ وہ
 ماضی، حال اور مستقبل کا پورا علم رکھتا ہے، پھر وہ صاحب قوت بھی ہے۔ جس پر ضعف و
 نقاہت کا غلبہ نہیں ہوتا، جسے کام کا بوجھ دوسروں پر بانٹنے کی کوئی مجبوری درپیش نہیں ہے۔
 اور جو اپنی ذمہ داریوں میں کسی دوسرے کے مشورے یا تعاون کا محتاج نہیں!

یہ اللہ صرف صاحب قوت ہی نہیں، اپنے بندوں کا رفیق و دمساز اور ولی و کارساز بھی ہے:-

ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ مَوْلَى الَّذِينَ آمَنُوا | یہ اس سبب سے کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کا رساز
(نحمدہ - ۱۱)

رفیق بھی ایسا رفیق نہیں جو وقت پڑے پر ہاتھ نہ آئے۔ بلکہ بکا سا سختی، ہر ہر لمحے کا ساتھی، برے اور نیلے کا ساتھی:-

وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ (الحجۃ - ۱۱) | تم جہاں بھی وہ تمہارے ساتھ ہے۔
ایسا ساتھی جو کٹھن گھڑیوں میں ہمت بندھاتا ہے۔ جب بندوں کو کوئی چکر لگتا ہے تو فوراً مرہم
تسکین لئے پاس موجود ہوتا ہے۔ اپنے قصر رحمت کا باب قبول کھول دیتا ہے کہ ناسازگار حالات
کی آندھیوں میں مجھے پکارو میں تمہاری فریادیں سنتا ہوں۔ اور ان پر مناسب کارروائی کرتا ہوں۔
أَدْعُوْنِي اسْتَجِبْ لَكُمْ | مجھے پکارو (دعا کرو) میں تمہاری درخواست (دعا)
(المومن - ۶۰) کو قبول کروں گا۔

وہ دلوں کو اطمینان دلاتا ہے کہ جب تم کرب کی گھڑیوں میں مجھے بس ہو کر پکارتے ہو تو میں
مصیبت کی گھاؤں کو چھانٹ دیتا ہوں۔

أَمَّنْ يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاہُ | وہ کون ہستی ہے کہ جب بے قرار آدمی
وَيَكْشِفُ السُّوْرَ۔ | اس کو پکارتا ہے تو اس کی سنتا ہے۔ اور
(النمل - ۶۲) اس کی مصیبت کو دور کرتا ہے۔

یہ وہ اللہ ہے جو قہار و جبار بن کر اپنے تخت پر براجمان نہیں ہوتا بلکہ اپنے بندوں کے
سروں پر شفقت کا ہاتھ پھیرتا ہے، ان کے جلتے ہوئے سینوں کو تسکین کی ٹھنڈک پہنچاتا ہے،
ان کی ڈھارس بندھاتا ہے، اس کا تصور اتنی بڑی طاقت ہے کہ انسان۔ اگر اس نے اسے
فی الواقع اپنے اندر جذب کر لیا ہو تو رضائے الہی پر نگاہ جما کر اپنی زندگی کو داؤں پر رکھ سکتا
ہے، وہ آروں کے نیچے چر سکتا ہے، اپنے تئیں کھال کھینچنے والے قصائیوں کے حوالے کر سکتا ہے
پھانسی کے تختوں پر کھڑا ہو سکتا ہے، کوڑوں کی بارش میں ثابت قدم رہ سکتا ہے، اور کیا
نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ سب اس بات پر منحصر ہے کہ انسان اس تصور کو حقیقتاً جنم کر لے۔

۶۔ عقیدہ توحید کے انفرادی زندگی پر اثرات | توحید کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو فی ذات
اور صفات میں کوئی اس کا شریک نہیں۔

تمام کائنات کی خالق و رازق ایک ذات واحد ہے۔ اس کے سامنے ساری مخلوق اور دنیا کی تمام

طاقتیں بیچ ہیں۔ موت و زندگی، صحت و بیماری، نفع و نقصان سب اسی کے اختیار میں ہے۔ اس میں کسی مخلوق کو کوئی دخل نہیں۔ اس کی اجازت کے بغیر کوئی شخص خواہ وہ تہی ہو ولی ہی کیوں نہ ہو۔ سفارش کی جرأت نہیں کر سکتا۔

انسانیت پر اسلام کا سب سے بڑا احسان عقیدہ توحید ہے جس طرح پورے اسلام کی جان اس کے عقائد میں، اسی طرح ان عقائد کی جان عقیدہ توحید ہے۔ یہ عقیدہ دوسرے تمام عقائد کا نقطہ کمال ہے جس نے شعور و یقین کے ساتھ کہہ دیا کہ اللہ ہی معبود ہے۔ اس نے درحقیقت اللہ تعالیٰ کی تمام صفات پر یقین رکھنے کا اعلان کر دیا۔ توحید دیگر مذاہب تھی مگر انسانی تصرفات کی وجہ سے توحید خالص ان میں باقی نہ رہی۔ اور کسی نہ کسی طرح ان میں شرک نے راہ پائی۔ تمام انبیاء و رسل سب سے پہلے توحید کی تبلیغ کیا کرتے تھے۔ ان کو بتو تکلیفیں دی گئیں، وہ عقیدہ توحید کی وجہ دی گئیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تیرہ سالہ کی زندگی اسی عقیدہ کی تبلیغ میں گزری، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سب مصائب اسی عقیدہ کی تبلیغ کی یادداشت میں برداشت کئے۔

۷۔ صفات باری تعالیٰ | اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے کے لئے اس کی صفات کا جاننا بھی ضروری ہے تاکہ یقین رکھا جائے کہ وہ ان صفات سے موصوف ہے اس لئے یہاں اللہ تعالیٰ کی چند بنیادی صفات اور ان کے جزوی تقاضوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی بنیادی اور اہم تر صفات یہ ہیں۔

- ۱۔ وہ ازلی اور ابدی ہے یعنی وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ کسی نے اسے پیدا نہیں کیا ہے، وہ آپ سے آپ موجود ہے۔
- ۲۔ وہ خالق یعنی سب اشیاء کو پیدا کرنے والا ہے۔
- ۳۔ وہ رب (پروردگار) ہے یعنی وہ سب کو رزق دیتا اور پرورش کرتا ہے۔
- ۴۔ وہ مالک اور حاکم ہے اور سب مخلوقات اس کی محکوم ہیں۔
- ۵۔ وہ علیم ہے یعنی یہ کہ ہر بات اور ہر حرکت کو جانتا ہے۔ کیا ہو چکا، کیا ہو رہا ہے اور کیا ہوگا۔ سب اس کے علم سے باہر نہیں ہے۔
- ۶۔ وہ حکیم ہے۔ اس کا کوئی کام حکمت سے خالی ہے نتیجہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے ہر کام میں کچھ حکمت و مصلحت ضرور ہوتی ہے۔
- ۷۔ وہ عزیز ہے اور ہر کام کی طاقت رکھتا ہے۔ اس کے لئے کوئی چیز ناممکن نہیں۔ اس کے کسی فیصلہ کو رد کا نہیں جاسکتا۔
- ۸۔ وہ عادل ہے اس کا ہر کام عدل و انصاف پر مبنی ہوتا ہے۔ اس کے سب فیصلے ٹھیک

بھٹک انصاف کے مطابق ہوتے ہیں۔

- ۹۔ مالک یوم الدین سے بڑے کام کا بدلہ اور اچھے کام کا اچھا بدلہ دیتا ہے۔
 ۱۰۔ وہ معبود ہے۔ وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے۔
 ۱۱۔ وہ احد ہے یعنی اس کی جتنی صفات ہیں۔ ان میں کسی کے اندر بھی کوئی اس کا شریک نہیں۔
 اور پر جتنی صفات مذکور ہوئیں وہ اس کے سوا کسی میں نہیں پائی جاتیں۔
 قرآن کریم اور احادیث نبویہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عقیدہ توحید کے اہم اور بنیادی تقاضے حسب ذیل ہیں۔

- ۸۔ عقیدہ توحید کے تقاضے
 ۱۔ اللہ کے سوا کوئی اور ہستی نہیں جو آپ سے آپ وجود میں آگئی ہو بلکہ ہر چیز مخلوق ہے اور اللہ کی پیدا کی ہوئی ہے ہر مخلوق اس کی محتاج اس کی ملک اور اسی کی محکوم ہے۔ وہ اپنے اندر کوئی ذاتی صفت نہیں رکھتی بلکہ جو صفت بھی اس میں پائی جاتی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہے۔
 ۲۔ اللہ تعالیٰ کی ذات بنیادی طور پر تمام موجودات سے مختلف ہے۔ کسی طرح بھی کوئی اس کا ہم جنس نہیں ہے۔

”لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ“ (الشوریٰ- ۱۱) | (اس جیسی کوئی چیز نہیں)
 نہ وہ کسی کا باپ ہے نہ کسی کا بیٹا۔ نہ وہ جسم رکھتا ہے نہ جسمانی صفات رکھتا ہے
 ۳۔ صرف اللہ ہی ہے جس کی رضا جوئی کی انسان کو فکّر کرنی چاہیے۔ یہی اس کے سارے کاموں کا اصل محرک بھی ہونا چاہیے اور اصل مقصد بھی۔

۴۔ ایسے سب کام جو اپنی صورت کے اعتبار سے عبادت کی قسم کے ہوں۔ صرف اللہ ہی کے لئے مخصوص ہیں سجدہ صرف اسی کو کیا جاسکتا ہے۔ پناہ صرف اسی کی ڈھونڈی جاسکتی ہے۔ امداد کے لئے صرف اسی کو پکارا جاسکتا ہے۔

۵۔ جن جذبات و احساسات میں عبادت کی روح پائی جاتی ہے۔ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہیں۔ بھروسہ صرف اسی پر کیا جائے۔ امیدیں صرف اسی سے وابستہ کی جائیں۔ حقیقی محبت صرف اسی سے کی جائے۔

۶۔ اس پوری کائنات کا حاکم اعلیٰ اللہ ہی ہے۔ حکم دینے منع کرنے اور اپنی مرضی پوری کرانے کا اصل مستحق وہی ہے۔ حقیقی قانون ساز بھی وہی ہے۔

۷۔ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جو اپنے اندر معبودیت کی شان رکھتا ہو۔ جو عبادت کے لائق ہو۔ کوئی اور نہیں جو اس لائق ہو کہ اس کے آگے پیشانیاں جھکیں اور نذرین پیش کی جائیں۔ کوئی اور

نہیں جسے کار ساز، حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا جائے جس سے دعائیں اور حاجتیں مانگی جائیں اور جسے مدد کیلئے پکارا جائے۔ کوئی اور نہیں جس پر بھروسہ کیا جائے۔ دل میں جس کا خوف اور تقویٰ رکھا جائے۔ جس سے امیدیں وابستہ کی جائیں اور جس سے حقیقی محبت کی جائے کوئی اور نہیں جس کے ہاتھ میں حقیقی اقتدار کا کوئی ذرہ بھی ہو جو بال برابر کسی کو نفع یا ضرر پہنچا سکتا ہو، جو کسی کے لئے قانون بنائے اور اپنا حکم چلانے کا ذاتی استحقاق رکھتا ہو اور جس کی بے قید اطاعت جائز ہو۔

عقیدہ توحید کے یہ بنیادی تقاضے اتنی اہمیت رکھتے ہیں کہ ان میں سے ایک کا بھی انکار اللہ پر ایمان رکھنے کے دعویٰ کو بے معنی کر کے رکھ دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ساری عبادتیں عقیدہ توحید کے اصل مفہوم میں شامل ہیں اور کوئی شخص صحیح معنوں میں مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک کہ یہ عقیدہ اپنے اس پورے مفہوم کے ساتھ اس کے دل میں اتر نہ چکا ہو۔ خلاصہ یہ کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس توحید کی تلقین کی وہ دو اصولوں پر مبنی ہے۔

- ۱۔ ایک یہ کہ انسان تمام مخلوقات میں اشرف ہے۔ اس لئے کسی مخلوق کے سامنے اس کا سر نہیں جھکنا چاہیئے۔
- ۲۔ دوسرے یہ کہ ہر قسم کی قوت ہر قسم کی قدرت اور تمام اوصاف کمال صرف ایک بزرگ و برتر ہستی کے لئے ہیں جو عرش سے لے کر فرش تک ہر ذرہ پر حکمران ہے۔ اس کی اطاعت کے دائرہ سے کوئی نقطہ باہر نہیں۔ انسان کی پیشانی کو ہر چوکھٹ سے اٹھ کر صرف اسی کے آستانہ پر جھکنا چاہیئے۔ ہمارا تمام خوف، ہماری تمام امیدیں، ہماری تمام دعائیں، ہماری تمام التجائیں صرف ایک درگاہ پر نشا رہوں اور اسی کے رحم و کرم کے سہارے ہماری زندگی کا ہر لمحہ بسر ہو۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے پہلے عرب بلکہ دنیا بھر میں طرح طرح کے غلط عقائد پھیل گئے تھے۔ ان میں سب سے بدتر اور تمام برائیوں کا اصلی محور شرک تھا۔ دنیا کی مشہور قوموں میں سے عیسائی اور مجوسی علاوہ مشرک تھے عیسائی تین اور مجوسی دو خدا مانتے تھے۔ ہندوؤں کے یہاں سینکڑوں خدا تھے۔ اس لئے سب سے پہلے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اصلاح سے دعوت و تبلیغ کا آغاز کیا۔ آپ کے تیرہ سالہ کئی دور رسالت میں روزہ، حج اور زکوٰۃ جیسے ارکان فرض نہیں ہوئے تھے لیکن شرک کا استیصال بتواتر کا پہلا سبق تھا۔ کئی عہد میں اکثر و بیشتر صرف یہی عقیدہ پیش کیا یا سورۃ الزمر مکہ میں نازل ہوئی۔ اس سورت میں شرک کی تمام صورتوں کو باطل قرار دیا گیا۔

۹۔ انفرادی زندگی پر توحید کے اثرات | جب توحید کا عقیدہ انسان کے دل میں راسخ ہو جاتا ہے تو اس سے وہ فوائد حاصل ہوتے ہیں جو کسی دوسرے عقیدہ سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ ہم مختصراً ان کا ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ وسعتِ نظر

ایمان باللہ کا انسانی زندگی پر پہلا اثر یہ ہے کہ وہ انسان کی نگاہ میں اتنی وسعت پیدا کر دیتا ہے جتنی خدا کی سلطنت وسیع ہے۔ انسان جب تنگ دنیا کو اپنے محدود علم اور قدرت کے دائرہ کے اندر بند رکھ کر دیکھتا ہے۔ اس کی نگاہ اسی تنگ دائرے میں محدود رہتی ہے۔ اسی دائرے میں وہ اپنے لئے حاجت و اتلاش کرتا ہے۔ اسی دائرے میں جو طاقتور ہیں ان سے ڈرتا اور دبتا ہے۔ اسی دائرے میں اس کی دوستی اور دشمنی محبت اور نفرت محدود رہتی ہے اللہ پر ایمان لانے کے بعد اس کی نظر اپنے ماحول سے نکل کر تمام کائنات پر پھیل جاتی ہے۔ اب وہ کائنات پر اپنے نفس کے تعلق سے نہیں بلکہ خداوند عالم کے تعلق سے نگاہ ڈالتا ہے اب اس وسیع جہان کی ہر چیز سے اس کا ایک اور ہی رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ اب اس کو دنیا میں کوئی حاجت روا کوئی طاقتور کوئی ضرر اور نفع دینے والا نظر نہیں آتا۔ اب اس کی دوستی یا نفرت اپنے نفس کے لئے نہیں بلکہ اللہ کے لئے ہوتی ہے پس جو اللہ پر ایمان رکھتا ہے۔ وہ کبھی تنگ نظر نہیں ہو سکتا۔

۲۔ عزتِ نفس

ایمان باللہ انسان کو پستی و ذلت سے اٹھا کر خودی و عزتِ نفس کے بلند ترین درجہ پر پہنچا دیتا ہے۔ جب تک اس نے اللہ کو نہ پہچانا تھا دنیا کی ہر طاقتور چیز ہر نفع یا ضرر پہنچانے والی چیز کے سامنے جھکتا تھا۔ اس خوف کھاتا تھا۔ اس کے آگے ہاتھ پھیلاتا تھا۔ اس سے امیدیں وابستہ کرتا تھا۔ مگر جب اس نے اللہ کو پہچانا تو معلوم ہوا کہ جن کے آگے وہ ہاتھ پھیلا رہا تھا وہ خود محتاج ہیں، جن کی وہ بندگی کر رہا تھا۔ وہ خود اسی کی طرح بندے ہیں۔ قرآن میں فرمایا:

”إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ عِبَادٌ أَمْثَلُكُمْ“ (الاعراف-۲۴) جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ تمہارے ہی جیسے بندے ہیں۔

جن سے وہ مدد کی امیدیں رکھتا تھا وہ اس کی مدد تو درکنار آپ اپنی ہی مدد نہیں کر سکتے۔ وہ تمہاری مدد نہیں کر سکتے بلکہ اپنی مدد سے ”لَا يَسْتَطِيعُونَ نَصْرَكُمْ وَلَا أَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُونَ“ (الاعراف-۲۴) بھی قاصر ہیں۔

یہ علم حاصل ہونے کے بعد وہ تمام دنیا کی قوتوں سے بے نیاز اور بے خوف ہو جاتا ہے۔ اللہ کے سوا اس کی گردن کسی کے آگے نہیں جھکتی۔ اللہ کے سوا اس کا ہاتھ کسی کے آگے نہیں پھیلتا۔ اللہ کے سوا کسی کی عظمت اس کے دل میں نہیں رہتی۔

۳۔ رعبِ و نیاز

ایمان باللہ سے جو خود داری انسان میں پیدا ہوتی ہے۔ وہ اس کو مغرور اور متکبر نہیں بناتی۔ بلکہ خدا پر ایمان رکھنے والے میں خود داری اکسار کے ساتھ اور عزتِ نفس عجز و نیاز کے ساتھ ملی ہوتی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ خدا کی طاقت کے سامنے میں بالکل بے بس

ہوں۔ خدا کی حکومت کے دائرہ سے نکلنا میرے اور کسی رستی کے بس میں نہیں ہے۔ میں کیا تمام عالم اللہ کا محتاج ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ ایمان باللہ کی عظیم خاصیت یہ ہے کہ وہ انسان کو سراپا انکسار بنا دیتا ہے۔

۴۔ غلط توقعات کا ابطال | ایمان باللہ کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے تمام جھوٹے بھروسوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ انسان خوب سمجھ لیتا ہے کہ اس کے لئے اعتقاد صحیح اور عمل صالح کے سوا نجات کا کوئی ذریعہ نہیں۔ جو لوگ ایمان باللہ سے محروم ہیں۔ ان میں سے کوئی سمجھتا ہے کہ خدا کے کاموں میں بہت سے اور جھوٹے جھوٹے خدا بھی شریک ہیں۔ ہم ان کی خوشامد کے سفارش کروالیں گے۔ کوئی سمجھتا ہے کہ اللہ بیٹا رکھتا ہے اور اس بیٹے نے ہمارے لئے کفارہ بن کر نجات کا حق محفوظ کر دیا ہے۔ کوئی سمجھتا ہے کہ ہم خود اللہ کے بیٹے ہیں اور اس کے پیچھے ہیں۔

﴿قَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَىٰ مَحَنُودٌ﴾ | یہود و نصاریٰ نے کہا ہم خدا کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں۔ (المائدہ - ۳)

ایسی ہی اور بہت سی غلط توقعات ہیں جو لوگوں کو ہمیشہ گناہ کے چکر میں پھنساتے رکھتی ہیں لیکن قرآن جس ایمان باللہ کی تعلیم دیتا ہے۔ اس میں غلط توقعات کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔

۵۔ صبر و توکل | ایمان باللہ انسان میں صبر و توکل کی شان پیدا کرتا ہے۔ خدا پر ایمان لانے والے کا دل ایک سنگین چٹان کی طرح مضبوط و مستحکم ہو جاتا ہے۔ بے ساری دنیا کی مشکلیں دشمنیاں تکلیفیں اور مخالفت طاقتیں مل کر بھی اس کو اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتیں۔ جو خدا پر ایمان نہیں رکھتا اس کا بھروسہ ان مادی اسباب و وسائل پر ہوتا ہے جو خود کسی طاقت کے مالک نہیں ہیں بلکہ جس کا بھروسہ خدا پر ہے جس نے خدا کا دامن تھام لیا ہے، اس کا سہارا ایسا مضبوط ہے کہ وہ کبھی ٹوٹ ہی نہیں سکتا۔

۶۔ شجاعت | ایمان باللہ سے انسان میں جرأت و شجاعت کا جذبہ ابھرتا ہے انسان کو دو چیزیں بزدل بناتی ہیں۔ ایک محبت جو وہ اپنی جان اپنے اہل و عیال اور اپنے مال سے رکھتا ہے۔ دوسرے خوف جو نتیجہ ہے اس غلط اعتقاد کا کہ نقصان پہنچانے اور ہلاک کر دینے کی قوت دراصل ان اشیاء میں ہے جو محض آلہ کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ ایمان باللہ ان دونوں چیزوں کو دل سے نکال دیتا ہے مومن کے دل میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ مال اور اولاد سب دنیا کی زینتیں ہیں جن کا کبھی نہ کبھی ضائع ہونا یقینی ہے۔ کبھی نہ ختم ہونے والی چیز وہ ہے جو اللہ کے ہاں ملے گی۔ رہا خوف تو مومن کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ نقصان پہنچانے اور ہلاک کرنے کی حقیقی قوت انسان یا حیوان

توب یا تلوار لکڑی یا پتھر میں نہیں ہے بلکہ خدا کے قبضہ قدرت میں ہے۔ تمام دنیا کی قوتیں مل کر بھی اگر کسی کو نقصان پہنچانا چاہیں اور خدا کا اذن نہ ہو۔ تو اس کا بال ہلک بیک نہیں ہو سکتا۔ موت کا جو وقت خدا نے لکھ دیا ہے۔ اس سے پہلے کسی کے لئے موت نہیں آ سکتی۔

۷۔ قناعت و بے نیازی ایمان باللہ انسان کے دل سے حرص و ہوس کے رکیک جذبات کو دور کر دیتا ہے۔ ایمان کے ساتھ انسان میں قناعت اور بے نیازی کی شان پیدا ہوتی ہے۔ مومن ہمیشہ باعزت طریقہ سے اپنے رب کا فضل تلاش کرتا ہے اور جو تھوڑا بہت مل جاتا ہے اس کو اللہ کی دین سمجھ کر قناعت کر لیتا ہے۔ عزت و دولت اس کے ہاتھ میں ہے۔ جس کو چاہے باعزت بنائے اور جسے چاہے ذیل کر دے۔

۸۔ اصلاح اخلاق توحید سے انسان میں ذمہ داری کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ نفوس میں پاکیزگی اور اعمال میں پرہیزگاری پیدا ہوتی ہے۔ لوگوں کے باہمی معاملات درست ہوتے ہیں۔ پابندی قانون کا احساس پیدا ہوتا ہے اور افراد ایک زبردست باطنی قوت سے ازہری اندر سدھر کر ایک صالح اور منظم معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ دراصل یہ توحید کا معجزہ ہے۔ دنیا کی کسی حاکمانہ قوت یا تعلیم و تربیت یا وعظ و تلقین سے اصلاح اخلاق اور تنظیم اعمال کا کام اتنے وسیع پیمانے اور اتنی گہری بنیادوں پر انجام نہیں پاسکتا۔

۹۔ عقیدہ توحید اور اجتماعی زندگی عقیدہ توحید کا اجتماعی زندگی پر بھی گہرا اثر پڑتا ہے۔ انسانی معاشرت کی بنیاد کامل عدل اور صحیح مسادات

وحدت الہ اور وحدت آدم کے بغیر ناممکن ہے۔ دنیا کی موجودہ ابتری اور تباہی کا اصلی سبب یہ ہے کہ جس رفتار سے دنیا میں سائنس نے ترقی کی ہے اُس رفتار سے انسان کے شعور نے ترقی نہیں کی۔ سائنس کی ترقیوں کا تو یہ عالم ہے کہ انسان نے ساری جغرافیائی حد بندیاں توڑ ڈالیں اپنی ایجادوں اور مشینوں کے زور سے اس وسیع زمین کو ایک مکان کے صحن کی طرح مختصر کر دیا، ریل و رسائل کی آسانوں نے اخبار و افکار کی نشر و اشاعت انتہائی سہل کر دی۔ لیکن اس سب کے باوجود انسانی ذہن کی تنگی کا حال یہ ہے کہ دنیا اب تک قوم پرستی اور وطن پرستی سے نجات حاصل نہیں کر سکی۔ وطن پرستی کے معنی یہ ہیں کہ انسان ہر حال میں اپنے وطن کا ساتھ دے۔ خواہ وہ حق پر ہو یا نہ ہو۔ یہ ذہن میں رہے کہ وطن پرستی اور حب الوطنی دو مختلف چیزیں ہیں۔ حب الوطنی ایک فطری جذبہ ہے لیکن وطن پرستی کے معنی یہ ہیں کہ انسان حق و ناحق کا معیار اللہ کی ہدایت کو چھوڑ کر محض اپنے وطن کو بنائے۔ یہ شرک کی ایک شکل ہے اور اسلام اس کی بھی اسی طرح بیخ کنی کرتا ہے۔ جس طرح شرک کی باقی تمام شکلوں کی۔

یہ قوم پرستی بھی درحقیقت شرک کی ایک قسم ہے اسی قوم پرستی نے گذشتہ نصف صدی میں

تاریخ انسانی کی ہونک ترین جنگوں کو جنم دیا اور آج بھی انسانیت کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ اسی خطرے کے پیش نظر دنیا کے سوچنے سمجھنے والے لوگ عالمی ریاست کی حمایت کرتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ یہ ساری کوششیں اس وقت تک بیکار ہیں جب تک انسانیت وحدت الہیہ اور وحدت آدم پر اشتراک نہیں کرتی۔

اس وقت اقوام میں افراتفری کا عالم یہ ہے کہ نہ ان میں خدا مشترک ہے اور نہ آدم۔ ہر قوم کا خدا الگ ہے، اس کی نسل الگ ہے، اس کی شہریت جدا ہے، اس کے عقائد اور اخلاق جدا ہیں۔ اور ہر قوم اس علیحدگی کو نہ صرف قائم رکھنا چاہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک دماغوں میں یہ گرہ موجود ہے۔ ان قوموں میں اتحاد کے لئے کوئی مشترک رشتہ موجود نہیں مشترک رشتہ صرف ایک ہو سکتا ہے، اور وہ یہ کہ سب ایک ہی خدا کو مانیں، اسی کے اتارے ہوئے قانون کو سب اپنے لئے شریعت بنائیں اور ایک ہی آدم کے مشترک گھرانے کا اپنے آپ کو فرد سمجھیں۔ اس اساس پر بلاشبہ ایک عالمگیر سیاسی تنظیم کی عمارت قائم ہو سکتی ہے۔ اور دنیا کی موجودہ مصیبتوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ اس کے سوا جتنی تدبیریں بھی اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے کی جائیں گی وہ رشتہ میں ایک اور گرہ کا اضافہ کریں گی اور کسی مشکل کو حل نہیں کر سکیں گی۔

۲۔ تعلق باللہ اور اس کی بنیادیں

۱۔ اللہ کا جامع تخیل | قرآن پاک کی آیات اور اسلام سے پہلے عربوں کے اشعار سے واضح طور پر ثابت ہے کہ عربوں کے ذہن میں ایک بالاتر ہستی کا تخیل ضرور موجود تھا، جس کا نام اُن کے ذہن میں اللہ تھا۔ اللہ کیا ہے، اس کی صفات کیا ہیں، اُس کا تعلق بندوں کے ساتھ کیا ہے؟ وہ کن باتوں سے خوش ہوتا ہے؟ ہم سے وہ کیوں اور کیوں کر ہمارے اعمال کا مواخذہ کرے گا؟ ان چیزوں کے متعلق ان کے ذہن میں کوئی تخیل نہ تھا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ربّانی تعلیمات سے ان کو اللہ تعالیٰ کی حقیقی عظمت سے آشنا کیا۔ ایک ایسی ہستی کے اعتقاد کی اُن کو تعلیم دی جس کی قدرت بے انتہاء اور جس کی وسعت غیر محدود ہے۔ جس کے علم کے حاطہ میں اندھیرے اور اُجالے کی ہر چیز داخل ہے۔ وہ ہر عیب سے پاک اور ہر وصف کا مستحق اور اس سے منصف ہے۔ وہ جب چاہے آسمان وزمین کو فنا کر دے۔ اس کی محبت دنیا کا حاصل اُس کی عبادت ہماری زندگی کا مقصود اور اس کی یاد ہمارے دلوں کی راحت ہے۔

ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ وہ لوگ جن کو مجھوئے۔ یہ بھی اللہ کا نام یاد آتا تھا، وہ اس کے سوا سب کچھ بھول گئے اور اُس کی راہ میں ہر چیز قربان کرنے کو تیار ہو گئے۔ وہ چلتے پھرتے اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، ہر حال میں اس کی یاد میں سرمست و سرشار رہتے تھے۔ اس سرمستی و سرشاری میں بھی انہوں نے جنگوں میں راجا بنے زندگی بسر نہیں کی۔ دولت مندوں کی عیبیک کو اپنا سہارا نہیں بنایا، دنیا کی کشمکش سے نجات حاصل کرنے کے لئے بزدلانہ گوشہ نشینی کو تقدس کا نام دے کر اختیار نہیں کیا بلکہ فرائض کی ادائیگی اور اس راہ میں جدوجہد اور سعی و کوشش کو اپنا مذہب سمجھا اور اللہ کا حکم جان کر اس کی پوری مستعدی کے ساتھ بجالانے اور ان تمام ہنگاموں کے ساتھ دل کا معاملہ دلدارانہ کے ساتھ ہمیت قائم رکھا، اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں اُن کی مدح فرمائی۔

"رَجَالٌ لَا تُلِهُهُمُ مَّخْرَجَ سَارَةٍ وَلَا يَمُوعُ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ" (النور۔ ۳۷) | وہ لوگ جن کو تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد سے غافل نہیں کرتی۔

ان کی محبت الہی کا درجہ دنیا کی ہر محبت پر غالب آگیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی شان میں فرمایا:

"وَالَّذِينَ آمَنُوا آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ" (البقرہ۔ ۱۶۵) | ایمان والے سب سے زیادہ محبت اللہ سے کرتے ہیں۔

۲۔ دیگر اہل مذاہب کا زاویہ نگاہ | ان کا توکل، ان کا صبر، ان کی استقامت، ان کی بہادری، غرض ان کی ہر چیز ان کے اسی جذبہ ایمانی کا پرتو تھی۔ دیگر مذاہب

اولوں کا معاملہ اس سے یکسر مختلف تھا۔ انجیل میں ”باب“ کا لفظ اللہ کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اس لفظ کی حقیقت اور اللہ پر اس کے لائق سے مقصود کیا ہے، اور اس سے اس مذہب میں کہاں تک غلطیاں پھیلیں۔ ان باتوں کو نظر انداز کر کے دیکھتے تو یہ اللہ کے صرف جہاں سمات کی ناقص اور مادی تعبیر ہے عیسائیت میں فلسفہ کی آمیزش نے تثلیث (TRINITY) کے عقیدہ کو اس امر کے پردہ میں چھپا لیا۔ یہ تاویل کی گئی کہ تثلیث کے اقامت ثلاثہ باب (خدا، بیٹا، دھرت عیسیٰ) اور روح القدس ہیں۔ یہ تینوں ایک ہیں اور تینوں اپنے وجود میں الگ الگ ہیں۔ اس تشریح سے اللہ کے جسم ہونے کے مسئلہ نے جنم لیا اور ایک خدا کئی خداؤں کا مجموعہ بن گیا۔

یہودیوں کے صحیفوں میں خدا کے نام ”یہودا“ تھا، مگر عام یہودیوں کو اس مقدس نام کے زبان پر لانے کی اجازت نہ تھی، دوسرا عام نام ”آدھیم“ ہے جو ہر موقع پر استعمال ہوتا ہے۔ ان دو کے علاوہ اللہ کے بیسیوں نام جو دراصل اس کے ذاتی اوصاف کے ترجمان ہیں، تورات کا دفران کے ذکر سے بالکل خالی ہے۔ صفات الہی میں سے جو صفت یہودی صحیفوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ ”فوج والا“ اللہ ہے۔ جو اللہ کی صفت جلالی کا مظہر ہے۔ اہل ہندوین اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات مختلف ہیں۔ لیکن ہر صفت نے ان کے ہاں ایک مستقل وجود حاصل کر لیا ہے، اور خود اللہ ہر قسم کی صفات سے خالی رہ گیا ہے۔ اسی لئے ہندوستان کے تمام مذاہب اسی تجسیم صفات کے جلوہ گاہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ برہما، ہمیش، وشتو تین صفات خالق، مہیت، مارنے والا اور قیوم کے محبتے ہیں۔ شکرہ آچاریہ نے اللہ کے صرف تین اصلی صفات تسلیم کئے ہیں یعنی حیات، علم اور سرور۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کے ان تمام فاسد تخیلات کو باطل ٹھہرایا، ان کے غلط عقیدوں کی تصحیح کی۔ آپ نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا مل گنتی اور شمار کی حد سے باہر ہیں۔ رسول کریم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ الہامی دعا سکھائی ”اے خداوند! میں تیرے سب اچھے ناموں کے وسیلہ سے جن میں سے کچھ کو ہم نے جانا اور بعض کو نہیں جانا تجھ سے درخواست کرتی ہوں“۔

بہیقی کتاب الاسماء والصفات

کہندہ کہ اگر سمندر میرے پروردگار کی باتوں کے لکھنے کیلئے سیاہی بن جائے تو سمندر ختم ہو جائے لیکن میرے پروردگار کی باتیں ختم نہ ہوں گی، اگرچہ ہم ایسا ایک اور سمندر کبوں نہ لے آئیں۔

قُلْ لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مَدَادًا لَكَلَّمْتُ
رَبِّي لَنَفَذَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَنْ تَنْفَذَ كَلِمَتُ
رَبِّي وَلَوْ جُنَا وَمِثْلَهُ مَدَدًا
(الکہف - ۱۰۹)

۳۔ تعلق باللہ اور اس کی بنیادیں | غور کرنے پر یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ دینی احکام کی اطاعت کا اصلی مقصد عباد و معبود اور نفاق و منحرف کے

مابین تعلق کو استوار کرنا ہے، ایک مومن پر فرض ہے کہ اللہ کی بندگی اور اطاعت کا فریضہ انجام دیتے وقت اپنا نسب العین صہ فرمائے اپنی زبان سے کیوں کہ ”اطاعت“ کے تصور کے ساتھ ”اجر“ کا تصور اسی طرح لازم ہے جس طرح سورج کے ساتھ روشنی اور گرمی کا تصور۔ اس لئے اگر دین کا بنیادی تصور اور انسان کا فریضہ و حیات اللہ کی طاعت ہے تو کوئی شک نہیں کہ اس اطاعت سے اس کا مقصد و منشا اللہ رب العزت سے اجر کا حصول ہی ہوگا۔ پھر جو کدہ کسی بالاتر مہستی کی خدمت و طاعت کا اجر حاصل اُسی وقت ہوتا ہے جب وہ اس کا خدمت اور عمل طاعت کو پسندیدہ اور قابل قبول پا کر اس سے خوش ہو گئی ہو۔ اس لئے فطری بات ہے کہ طالب اجر کی نظر اجر سے پہلے اپنے مالک کی خوشنودی پر مبنی رہے۔ وہ اگر خوش ہو گیا تو گویا اجر حاصل ہی ہو گیا۔

اس حقیقت کے پیش نظر قرآنی تصور دین کا واضح تقاضا یہ ہوا کہ انسان کی غرض اپنے مالک کی رضا حاصل کر لینا ہو اور اپنا فرض منصبی ادا کرتے ہوئے اس کی فطری ہر وقت اسی مقصد پر مبنی رہیں۔ اور یہ بھی کہ وہ جو کئی بھی کرے اسی مقصد و نیت سے کرے کہ اس کا تعلق اپنے اللہ کے ساتھ استوار ہو جائے۔ قرآن میں فرمایا:

”وَمَا لِاحِدٍ عِنْدَهُ مِنْ نِعْمَةٍ تُجْزَىٰ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَىٰ“
(البلبل - ۱۹ - ۲۰)
”وَمَا كُتِبَ عَلَيْهِنَّ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ“ (الحديد - ۲۷)

اور اس لئے نہیں دیتا کہ اس پر کسی کا احسان ہے جس کا وہ بدلہ اتارتا ہے۔ بلکہ اپنے رب سے اعلیٰ کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے دینا ہے۔
اور ہم نے ان پر اللہ کی رضامندی حاصل کرنے کے سوا اور کچھ فرض نہیں کیا تھا۔

پہلی بنیاد ایمان | تاہم تعلق باللہ استوار کرنے کے لئے چند امور اساس و بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں:-

تعلق باللہ استوار کرنے کے لئے اولین بنیاد ایمان باللہ ہے۔ یہ عقیدہ جو اسلام کے فکری و عملی نظام میں اس قدر اہمیت رکھتا ہے۔ محض اسی قدر نہیں کہ اللہ تعالیٰ موجود ہے بلکہ وہ اپنے اندر اللہ تعالیٰ کی صفات کا ایک مکمل اور صحیح تصور رکھتا ہے۔ اسی تصور صفات سے وہ قوت حاصل ہوتی ہے جو انسان کی تمام فکری اور عملی قوتوں پر حکمران ہو جاتی ہے محض مہستی باری کا اثبات وہ چیز نہیں ہے۔ جسے اسلام کی امتیازی خصوصیت کہا جاسکتا ہو۔ دوسری باتوں نے بھی کسی نہ کسی طور سے باری تعالیٰ کے وجود کو تسلیم کیا ہے۔ البتہ جس چیز نے اسلام کو تمام مذاہب و ادیان سے ممتاز

کر دیا ہے، وہ یہی ہے کہ اس نے صفاتِ باری کا صحیح، مکمل اور مفصل علم بخشا ہے اور پھر اسی علم کو اصل ایمان بنا کر اس سے ترکیبِ نفس، اصلاحِ اخلاق، تنظیمِ اعمال اور بناءِ تمدن کا کتنا بڑا کام لیا ہے۔ جو دنیا کے کسی مذہب و ملت نے نہیں لیا۔

ایمان باللہ کی مجمل صورت جس کے زبانی اقرار اور قلبی تصدیق کو دخولِ اسلام کی پہلی اور لازمی شرط قرار دیا گیا ہے۔ کلمہ لا الہ الا اللہ ہے۔ یعنی دل سے اس امر کی تصدیق اور زبان سے اس امر کا اعتراف کہ "اللہ" بغیر اُس ایک ہستی کے اور کوئی نہیں ہے جس کا نام اللہ ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ "الوہیت" کو کائنات کی جملہ اشیاء سے سلب کر کے سرف ایک ذات کے لئے ثابت کیا جائے، اس مجمل کلمہ کے اجزاء ترکیبی تین ہیں:-

(۱) ایک الوہیت کا تصور

(۲) تمام اشیاء سے اس کی نفی

(۳) صرف اللہ کے لئے اس کا اثبات

قرآن مجید میں اللہ کی ذات و صفات کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ سب انہی تینوں امور کی تفصیل ہے۔

یہ ایمان باللہ کا اجمالی مفہوم ہے مگر اس کی وسعت اور جامعیت کا یہ عالم ہے کہ دین کے تمام ایمانیات و عقائد اسی ایک اصل کی فرع ہیں۔ اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے اس کا مسد و مرجع اللہ کی ذات ہے۔ ملائکہ پر اس لئے ایمان ہے کہ وہ اللہ کے فرشتے ہیں۔ کتابوں پر اس لئے ایمان ہے کہ وہ اللہ کی نازل کردہ ہیں۔ رسولوں پر اس لئے ایمان ہے کہ وہ اللہ کے بھیجے ہوئے ہیں۔ یوم آخر پر اس لئے ایمان ہے کہ وہ اللہ کے انصاف کا دن ہے۔ فرائض اس لئے فرائض ہیں کہ اللہ نے ان کو مقرر کیا ہے حقوق اس لئے حقوق ہیں کہ وہ اللہ کے حکم پر مبنی ہیں۔ اوامر کی اطاعت اور نواہی سے اجتناب اس لئے ضروری ہے کہ وہ اللہ کی جانب سے ہیں۔ غرض ہر چیز جو اسلام میں ہے، خواہ وہ عقیدہ ہو یا عمل، اس کی بناء ایمان باللہ پر ہے۔ اس ایک چیز کو الگ کر دیجئے، پھر نہ ملائکہ کوئی چیز ہیں نہ یوم آخر، نہ رسول اتباع کے مستحق ٹھہرتے ہیں، نہ اُن کی لائی ہوئی کتابیں، نہ فرائض و طاعات میں کوئی معنویت باقی رہ جاتی ہے نہ حقوق و واجبات ہیں نہ اوامر و نواہی کسی قوتِ نفاذ کے حامل رہتے ہیں اور نہ قوانین و ضوابط۔ ایمان باللہ کے پٹے ہی یہ سارے کا سارا نظامِ درہم برہم ہو جاتا۔ بلکہ سرے سے اسلام ہی کسی چیز کا نام نہیں رہتا۔

پس تعلق باللہ کی پہلی بنیاد اللہ کی ذات پر ایمان ہے۔ اس ایمان کا نفاذ یہ ہے کہ تمام موجوداتِ عالم محتاج ہیں کسی کو نفع و ضرر پہنچانا تو درکنار خود اپنی ذات سے ضرر کو دفع کرنے پر بھی قادر نہیں ہیں

ان کے افعال کا سرشتہ ان کی اپنی ذات میں نہیں بلکہ وہ سب کی سب کہیں اور سے قوت وجود قوت فعل اور قوت تاثیر حاصل کرتی ہیں۔ اس لئے کائنات کی کوئی شے ایسی نہیں جو ”الوہیت“ کا شاہد ہی اپنے اندر رکھتی ہو۔ اس نفی کے بعد وہ ایک ذات کے لئے ”الوہیت“ ثابت کرتا ہے جس کا نام اللہ ہے۔ اور انسان سے مطالبہ کرتا ہے کہ سب کو چھوڑ کر اسی پر ایمان لاؤ۔ اُسی کے آگے جھکو۔ اسی کی تعلیم کرو۔ اُسی سے محبت کرو، اُسی سے ڈرو، اُسی سے اُمید رکھو۔ جو کچھ مانگو اُسی سے مانگو۔ ہر حال میں اُسی پر بھروسہ کرو اور ہمیشہ یاد رکھو کہ ایک دن اُسی کے پاس جانا ہے، اس کو حساب دینا ہے اور تمہارا اچھا یا بُرا انجام اسی کے فیصلہ پر منحصر ہے۔ ایمان باللہ اصل ہے اور دیگر تمام ایمانیات اس کی فرع ہیں۔ یہ تعلق باللہ کی پہلی بنیاد ہے۔

دوسری بنیاد اطاعت | اللہ کے ساتھ ہمارے تعلق کی دوسری بنیاد اُس کی اطاعت ہے، جس میں انبیاء کتب مقدسہ اور یوم آخر پر ایمان سب شامل ہیں۔ اس لئے کہ کسی چیز پر ایمان لانے کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ اس کی ہستی کو تسلیم بھی کیا جائے اور عملی زندگی میں اس کی اطاعت بھی کی جائے۔ اُس نے انبیاء پر جو کتب مقدسہ نازل کیں اور اُن میں جو احکام اپنے بندوں کو دیئے ان پر عمل کرنے کا نام ہی اطاعت ربانی ہے۔ کیوں کہ وہ اپنے بندوں کو احکام براہ راست نہیں دیتا بلکہ انبیاء و رسل کی وساطت سے دیتا ہے۔ اس طرح انبیاء کی اطاعت بالواسطہ اللہ ہی کی اطاعت ہوتی ہے اور اُن کے دیئے ہوئے احکام کے بغاوت کی ہم معنی ہے۔ قرآن کریم میں انبیاء کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت قرار دیا گیا ہے۔

ارشاد فرمایا:

”وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ“ (النساء - ۶۴) | ہم نے کوئی رسول سوائے اس مقصد کے کسی اور مقصد کے لئے نہیں بھیجا کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔

رسول کی اطاعت کے مطالبے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت جو اصل مقصود ہے اس کا راستہ ہی یہ ہے کہ اس کے رسول کی اطاعت کی جائے۔ کیوں کہ رسول ہی لوگوں کو اس کی ہدایات اور اس کے احکام سے آگاہ کرتا ہے۔ اس لئے جو اللہ کی اطاعت کرنا چاہتا ہے اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ رسول کی اطاعت کرے کیوں کہ رسول کی اطاعت درحقیقت اللہ کی اطاعت ہے۔

”مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ“ | جس نے رسول کی اطاعت کی اُس نے اللہ کی اطاعت کی۔ (النساء - ۸۰)

احادیث میں بھی اس حقیقت کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں فرمایا۔ ”جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی اُس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے اُن کی

نافرمانی کی، اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ اللہ کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی نشان امتیاز ہیں۔“ (صحیح بخاری)

اطاعت کے بارے میں قرآن نے بڑے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ محض ظاہری اطاعت مطلوب نہیں بلکہ ضروری ہے کہ آدمی پورے خلوص دل کے ساتھ اطاعت کرے جو نزاع باہم بپا ہو اُس کے لئے حکم خداوندی کی طرف رجوع کرے جو رسول کریم کے ذریعے مل سکتا ہے۔ اور وہاں سے جو فیصلہ بھی ہو اُسے اطمینان قلب سے قبول کرے اور دل میں بدگمانی اور شکایت نہ رکھے۔ غرض یہ کہ تعلق باللہ کی دوسری بنیاد عملی زندگی میں اللہ کی اطاعت ہے جس میں انبیاء کی اطاعت بھی شامل ہے۔ اس اطاعت پر مضبوطی سے قائم ہونے بغیر تعلق باللہ کے سب دعاوی طبل بلند بانگ و در باطن سیح کے ہم معنی ہیں۔ اس سے اُن لوگوں کے دعویٰ کی قلبی کھل جاتی ہے جو اپنے آپ کو ولی، قطب اور نہ جانے کیا کچھ کہتے ہیں مگر اُن پر اطاعت الہی کی کوئی چھاپ نظر نہیں آتی۔

تیسری بنیاد اخلاص و محبت | کسی کام کو صرف اللہ تعالیٰ کے تقرب و رضا کے لئے انجام دینا اور مخلوق کی خوشنودی و رمنامندی یا اپنی کسی نفسانی خواہش کو شامل نہ کرنا اخلاص کہلاتا ہے۔ اخلاص کے وجود اور عملاتین درجے ہیں۔

اخلاص: (۱) ایک یہ کہ فعل کو انجام دیتے وقت صحیح مقصد پیش نظر ہو۔ یہی مقصد اور مرتبہ کمال کا ہے۔ (۲) دوسرے یہ کہ غلط مقصد پیش نظر ہو، یہ بالکل اخلاص کے خلاف ہے۔

(۳) تیسرے یہ کہ کچھ بھی پیش نظر نہ ہو، نہ غلط مقصد اور نہ ہی صحیح۔ بلکہ یونہی مہول کے مطابق ایک کام انجام دیا جائے۔ یہ درجہ متوسط ہے، یہ اخلاص سے اس قدر بعید نہیں جس قدر دوسرا فعل ہے۔

اس کی مثال یہ ہے کہ ہم نماز پڑھیں اور مقصد یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ ہم سے راضی ہو، اس کے سوا اور کوئی نیت نہ ہو۔ یہ اخلاص کا درجہ کمال ہے۔ ایک یہ صورت ہے کہ نماز پڑھتے ہوئے کسی دوسرے شخص کو دکھانے کا خیال ہو کہ فلاں شخص میرے خشوع و خضوع کو دیکھ کر میرا معتقد ہو جائے گا۔ یہ بالکل اخلاص کے خلاف ہے۔ ایک صورت یہ ہے کہ ہم حسب معمول نماز پڑھ لیں اور کوئی خیال دل میں نہ ہو۔ یہ صورت بین بین ہے۔ یہ اگر اخلاص کا درجہ نہیں تو اخلاص کے زیادہ منافی بھی نہیں۔ البتہ کسی حد تک اخلاص کے قریب ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ کام اپنے اختیار سے کیا جائے وہ کسی غرض کے تصور سے خالی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے تعلق باللہ کے لئے ضروری ہے جو افعال ہند سے صادر ہوں وہ محض رضائے الہی کے لئے ہوں۔ کوئی کام کیسا ہی نیک ہو

اُس میں جس قدر اخلاص زیادہ ہوگا اسی قدر اجر و ثواب بڑھتا جائے گا۔ حدیث میں آیا ہے کہ میرا صحابی اگر آدھ سیر جو اللہ کی راہ میں خرچ کرے تو وہ دوسرے کے اُحد کے برابر سونا خرچ کرنے سے بہتر ہے۔ چونکہ صحابہ کے دلوں میں خلوص و محبت دوسروں سے بہت زیادہ تھی اس لئے اُن کے صدقات و حسنات بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

محبت: کا ملنا متوقع ہو۔ (مفردات امام راغب)

ظاہر ہے کہ محبت ایک ہی قسم کی نہیں ہوتی، بلکہ بنیادی طور پر اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ محبت جس کی بنیاد عقل پر ہوتی ہے اور جو اپنے طور پر خواہ کتنی ہی ترقی کر جائے محبت ہی رہتی ہے۔ دوسری محبت وہ ہوتی ہے جس کا سرچشمہ طبعی جذبات ہوتے ہیں۔ اور یہی وہ محبت ہوتی ہے جو اگر حد سے بڑھ جائے تو عشق کہلاتی ہے۔ یہ ایک بذریعہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کا ادراک ہم حسی اور طبعی طور پر نہیں کھتے۔ اس لئے اُس سے کی جانے والی محبت بھی دراصل عقلی نوعیت ہی کی ہوتی ہے۔ قرآن حکیم نے عشق کے لفظ اور اس کے فطری تقاضوں کے ذکر سے مکمل اجتناب کر کے یہ ظاہر کر دیا کہ اُسے جو محبت مطلوب ہے وہ بھی عقلی محبت ہے، نہ کہ وہ محبت جو طبعی اور جذباتی ہوتی ہے۔ الغرض تعلق باللہ کی تیسری بنیاد اخلاص و محبت ہے۔ دین میں ایمان یا اطاعت معتبر نہیں جو اللہ کی محبت اور اخلاص پر مبنی نہ ہو۔ محبت بھی محض ظاہری اور رسمی قسم کی مطلوب نہیں، بلکہ ایسی محبت مطلوب ہے جو تمام محبتوں پر غالب آجائے۔ جس کے مقابلہ میں عزیز سے عزیز رشتے اور محبوب سے محبوب تعلقات کی قدر و قیمت بھی باقی نہ رہے۔ جس کے لئے دنیا کی ہر چیز کو چھوڑا جا سکے، لیکن اس کو کسی قیمت پر نہ چھوڑا جاسکے، قرآن مجید میں اس محبت کا معیار یہ بتایا گیا ہے:-

”کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارا خاندان اور مال جو تم نے کمایا ہے اور تجارت جس کے گرجانے کا تمہیں اندیشہ ہے اور مکانات جو تمہیں پسند ہیں، تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اُس کی راہ میں جہاد سے زیادہ عزیز نہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر کر دے۔“ (التوبہ-۲۴)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”ایمان کی حقیقی لذت سے وہی آشنا ہو سکتا ہے جس کے نزدیک اللہ اور اس کا رسول

صلی اللہ علیہ وسلم دوسری تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہوں۔ (صحیح بخاری و مسلم)

لیکن یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ اللہ سے جو خلوص و محبت مطلوب ہے۔ ہے اس سے مراد وہ جذباتی محبت نہیں جو انسان کو بیوی بچوں سے ہوتی ہے۔ بلکہ وہ عقلی اور اصولی محبت ہے جس کی بناء پر انسان اپنی

عزیز ترین بھائیوں پر ان اصولوں کو مقدم رکھتا ہے۔ اگر ان اصولوں کی راہ میں خود اس کا اپنا نفس مزاحم ہوتا ہے تو اس سے لڑتا ہے، دوسرے مزاحم ہوتے ہیں تو ان کا مقابلہ کرتا ہے، یہاں تک کہ بیوی بچے، خاندان، ملک اور قوم بھی ان اصولوں کے مخالف ہو جاتے ہیں تو ان سب کے مطالبات ٹھکرا دیتا ہے۔ مندرجہ صدر بیان اس حقیقت کی آئینہ داری کرتا ہے کہ اللہ سے محبت کا یہی تقاضا ہے کہ اس کے احکام و فرامین پر عمل کیا جائے اور اگر نہ کیا جائے تو عشق و محبت کے تمام دعوے کھو بیٹھے اور یہ بنیاد ہیں۔ حدیث جبریل — جس میں دین کے اصول و مبادیات پر روشنی ڈالی گئی ہے — میں بول کر:

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے حضرت جبریل کے دریافت کرنے پر کہ احسان کیا چیز ہے، فرمایا:

”اَلْاِحْسَانُ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَّمْ تَرَكَ تَرَاهُ فَإِنَّ لَّهُ سَكْرًا لَا قَاتَ لَهُ يَرَاهُ“ (صحیح بخاری)

تعلق باللہ یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے تو اسے دیکھتا ہے اور اگر ایسا نہ ہو سکے تو یہ سمجھے کہ وہ تجھے دیکھتا ہے۔

اس حدیث پاک میں حقیقی اخلاص، خشوع و متقون اور توجہ الی اللہ کی منظر کشی کی گئی ہے۔ یعنی اللہ کی عبادت کرتے وقت انہماک و تہیت اور توجہ الی اللہ کا یہ عالم ہو کہ انسان یہاں تصور کرے کہ وہ ان مادی آنکھوں سے جمال الہی کا نظارہ کر رہا ہے اور پوری کائنات کا تصور اس کی توجہ ان سے مٹ چکا ہے۔

پس ایمان، اطاعت اور اخلاص وہ ستون ہیں جن پر تعلق باللہ کی عبادت کو اتوار کیا جاسکتا ہے۔ یہ تینوں امور اس قدر جامع اور ہمہ گیر ہیں کہ دین کے کلیات سے لے کر فروع و جزئیات تک کوئی چیز ان کے احاطہ سے باہر نہیں۔ ان کے بغیر تعلق باللہ کے سب دعوے بے کار ہیں۔

زبان نے کہہ بھی دیا لا الہ الا تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں (ایمان)

(۴) رسالت

۱۔ انبیاء کی ضرورت | انسان کو انبیاء کی کیا ضرورت ہے؟ رسولوں کا سلسلہ کیوں قائم کیا گیا؟ ان پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے؟ ان مسائل پر غور کرنے کے

لئے ہمیں ذرا دور سے جانا ہوگا یعنی پہلے یہ دیکھنا پڑے گا کہ انسان کو اپنی زندگی میں فلاح کیوں کر پائی ہو سکتی ہے اور وہ صحیح کامیابی کیوں کر حاصل کر سکتا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ دنیا کی کامیابی زیادہ عرصہ قائم رہنے والی نہیں ہے بڑی کامیابی یہ ہے کہ انسان کو آخرت میں جو باقی رہنے والی ہے، کامیابی نصیب ہو۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہے کہ انسان دونوں عالم میں کامیابی حاصل کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے مقاصد کا تعین صحیح طور پر کرے اور اس کے حصول کے لئے صحیح راہ عمل تلاش کرے، اس کے لئے اسے ہدایت کی ضرورت ہے تاکہ وہ یہ معلوم کر سکے کہ فلاح کس عقیدے اور کس طریقہ میں ہے۔

اسلام نے اس دو گونہ کامیابی کے حصول کا جو طریقہ بتایا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت ہے۔ اس لئے کہ ہدایت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتی ہے اور اس کی اطاعت کے ذریعہ اس ہدایت سے پورا فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

اللہ کی بندگی اور اطاعت کا نام آتے ہی فطری طور پر اللہ کے احکام اور مرضیات کا سوال سامنے آکھڑا ہوتا ہے کیوں کہ اطاعت احکام ہی کی ہوتی ہے اور احکام کے بغیر اس کا کوئی تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے ایک انسان جو ہی اپنے پروردگار کا بندہ اور اطاعت گزار بن کر رہنے کا فیصلہ کرے گا وہ لا محالہ یہ جاننا چاہے گا کہ اس کے مالک کے وہ احکام کیا ہیں جن کی اسے اطاعت کرنی ہے، اس کا مالک کن باتوں کو پسند کرتا ہے اور کن باتوں کو ناپسند کرتا ہے؟ اس کا فائدہ اٹھانے کے لئے اسے کیا کرنا چاہیئے اور اس کی نافرمانی سے محفوظ رہنے کے لئے اسے کیا کرنا چاہیئے؟ یہ ساری باتیں جانے بغیر اطاعت الہی کی راہ میں پہلا قدم بھی نہیں اٹھایا جاسکتا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام و مرضیات کے جاننے کا ذریعہ کیا ہے؟ انسان یہ کیسے معلوم کر سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں فلاں باتوں کے کرنے کا حکم دیا ہے اور فلاں فلاں کاموں سے روکا ہے؟

اس کے جواب میں جن چیزوں کا نام لیا جاسکتا ہے۔ ان میں سے ایک تو ہر شخص کی اپنی

عقل ہے۔ لیکن انسان کے لئے بطور خود یہ معلوم کرنا دشوار ہے کہ اس کی زندگی کے اور اس کائنات کے بنیادی حقائق کیا ہیں؟ اس کے نافی و پروردگار میں کیا صفات پائی جاتی ہیں؟ انسانوں سے ان صفات کے تقاضے کیا ہیں؟ اور ہمارے لئے اس کے احکام کیا ہیں؟ غرض کہ اس سلسلے میں عقل کی نارسائی بالکل مسلمہ و ثابت ہے۔

دوسری چیز انسان کا وجدان اور اس کی قلبی قوت کیا ہے۔ لیکن اس قوت کا معاملہ بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ رہاضت نفس کی کوئی بڑی سے بڑی کوشش بھی یہاں کوئی کارکردگی نہیں دکھائی سکتی کیوں کہ انسان اپنے یا غور کو مانعہ کر چاہے کیسا ہی آئینہ کیوں نہ بنائے، اس میں اللہ تعالیٰ کے احکام و مریضیات کا لمس آپ سے آپ ہرگز نہیں دکھائی دے سکتا۔ آئینے میں کسی چیز کا عکس پڑنے کے لئے یہی نوکالی نہیں ہے کہ آئینہ صاف اور چمک دار ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ چیز کھلی شکل میں اس کے سامنے اور قریب ہو۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ جب تک خود ہی اپنے احکام کا تعین کر کے انہیں وجود میں نہ لائے اور وجود میں لاکر قلب انسانی کے سامنے نہ رکھ دے، لاکھ فنا اور چمک دار ہونے کے باوجود بھی اس کے اندر ان کی چھاپ نہیں پڑ سکتی۔

تیسری چیز مختلف افراد کے الگ الگ انداز فکر کے بجائے اجتماعی غور و فکر ہے۔ لیکن جس طرح ہزاروں اور لاکھوں اندھے مل کر ایک آنکھوں والے شخص کی حیثیت حاصل نہیں کر سکتے اسی طرح افراد انسانی کی کوئی بڑی سے بڑی تعداد بھی احکام الہی کے دریافت کر لینے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ آخر بہت سے افراد کا مجموعہ بھی تو ایسے ہی لوگوں سے مل کر بنا ہو گا جن میں کوئی ایک فرد بھی ایسا نہ ہو گا جو اپنی عقل سے احکام الہی معلوم کر لینے کا خواب بھی دیکھ سکے۔ اس لئے یہ ذریعہ بھی اتنا ہی ناکام و ذریعہ ہے جتنا کہ پہلا۔

اس طرح ہم نے دیکھا کہ ان تینوں ذرائع میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں جو انسان کی یہ ضرورت پوری کر سکے۔

بلاشبہ بہت سے کام ایسے ہیں جن کا برا یا بھلا ہونا ہمیں خود بخود محسوس ہو جاتا ہے اور ان کی برائی یا بھلائی کا فیصلہ ہم اپنی عقل یا اپنی فطرت یا اپنے وجدان سے کر سکتے ہیں۔ اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہدایت الہی بھی برے اور بھلے کاموں کے تعین ہی کا دوسرا نام ہے۔ لیکن محض اتنی سی بات سے یہ خیال کر بیٹھنا صحیح نہ ہو گا کہ انسان بطور خود اللہ تعالیٰ کے سامنے احکام اور مریضیات کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ کیونکہ کچھ کاموں کے برے یا بھلے ہونے کا علم و اندازہ تمام کاموں کے بارے میں علم و اندازے کا قائل مقام کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ ذرا اپنی دنیا کو دیکھئے آخر وہ کتنی قدروں میں متفق ہے؟ کتنے کام ہیں جن کے بھلے ہونے پر اور کتنے کام ہیں جن کے برے

ہو جائے۔ یہ تو نوع و نسل کی مشابہت ہے؟ بڑی بجاہت کے یہ کہہ کر ایسے کاموں اور ایسی قدریں کی کوئی قابلِ اعتداد نہیں بن سکتے جن کی بھارتی اور برطانوی ہر تمام لوگوں کا اتفاق ہو اور جن کا تقویٰ ہی بظاہر میرا اتفاق ہوگا تفصیلات میں یہ اتفاق بھی قائم نہیں رہے گا۔ چند باتوں کے برے یا بھلے ہونے کا فیصلہ اگر نوع انسان کی کر ہی سکتی ہے تو یہ خیر و شر کے پورے مسئلے کو حل کر سکنے کی قابلیت کی نشانی نہیں ہو سکتی۔ بلاشبہ یہ نہ کہا جائے گا کہ دئے کی روشنی، روشنی ہی نہیں ہے لیکن یہ ضرور کہنا پڑے گا کہ پوری دنیا کو متور کر دینے کے لئے سورج کی ضرورت ہے اور ڈھلتا ہوا دیا سورج کی بجگہ نہیں لے سکتا۔

غرض اس معاملے میں انسانی قوتوں کی بے بسی ایک مانی ہوئی حقیقت ہے جس کے خلاف نہ عقل کچھ کر سکتی ہے نہ تجربہ و مشاہدہ زبان کھول سکتا ہے اس صورت حال کا مطالبہ واضح طور پر یہی تھا کہ اس معاملے میں انسان کو بھٹکنے کے لئے چھوڑنے کے بجائے اس کی اوپر سے رہنمائی کی جاتی کیونکہ اس کی اپنی فکری اور وجدانی قوتوں میں اگر یہ صلاحیت نہ تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مرضیات و علوم کر لیتیں۔ حالانکہ انسان کو اس بات کی ضرورت اتنی ہی تھی، جتنی غذا اور پانی کی۔ کہ اب اس کی ضرورت کے پوری کرنے کی شکل اس کے سوا اور کوئی رہ ہی نہیں جاتی کہ اس کا اللہ کی طرف سے کوئی خارجی انتظام ہو۔

ایک طرف تو یہ صورت حال اور انسان کی سب سے بڑی بنیادی ضرورت تھی۔ دوسری طرف اللہ کی رحمت تھی، اس کی رحمت تھی، اس کا عدل تھا، اس کی حکمت تھی اور ان میں سے ہر ایک صفت کا مطالبہ تھا کہ انسان کو یوں بے بسی کے اندھیرے میں نہ چھوڑا جائے بلکہ اس کی مدد کی جائے، اس کو وہ احکام صاف صاف بتا دیئے جائیں جن کے بدلے فیروزہ بندگی اور اطاعت کی راہ اختیار کر ہی نہیں سکتا۔ ایسی حالت میں ممکن ہی نہ تھا کہ اللہ رب العالمین اپنے احکام و مرضیات کو انسانوں تک پہنچانے کے لئے کوئی خارجی اہتمام نہ کرنا اور اس سلسلے میں ایک دن کی بھی تاخیر روا رکھی جاتی، اور نسل انسانی کی ابتداء کے ساتھ ہی ساتھ اس اہتمام کی بھی ابتداء نہ ہو جاتی۔ جس پروردگار نے انسان کی مادی ضروریات کا اتنا بڑا انتظام کر رکھا تھا، اس کی شان پروردگاری سے بالکل بیحد تھا کہ وہ اس کی اخلاقی، دینی اور سماجی ضرورتوں کی طرف توجہ نہ فرماتا۔ جس آقا نے انسان پر اپنی مرضی کی راہ چلنے کی ذمہ داری ڈالی تھی اس کی رحمت اور اس کا انصاف یہ کیسے گوارا کرتا کہ وہ اسے اس راہ سے باخبر کرنے کا ضروری انتظام نہ کرے چنانچہ اس نے یہ انتظام کیا۔ اور یہی وہ انتظام ہے جسے دین کی اصطلاح میں ”رسالت“ کہا جاتا ہے اور جس واسطے سے یہ انتظام ہوتا ہے اسے ”رسول“ کہتے ہیں۔

جہاں یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ رسالت کے بغیر انسان اللہ تعالیٰ کے احکام سے واقف نہیں ہو سکتا و یاں اس بات کو بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ مومن اور مسلم بننے کے لئے رست پر ایمان لانا اتنا انتہائی ضروری ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح آنکھوں کی پتلی میں بینائی ضروری ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو چیز کسی منزل تک پہنچنے کا واحد ذریعہ ہو جب تک اسے اپنا نہ لیا جائے منزل تک پہنچنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس کے علاوہ غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ رسالت کی عملی اہمیت اس سے بھی اونچی ہے۔ نہ صرف یہ کہ اس کے بغیر اللہ کے احکام کو نہیں جانا جاسکتا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس کے بغیر خود اللہ اور آخرت کو بھی نہیں جانا جاسکتا۔ رسالت ہی وہ ذریعہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت اور آخرت کا صحیح علم عطا کرتا ہے۔ اس لئے رسالت کے بغیر اللہ اور آخرت پر ایمان بھی ایسا کہ چاہیئے نہیں لایا جاسکتا۔

۲۔ انبیاء کی بنیادی خصوصیات | اس سے پہلے ”انبیاء کی ضرورت کے تحت ہم دیکھ چکے ہیں کہ انسانوں کو جیسے ہوا اور پانی کی ضرورت ہے

ویسے ہی الہامی ہدایت اور انبیاء کی تعلیم کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں سب سے پہلے جس انسان (حضرت آدمؑ) کو بھیجا اسے منصب نبوت سے سرفراز کیا۔ حضرت آدمؑ نے اپنی اولاد تک خدا کے تمام فرمان پہنچائے اور ان کی اولاد نے اپنے بیٹوں، پوتوں تک ان ہدایات کو منتقل کیا۔ لیکن جوں جوں انسانی نسل پھیلتی اور دور دراز کے علاقوں میں آباد ہوتی گئی اس تعلیم کے نقوش مدہم پڑتے گئے، یہاں تک کہ بہت سے لوگوں نے ان تعلیمات کو فراموش کر دیا۔ ان جگہوں پر اللہ تعالیٰ نے دوسرے انبیاء بھیجے تاکہ انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی کا کام سرانجام دیں۔ یہ پیغمبر مختلف زمانوں اور مختلف علاقوں میں آئے۔ ان میں چند مثلاً حضرت نوح۔ حضرت ابراہیم، حضرت اسمعیل، حضرت اسحاق، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام سے ہم ابھی طرح مانوس ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ بھی ہزار ہا انبیاء آئے۔ ایک اندازہ کے مطابق تمام انبیاء کی تعداد تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے۔

قرآن کریم میں انبیاء کی جو خصوصیات بیان کی گئیں ہیں ان میں سے نمایاں خصوصیات ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

۱۔ بشریت | اگرچہ انبیاء نے کرام علیہم السلام باطن اور معنویت میں عام انسانوں سے بہت بلند تھے لیکن اس کے باوجود وہ سب انسان ہی تھے۔ نہ وہ فرشتوں کے گروہ سے تھے اور نہ جنوں سے۔ اسلام کے نزدیک یہ عقیدہ بھی غلط ہے کہ خدا یا اس

کا بیٹا یا اس کا کوئی اوتار انسانی شکل میں آکر الہامی ہدایت پہنچائے۔ دراصل انبیاء میں الوہیت کا ادنیٰ سا شاہد بھی تسلیم کر لینے کے بعد توحید و نبوت کی حیثیتیں مثبت ہو جاتی ہیں۔ خدا کی کیناٹی کا تصور مجروح ہوتا ہے اور انبیاء کی بعثت کا اصل مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نبی نے ہمیشہ اس بات کا اعلان کیا کہ:

”إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ“ (الکہف) | میں تمہاری طرح کا ایک انسان ہوں۔

قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ بسا اوقات انبیاء پر یہ اعتراض بھی ہوا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ایسا شخص جو ہماری طرح کھانا پیتا اور دیگر انسانی ضروریات رکھتا ہے نبوت کے منصب پر فائز ہو جائے۔ لیکن ان کے اعتراضات کے باوجود انبیائے کرام نے کبھی یہ نہیں کہا، نہیں، ہم تو بشر نہیں ہیں اس سے بلند تر کچھ چیز ہیں، ان کا متفقہ جواب تھا:-

”إِنَّا نَحْنُ الْبَشَرُ مِثْلُكُمْ“ (ابراہیم - ۱۱) | بلاشبہ ہم تمہاری طرح انسان ہونے کے علاوہ کچھ نہیں۔

خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی یہی اعتراض ہوا، لوگوں نے کہا کہ اگر خدا کو کوئی پیغامبر بھیجنا ہی تھا تو وہ ہمارے ہی جیسے انسان کے بجائے کسی فرشتے کو کیوں نہ بھیجتا۔ قرآن نے اس کا جواب دیا کہ:

”اگر اس زمین پر فرشتے ہی چلتے پھرتے اور آباد ہوتے تو ضرور ہم ان پر آسمان سے فرشتے ہی کو رسول بنا کر بھیجتے“ (بنی اسرائیل : ۹۵) -

یہ درحقیقت بڑا ہی حکیمانہ جواب ہے۔ اس لئے کہ (جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے) پیغمبروں کا کام محض یہ نہیں ہے کہ نوحو باللہ ڈال دیکے کی طرح اللہ کی کتاب پہنچا دیں بلکہ ان کے کاموں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اپنی زندگی کو ہدایات الہی کا منظر بنا کے دکھادیں اور دنیا کے سامنے مثال اور نمونہ بن کر پیش ہوں۔ اب اگر فرشتوں یا کسی اور مخلوق کو پیغمبر بنا کر بھیجا جاتا تو اگرچہ وہ خدا کا پیغام پہنچا دیتے لیکن فرشتہ ہوتے ہوئے آخر وہ ان احکام پر کیسے عمل کر پاتے جن کا تعلق خاص بشری جذبات و داعیات اور مخصوص انسانی مسائل سے ہے اور جب وہ شریعت کے ایک بڑے حصے پر عمل ہی نہ کر پاتے تو اپنے پیروؤں کے لئے اچھا نمونہ کیسے ثابت ہوتے مزید برآں فرشتہ یا دیگر غیر انسانی مخلوقات کی مثال انسانوں کے کام کی ہی نہیں ہو سکتی اس لئے کہ انسان اقتہا اسی کی کر سکتا ہے جو قوت و اختیار کے اعتبار سے اسی جیسا ہو مختلف الجنس مخلوق ہیں موعوب تو کر سکتی ہے لیکن ہمارے لئے نمونہ نہیں بن سکتی۔

۲۔ وہبیت | وہبیت کے معنی یہ ہیں کہ رسالت کوئی اکتسابی شے نہیں جو محنت اور تلاش و جستجو سے مل جائے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا خصوصی عطیہ ہے اور اسی

شخص کو ملتی ہے جسے وہ مرحمت فرماتا ہے۔ اس کے ملنے میں انسانی کوشش اور ارادے کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔

اکثر پیغمبروں کے حالات میں ہمیں یہ ملتا ہے کہ آغاز وحی سے پہلے وہ ایک عرصے تک عبادت و مراقبہ میں مشغول رہے۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام تورات کے ملنے سے پہلے چالیس روز تک روزے کی حالت میں کوہ طور پر رہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام ایک انسان جنگل میں ۴۰ روز تک عبادت میں مشغول رہے۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مہینوں غار حرا میں عزلت گزریں رہے۔ اس طرح کی عبادت اور صفتِ نفس میں وحی کے قبول کرنے کی استعداد پیدا کر دیتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود نبوت کا منصب انسانی نہیں جو محنت و کوشش سے حاصل ہو جائے بلکہ جس طرح خدا نے تعالیٰ نے انسانوں میں مختلف کمالات عطا کئے ہیں لیکن ان کے بالفعل حصول کے لئے جدوجہد کرنی پڑتی ہے اسی طرح انبیاء میں نبوت بالقوہ موجودہ ہوتی ہے البتہ قبول وحی کے لئے استعداد حاصل کرنے کے لئے انبیاء کو بھی تیاری کرنی پڑتی ہے۔ اسی سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اگر کوئی دوسرا شخص اسی قسم کی عبادت و ریاضت خواہ کتنی ہی کیوں نہ کر سے چونکہ بالقوہ نبوت کی صلاحیت سے محروم ہے لہذا نبوت حاصل نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس منصب و ذمہ داری کے لئے افراد کا انتخاب خود کیا۔ اس انتخاب خود کو قرآن کی زبان میں اصطفا کہتے ہیں۔ اصطفا کے معنی ہیں بہت اسی چیزوں میں سے بہترین چیز کو چن لینا۔ یہ لفظ خود بتاتا ہے کہ رسالت کے لئے انتخاب ایسے ہی افراد کا ہوا تھا جو خدا کے نزدیک اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کے اعتبار سے اس عظیم مقصد کے لئے موزوں ترین تھے۔ چنانچہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین نے آپ کے نبی بنائے جانے پر اعتراض کیا اور اپنے لئے بھی برابر کے استحقاق کی باتیں کیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”أَلَمْ أَعْلَمْ بِمَا تُحِبُّونَ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ“ | اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ اسے اپنی پیغمبری کون عطا کرنی چاہیئے۔ (الانعام - ۱۲۵)

۳۔ تعلیماتِ مرن جانب اللہ | پیغمبرِ دین اور شریعت کے نام پر جو کچھ انسانوں کے سامنے پیش کرتے ہیں وہ سب اللہ کی جانب سے ہوتا ہے۔ وہ ہدایت ربانی کے تابع ہوتے ہیں، نہ خود ان کی کوئی مرضی ہوتی ہے اور نہ ذاتی ارادہ۔ وہ وہی کرتے اور کہتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے:

”وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۚ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ“ (الانعام - ۳۳)

نبی کی ساری تعلیمات کے اللہ ہی کی جانب سے ہونے کا مطلب بہت وسیع ہے۔ اس کی

دو نوعیتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام متعین لفظوں میں خود براہ راست یا فرشتے کے ذریعے نبی کو سکھا دیئے ہوں۔ دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو خصوصی حکمت اور نور نبوت اس کو عطا ہوئے ہیں ان کے ذریعہ اس نے خود مزید احکام نکالے ہوں، یہ دونوں قسم کی تعلیمات بلا واسطہ یا بالواسطہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتی ہیں۔

”وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ“ (یعنی) جو کچھ حکم رسول تمہیں دے اسے مان لو اور حرج نہ کرو
 وَمَا نَهَاكُمُ عَنْهُ فَانْتَهُوا (الحشر۔ ۵۱) سے وہ منع کر دے اس سے رک جاؤ۔

۴۔ عصمت | بنی معصوم ہوتا ہے۔ اس سے نہ فکر و اجتہاد کی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں نہ اخلاق و اعمال کی لغزشیں۔ نفس اور شیطان کی دراندازیوں سے اس کے جذبات، اخلاق و افکار اور اعمال سبھی پاک ہوتے ہیں لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس میں غلط کام کرنے کی قابلیت ہی نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان کی طبعی اندیاز علیہم السلام کے اندر بھی یہ قابلیت طبعی طور پر لازماً موجود ہوتی ہے، لیکن اس قابلیت کو بروئے کار آنے میں کامیابی نہیں ہو پاتی۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کی فکر و بصیرت بھی حد درجہ کامل ہوتی ہے اور اس کی اخلاقی قوت بھی۔ ایک طرف تو وہ احکام الہی کا منشا سمجھنے اور ان سے اپنے اجتہاد کے ذریعہ مزید احکام نکال لینے کی بہترین صلاحیتیں رکھتا ہے۔ دوسری طرف اسے اپنے نفس پر پورا پورا قابو حاصل ہوتا ہے اور اس کی اخلاقی حس، اس کا خوف خدا اور اس کا اندیشہ آخرت اس درجہ ترقی یافتہ ہوتے ہیں کہ گناہ کے محرکات سراٹھا ہی نہیں پاتے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان پر اللہ تعالیٰ کی خصوصی نگرانی رہتی ہے اور یہی نگرانی انہیں فکر و اجتہاد کی غلطیوں اور اخلاق و عمل کی کوتاہیوں سے بچائے رکھتی ہے۔ اور اس طرح اس کا ہر قول حق اور ہر عمل صحیح و صواب ہوتا ہے اور پوری زندگی ایک صاف اور روشن آئینہ کی مانند ہوتی ہے۔ جسے خالق کائنات نے انسانوں کے لئے اسوہ (مثالی نمونہ) مقرر فرمایا ہے اور جس کی اتباع میں نجات ہے۔

درحقیقت نبی کا معصوم ہونا اس مقصد کے لئے بالکل ناگزیر تھا جس کے لئے رسالت کا

کاسلسلہ قائم کیا گیا ہے۔ ایک ایسا آدمی جس کے متعلق یہ اندیشہ ہو کہ وہ جھوٹ بول سکتا ہے، یا خیانت کر سکتا ہے یا نفسانیت کا شکار ہو سکتا ہے، یا منشاۓ الہی کی غلط ترجمانی کر سکتا ہے، آخر دوسروں کا اعتماد کیسے حاصل کر سکتا ہے۔ لوگ کیسے یقین کریں کہ وہ فلاں حکم دیتے ہوئے سچ بول رہا ہے۔ یا خدا کے نام پر جو ہدایات دے رہا ہے وہ سب کی سب فی الواقع خدا کی طرف سے ہیں۔ اور اس نے اپنی طرف سے کوئی کمی و بیشی نہیں کی جس کا دامن غلطیوں یا گناہوں سے آلودہ ہو، لوگوں کے لئے اعلیٰ ترین اور قابل تقلید نمونہ (اسوہ حسنہ) کیسے بن سکتا ہے؟ نبی کو چوں کہ

اللہ تعالیٰ نے احکام الہی کی مکمل اطاعت کا اعلیٰ ترین نمونہ بنا کر بھیجا تھا لہذا ان کے دامن کو گناہ کی آلودگی سے پاک رکھنا تاکہ لوگ بلا خوف و خطر ان کی زندگی کے ہر پہلو کی پیروی کر سکیں۔ یاد رہے کہ نبی نہ صرف یہ کہ معصوم ہوتا ہے بلکہ فی الحقیقت معصوم صرف نبی ہی ہوتا ہے۔ فکر و اجتہاد کی غلطیوں اور سیرت و کردار کی لغزشوں سے پاک ہونا صرف اللہ کے انہی خاص نمونوں کا حصہ ہے۔ دوسرے لوگ خواہ فہم و بصیرت اور نیکی و تقویٰ کی کتنی ہی بلند چوٹیوں پر کیوں نہ پہنچ جائیں لیکن معصوم عن الخطا نہیں ہو سکتے یہی وجہ ہے کہ بزرگوں کی زندگیاں قابل تقلید ضرور ہیں لیکن ان کے اعمال دین میں حجت بالذات نہیں ہیں اور نہ تنقید سے بالا تر ہیں۔ اس کے مقابلہ میں انبیاء کی زندگیاں سند و حجت کی بناء پر تنقید سے بالا تر ہیں۔

۵۔ ہر قوم کے لئے نبی | ان موٹی موٹی باتوں کے علاوہ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ انبیاء ہر قوم میں بھیجے گئے ہیں :-

وَرَأٰی قَسَمَ اُمَمٍ اِلَّا خَلَاۤیَہَا نَذِیْرٌ
(فاطر - ۲۴)

اس کی وجہ ظاہر ہے۔ تمام انسان برابر ہیں اور سب ایک ہی مقصد کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اللہ کی بندگی سبھی کا فریضہ ہے اور آخرت میں اس فرض کے متعلق ہر ایک سے پوچھ گچھ ہوگی۔ پھر ایسا کیوں ہوتا کہ کچھ لوگوں میں تو اللہ نبی بھیجتا اور باقی لوگوں کو ان سے محروم رکھتا حالانکہ وہ خالق و مالک سب کا ہے۔

ان تمام انبیاء کو ماننا ہر مسلمان کا فرض ہے، اور نہ صرف ماننا بلکہ ان کا احترام کرنا بھی ضروری ہے۔ بدقسمتی سے اکثر مذاہب اس سلسلے میں اپنے پیروؤں کی تنگ نظری کا شکار ہو گئے ہیں۔ یہودیوں پر انیلے بنی اسرائیل کے علاوہ کسی اور نبی کا اقرار فرض نہیں رہا، ہندو تمام غیر ہندو انسانوں کو بلیچھ اور چنڈال سمجھ کر یہی بہترین ہندو رہ سکتے ہیں۔ مسیحی عاقلوں میں پیغمبر اسلام کی جی بھر کر توہین ہوتی ہے، غرض کہ عام طور پر ایک مذہب کے ماننے والے اپنے دائرے کے باہر کسی نبی کی عزت و توقیر ضروری نہیں سمجھتے، لیکن مسلمان ایسا نہیں کر سکتے، ان پر تمام انبیاء کی تعظیم فرض ہے۔

۶۔ منصب رسالت | انبیاء علیہم السلام کے منصب اور ان کے درجے کے بارے میں اچھی خاصی غلط فہمیاں رہی ہیں اور بعض حلقوں میں اب بھی ہیں۔

ایک طرف تو یہ خیال تھا کہ انبیاء درجہ بشریت سے بلند فرشتے یا خدا ہوتے ہیں، یا کم از کم خدائی میں مقنورے بہت شریک ہوتے ہیں۔ حالانکہ انبیائے کرام نے خود ہمیشہ اس کی تردید کی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا:

میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے قبضے میں خدا کے خزانے
ہیں اور نہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں اور نہ میں
یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔

”وَلَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ اللَّهِ
وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبُ وَلَا أَشْوَلُ إِنِّي
مَلَكٌ“ (ہود - ۲۱)

اسی طرح بعض انبیاء علیہم السلام کو ان کی قوموں نے خدا کا بیٹا بنایا۔ حالانکہ انہوں
نے بھی اعلان کر دیا تھا:

”میں اللہ کا بندہ ہوں اور اللہ تعالیٰ نے مجھے
کتاب دی اور نبی بنایا ہے۔“

”إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ إِنِّي أَلْهَيْتُ الْكِتَابَ وَ
وَجَعَلَنِي نَبِيًّا“ (مریم - ۳۰)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ کر کہ کچھلی امتوں نے اپنے انبیاء کی تعظیم و تکریم میں غلو
کرتے کرتے انہیں خدا کی مرتبے تک پہنچا دیا۔ اس بات کا بڑا خیال رکھا کہ کوئی شخص آپ کی
ایسی بے جا تعظیم نہ کرے جس سے فتنہ پیدا ہو۔ کئی بار لوگوں نے آپ کو سجدہ کرنے کی اجازت
چاہی لیکن آپ نے سختی سے روک دیا اور بار بار خدا کے سامنے اپنی بندگی اور بیچارگی کا اعلان کیا۔
ایک طرف تو انبیاء کے مرتبے میں اس درجہ غلو کیا گیا کہ انہیں خدا کی تک پہنچا دیا گیا۔ دوسری
طرف ایک گروہ نے رسالت کے درجے کو اس قدر کم سمجھا کہ رسول کی حیثیت ایک ڈاکہ یا نامہ بردار
سے زیادہ نہ رہی، انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ نبی کا کام اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ اللہ کی کتاب لے آئے
تک پہنچا دے اور بس۔ لیکن اگر رسولوں کا کام اتنا ہی ہوتا تو خدا یہ کام دوسروں سے بھی لے سکتا
تھا۔ آخر اس کے لئے یہ کیا مشکل تھا کہ لوگوں پر کبھی لکھائی کتابیں نازل کر دیتا یا فرشتوں کے
ذریعے کتب بھیج دیتا۔ لیکن چونکہ شہادت کا کام بڑا وسیع ہے لہذا اللہ تعالیٰ نے انبیاء و رسول بھیجے، ان
انبیاء کی ذمہ داریاں اور ان کے مناصب کیا تھے، اس سلسلے میں ہم قرآن سے رہنمائی حاصل کریں گے
کہ اس نے انبیاء کی کیا حیثیت بیان کی ہے۔

۷۔ قابل اطاعت | قرآن کریم کی رو سے نبی کی مکمل اطاعت اور پیروی ضروری ہوتی
ہے اور ایسا سمجھنا شرط ایمان ہے۔ دین و شریعت کے دائرے

میں نبی جو کچھ بھی کہتا ہے ایک مومن کا فرض ہے کہ اس کی تعمیل میں جو ن و چراغ نہ کرے اور مصلحت خواہ
اس کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے بہر صورت یقین رکھے کہ وہ خیر ہی خیر ہے اور سراپا حق ہے۔ اللہ تعالیٰ
نے فرمایا ہے:

ہم نے جس رسول کو بھی بھیجا اسی لئے بھیجا کہ اذن
خداوندی کے مطابق اس کی اطاعت کی جائے۔

”وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ
بِإِذْنِ اللَّهِ“ (النساء - ۶۴)

پھر یہ اطاعت بھی صرف ظاہر کی حد تک نہیں ہونی چاہیئے بلکہ دل کی رضا کے ساتھ ہونی چاہیئے۔

نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے حق اطاعت کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

فَلَا تَعْصِي لِرَءَايِهِمْ شَيْئًا
يُحِلُّهُ لَكَ فِي حَقِّهِمْ شَيْئًا
وَأَنِيعُوا أَفْئِدَتِكُمْ
وَأَنْفُسَكُمْ وَأَعْيُنَكُمْ
وَأَنْفُسَكُمْ وَأَعْيُنَكُمْ
وَأَنْفُسَكُمْ وَأَعْيُنَكُمْ
(النساء - ۵۹)

اور یہ بات عقل کے مطابق بھی ہے اس لئے کہ اگر انسان کے لئے اللہ تعالیٰ کے احکام کو جاننے کا واحد ذریعہ نبی ہے تو نبی کی کامل اطاعت اور پیروی کے بغیر اللہ کی اطاعت اور بندگی کی کوئی شکل رہ ہی نہیں باقی رہی و جس سے کہ ہر نبی نے اپنی دعوت کے ساتھ یہ مطالبہ کیا:

فَاَتَقَرُّوْا اللّٰهَ وَاَطِيعُوْا (الشورى - ۳۸) اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو

اس دعوت سے اس حقیقت سے کہ اللہ تعالیٰ اور بندگی کی راہ صرف رسول کی اطاعت میں سے معلوم ہو سکتی ہے اور صرف رسول ہی بتا سکتا ہے کہ خدا کے احکام کیا ہیں اور ان احکام پر کس طرح عمل کیا جانا چاہئے یہی وجہ ہے کہ قرآن میں بار بار اطیعوا اللہ (اللہ کی اطاعت کرو) کے ساتھ ساتھ اطیعوا الرسول (رسول کی اطاعت کرو) کا بھی حکم آیا ہے۔

نبی دین و شریعت کے دائرے میں جو کچھ کہتا ہے وہ سب کا سب اللہ ہی کی طرف سے ہوتا ہے یہ حقیقت نبی کی بحیثیت کہ اور بھی اہم بنا دیتی ہے کیوں کہ اگر ضرورت میں نبی کی اطاعت نہیں رہ جاتی بلکہ وہ اس کی اطاعت بن جاتی ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا۔

”هُوَ الَّذِي يُخَوِّفُ لِقَاءَ رَسُولِهِ فَقَدْ اطَاعَ اللّٰهَ“
(النساء - ۸۰)

ان آیات سے معلوم ہوا کہ نبی کا ایک بڑا اہم منصب ”مطاع“ کا ہے۔ وہ ایک ایسی ہستی ہے جس کی کامل اطاعت کی جانی چاہئے، ایسی اطاعت جس میں نہ کوئی قید و شرط ہو نہ کوئی بے لپی۔ جو شخص نبی کا مقام اس سے نیچے سمجھتا ہے وہ صحیح معنوں میں نبی پر ایمان ہی نہیں رکھتا اور بالکل نہیں جانتا کہ نبوت کسے کہتے ہیں۔

۸۔ شارح کتاب اللہ

اللہ تعالیٰ کی شریعت چونکہ ہمیشہ رہنے کے لئے ہے لہذا کتاب اللہ میں زیادہ تر اصول و مبادی پر دیا گیا ہے اور اللہ کے پیغمبر کے پیچھے

یہ کام کیا گیا ہے کہ وہ ان کی تشریح و توضیح کریں، سورہ نمل میں ارشاد کیا گیا ہے کہ:

”وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ
لِلنَّاسِ مَا حُذِلَ إِلَيْهِمْ“ (آیت - ۴۴)

اور ہم نے یہ ذکر (قرآن) تمہاری طرف اس لئے نازل کیا ہے تاکہ لوگوں کو بتا دے تم اس ہدایت کو واضح کرو جو ان کی طرف اتاری گئی ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ تشریح و توضیح خود کتاب کے الفاظ پڑھ کر سنا دینے سے نہیں ہوتی بلکہ تشریح کرنے والا اس کے الفاظ سے زائد بھی کچھ کہتا ہے تاکہ سننے والا کتاب کا مطلب پوری طرح سمجھ جائے اسی طرح اگر کتاب میں کسی عملی مسئلے کا ذکر ہو تو سب اوقات شارح کو عملی مظاہر کے ذریعے سے مطلب سمجھانا پڑتا ہے۔ جیسا کہ ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں، انبیاء معصوم ہوتے ہوتے ہیں، اسی بناء پر ان کی یہ تشریح و تعبیر خطا سے بالاتر اور ہمیشہ کے لئے حجت ہے۔ اس کے برخلاف دوسرے لوگ قرآن کی تشریح اور اس سے احکام اخذ کرنے کا جو کام کریں گے ضروری نہیں کہ وہ صحیح ہی ہو، وہ حجت نہیں ہوگا۔

۹۔ **مُعَلِّمٌ وَمُرَبِّیٌّ** | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتے ہوئے فترتِ قرآن حکیم میں ارشاد ہوا ہے کہ:-

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر احسان فرمایا ہے کہ خود انہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو انہیں اس کی آیات پڑھ کر سنا آئے، ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

«لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُو آيَاتِهِمْ آيَاتِهِ وَفِي ذِكْرِهِمْ وَوَعَلَمَ لَهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ»
(آل عمران - ۱۶۴)

اور دیگر متعدد مقامات پر اس مہم کی آیات وارد ہوئی ہیں، ان ساری آیات میں جو بات مشترک نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو صرف قرآن کی آیات سنا دینے کے لئے نہیں بھیجا تھا بلکہ اس کے ساتھ بعثت کے تین اور مقاصد تھے:-

- (۱) لوگوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم "کتاب" کی تعلیم دیں۔
- (۲) اس کتاب کے مفہمات کے مطابق کام کرنے کی حکمت سکھائیں۔
- (۳) افراد کا بھی اور ان کی اجتماعی حیثیت کا بھی تزکیہ کریں یعنی اپنی تربیت سے ان کی انفرادی اور اجتماعی غرایب کو دور کریں اور ان کے اندر اچھے اوصاف اور بہتر نظام اجتماعی کو آشوب نہادیں۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب اللہ پڑھ کر سنانے کے علاوہ نبی کے جو فرائض ہیں، ان میں کتاب و حکمت کی تعلیم بھی ہے۔ اور جب یہ تعلیم آپ کے فرائض نبوت میں سے ہے تو یہ بات بدیہی ہے کہ اسی تعلیم کو پیغمبرانہ حیثیت حاصل ہوگی اور اس کی تعلیم امتِ مسلمہ کے لئے فرض

ہوگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی زبانی تعلیم اور عملی مظاہرے کو صحابہ اور تابعین نے اپنی روایات اور عمل کے ذریعے محفوظ رکھا اور وہ ”احادیث و سنن“ کے نام سے موسوم ہوا۔

۱۰۔ پیشوا اور نمونہ تقلید | اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو امام و پیشوا اور ہادی و رہنما بنایا ہے یعنی نبوت اور وحی سے سرفراز نہ ہونے کے بعد ان کی ذات مجسم ہدایات و رہنمائی اور امامت و پیشوائی کے لئے خاص ہو جاتی ہے۔ ان کی بعثت اسی لئے ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی رہنمائی فرمائیں اور ان کو سنن و سنت و گمراہی سے بچائیں، وہ جس اُمت میں مبعوث ہوتے ہیں، اس کے سامنے ہدایت و رہنمائی کے دو چراغ رکھتا ہے: اللہ اور سنت رسول اللہ روشن ہوتے ہیں جن کی روشنی کی ایک ہوتی ہے۔ سورۃ آل عمران میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

”قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَأَخْذِلْكُمْ لِكُلِّ ذَنْبٍ كَفِّرْهُ
وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ
وَالرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ
الْكَافِرِينَ“ (آیات - ۳۱-۳۲)

اے نبی کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت رکھے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا اور اللہ غفور و رحیم ہے۔ کہو کہ اطاعت کرو اللہ کی اور رسول کی، پھر اگر وہ منہ موڑتے ہیں تو اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔

اسی طرح سورۃ احزاب میں کہا گیا ہے۔
”لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ
حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ
وَالْيَوْمَآءَ وَلَا خَشَرَ“ (آیت - ۳۱)

ان دونوں آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو پیشوا مقرر کیا تھا اور ان کی پیروی اور تقلید کو مسلمانوں کے لئے لازم قرار دیا ہے۔ یہ آیات اسی بات کی طرف واضح رہنمائی کرتی ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری خطبوں میں سے ایک میں حجۃ الوداع کے موقع پر کہی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:-

إِنِّي تَارِكٌ فِيكُمْ الْمَثَلَيْنِ: كِتَابِ اللَّهِ وَسُنَّتِي۔
میں تم میں دو چیزیں چھوڑ رہا ہوں اللہ کی کتاب اور اپنی سنت، (یعنی عملی زندگی)

جو مسلمان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں تھے ان کے تو سامنے ہی آپ کی زندگی تھی لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی آپ کی زندگی سنت کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے اور قرآن کریم کے بعد ہماری ہدایت کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے۔

۱۱۔ شارع اور قانون ساز | سورہ اعراف میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

يَا مَرْهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ

اعراف (آیت - ۵۷)

وہ ان کو معروف کا حکم دیتا ہے اور منکر سے روکتا ہے اور ان کیلئے پاک چیزوں کو حلال کرتا ہے اور ان پر ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اور بندھن (غیر الہی قوانین) اتار دیتا ہے، جو ان پر چڑھے ہوئے تھے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تشریعی اختیارات عطا کئے ہیں۔ اللہ کی طرف سے امر وہی اور تحلیل و تحریم صرف وہی نہیں ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہے بلکہ جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حلال و حرام قرار دیا ہے اور جس چیز کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے یا جس سے منع کیا ہے وہ بھی اللہ کے دیئے ہوئے اختیارات سے ہے اس لئے وہ بھی قانون خداوندی کا حصہ ہے۔ یہی بات سورہ حشر میں بڑی صراحت سے ارشاد ہوئی ہے۔

”وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ“ (الحشر آیت ۵)

جو کچھ رسول تمہیں دے اسے لے لو اور جس سے منع کرے اس سے رُک جاؤ اور اللہ سے ڈرو، بلا شبہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

۱۲۔ قاضی اور حکم | قرآن میں بے شمار جگہوں پر اس امر کی تصریح کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قاضی و حکم مقرر کیا ہے۔

”إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ“ (النساء - ۱۰۵)

اے نبی! ہم نے تمہاری طرف، حق کے ساتھ کتاب نازل کی ہے تاکہ لوگوں کے درمیان تم فیصلے کر دجیسا کہ اللہ تمہیں دکھائے۔

مومنین کی صفات میں سے ایک صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ جب رسول کے فیصلے کی طرف دعوت دی جاتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور مان لیا (سمعنا و اطعنا) اسی طرح ایک اور جگہ بیان کیا گیا ہے کہ مومنین کی شان یہ ہے کہ جب اللہ کا رسول کسی معاملے میں انہیں کوئی حکم دے دے تو وہ اسے بسر و چشم تسلیم کر لیتے ہیں اور ان کے دل میں فیصلے کے خلاف ذرا جھنجھکی نہیں ہوتی۔

انبیاء کے گونا گوں مناصب میں سے یہ صرف چند تھے جن کا ذکر اوپر کیا گیا قرآن میں ان کے علاوہ بتایا گیا ہے کہ انبیاء ہادی (رہنما) تئذیر (ڈرانے والے) داعی (خدا کی طرف

دعوت دینے والے) مبشر (خوشخبری سننے والے) مبلغ خدا کے احکام پہنچانے والے) مزرک (براہیوں سے پاک کرنے والے) سراج منیر (روشن چراغ) بھی تھے۔

یہاں اس بات کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ انبیاء عام رہنماؤں سے کوئی مشابہت نہیں رکھتے۔ اگرچہ عام رہنماؤں میں ہمیں معلم بھی مل جاتے ہیں، حاکم بھی، قانون ساز بھی، اور جج بھی، لیکن ان لوگوں کی رہنمائی اور انبیاء کی رہنمائی میں سب سے بڑا فرق یہ ہوتا ہے کہ عام رہنمایا تو خود ساختہ ہوتے ہیں یا عوام کے بنائے ہوئے۔ اس کے برخلاف انبیاء کو نہ کوئی شوق ہوتا ہے اور نہ وہ عوام الناس کے منتخب کردہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے جملہ مناصب کے ساتھ خدا کے مقرر کردہ ہوتے ہیں۔ اور ان کی یہ جملہ حیثیتیں حاکم، قاضی، شارح وغیرہ سب خدا کی طرف سے ہوتی ہیں۔ اپنی اس حیثیت کی وجہ سے وہ کوئی بات اپنے دل سے گھڑ کر نہیں کرتے۔ صرف وہی کچھ کہتے ہیں جس کا خدا نے انہیں حکم دیا ہو۔ وہ خدا کے فرمان میں تبدیلی یا انصاف بھی نہیں کر سکتے۔ غرض یہ کہ ان کی پوری زندگی اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ اصولوں کے ماتحت ہوتی ہے علیہم الصلوٰۃ والسلام۔

(اسلام ایک نظریں از مولانا صدر الدین اصلاحی)

سورۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق کی بنیادیں

کیا ہونی چاہیے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے سلسلے میں موجودہ دور میں بہت کافی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ ایک گروہ کے نزدیک اللہ کے رسول کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں جو کاتب اور مکتوب الیہ کے درمیان ایک دیا نندار قاصد کی ہوتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن ہم تک پہنچا دیا اور اس کے بعد آپ کا تعلق ہم سے اور ہمارا تعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ لیکن ہم اس سے پہلے دیکھ چکے ہیں کہ یہ تصور صحیح نہیں اس لئے کہ رسول صرف بیخامبری نہیں ہوتا بلکہ معلم، مزرک، قانون ساز اور رہنما بھی ہوتا ہے اور یہ سارے مناصب اسے خدا ہی کی طرف سے ملتے ہیں۔

دوسرے گروہ کے نزدیک علم کے دو حصے ہیں، علم ظاہر اور علم باطن، ان کے نزدیک علم ظاہر یعنی شریعت کا علم (جو ان کے نزدیک کمزور ہے) کا علم ہے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عام لوگوں میں پھیلا دیا لیکن علم باطن یعنی طریقت کا علم صرف چند لوگوں کو دیا اور انہی سے یہ علم سینہ بہ سینہ چلا۔ یہ خیال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کو مجروح اور ان سے ہمارے تعلق کو کمزور کرتا ہے، اس لئے کہ انہیں جس علم سے نوازا گیا تھا وہ پوری انسانیت کے لئے سروری تھا تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ماضی کی ایک قابل احترام شخصیت سے زیادہ

اہمیت نہیں دیتے۔ ماحول کے زیر اثر احترام بھی کرتے ہیں لیکن بس اس طرح کہ اگلی وقتوں کے ہیں یہ لوگ! ان کے ذہن میں یہ بات نہیں آتی کہ انسان کی دنیوی اور اخروی سعادت کا دار و مدار صرف اس بات پر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو بلا چون و چرا مان لے۔ ان لوگوں کے نزدیک گناہ مانے کے تقاضے، کچھ اور ہیں، اور زمانہ قدیم کی روش پر اب بھی اسرار کرنا جہالت اور تاریک خیالی سے زیادہ کچھ نہیں۔ چونکہ گروہ ہمارے عوام انسان کا ہے جس کے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بس ایک اندھی بہری عقیدت کا سرچھ ہے اور اس عقیدت کی تسکین کے لیے میلاد کرنے کے مدارج ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔

ان امور کے پیش نظر ضروری ہے کہ جن بنیادوں پر قرآن نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عیسائی استوار کرنے کی ہدایت کی ہے وہ بنیادیں واضح کی جائیں قرآن نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے تعلق کو پیار بیادوں پر قائم کیا ہے۔ یہ ایمان اطاعت اتباع اور محبت۔ اذیل میں ہم ان سب کی مختصر تشریح کریں گے۔

(۱۔ ایمان) نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق کی یہ پہلی بنیاد ہے۔ ایمان کا مطلب صرف یہ مان لینا ہی نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے رسول ہیں بلکہ اس ایمان کی اصل روح آپ کی ذات پر سچا اور پکا اعتماد ہے، اس بات پر اعتماد کہ آپ صادق و امین ہیں، آپ کے ہر قول و فعل میں گہری حکمت ہے۔ جو راہ آپ نے دکھائی ہے اگرچہ اس میں ظاہراً کتنے ہی خطرات نظر آتے ہیں مگر نجات اور فلاح کی حقیقی راہ وہی ہے اس بات پر اعتماد کہ آپ نے زندگی کے اصول سکھائے ہیں وہ دائمی اور ابدی ہیں اور انسان ان سے کبھی بے نیاز نہیں ہو سکے گا۔ اور سب سے بڑھ کر اس پر اعتماد کہ خدا کی معرفت کا طریقہ جو آپ نے بتایا اور سکھایا ہے اس سے بہتر طریقہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ یہ اعتماد اور یقین انسانوں میں پیدا نہ ہو وہ ایمان کی حقیقی لذت سے آشنا نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے حدیث میں کہا گیا ہے:-

ذائقہ طعم الایمان من رضی باللہ دیا | ایمان کا مزہ اس نے کھجا جو اللہ کے پناہ پر چڑھا۔
و بالاسلام دیناً و بمحمد رسولاً (م) | اسلام کے اپنا دین ہونے پر اور محمد کے پناہ پر چڑھنے پر مطمئن ہو گیا۔

اس ایمان کے معنی یہ ہیں کہ دنیا کے دوسرے علوم و افکار اگر کچھ قابل لحاظ ہو سکتے ہیں تو صرف اس حد تک ہو سکتے ہیں جس حد تک وہ کتاب و سنت کے مؤید ہوں۔ اگر کوئی شخص اس حد سے بڑھ کر کسی منکر و فلسفہ کو یا کسی دھند و کشف کو نبی کے علم و عمل پر ترجیح دے یا اس کے برابر ہی ٹھہرائے یا اس کو سوائے پر جانچے بغیر ہی اس کو تسلیم کرے اور اس کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

پر ایمان کا دعویٰ بھی کرے تو اس کا دعوائے ایمان محض ایک فریب نفس ہے اس لئے کہ اس کا ایمان اس اعتماد سے خالی ہے جو اس ایمان کی اصل روح ہے۔

۲۔ اطاعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے تعلق کی دوسری بنیاد اطاعت ہے۔ دنیا میں کوئی بھی نبی یا رسول محض اس لئے نہیں بھیجا گیا کہ بس اس کو مان لینے کی حد تک لوگ اس کو نبی اور رسول مان لیں بلکہ اس کے بھیجے جانے سے اصل شے جو مقصود رہی ہے وہ یہ ہے کہ اسی کی اطاعت بھی کی جائے اور زندگی کے معاملات میں جو احکام و ہدایت وہ دے اس کی بے چون و چرا تعمیل کی جائے۔

اس حقیقت کو قرآن نے ان الفاظ میں واضح فرمایا ہے :

”وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا
لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ“ (نساء - ۶۴)

ہم نے کوئی رسول سوائے اس مقصد کے کسی اور مقصد کے لئے نہیں بھیجا کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔

رسول کی اطاعت کے مطالبے کی وجہ یہ ہے کہ خدا کی اطاعت جو اصل مقصود ہے، اس کا راستہ ہی یہ ہے کہ اس کے رسول کی اطاعت کی جائے۔ اللہ اپنے بندوں سے براہ راست معاملہ نہیں کرتا بلکہ اپنے رسول کے واسطے سے کرتا ہے۔ رسول ہی لوگوں کو اس کی ہدایات اور اس کے احکام سے آگاہ کرتا ہے۔ اس وجہ سے جو اللہ کی اطاعت کرنا چاہتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ رسول کی اطاعت کرے۔ کیوں کہ رسول کی اطاعت، درحقیقت اللہ کی اطاعت ہے۔

”مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ“ (التشاور)

جس نے رسول کی اطاعت کی اور اللہ کی اطاعت کی۔

امارتیں بھی ان حقیقت کو بہت آشوب کے ساتھ بیان کیا گیا ہے مثلاً ایک حدیث میں آیا ہے کہ ”جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے محمد کی نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ اللہ کے راستے والوں اور نہ ماننے والوں میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی نشان امتیاز ہیں“ (بخاری)

اس اطاعت کے بارے میں بھی قرآن نے بڑے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ محض ظاہری اطاعت مطلوب نہیں ہے بلکہ ضروری کہ آدمی پورے خلوص دل کے ساتھ اطاعت کرے۔ جو قبضے اور جھگڑے پیدا ہوں، ان کے لئے اللہ کے رسول کی طرف رجوع کرے اور وہاں سے جو بھی فیصلہ ہو اسے اطمینان اور پوری رضامندی سے قبول کرے اور دل میں بدگمانی اور شکایت نہ رکھے۔

ان احکام کا تعلق صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ ہی سے نہیں تھا۔ بلکہ اب بھی جب کہ آپ کی ذات پاک ہمارے درمیان موجود نہیں ہے تو آپ کی سنتوں آپ کی قائم مقام ہے

اور اس کی اطاعت بھی آپ کی اطاعت ہے۔ اپنی وفات سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس بات کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا تھا ”میں نے تم میں دو چیزیں چھوڑی ہیں، پہلی یہ کہ تم ان دونوں پر مضبوط رہو، دوسری یہ کہ تم گمراہ نہ ہو گے، ایک کتاب اللہ اور دوسری سنت رسول“ یہ دونوں امام مالک نے اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ آپ کو رسول ماننے کی اصل حقیقت یہ ہے کہ ہم اس کتاب و سنت کی پیروی کریں جن کے ذریعے سے آپ نے اللہ تعالیٰ کی مرضیات اور اس کے احکام سے ہمیں آگاہ فرمایا ہے۔ اگر محض زبان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار کیا جائے ہے۔ اور اطاعت اپنی ہوا کے آئیں کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے بالکل خلاف دوسروں کی کی جاتی رہے تو یہ رسول کو صحیح معنوں میں ماننا نہیں ہوگا۔

۳۔ اتباع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے تعلق کی تیسری بنیاد اتباع ہے۔ اتباع کا دائرہ اطاعت سے زیادہ وسیع ہے۔ اطاعت کا لفظ میں تو عمر گزشتہ باتیں آتی ہیں جن کی حیثیت احکام و ایات اور اوامر و نہی کی ہاں لیکن اتباع کے دائرہ میں متواتر اور فوافل بھی آجاتے ہیں۔ پھر اطاعت بعض حالات میں خاص ظاہری اور رسمی ہو سکتی ہے۔ آدمی ایک شخص کی اطاعت کرنا۔ ہے لیکن اس کی اطاعت میں، خلاص اور محبت کا جذبہ درجہ بھی شامل نہیں ہوتا لیکن اتباع میں متبوع کے لئے عقیدت و احترام کا جذبہ پایا جاتا ہے۔

اس کلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف اطاعت ہی نہیں کرتے تھے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع بھی کرتے تھے۔ صرف یہی نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی حکم دیا تو اطاعت کر لی بلکہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک ادا کو دیکھتے، اس کو گنگا ہوں میں لے جاتے اور اس کی تقلید کرنے لگتے۔ ان میں سے ہر شخص کی دلی خواہش ہوتی کہ وہ اپنی زندگی کو زیادہ سے زیادہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے سانچے میں ڈھال دے اور یہ اہتمام کسی خارجی دباؤ کے تحت نہیں بلکہ محض محبت اور عقیدت کے جذبے سے سرشار ہو کر کرتے تھے۔

اتباع رسول میں صحابہ کرام کے اس ذوق و شوق کی وجہ یہ تھی کہ خدا کی محبت اور محبوبیت کا درجہ صرف اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں بلکہ فی الحقیقت اتباع رسول سے حاصل ہوتا ہے۔ رسول خدا کی معرفت کا منظر کامل ہوتا ہے اور اس کی ہر ہر ادا معرفت الہی کا نشان ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے جو لوگ خدا سے محبت رکھتے ہیں۔ اس کا اتباع کرتے ہیں، یہاں تک کہ خدا کے محبوب بن جاتے ہیں۔ اس حقیقت کو قرآن کی اس آیت میں بیان کیا گیا ہے:-

۴۷ عجیبہ

سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ۔ سُنْم کے ساتھ ہمارے تعلق کی چوتھی بنیاد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہماری محبت ہے۔ دین میں وہ ایمان یا اطاعت معتبر نہیں

”قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ
وِإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ
وَأَمْوَالٌ ذَاتُ بَيْنٍ مَعَكُمْ فَذَلِكُمْ
فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبِمَا رَزَقْنَاهُمْ
لَا يُخْشَوْنَ كَمَا دَعَا السَّكِينُ تَرْوُونَ مِمَّا
أَحْبَبَ إِلَيْكُمْ مِّنَ اللَّهِ فَلْيَسْأَلُوا وَفِي سَبِيلِ
اللَّهِ فِي سَبِيلِهِ فَتَرْتَبَّصُوا حَتَّى يَخْرُجَ
بِأَمْرٍ“ (توبہ ۲۴)

اسی حقیقت کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف طریقوں سے احادیث میں بھی واضح فرمایا ہے مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ "کسی شخص کا ایمان تصدیق نہیں ہو سکتا جب تک وہ مجھ کو اپنے باپ بیٹے اور دوسرے تمام عزیز و اقارب سے عزیز نہ کرے" اسی طرح ایک اور حدیث میں فرمایا کہ "ایمان کی حقیقی لذت سے وہی آشنا ہو سکتا ہے جس کے نزدیک اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوسری تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہوں"

لیکن یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جس محبت کا ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد وہ جذباتی محبت نہیں جو انسان کو بیوی بچوں سے ہوتی ہے۔ بلکہ وہ عقلی اور اصولی محبت ہے جس کی بناء پر انسان اپنی عزیز ترین چیزوں پر ان اصولوں کو مقدم رکھتا ہے۔ اگر ان اصولوں کی راہ میں خود اس کا اپنا نفس مزاحم ہوتا ہے تو اس سے بڑھتا ہے، دوسرے مزاحم ہوتے ہیں تو ان کا مقابلہ کرتا ہے یہاں تک کہ بیوی بچے، خاندان، ملک اور قوم بھی ان اصولوں کے مخالف ہو جاتے ہیں تو ان سب کے مطالبات ٹھکرا دیتا ہے۔ اس محبت کی اس اصولی نوعیت کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ایک حدیث میں واضح فرمادیا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے:-

”وَسَبَّ سَائِرَ الْبَنِي إِسْرَٰءِيلَ لَمَّا تَغَدَّبَ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ وَفَتَنَهُمْ فَمَن ذَكَرَكَ“ (ترمذی) | جس نے میری سنت سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی۔ اسی حدیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا یہی تقاضا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل کیا جائے اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل نہ ہو تو محبت کا دعویٰ کھوکھلا اور بے بنیاد ہے۔

۱۴- **اُسوۂ رسول اللہ** یہ انبیائے کرام اور بانیان مذہب کی موجودہ سیرتوں کا وہ باب ہے جو تمام تر خالی اور سادہ ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی سیرت کا یہی باب سب سے بڑا اور ضخیم ہے۔ اور یہی ایک معیار اس فیصلہ کے لئے کافی ہے کہ نبیوں کا سردار اور رسولوں کا خاتم کون ہو سکتا ہے۔ بیفہ نصیحتوں، میٹھی میٹھی باتوں اور اچھی اچھی تعظیموں کی دنیا میں کی نہیں گئی تھی۔ یہی چیز ہے کہ وہ کام اور عمل ہے۔ موجودہ مذاہب کے شارعوں اور بانیوں کی سیرتوں کے تمام صفحے پڑھ جائیے۔ دلچسپ تقریریں ملیں گی، دل آویز حکایتیں ملیں گی، خطبے بلند، رنگیناں ملیں گی، تقریر کا زور شور اور فصاحت و بلاغت کا جوش و خروش نظر آئے گا۔ مؤثر حکایتیں، مقوڑی دیر کے لئے خوش کردیں گی، مگر جو چیز نہیں ملے گی وہ عملی کام اپنا احکام و نصائح کو آپ بہت کر اور کر کے دکھانا ہے۔

انسان کی عملی سیرت کا نام خلق (اخلاق) ہے۔ قرآن کے سوا اور کس مذہب کے صحیفے نے اپنے شارع کی نسبت اس بات کی کھلی شہادت دی ہے کہ وہ اپنے عمل کے لحاظ سے بھی بدرجہا بلند انسان تھا؟ لیکن قرآن نے صاف کہا اور دوست و دشمن کے مجمع میں علی الاعلان کہا:

”وَإِنَّ لَكَ لَأَجْرًا غَيْرَ مَنُوتٍ ۚ وَ
إِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ“ (القم ۳-۴)

چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا سب سے روشن پہلو یہ ہے کہ آپ نے یکجہتیت ایک پیغمبر کے اپنے پیروؤں کو جو نصیحت فرمائی اس پر سب سے پہلے خود عمل کر کے دکھا دیا۔

آپ نے لوگوں کو خدا کی یاد اور محبت کی نصیحت کی تو شرب و راز میں کوئی لمحہ ایسا نہ تھا جب خدا کی یاد سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل اور خدا کے ذکر سے آپ کی زبان غافل ہو۔ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے کھاتے پیتے، سوتے جاگتے، پہنتے اوڑھتے، ہر حالت میں اور ہر وقت خدا ذکر اور اس کی حمد زبان مبارک پر جاری رہتی تھی۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ ہر وقت اور ہر لمحہ خدا کی یاد میں مصروف رہتے تھے۔

آپ نے لوگوں کو نماز کا حکم دیا مگر خود آپ کا حال کیا تھا؟ عام یہودیوں کو تو پانچ وقتوں کی نماز کا حکم تھا، مگر خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم آٹھ وقت نماز پڑھتے تھے۔ طلوع و آفتاب کے

بعد ازاں اتر، کچھ اور دن چڑھنے پر چاشت، پھر ظہر، عصر، مغرب، عشاء، پھر تہجد پھر صبح کی نماز ادا کرتے۔ اور نماز بھی کیسی کہ رات رات بھر خدا کے حضور میں کھڑے رہی حتیٰ کہ کھڑے کھڑے پائے مبارک میں درم آجاتا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا عرض کرتیں ”اللہ نے تو آپ کو ہر طرح معاف کر دیا ہے پھر اس قدر کیوں تکلیف اٹھاتے ہیں“ فرماتے ”اے عائشہ! کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ ہوں؟ یعنی نماز خشیت الہی سے نہیں ہے بلکہ محبت الہی اس کا منشا ہے۔ رکوع میں اتنی دیر جھکے رہتے کہ دیکھنے والے کہتے کہ شاید آپ سجدہ کرنا بھول گئے۔“

آپؐ نے روزہ کا حکم دیا۔ عام مسلمانوں پر سال میں تیس دن کے روزے فرض ہیں مگر خود آپؐ کی کیفیت کیا تھی؟ کوئی ہفتہ اور کوئی مہینہ روزوں سے خالی نہیں جاتا تھا۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں ”جب آپؐ روزے رکھنے پر آتے تو معلوم ہوتا تھا کہ اب کبھی افطار نہ کریں گے۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو دن بھر سے زیادہ روزہ رکھنے کی ممانعت فرمائی مگر خود آپؐ کا یہ حال تھا کہ کبھی کبھی دو روتین تین دن بغیر کھائے پئے متصل روزے رکھتے اور اس عرصے میں ایک دانہ بھی منہ میں نہ جاتا تھا۔

آپؐ نے لوگوں کو زکوٰۃ و خیرات کا حکم دیا تو پہلے خود اس پر عمل کر کے دکھایا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی شہادت مشہور ہے ”یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ قرابت والوں کا حق پورا کرتے ہیں، مفروضوں کا قرض ادا کرتے ہیں، غریبوں کی مدد کرتے ہیں، جہانوں کی خاطر تواضع کرتے ہیں۔ ہمیشہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل یہ رہا کہ جو کچھ آتا سب اللہ کی راہ میں خرچ کر دیتے۔ حالانکہ غزوات اور فتوحات کی وجہ سے مال و اسباب میں نہ کمی تھی مگر وہ سب غیروں کے لئے تھا۔ اپنے لئے کچھ نہ تھا۔ اگر تھا تو بس وہی فقر و فاقہ تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں سے زیادہ سخی تھے اور سب سے زیادہ سخاوت آپؐ رمضان المبارک میں فرماتے تھے۔ تمام عمر کسی کے سوال کے جواب میں ”نہیں“ کا لفظ نہیں فرمایا۔

حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ رات کو میں آپؐ کے ساتھ ایک راستے سے گزر رہا تھا راہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”ابوذر! اگر احد کا یہ پہاڑ میرے لئے سونا ہو جائے تو کبھی میں پسند نہ کروں گا کہ تین راتیں گزر جائیں اور اس میں سے ایک دینار بھی میرے پاس رہ جائے، البتہ یہ کہ کسی قرض کے ادا کرنے کے لئے کچھ چھوڑ دوں“ یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خوش نما الفاظ ہی نہ تھے۔ بلکہ عمل تھا۔ ایک دفعہ عصر کی نماز کے بعد خلاف معمول فوراً اندر تشریف لے گئے اور باہر آ گئے۔ لوگوں کو تعجب ہوا،

فرمایا ”مجھ کو نماز میں یاد آیا کہ سونے کا ٹکڑا گھر میں پڑا رہ گیا ہے، خیال ہوا ایسا نہ ہو کہ رات ہو جائے اور محمدؐ کے گھر میں پڑا رہ جائے“ اس سے بڑھ کر یہ کہ آپؐ مرض الموت میں ہیں، بیماری کی سخت تکلیف اور بے چینی ہے۔ لیکن اسی وقت یاد آیا کہ کچھ اشرفیاں گھر میں پڑی ہیں حکم ہوتا ہے کہ ”انہیں خیرات کر دو کیا محمدؐ اپنے رب سے اس طرح ملے گا کہ اس کے پیچھے اس کے گھر میں اشرفیاں پڑی ہوں“

آپؐ نے زہد و قناعت کی تعلیم دی لیکن اس راہ میں آپؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اپنا طرز عمل کیا تھا؟ آپؐ سن چکے ہیں کہ عرب کے گوشہ گوشہ سے جزیہ، خراج، عشر اور زکوٰۃ و صدقہ کے خزانے لے لے چلے آتے تھے۔ مگر امیر عرب کے گھر میں وہی فقر تھا اور وہی فاقہ تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہا کرتی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے گئے مگر دو وقت بھی سیر ہو کر آپؐ کو کھانا نصیب نہ ہوا۔ جب آپؐ نے وفات پائی تو گھر میں اس دن کے کھانے کے لئے تھوڑے سے جو کے سوا کچھ موجود نہ تھا اور چند سیر جو کے بدلے میں آپؐ کی زرہ ایک یہودی کے یہاں رہن تھی۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ فرزند آدم کو ان چیزوں کے سوا اور کسی چیز کا حق نہیں۔ رہنے کو ایک جھوپڑا، تن ڈھانکنے کو کپڑا، پیٹ بھرنے کو روکھی سوکھی روٹی اور پانی“ یہ محض الفاظ کی خوشامبندش نہ تھی بلکہ یہی آپؐ کی طرز زندگی کا عملی نقشہ تھا۔ رہنے کا مکان ایک حجرہ تھا جس میں کچی دیوار اور کھجور کے تنوں اور اونٹ کے بالوں کی پھت تھی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں۔ آپؐ کا کپڑا کبھی نہ کر کے نہیں رکھا جاتا تھا یعنی جو بدن مبارک پر کپڑا ہوتا تھا اس کے سوا کوئی اور کپڑا ہی نہیں ہوتا تھا جو تہ کیا جاتا۔ ایک دفعہ ایک سائل خدمت اقدس میں آیا اور عرض کیا کہ سخت بھوکا ہوں۔ آپؐ نے ازواج مطہرات کے پاس کہلا بھیجا کہ کچھ کھانے کو ہو تو بھیج دیں۔ ہر جگہ سے یہی جواب آیا کہ ”گھر میں پانی کے سوا کچھ نہیں ہے“۔ سنہ ہجری میں جب اسلام کی حکومت یمن سے شام تک پھیلی ہوئی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے توشہ خانہ کی مالیت یہ تھی۔ جسم مبارک پر ایک تہبند، ایک کھری چار پائی، سرمانے ایک تکیہ جو، یمن خرمے کی چھال بھری تھی۔ ایک طرف تھوڑے سے جو، کھونٹی میں پانی کا مشکیزہ اور بس۔

آپؐ نے لوگوں کو ایثار کی تعلیم دی تو ساتھ ہی ان کے سامنے اپنا نمونہ پیش کیا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت معلوم ہے، مگر جب انہوں نے اپنی عسرت اور تنگدستی کی وجہ سے ایک خادمہ کی خواہش ظاہر کی تو کا شانہ نبوت سے جواب ملا۔ ”اے فاطمہ! ابھی تک صفہ کے غریبوں کا انتظام نہیں ہوا ہے“ ایک دفعہ آپؐ کے پاس چادر

نہ تھی۔ ایک صحابی نے لاکر پیش کی۔ اس وقت ایک صاحب نے کہا، کیسی اچھی چادر ہے۔ آپ نے فوراً اتار کر ان کی نذر کر دی۔ ایک صحابی کے گھر کوئی تقریب تھی مگر کوئی سامان نہ تھا ان سے کہا، عائشہ کے پاس جا کر آٹے کی ٹوکری مانگ لاؤ۔ وہ گئے اور جا کر آئے سالانہ آپ کے گھر میں اس آٹے کے سو رات کے کھانے تک کو کچھ نہ تھا۔

خدا پر اعتماد، توکل اور بھروسہ کی شان دیکھنا ہو تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں دیکھو۔ حکم الہی تھا کہ ”واصبر کما صبر اولو العزم من الرسل“ یعنی جس طرح اولو العزم پیغمبروں نے صبر و استقلال دکھایا تو بھی دکھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی کر کے دکھا دیا۔ پھر آپ ایک ایسی جاہل اور ان پڑھ قوم میں پیدا ہوئے تھے جو اپنے معتقدات کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سن سکتی تھی۔ اور اس کے لئے مرنے مارنے پر تیار ہو جاتی تھی مگر آپ نے کبھی اس کی پروا نہ کی اور اپنے فرض کو پورا کرتے رہے۔ قریش نے آپ کو کیسی کیسی تکلیفیں دیں مگر صبر و استقلال کا سرشتہ آپ کے ہاتھ سے کبھی نہ چھوٹا۔ ہجرت کے وقت غار ثور میں پناہ لیتے ہیں۔ کفار آپ کا پیچھا کرتے ہوئے غار کے منہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ بے یار و مددگار نہتے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور مسلح قریش کے درمیان چند گز کا فاصلہ رہ جاتا ہے۔ ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ گھبرا اٹھتے ہیں کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم دو ہی ہیں لیکن ایک تسکین بھری ہوئی آواز آتی ہے۔ ابو بکر ہم دونہیں ”لا تحزن ان اللہ معنا“ گھبراؤ نہیں ہمارا خدا ہمارے ساتھ ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ پہنچنے کے بعد چونکہ یہود، منافقین اور قریش کی ریشہ و ایناں اور غارتگری حد سے بڑھ چکی تھیں اس لئے لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مسکن کی رات کو حفاظت کرتے لیکن جب آیت ”واللہ یعصمک من الناس“ (خدا تجھ کو لوگوں سے بچائے گا) نازل ہوئی تو اس وقت خیمہ سے سر باہر نکال کر پہرے کے سپاہیوں سے فرمایا ”لوگو! واپس جاؤ مجھے جھوٹ دو کہ میری حفاظت کی ذمہ داری خود خدا نے لے لی ہے“ غزوہ نجد سے واپسی میں آپ ایک درخت کے نیچے آرام فرماتے ہیں صحابہ کرام ادھر ادھر بٹ گئے ہیں۔ ایک بدو تلوار کھینچ کر سامنے آ جاتا ہے۔ آپ بیدار ہوتے ہیں۔ موقع کی نزاکت قابل غور ہے۔ بدو پوچھتا ہے ”بتاؤ لے محمد! اب کون تم کو میرے ہاتھ سے بچا سکتا ہے؟“ اطمینان اور تسکین سے بھری ہوئی آواز آتی ہے کہ ”اللہ!“ اس پر اثربواب سے دشمن متاثر ہو جاتا ہے۔ اور تلوار نیام میں پہنچ جاتی ہے۔ عفو و درگزر سے کام لینا اور دشمنوں سے پیار کرنا گویا صرف حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ہی حصہ تھا۔ چنانچہ ابوسفیان نے جو برسات سال تک آپ کے خلاف فوجیں لاتے رہے، بارہا آپ کے قتل کا فیصلہ کیا۔ ہر قدم پر اسلام کے سخت ترین دشمن ثابت ہوئے لیکن فتح مکہ سے

پہلے جب حضرت عباسؓ کے ساتھ دھپکے کے سامنے آتے ہیں تو گو ان کا ہر جرم ان کے قتل کا طالب ہے مگر رحمت عالم کا عفو عام ابوسفیان سے کہتا ہے کہ ڈر کا مقام نہیں۔ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) انتقام کے جذبہ سے بالاتر ہیں۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف ان کو معاف فرماتے ہیں بلکہ یہ بھی فرماتے ہیں:-

”مَنْ دَخَلَ دَارَ آتِي سَفِيَّانَ كَانَ آهِنًا۔ (جو ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے گا اس کو بھی امن ہوگا)۔

ہندہ (ابوسفیان کی بیوی) جو احد کے معرکے میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ گا گا کر قریش کے سپاہیوں کا دل بڑھاتی تھی، جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب چچا حضرت حمزہؓ کی لاش کے ساتھ بے ادبی کی تھی اور جس نے ان کے سینے کو چاک کر کے کلیجہ چبانا چاہا، وہ فتح مکہ کے دن نقاب پوش سامنے آتی ہے اور یہاں بھی گستاخی سے باز نہیں آتی۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم پھر بھی کچھ تعرض نہیں فرماتے بلکہ یہ بھی نہیں پوچھتے کہ تو نے یہ کیوں کیا۔ چنانچہ عفو عام کی اس معجزانہ مثال کو دیکھ کر وہ پکار اٹھتی ہے ”اے محمد! آج سے پہلے تمہارے خیمے سے زیادہ کسی خیمے سے مجھے نفرت نہ تھی لیکن آج تمہارے خیمے سے زیادہ کسی کا خیمہ مجھے محبوب نہیں ہے“ اسی طرح بتیار بن الاسود وہ شخص تھا جو ایک حیثیت سے آپؐ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کا قاتل تھا اور کئی شرارتوں کا مرتکب ہو چکا تھا۔ مکہ کی فتح کے موقع پر اس کا خون بد کر دیا جاتا ہے۔ اور وہ چاہتا ہے کہ بھاگ کر ایران چلا جائے لیکن پھر کچھ سوچ کر سیدھا در دولت پر حاضر ہوتا ہے۔ اور کہتا ہے ”یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں بھاگ کر ایران چلا جانا چاہتا تھا لیکن مجھے حضور کا رحم و کرم اور عفو و حلم یاد آیا۔ میں حاضر ہوں۔ میرے جرائم کی جو اطلاعیں آپؐ کو ملی ہیں۔ وہ سب درست ہیں“ اتنا سنتے ہی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رحمت کا دروازہ کھل جاتا ہے اور دوست و دشمن کی تیز مٹھ جاتی ہے۔

غرض، تمام دنیا میں یہ فخر صرف اسلام کے پیغمبر کو حاصل ہے کہ وہ تعلیم اور اصول کے ساتھ ساتھ اپنے عمل اور اپنی مثال کو پیش کرتا ہے۔ آخری حج کے موقع پر جب کہ شیعہ نبوت کے ارد گرد ایک لاکھ پیر والوں کا ہجوم تھا، انسانوں کو خدا کا آخری پیغام سنایا جاتا ہے عرب کے باطل رسوم اور نہ ختم ہونے والی لڑائیوں کا سلسلہ توڑا جاتا ہے مگر تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنی ذاتی نظیر اور عملی مثال بھی ہر قدم پر پیش کی جاتی ہے

”آج عرب کے تمام انتقامی خون باطل کر دیئے گئے یعنی تم سب ایک دوسرے کے قاتلوں کو معاف کر دو۔ اور سب سے پہلے میں اپنے خاندان کا خون اپنے بھتیجے ربیعہ بن حارث کے بیٹے کا خون معاف کرتا ہوں۔ جاہلیت کے تمام سودی لین دین

اور کاروبار آج باطل کئے جاتے ہیں اور سب سے پہلے میں اپنے چچا عباس بن عبدالمطلب کا سو ذی بیو پار توڑتا ہوں۔“

بہر حال، آدم علیہ السلام سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام تک اور شام سے لے کر ہندوستان تک ہر ایک تاریخی انسان کی مصلحانہ زندگی کا جائزہ لے لیجئے لیکن ایسی عملی ہدایتوں اور کامل مثالوں کا کوئی نمونہ نظر نہیں آسکتا۔

۴۔ اسلامی تصورِ آخرت

(۱) انسان کی دنیوی زندگی دراصل اس کی اخروی زندگی کا مقدمہ ہے۔ یہ زندگی عارضی ہے اور وہ پائیدار ہے۔ یہ ناقص ہے اور وہ کامل۔ تمام اعمال کے پورے پورے نتائج اس عارضی زندگی میں مرتب نہیں ہوتے۔ اور نہ ہر وہ بیج جو یہاں بویا جاتا ہے اپنے فطری ثمرات کے ساتھ اس ناقص زندگی میں بار آور ہوتا ہے۔ اس نقص کی تکمیل اس دوسری زندگی میں ہوگی اور جو کچھ یہاں بے نتیجہ اور بے ثمرہ گیا ہے وہ اپنے حقیقی نتائج اور ثمرات کے ساتھ وہاں ظاہر ہوگا۔

(۲) جس طرح دنیا کی ہر چیز فرداً فرداً اپنی ایک عمر رکھتی ہے جس کے ختم ہو جانے کے بعد اس میں فساد رونما ہو جاتا ہے، اسی طرح اس پورے نظامِ عالم کی بھی ایک عمر ہے جس کے تمام ہونے پر یہ سارا کارخانہ درہم برہم ہو جائے گا، اور کوئی دوسرا نظام اس کی جگہ لے گا جس کے قوانین طبیعی اس نظام کے قوانین طبیعی سے مختلف ہوں گے۔

(۳) اس نظام کے درہم برہم ہونے پر ایک زبردست عدالت قائم ہوگی جس میں انسان کے اُس کے ہر عمل کا حساب لیا جائے گا۔ انسان کو اس روز پھر ایک نئی جسمانی زندگی ملے گی وہ اپنے خدا کے سامنے حاضر ہوگا۔ اس کے تمام اعمال جو اس نے اپنی پہلی زندگی میں انجام دیئے تھے ٹھیک ٹھیک جاپنچے اور تولے جائیں گے۔ حق اور انصاف کے ساتھ اس کے مقدمے کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اچھے اعمال کی اچھی جزا ملے گی اور بُرے اعمال کی بُری سزا دی جائے گی۔

لیکن اسلام کے پیش کردہ اس حل کا تفصیلی جائزہ لینے سے پہلے ان کوششوں کا تذکرہ مفید ہوگا جو انسان نے ان سوالات کے حل کرنے کے لئے خود کی ہیں۔

۱۔ مادہ پرستوں کا نقطہ نظر اور اس کا علمی جائزہ | ایک جماعت کے نزدیک زندگی جو کچھ

بھی ہے یہی دنیا کی زندگی ہے، اور موت کے معنی بالکل فنا اور معدوم ہو جانے کے ہیں۔ جس کے بعد حیات، شعور، احساس، پھل اور نتائج کچھ بھی نہیں۔

”إِنَّ هُوَ لَآ يَمُوتُ لَوْ أَنَّ هِيَ إِلَّا
مَوْتَنَا الَّذِي وَمَا نَحْنُ بِمُتَشَرِّينَ ۝

(الدخان - ۳۵)

اور (انکار آخرت کرنے والے) لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں صرف پہلی مرتبہ (ایک بار) مرنا ہے اور پھر ہمیں اٹھنا نہیں ہے۔

اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہماری زندگی تو بس صرف اسی دنیا کی ہے کہ یہیں مرتے اور جیتے ہیں اور یہیں تو زمانہ مار دیتا ہے۔

وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا
نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُمْلِكُنَا إِلَّا التَّهَرُّجُ
(المجادلہ - ۲۳)

ان لوگوں کے نزدیک یہ کارخانہ عالم جس طرح چل رہا ہے یوں ہی چلتا رہے گا۔ اس نظام میں ایسی پائیداری ہے۔ کہ یہ کبھی درہم برہم ہونے والا نہیں ہے۔ لیکن جو لوگ ایسا کہتے ہیں وہ یہ بات اس پست پر نہیں کہتے کہ فی الواقع موت کے بعد کچھ نہیں ہے اور فی الحقیقت یہ کارخانہ عالم لازوال ہے۔ بلکہ دراصل انہوں نے محض اپنے حواس پر اعتماد کیا ہے اور یہ رائے اس لئے قائم کی ہے کہ موت کے بعد کی کوئی کیفیت ان کو محسوس نہیں ہوئی۔ اور نظام عالم کی برہمی کے کوئی آثار انہوں نے نہیں دیکھے۔ مگر کیا ہمارا کسی شے کو محسوس نہ کرنا اس کے انکار کے لئے کافی دلیل ہے؟ کیا ہمارا احساس ہی دراصل اشیاء کا وجود اور ہمارا عدم احساس اشیاء کا عدم ہے؟ اگر ایسا ہے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ جو چیز جس وقت میرے احساس میں آتی ہے وہ دراصل اسی وقت وجود میں آتی ہے۔ اور جب وہ میرے حواس سے غائب ہو جاتی ہے تو وہ دراصل فنا ہو جاتی ہے۔ میں نے جس دریا کو بہتے دیکھا تھا وہ اسی وقت پیدا ہوا جب میں نے محسوس کیا اور اسے بہتے دیکھا اور جب وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تو معدوم ہو گیا۔ کیا کوئی صاحب عقل میرے اس قول کو صحیح مان لے گا؟ اگر نہیں تو کوئی صاحب عقل اس قول کو کیسے صحیح مان سکتا ہے کہ موت کے بعد سرے سے کوئی حییات ہی نہیں ہے۔

پھر جس طرح موت اور فنا کے متعلق محض حواس پر مبنی و سہ کر کے حکم لگانا غلط ہے۔ اسی طرح زندگی اور بقا کے متعلق بھی جو احکام محض حواس کے بل پر لگائے جاتے ہیں ان کا کچھ اعتبار نہیں۔ کیونکہ ہمارے پاس وہ آنکھیں نہیں جن سے ہم موت کی سرحد کے اس پار جھانک سکیں کہ وہاں کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ ہمارے پاس وہ کان نہیں جن سے ہم اُدھر کی کوئی آواز سن سکیں۔ ہم کوئی ایسا آلہ بھی نہیں رکھتے جس کے ذریعے سے تحقیق کے ساتھ معلوم کیا جاسکے کہ اُدھر کچھ ہے بھی یا کچھ نہیں ہے۔ پھر اگر کارخانہ عالم کے دائمی اور لازوال ہونے کا حکم محض اس بنا پر لگانا درست

ہے کہ ہم نے اس امر کو درہم برہم ہوتے نہیں دیکھا تو میں بھی ایک مضبوط عمارت کو دیکھ کر کہہ سکتا ہوں کہ یہ ہمیشہ ہمیشہ قائم رہے گی، کیونکہ میں نے اس کو نہ گرتے دیکھا ہے اور نہ اس میں کوئی بوسیدگی نظر آتی ہے جو اس کے کبھی گرنے کی پیشین گوئی کرتی ہو۔ کیا میرا یہ استدلال ارباب عقل کی بارگاہ میں مقبول ہوگا؟

لیکن زندگی بعد موت کا سوال محض ایک عقلی اور فلسفیانہ سوال نہیں ہے۔ بلکہ ہماری عملی زندگی سے اس بات کا بہت گہرا تعلق ہے اور دراصل ہمارے اخلاقی رویے کا سارا انحصار ہی اس سوال پر ہے۔ کیونکہ اگر میرا یہ خیال ہو کہ زندگی جو کچھ ہے بس یہی دنیوی زندگی ہے اور اس کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہے تو میرا اخلاقی رویہ ایک طرح کا ہوگا، اور اگر میں یہ خیال رکھتا ہوں کہ اس کے بعد ایک دوسری زندگی بھی ہے۔ جس میں مجھے اپنی زندگی کا حساب دینا ہوگا، اور وہاں میرا اچھا یا بُرا انجام میرے یہاں کے اعمال پر منحصر ہوگا، تو یقیناً میرا اخلاقی طرز عمل بالکل ایک دوسری ہی طرح کا ہوگا۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے ایک شخص یہ سمجھتے ہوئے سفر کر رہا ہے کہ اسے بس لاہور سے کراچی تک جانا ہے۔ اور کراچی پہنچ کر نہ صرف یہ کہ اس کا سفر ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا بلکہ وہ وہاں پولیس اور عدالت اور اس طاقت کی دسترس سے باہر ہوگا۔ جو اس سے کسی قسم کی باز پرس کر سکتی ہے۔ برعکس اس کے ایک دوسرا شخص یہ سمجھتا ہے کہ لاہور سے کراچی ہی تک تو اس کے سفر کی صرف ایک منزل ہے۔ اس کے بعد اسے ایک ایسے ملک میں جانا ہوگا جہاں کا بادشاہ وہی ہے جو پاکستان کا بادشاہ ہے اور اس بادشاہ کے دفتر میں میرے اس کارنامے کی خفیہ مسئل موجود ہے جو میں نے پاکستان میں انجام دیا ہے اور وہاں میرے ریکارڈ کو جانچ کر فیصلہ کیا جائے گا کہ میں اپنے کام کے لحاظ سے کس درجے کا مستحق ہوں۔

آپ بآسانی اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان دونوں شخصوں کا طرز عمل کس قدر ایک دوسرے سے مختلف ہوگا۔ پہلا شخص لاہور سے کراچی ہی تک کے سفر کی تیاری کرے گا اور دوسرے کی تیاری بعد کی طویل منزلوں کے لئے بھی ہوگی۔ پہلا شخص یہ سمجھے گا کہ نفع یا نقصان جو کچھ بھی ہے کراچی پہنچنے تک ہے۔ آگے کچھ نہیں۔ اور دوسرا یہ خیال کرے گا کہ اصل نفع و نقصان سفر کے پہلے مرحلے میں نہیں ہے بلکہ آخری مرحلے میں ہے۔ پہلا شخص اپنے افعال کے صرف ان ہی نتائج پر نظر رکھے گا جو کراچی تک سفر میں نکل سکتے ہیں۔ لیکن دوسرے شخص کی نگاہ ان نتائج پر ہوگی جو اس دوسرے ملک میں پہنچ کر نکلیں گے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں شخصوں کے طرز عمل کا یہ فرق براہ راست نتیجہ ہے ان کی اس رائے کا جو وہ اپنے سفر کی نوعیت کے متعلق رکھتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح

ہماری اخلاقی زندگی میں بھی وہ عقیدہ فیصلہ کن اثر رکھتا ہے جو ہم زندگی اور موت کے بارے میں رکھتے ہیں۔ عمل کے میدان میں جو قدم بھی ہم اٹھائیں گے اس کی سمت کا تعین اس بات پر منحصر ہوگا کہ آیا ہم اس زندگی کو پہلی اور آخری زندگی سمجھ کر کام کر رہے ہیں یا کسی بعد کی زندگی اور اس کے نتائج کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ پہلی صورت میں ہمارا قدم ایک سمت اٹھے گا اور دوسری صورت میں اس کی سمت بالکل مختلف ہوگی۔

چنانچہ اگر انسان کے اخلاق اور سیرت کی تعمیر اس اعتقاد پر قائم ہو کہ میں زندگی تو دنیا ہی کی زندگی ہے، یہ ہمیشہ رہے گی۔ تو یقیناً ایسے شخص کی زندگی دو حال سے خالی نہ ہوگی۔ ناموافق حالات کی بنا پر اس سے ایک شدید قسم کی مایوسی اور پست ہمتی انسان پر طاری ہوگی۔ کیوں کہ جب وہ اپنی نیکو کاری کا کوئی نتیجہ دنیا میں ظاہر ہوتے نہ دیکھے گا تو اس کی قوت عمل سرد پڑ جائے گی، جب وہ اپنی مظلومی کی دادرسی کا کوئی ذریعہ دنیا میں نہ پائے گا تو اس کا دل ٹوٹ جائے گا اور جب وہ مشربروں، بدکاروں اور ظالموں کو دنیا میں پھلتے پھولتے دیکھے گا تو خیال کرے گا کہ عالم ہستی میں شر ہی کا بول بالا ہے اور خیر صرف سرنگوں ہونے ہی کے لئے ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جن ممالک میں مادہ پرستی کا غلبہ ہے وہاں خودکشی کی رفتار نہایت تیز ہے اور وہ اقوام جن کا پختہ یقین زندگی بعد موت پر ہے ان میں خودکشی کے واقعات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ پروفیسر فلیپ جی اس امر کا تذکرہ بطور خاص کرتا ہے کہ مسلمانوں میں خودکشی کا رواج سب سے کم ہے اور قردن اولیٰ میں تو اس کا نشان بھی نہیں ملتا۔ یہ دراصل نتیجہ ہے تصور آخرت کا۔

بخلاف اس کے اگر حالات موافق ہوں تو اس اعتقاد کے اثر سے انسان ایک نفس پرست حیوان بن جائے گا۔ وہ خیال کرے گا کہ جو دین عیش اور لطف میں بسر ہو جائیں پس وہی غنیمت ہیں۔ اگر دنیا کی کسی لذت اور کسی لطف سے محروم رہ گئے تو پھر کوئی زندگی نہیں جس میں اس کی کسر پوری ہو۔ وہ ظلم و ستم کرے گا، لوگوں کے حقوق غصب کرے گا، اپنے فائدے اور اپنے نفس کی خواہشات کے لئے کوئی بد سے بدتر فعل کرنے میں بھی اس کو باک نہ ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ نیکی اور شرافت جو ایسے شخص کے تصور میں آسکتی ہے۔ وہ پس وہی ہے جس کے اظہار سے نیک نامی، شہرت، عزت یا اسی قسم کے اور دنیوی فائدے حاصل ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح وہ صرف ایسے جرائم کو جرائم اور ایسے ہی گناہوں کو گناہ سمجھے گا جس کا نتیجہ کسی دنیوی سزا یا جہانی عقوبت یا مادی نقصان کی شکل میں ظاہر ہونے کا اندیشہ ہو۔ رہیں وہ نیکیاں جن کا کوئی نفع اس دنیا میں ظاہر ہونے والا نہ ہو۔ تو وہ اس کے نزدیک حماقت سے کم نہ

ہوں گی اور وہ برائیاں جن کا کوئی نقصان اس دنیا میں عائد ہونے والا نہ ہو تو وہ اس کے نزدیک عین صواب ہوں گی۔

اگر کہیں پورے معاشرے کا نظام اخلاق اسی اعتقاد اور اسی ذہنیت پر قائم ہو تو سرے سے اس کے اخلاقی تصورات ہی بدل جائیں گے، اس کا پورا نظام اخلاق خود غرضی اور نفسیات کی بنیاد پر تعمیر ہوگا۔ نیکی محض دنیوی فائدے کے ہم معنی ہوگی اور بدی محض دنیوی نقصان کی مترادف ہو کر رہ جائے گی، غرض، دنیوی زندگی سے آگے کسی اچھے یا برے نتیجے کے مرتبہ ہونے کا خوف یا امید نہ ہو تو انسان افعال کے صرف ان ہی نتائج پر نظر رکھے گا جو اس دنیا میں ظاہر ہونے والے ہیں۔ اور اس سے اعمال کی اخلاقی قدروں میں ایسا تغیر واقع ہو جائے گا جو ہرگز کسی مہذب انسانی سوسائٹی کے لئے سازگار نہیں ہو سکتا۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ سزا و جزا کے لئے دنیا میں صرف مادی و جسمانی نقصانات اور فوائد ہی نہیں بلکہ خود انسان کے اندر بھی ایک قوت موجود ہے جس کا نام ”ضمیر“ ہے۔ اس کی ملامتیں اور اس کی بے اطمینانی اس دنیا میں بدی کے لئے کافی سزائیں، اور اس کا اطمینان انسان کے لئے نیکی کا کافی معادضہ ہے۔ مگر اول تو بہت سے گناہ ایسے ہیں جن کے مادی فوائد انسان کو ضمیر کی سرزنش بڑاشت کرنے کے لئے آمادہ کر دیتے ہیں اور بہت سی نیکیوں کے لئے انسان کو اتنی قربانی کرنا پڑتی ہے کہ محض ضمیر کا اطمینان ان کا پورا معادضہ نہیں ہو سکتا۔ دوسرے، اگر آپ ضمیر کی حقیقت پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس کا کام اخلاقی تصورات پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ جو اخلاقی تصورات ایک خاص قسم کی تعلیم و تربیت سے انسان کے ذہن میں راسخ ہو جاتے ہیں، ان ہی کی تائید اس کا ضمیر کرنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک غیر مسلم کا ضمیر جن باتوں پر سرزنش کرتا ہے ایک مسلمان کا ضمیر ان پر سرزنش نہیں کرتا۔ اگر کسی سوسائٹی کے اخلاقی تصورات بدل جائیں اور نیر و شر کے معیار متغیر ہو جائیں تو ان کے ساتھ ضمیر کا رخ بھی پھر جائے گا۔

۲۔ ہندومت کا تصور آخرت | ہندو کے خیال میں موت کے معنی فنائے محض کے نہیں ہیں بلکہ محض تبدیل جسم کے ہیں۔ روح اس جسم سے مفارقت

کرنے کے بعد کوئی دوسرا جسم اختیار کرتی ہے، اور وہ دوسرا جسم یا زیادہ صحیح الفاظ میں دوسرا قالب اس قابلیت کی مناسبت سے ہوتا ہے جو انسان نے اپنی پہلی زندگی میں اپنے اعمال اور اپنے رجحانات سے بہم پہنچائی ہے۔ اگر اس کے اعمال برے رہے ہیں اور ان کے اثر سے اس کے نفس میں بری قابلیتیں پیدا ہو گئی ہیں تو اس کی روح ادنیٰ درجہ کے حیواناتی یا نباتاتی طبقات میں چلی جائے گی۔ اور اگر اچھے اعمال سے اچھی قابلیتیں اس نے بہم پہنچائی ہیں تو روح اعلیٰ

طباقوں کی طرف ترقی کرے گی۔ غرض اس نظریہ کی رو سے جزا اور سزا جو کچھ بھی ہے اس دنیا اور ان ہی اجسام کے عالم میں ہے۔ ارواح بار بار اس دنیا میں قالب بدل کر آتی ہیں تاکہ اپنے پچھلے اعمال کے نتائج بھگتیں۔ گویا اس عقیدے کی روح سے ایک شخص جو اس وقت انسان ہے وہ اس لئے انسان ہو گیا کہ جب وہ جانور تھا تو اس نے اچھے عمل کئے تھے۔ اور ایک جانور جو اس وقت جانور ہے وہ اس لئے جانور ہو گیا کہ انسان کی جون میں اس نے بُرے عمل کئے تھے۔ دوسرے الفاظ میں انسان و حیوان اور درخت ہونا سب دراصل پہلے جنم کے اعمال کا نتیجہ ہے! اس طرح اس نظریہ کو ماننے کے لئے ایسی باتوں کو ماننا ضروری ہے جو صریح علم و عقل کے خلاف ہیں۔ چنانچہ

۱۔ تنازع کا یہ چکر ایسا ہے جس کا کوئی آغاز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ انسان ہونے کے لئے لازم ہے کہ اس سے پہلے نبات اور حیوان ہو اور نبات اور حیوان ہونے کے لئے لازم ہے کہ ان سے پہلے انسان ہو۔ اس پر بوالعجبی است؟

۲۔ اگر تنازع کا چکر ازلی اور ابدی ہے تو ماننا پڑے گا کہ نہ صرف وہ ارواح، جو بار بار قالب بدلتی ہیں، بلکہ وہ مادے بھی، جو ان ارواح کو قالب مہیا کرتے ہیں، ازلی اور ابدی ہیں۔
۳۔ ماننا پڑے گا کہ نباتات، حیوانات اور نوع بشری کی جتنی امتیازی خصوصیات ہیں وہ سب دراصل ان کے اجسام کے خاصے ہیں، نہ کہ نفوس کے۔ اس لئے جو نفوس انسان کے قالب میں عقلی و فکری قوتیں رکھتا تھا وہ حیوان کے قالب میں لایعقل ہو گیا۔ اور نباتی قالب میں اس غریب سے حرکت ارادی کی قوت بھی سلب ہو گئی۔

۴۔ نیک اور بد کا اطلاق ان اعمال پر ہوتا ہے جو سوچ سمجھ کر بالا راہ کئے جائیں۔ اس لحاظ سے انسان کے اعمال تو نیک اور بد ہو سکتے ہیں، اور ان پر جزا اور سزا بھی ہو سکتی ہے، لیکن نباتات اور حیوانات کے اعمال پر نہ تو نیک اور بدی کا اطلاق جائز ہے۔ اور نہ ان کے لئے جزا و سزا کی کوئی وجہ جواز ہے۔

۵۔ اگر بعد کی زندگی ہمارے موجودہ جنم کے کرموں کا پھل ہے تو ظاہر ہے کہ بُرے کرموں کا پھل برا ہی ہونا چاہیئے۔ اور جب دوسرے جنم میں وہ برا پھل، ہم کو ملا تو یہ کیوں کر ممکن ہے کہ اس بُرے پھل سے نیک اعمال صادر ہوں۔ لامحالہ اس سے بُرے ہی اعمال صادر ہوں گے اور پھر ان کا پھل تیسرے جنم میں اور بھی زیادہ برا ہو گا۔

غرض، عقل سلیم اس نظریے کو قبول نہیں کر سکتی۔ اور یہی وجہ ہے کہ انسان عقل اور علم میں جتنی ترقی کرتا گیا، تنازع کا اعتقاد باطل ہوتا چلا گیا۔

ظاہر ہے کہ اس رویے کا اثر انسانی زندگی اور تمدن پر اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ
ہمتوں کو پست کرنے والا اور ترقی کی روح کو مردہ کرنے والا ہو جب کہ اس میں سرے سے کوئی
معقولیت ہی نہیں پائی جاتی۔ اسی اعتقاد سے "اہنسا" کا عقیدہ نکلا ہے جو انسان کی شخصی اور
قومی زندگی کے لئے حد درجہ مہلک ہے۔ جو قوم اس عقیدہ کی قائل ہو اُس کا جذبہ شجاعت فنا
ہو جاتا ہے اس کی جسمانی قوتیں مضاعف ہو جاتی ہیں۔ اور وہ قوائے جسمانی کو نشوونما دینے والی
بہترین غذاؤں سے محروم ہو جاتی ہے۔ یہ عقیدہ تمدن و تہذیب کا بھی دشمن ہے اور انسان کو
رہبانیت اور ترک دنیا کی طرف لے جاتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ جو لوگ نجات کے طالب ہیں
وہ سیاسی بن کر جنگوں اور پہاڑوں میں جا بیٹھیں جو ایسا نہ کریں وہ نجات سے مایوس ہو کر جانوروں
اور درختوں کے طبقات میں جانے کے مستعد ہو جائیں۔ کیا یہ تحقیر تہذیب و تمدن کی ترقی میں کسی طرح
مردگار ہو سکتا ہے؟ اور کیا کوئی قوم یہ اعتقاد رکھ کر دنیا میں ترقی کر سکتی ہے؟

۳۔ یہود و نصاریٰ کا تصور آخرت | یہود و زرقیامت اور آخری جزا و سزا کے قائل تھے
"ایوب" میں لکھا ہے :-

"کیوں کہ مجھے یقین ہے کہ میرا بدلہ دینے والا زندہ ہے اور روز آخرت زمین پر قائم ہوگا ہر چند
میرے مرنے کے بعد میرا جسم کرم خوردہ ہو جائے گا۔ لیکن میں اپنے گوشت میں سے خدا کو دیکھوں گا۔"
واعظ کی کتاب میں لکھا ہے :-

لے جو ان تو اپنی جوانی میں خوش ہو اور اپنی بلوغت کے دنوں میں اپنا جی بہلا۔ مگر جان رکھ کہ ان
ساری باتوں کے لئے خدا تجھ کو عدالت میں لائے گا۔"

کفارہ مسیح کا عقیدہ :- عیسائی آخری اور جزا و سزا کو مانتے ہیں۔ مگر وہ کفارے کا
عقیدہ رکھتے ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت مسیح نے صلیب پر جان دے کر تمام بنی آدم کے
گناہوں کو چھپا لیا ہے اور ان کے لئے نجات کا موجب بن گئے ہیں۔ عیسائیوں کے نزدیک ہر انسان
پیدائشی گنہگار ہے۔ آدم اور حوا نے جو گناہ کیا وہ وراثتہ ہر شخص کی فطرت میں چلا آ رہا ہے جس کی
وجہ سے ہر شخص گنہگار ہے۔ عیسائیوں کے نزدیک نیک اعمال نجات کے موجب نہیں ہو سکتے۔ اگر
اللہ تعالیٰ بندے کے گناہ توبہ اور استغفار سے معاف کر دے تو اس کا یہ رحم اس کے عدل کے
خلاف ہے۔ اللہ رحیم ہے، اس کا رحم چاہتا ہے کہ انسان سزا سے بچ جائے۔ وہ عادل بھی ہے
اُس کے عدل کا یہ تقاضا ہے کہ سزا ضروری جائے۔ رحم اور عدل ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ بندے
کی نجات کا ہونا ضروری ہے۔ بندوں کو نجات دلانے کی ایک صورت یہ ہے کہ خدا کا بیٹا یسوع مسیح جو
تمام گناہوں سے پاک اور معصوم ہے لوگوں کے تمام گناہوں کو اپنے اوپر لے کر جان کی قربانی دے

اور سارے لوگوں کے لئے نجات کا ذریعہ بنے۔

۴۔ اسلامی عقیدہ آخرت و اس کے دلائل | سوالات کے ان دو غیر مطمئن جوابات کے بعد اب تیسرا

جل زیر بحث ہے جو اسلام پیش کرتا ہے اور جیسے جیسے اسلام کے جوابات کو غائر نظر سے دیکھیں گے اس کی حقانیت و صداقت مبرہن ہوتی چلی جائے گی۔ اسلام کے نزدیک، جیسا کہ ابتداً اشارہ کیا گیا، ان بنیادی فطری سوالات کا جواب یہ ہے کہ:

(د) ایک دن اللہ تعالیٰ تمام عالم اور اس کی مخلوقات کو مٹا دے گا۔ یہ دنیا کی زندگی عارضی اور فانی ہے۔

(ب) پھر وہ سب کو ایک دوسری زندگی بخشنے کا، اور سب اللہ کے سامنے حاضر ہوں گے۔
(ج) تمام لوگوں نے اپنی دنیوی زندگی میں جو کچھ کیا ہے اس کا پورا نامہ اعمال خدا کی عدالت میں پیش ہوگا۔

(د) اللہ تعالیٰ ہر شخص کے اچھے اور بُرے اعمال وزن فرمائے گا، جس کی بھلائی خدا کی میزان میں برائی سے زیادہ وزنی ہوگی اس کو بخش دے گا اور جس کی برائی کا پلہ بھاری رہے گا اسے سزا دے گا۔

یہ ہے فطری سوالات کا وہ جواب جسے اسلام "عقیدہ آخرت" کے نام سے موسوم کرتا ہے یہ وہ مذہب ہے جسے انبیاء علیہم السلام نے پیش کیا ہے۔ قرآن مجید اسی مذہب کا پر زور وکیل ہے۔ بلکہ قرآن مجید کا شاید ہی کوئی صفحہ ایسا ہو جو اس کے تذکرے سے خالی ہو مگر قبل اس کے کہ ہم اس عقیدہ کے اخلاقی نتائج اور تہذیب اسلامی میں اس کے رتبے اور اہمیت پر کلام کریں، ہمیں دیکھنا چاہیے کہ اس نظریہ کے حق میں کیا دلائل ہیں اور عقل کہاں تک اس کو قبول کرتی ہے؟

۵۔ عقلی دلائل | یہ سوال کہ موت کے بعد کوئی زندگی ہے یا نہیں ان امور سے تعلق رکھتا ہے جو ہمارے حواس اور حسی تجربہ کے حدود سے باہر ہیں۔ ہم جو کچھ محسوس کرتے ہیں وہ صرف اس قدر ہے کہ ایک شخص، جو چند لمحہ قبل تک سانس لیتا اور اپنے ارادہ سے حرکت کرتا تھا، وہ اب زندگی کے تمام آثار سے محروم ہو گیا اور اس کے جسم سے کوئی ایسی شے غائب ہو گئی جس نے اس جامد، غیر نامی، غیر متحرک مادے کو نمودار حرکت کی قوت مہیا کر رکھی تھی۔ اب رہا یہ سوال کہ وہ شے کہاں چلی گئی؟ جسم سے الگ ہو کر بھی موجود ہے یا معدوم ہو گئی؟ اور پھر کبھی اس جسم یا ایسے ہی کسی اور جسم سے اس کا تعلق دوبارہ قائم ہوگا یا نہیں؟ تو یہاں تک ہمارے حواس اور تجربی علم کا تعلق ہے ہم اس سوال کا فیضاً یا اثباتاً کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ کیونکہ اس چیز کوئی نفسہ نہ ہم نے پہلے کبھی محسوس کیا تھا اور نہ اب محسوس کرتے ہیں۔

اس بنا پر جہاں تک سائنس کا تعلق ہے، یہ سوال اس کے دائرے سے قطعی خارج ہے۔ جو شخص سائنس کا نام لے کر کہتا ہے کہ موت کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے، وہ سائنس سے انحراف کرتا ہے۔ سائنس کی رو سے کوئی یہ تو کہہ سکتا ہے کہ میں کچھ نہیں جانتا کہ مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے؟ (کیوں کہ یہ میرے حسی اور تجربی علم سے باہر ہے) لیکن اگر وہ یہ کہے کہ ”چوں کہ میں نہیں جانتا کہ مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے۔ اس لئے میں جانتا ہوں کہ مرنے کے بعد کچھ نہیں ہوتا“ تو یقیناً معقولیت کے حدود سے تجاوز کر جائے گا۔ ایک گنوار نے اگر ”راکٹ“ نہیں دیکھا تو وہ کہہ سکتا ہے کہ ”مجھے نہیں معلوم کہ ”راکٹ“ کیا چیز ہے“ لیکن جب وہ کہے گا کہ میں جانتا ہوں کہ راکٹ کوئی چیز نہیں ہے، (کیوں کہ میں نے اسے نہیں دیکھا) تو عقل مند اس کو احمق کہیں گے۔ اس لئے کہ اس کا کسی چیز کو نہ دیکھنا یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ چیز ہے ہی نہیں۔ ایک آدمی کیا اگر ساری دنیا کے لوگوں نے بھی کسی چیز کو نہ دیکھا ہو تو یہی یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ نہیں ہے یا نہیں ہو سکتی۔ اس لئے جب تک ہم کوئی یقینی ذریعہ علم نہیں پاتے کم از کم اس وقت تک تو صحیح سائنٹیفک رویہ یہی ہو سکتا ہے کہ ہم زندگی بعد موت کا نہ انکار کریں نہ اقرار۔

مگر کیا عملی زندگی میں ہم اس سائنٹیفک رویے کو نباہ سکتے ہیں؟ یقیناً نہیں۔ عقلی حیثیت سے تو یہ ممکن ہے کہ جب ایک چیز کو جاننے کے ذرائع ہمارے پاس نہ ہوں تو اس کے متعلق ہم نفی اور اثبات دونوں سے پرہیز کریں۔ لیکن جب اسی چیز کا تعلق ہماری عملی زندگی سے ہو تو ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ یا تو انکار پر اپنا طرز عمل قائم کریں یا اقرار پر۔ مثلاً ایک شخص ہے جس سے آپ واقف نہیں ہیں۔ اگر اس کے ساتھ آپ کا کوئی معاملہ پیش نہ ہو تو آپ کے لئے یہ ممکن ہے کہ اس کے ایمان دار ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں کوئی حکم نہ لگائیں۔ لیکن جب آپ کو اس سے معاملہ کرنا ہو تو آپ مجبور ہیں کہ یا تو اسے ایمان دار سمجھ کر معاملہ کریں یا بے ایمان سمجھ کر۔ اپنے ذہن میں آپ ضرور یہ خیال کر سکتے ہیں کہ جب تک اس کا ایمان دار ہونا یا نہ ہونا ثابت نہ ہو جائے اس وقت تک ہم شک کے ساتھ معاملہ کریں گے، مگر اس کی ایمان داری کو مشکوک سمجھتے ہوئے جو معاملہ آپ کریں گے، عملاً اس کی صورت تو وہی ہوگی جو اس کی ایمان داری کا انکار کرنے کی صورت میں ہو سکتی تھی۔ لہذا فی الواقع انکار اور اقرار کے درمیان شک کی حالت صرف ذہن ہی میں ہو سکتی ہے۔ عملی رویہ کبھی شک پر قائم نہیں ہو سکتا۔ لہذا ہم بہر حال اس امر کا تعین کرنے پر مجبور ہیں کہ آیا موت کے بعد کوئی اور زندگی ہے یا نہیں۔ اگر سائنس اس کے تعین میں ہماری مدد نہیں کرتی تو ہمیں عقلی استدلال سے مدد لینا چاہیئے۔

اس سلسلے میں ہمارے سامنے ایک تو خود انسان ہے۔ اور دوسرے یہ نظام کائنات۔ ہم انسان کو اس نظام کائنات کے اندر رکھ کر دیکھیں گے کہ جو کچھ انسان میں ہے آیا اس کے سارے مقتضیات اس نظام میں پورے ہو جاتے ہیں یا کوئی چیز بچی رہتی ہے جس کے لئے کسی دوسری نوعیت کے نظام (دوسری زندگی "آخرت") کی ضرورت ہو۔

انسان ایک تو جسم رکھتا ہے، جو بہت ہے معدنیات، نمکیات، پانی اور گیسوں کا مجموعہ ہے اس کے جواب میں کائنات کے اندر بھی مٹی، پتھر، دھاتیں، تنک، گیسیں، دریا اور اسی جنس کی دوسری چیزیں موجود ہیں۔ ان چیزوں کو کام کرنے کے لئے بن قوانین کی ضرورت ہے، وہ سب کائنات کے اندر کار فرما ہیں، اور جن طرح وہ باہر کی فضا میں پہاڑوں، دریاؤں اور ہواؤں کو اپنے حصے کا کام پورا کرنے کا موقع دے رہے ہیں اسی طرح انسانی جسم کو بھی ان قوانین کے تحت کام کرنے کا موقع حاصل ہے۔

پھر انسان ایک ایسا وجود ہے جو گرد و پیش کی چیزوں سے غذائے کر بڑھتا اور نشو و نما حاصل کرتا ہے۔ اسی جنس کے درخت، پودے، اور گھاس پھوس کائنات میں بھی موجود ہیں۔ اور وہ قانون بھی یہاں پائے جاتے ہیں۔ جو نشو و نما پانے والے اجسام کے لئے درکار ہیں۔ پھر انسان ایک زندہ وجود ہے۔ جو اپنے ارادے سے حرکت کرتا ہے، اپنی غذا خود اپنی کوشش سے فراہم کرتا ہے، اپنے نفس کی آپ حفاظت کرتا ہے اور اپنی نوع کو باقی رکھنے کا انتظام کرتا ہے۔ کائنات میں اس جنس کی بھی دوسری بہت سی قسمیں موجود ہیں۔ خشکی، تری، اور ہوا میں بے شمار حیوانات پائے جاتے ہیں، اور وہ قوانین بھی تمام و کمال یہاں کار فرما ہیں جو ان زندہ ہستیوں کے پورے دائرہ عمل پر حاوی ہونے کے لئے کافی ہیں۔

ان سب سے اوپر انسان ایک اور نوعیت کا وجود بھی رکھتا ہے، جس کو ہم اخلاقی وجود کہتے ہیں۔ اس کے اندر نیکی اور بدی کرنے کا شعور ہے۔ نیک اور بد کی تمیز ہے۔ نیکی اور بدی کرنے کی قوت ہے۔ اور اس کی فطرت یہ مطالبہ کرتی ہے کہ نیکی کا اچھا اور بدی کا برا نتیجہ ظاہر ہو۔ اور وہ ظلم اور انصاف، سچائی اور جھوٹ، حق اور ناحق، رحم اور بے رحمی، احسان اور احسان فراموشی، فیاضی اور سخی، امانت اور خیانت اور ایسی ہی مختلف اخلاقی صفات کے درمیان فرق کرتا ہے۔ یہ صفات عملاً اس کی زندگی میں پائی جاتی ہیں اور یہ محض خیالی چیزیں نہیں ہیں۔ بلکہ بالفعل ان کے اثرات انسانی تمدن پر مرتبہ ہوتے ہیں۔ لہذا انسان جس فطرت پر پیدا ہوا ہے اس کا شدت کے ساتھ یہ تقاضا ہے کہ جس طرح اس کے افعال کے طبیعی نتائج رونما ہوتے ہیں اسی طرح اخلاقی نتائج بھی رونما ہوں۔

مگر نظام کائنات پر گہری نگاہ ڈال کر دیکھئے۔ کیا اس نظام میں انسانی افعال کے اخلاقی نتائج پوری طرح رونما ہو سکتے ہیں؟ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہاں اس کا امکان نہیں ہے اس لئے کہ یہاں کم از کم ہمارے علم کی حد تک کوئی دوسری ایسی مخلوق نہیں پائی جاتی جو اخلاقی وجود رکھتی ہو۔ سارا نظام کائنات طبیعی قوانین کے ماتحت چل رہا ہے۔ اخلاقی قوانین کسی طرف کار فرما نظر نہیں آتے، یہاں روپے میں وزن اور قیمت ہے مگر سچائی میں نہ وزن ہے نہ قیمت۔ یہاں آم کی گھٹی سے ہمیشہ آم پیدا ہوتا ہے مگر سچی پرستی کا بیج بونے والے پر کسی پھولوں کی بارش ہوتی ہے اور کبھی، بلکہ اکثر جوتوں کی۔ یہاں مادی وسائل کیلئے کوئی قانون مقرر نہیں ہے کہ ان کی فعلیت سے ہمیشہ مقرر نتیجہ نکل سکے۔ طبیعی قوانین کی فرماں روائی کے سبب سے اخلاقی نتائج کبھی تو نکل ہی نہیں سکتے، کبھی نکلے ہیں تو صرف اس حد تک جس کی اجازت طبیعی قوانین دے دیں۔ اور بار بار ایسا بھی ہوتا ہے کہ اخلاق ایک فعل سے ایک خاص نتیجہ نکلنے کا تقاضا کرتا ہے مگر طبیعی قوانین کی مداخلت سے نتیجہ بالکل برعکس نکل آتا ہے۔ اس لئے اول تو موجودہ نظام کائنات جن قوانین پر چل رہا ہے ان کے اندر اتنی گنجائش ہی نہیں ہے کہ انسانی افعال کے اخلاقی نتائج پوری طرح مرتب ہو سکیں۔ دوسرے یہاں چند سال کی زندگی میں انسان جو عمل کرتا ہے اس کے رد عمل کا سلسلہ اتنا وسیع ہوتا ہے اور مدت تک جاری رہتا ہے کہ صرف اس کے پورے نتائج وصول کرنے کے لئے ہزاروں بلکہ لاکھوں برس کی زندگی درکار ہے اور موجودہ قوانین قدرت کے ماتحت ظاہر ہے کہ انسان کو اتنی زندگی ملنی ناممکن ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسانی ہستی کے خاکی، عضوی اور حیوانی عناصر کے لئے تو موجودہ طبیعی دنیا اور اس کے طبیعی قوانین کافی ہیں مگر اس کے اخلاقی عنصر کے لئے یہ دنیا بالکل ناکافی ہے۔ اس کے لئے ایک دوسرا نظام عالم درکار ہے جس میں اخلاق کا قانون حکمران ہو اور طبیعی قوانین اس کے ماتحت محض مددگار کی حیثیت سے کام کریں۔ جس میں زندگی محدود نہ ہو بلکہ غیر محدود ہو، جس میں وہ تمام اخلاقی نتائج جو یہاں مرتب ہونے سے رہ گئے ہیں یا اُٹنے مرتب ہوئے ہیں اپنی صحیح صورت میں پوری طرح مرتب ہو سکیں، جہاں سونے اور چاندی کے بجائے نیکی اور صداقت میں وزن اور قیمت ہو، جہاں آگ صرف اس چیز کو جلائے جو اخلاقاً جلنے کی مستحق ہو، جہاں عیش اس کو ملے جو نیک ہو اور مصیبت اس کے حصے میں آئے جو بد ہو۔ عقل چاہتی ہے، فطرت مطالبہ کرتی ہے کہ ایک ایسا نظام عالم ضرور موجود ہو۔

۶۔ قرآن کا طرز استدلال | جہاں تک عقلی استدلال کا تعلق ہے وہ ہم کو صرف ”ہونا چاہیئے“ کی حد تک لے جا کر چھوڑ دیتا ہے۔ اب

رہا یہ سوال کہ آیا واقعی کوئی ایسا عالم ہے بھی؟ تو ہماری عقل اور ہمارا علم دونوں اس کا حکم دینے سے عاجز ہیں۔ یہاں قرآن ہماری مدد کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمہاری عقل اور تمہاری فطرت جس چیز کا مطالبہ کرتی ہے فی الواقع وہ ہونے والی ہے۔ موجودہ نظام عالم جو طبعی قوانین پر بنا ہے ایک وقت میں توڑ ڈالا جائے گا۔ اس کے بعد ایک دوسرا نظام بنے گا جس میں زمین و آسمان اور ساری چیزیں ایک دوسرے ڈھنگ پر ہوں گی۔ پھر اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کو جو ابتدائے آفرینش سے قیامت تک پیدا ہوئے تھے، دوبارہ پیدا کر دے گا۔ اور بیک وقت ان سب کو اپنے سامنے جمع کرے گا۔ وہاں ایک ایک شخص کا، ایک ایک قوم کا اور پوری انسانیت کا ریکارڈ غلطی اور فروگزاشت کے بغیر محفوظ رکھا، ہر شخص کے ایک عمل کا جتنا ردعمل دنیا میں ہوا ہے، اس کی پوری روداد موجود ہوگی، وہ تمام نسلیں گواہوں کے کٹھرے میں حاضر ہوں گی جو اس ردعمل سے متاثر ہوئیں۔

ایک ایک ذرہ جس پر انسان کے اقوال اور افعال کے نقوش ثبت ہوئے اپنی داستان سنا دے گا۔ خود انسان کے ہاتھ اور پاؤں اور آنکھ اور زبان اور تمام اعضاء شہادت دیں گے کہ ان سے اس نے کس طرح کام لیا۔ پھر اس روداد پر وہ سب سے بڑا حاکم پورے انصاف کے ساتھ فیصلہ کرے گا کہ کون کتنے انعام کا مستحق ہے، اور کون کتنی سزا کا مستوجب ہے۔ یہ انعام اور یہ سزا، دونوں چیزیں اتنے بڑے پیمانے پر ہوں گی جس کا کوئی اندازہ موجودہ نظام عالم کی محدود مقداروں کے لحاظ سے نہیں کیا جاسکتا۔ وہاں وقت اور جگہ کے معیار کچھ اور ہوں گے، وہاں مقداریں کچھ اور ہوں گی، وہاں کے قوانین قدرت کسی اور قسم کے ہوں گے، انسان کی جن نیکیوں کے اثرات دنیا میں ہزاروں برس چلتے رہے ہیں وہاں وہ ان کا بھرپور صلہ وصول کرے گا۔ بغیر اس کے کہ موت اور بیماری اور بڑھاپا اس کے عیش کا سلسلہ توڑ سکیں اور جس انسان کی برائیوں کے اثرات دنیا میں ہزار ہا برس تک اور بے شمار انسانوں تک پھیلتے رہے ہیں وہ ان کی پوری سزا جگمگے گا بغیر اس کے کہ موت اور بے ہوشی آکر اسے تکلیف سے بچا سکے۔

ایسی ایک زندگی اور ایسے ایک عالم کو جو لوگ ناممکن سمجھتے ہیں ان کے ذہن کی تنگی پر ترس آتا ہے۔ خصوصاً آج کل جب کہ سائنسی ایجادات اور انکشافات قدم قدم پر اس نظریہ آخرت کی تائید و توثیق کرتے چلے جا رہے ہیں۔ مثلاً خود سائنس دانوں کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ایک دن سورج ٹھنڈا اور بے نور ہو جائے گا۔ سیارے ایک دوسرے سے ٹکرائیں گے۔ اور یہ دنیا تباہ ہو جائے گی۔ یا جیسا کہ پہلے سمجھا جاتا تھا کہ جو آواز ہمارے منہ سے نکلتی ہے وہ

ہو میں بخوڑی سی لہر پیدا کر کے فنا ہو جاتی ہے۔ مگر اب معلوم ہوا کہ ہر آواز اپنے گرد و پیش کی چیزوں پر اپنا نقش چھوڑ جاتی ہے جس کو دوبارہ پیدا کیا جاسکتا ہے چنانچہ گراموفون کا ریکارڈ اسی اصول پر بنا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ ہماری ہر حرکت کا ریکارڈ ان تمام چیزوں پر منقوش ہو رہا ہے جن کے ساتھ اس حرکت کا کسی طور پر تصادم ہوتا ہے۔ غرض، اگر ہمارے موجودہ نظام عالم کا موجودہ قوانین قدرت کے ساتھ موجود ہونا ممکن ہے تو آخر ایک دوسرے نظام عالم کا دوسرے قوانین کے ساتھ وجود میں آنا کیوں ناممکن ہو؟

۷۔ قرآنی دلائل | اس موقع پر اگر مختصراً قرآنی طرز استدلال پر کچھ روشنی ڈال دی جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس سلسلے میں اصولی طور پر قرآن نے جو طرز استدلال اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ سب سے پہلے وہ قدرت الہی کے آثار کا مشاہدہ کرنے اور ان پر فکرم کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ مثلاً

”أَوَلَمْ يَنْظُرُوا فِي مَلَكُوتِ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ۔ (الاعراف - ۱۸۵)

کیا ان لوگوں نے آسمانوں اور زمین کے انتظام پر غور نہیں کیا۔

گویا اشارہ کیا گیا کہ اگر تم آنکھیں کھول کر ان آثار کو دیکھو، جو شب و روز تمہارے سامنے پیش ہو رہے ہیں اور زمین و آسمان کے انتظام کا مشاہدہ کرو اور ان سب محسوسات اور مشاہدات پر غور و فکر کر کے حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرو تو تم کو معلوم ہو جائے گا کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ درست ہے۔ پھر وہ ان ہی آثار و مظاہر میں سے ان چیزوں کو پیش کرتا ہے جو سب سے زیادہ بدیہی ہیں۔ اور ان سے استدلال کرتا ہے کہ جس بات (مخفوی زندگی) کو تم بعید از عقل سمجھ رہے ہو، تمہاری عقل و قیاس سے دُور ہو مگر حقیقت میں ناممکن نہیں ہے۔ چنانچہ فرمایا:

”وَ اَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمٰوٰتِ
بَنٰهَآ۔ (النازعات - ۲۷)

کیا تمہارا پیدا کرنا زیادہ دشوار ہے یا آسمان کا؟
خدا نے تو ایسی (بڑی چیز کو) بنایا ہے۔

جس خدا نے اتنا بڑا نظام کائنات پیدا کیا ہے جس نے اجرام سماوی کو اپنے قانون کی بندش میں جکڑ رکھا ہے، جس کی قدرت ان عظیم الشان اجرام کو اس انتظام کے ساتھ حرکت دے رہی ہے کہ کوئی جرم اپنے مدار سے بال برابر تجاوز نہیں کر سکتا اور جس کی طاقت نے کائنات کے طبقوں کو ایسے غیر مرئی اور غیر محسوس سہاروں پر قائم کیا ہے جن کے ادراک سے تم عاجز ہو، اس خدا کے متعلق یہ گمان کرنا کہ وہ تم جیسی حقیر مخلوق کو ایک دفعہ ہلاک کر کے دوبارہ زندہ کرنے پر قادر نہیں ہے، کیسی بڑی خام خیالی ہے۔ آسمان کے بعد وہ ہمارے قریب ترین ماحول یعنی زمین کے آثار کی طرف ہم کو متوجہ کرتا ہے:-

اور ۲۱ کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے تو زمین کو دیکھتا ہے کہ سونی پڑی ہے پھر جہاں ہم نے پانی برسایا اور وہ بھیگ اٹھی اور لہلہانے لگی تو جس نے اس کو زندہ کیا وہی مردوں کو بھی زندہ کرنے والا ہے یقیناً وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اگر تم کو مرنے کے بعد جی اٹھنے میں شک ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ ہم نے مٹی سیسی بے جان شے سے تم کو پیدا کیا ہے۔

”وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْتَ تَرَى الْأَرْضَ خَاشِعَةً فَإِذَا أَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْزَلَتْ وَرَبَّتْ إِنَّ الَّذِي أَحْيَاهَا لَمُجِى الْمَوْتِ إِنَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ“

(حم السجده - ۳۹)

”إِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّنْ تُرَابٍ“

(الحج - ۵)

اسی طرح ان صاف اور واضح اور ہمارے مشاہدہ و احساس سے قریب تر شواہد پیش کرنے کے بعد قرآن مجید ایک ایسی کھلی ہوئی دلیل پیش کرتا ہے جو بالکل معمولی سمجھ سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اشیاء کو عدم سے وجود میں لانا زیادہ مشکل ہے بہ نسبت اس کے کہ ان کو منتشر اور پراگندہ ہو جانے کے بعد دوبارہ پہلی صورت پر پیدا کیا جائے۔ پس جو طاقت اس دشوار تر کام کو انجام دینے سے عاجز نہ ہوئی، وہ آسان تر کام کو انجام دینے سے کیوں کر عاجز ہو سکتی ہے؟ اگر ایک شخص موٹر ایجاد کرنے پر قادر ہے اور اس کو بنا چکا ہے تو کیا یہ بات عقل میں آسکتی ہے کہ وہ موٹر کے پرزوں کو الگ الگ کرنے کے بعد دوبارہ بوڑنے پر قادر نہیں ہے؟ اسی مثال پر قیاس کر لو کہ صانع عالم، جو تم کو عدم سے وجود میں لایا ہے تمہیں مرنے کے بعد دوبارہ پیدا کرنے سے ہرگز عاجز نہیں ہو سکتا۔

اور وہی تو ہے جو آفرینش کی ابتداء کرتا ہے پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا اور یہ اعادہ اس کے لئے سہل تر ہے۔

”وَهُوَ الَّذِي يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ“

(الروم - ۲۷)

۸۔ عقیدہ آخرت کے انسانی زندگی پر اثرات

اب تک جو کچھ کہا گیا ہے اس دنیوی زندگی کے بعد ایک اخروی زندگی کا وجود میں آنا ممکن اور اغلب اور اقتضائے حکمت کے مطابق ہے۔ اور عقل (بشرطیکہ صحیح و سلیم ہو) اور علم (بشرطیکہ حقیقی ہو) ہم کو اخروی زندگی کے اس تصور پر جو قرآن نے پیش کیا ہے، ایمان لانے سے نہیں روکتے بلکہ اس پر آمادہ کرتے ہیں۔ اور یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ حیات اخروی کا مسئلہ محض ایک فلسفیانہ مسئلہ ہی نہیں ہے، بلکہ انسان کی اخلاقی اور عملی زندگی سے اس کا ایک گہرا تعلق ہے۔ اس کو ماننے سے زندگی اور اس کے معاملات کے متعلق انسان

کا نقطہ نظر بنیادی طور پر بدل جاتا ہے۔ اس اعتقاد کو تسلیم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے آپ کو ایک ذمہ دار اور جواب دہ ہستی سمجھے اور اپنی زندگی کے تمام معاملات یہ سمجھتے ہوئے انجام دے کہ وہ اپنی ہر حرکت اور ہر فعل کے لئے ذمہ دار ہے۔ آئندہ زندگی میں اس کو اپنے تمام اعمال کی جوابدہی کرنی ہے اور مستقبل کی سعادت و شقاوت اس کے حال کی نیکی اور بدی پر منحصر ہے۔ جو شخص اس اخروی زندگی کا معتقد ہوگا اس کی نظر اپنے اخلاقی افعال کے صرف اپنی نتائج پر نہ ہوگی جو اس زندگی میں مرتب ہوتے ہیں، بلکہ وہ ان آخری نتائج پر نگاہ رکھے گا جو اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی میں ظاہر ہونے والے ہیں۔ اور ان نتائج کے لحاظ سے ہر فعل کے مفید یا مضر ہونے کا فیصلہ کرے گا۔ اس کو جس طرح زہر کے جہلک اور آگ کے موذی ہونے کا یقین ہوگا۔ وہ جس طرح روٹی اور پانی کو مفید سمجھے گا۔ اسی طرح عدل و امانت اور عفت کو بھی مفید سمجھے گا۔ وہ اپنے ہر فعل کے ایک متعین اور یقینی نتیجہ کا قائل ہوگا۔ خواہ وہ نتیجہ اس زندگی میں قطعاً ظاہر نہ ہو، بلکہ برعکس صورت میں ظاہر ہو۔ اس کے پاس اخلاقی اعمال کی متعین اخلاقی قدریں ہوں گی اور ان قدروں میں دنیوی فوائد یا مضرتوں سے کوئی تغیر واقع نہ ہوگا۔

اس طرح اسلام نے آخرت کے عقیدے کو اپنے اخلاقی ضابطہ اور نظام شرعی کے لئے ایک زبردست پشت پناہ بنا دیا ہے۔ جس میں ایک طرف خیر و صلاح پر عمل کرنے اور شر و فساد سے بچنے کے لئے عقلی ترغیب بھی موجود ہے اور دوسری طرف نیکی پر یقینی جزا اور بدی پر یقینی سزا کا خوف بھی ہے۔ اس کا ضابطہ اور نظام اپنی بقا و استحکام کے لئے مادی طاقت اور حاکمانہ اقتدار کا محتاج نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایمان بالیوم الآخر کے ذریعے سے انسان کے نفس میں ایک ایسے طاقت ور ضمیر کی تشکیل کرتا ہے۔ جو کسی بیرونی لالچ اور خوف کے بغیر انسان کو آپ سے آپ ان نیکیوں کی طرف راغب کرتا ہے جن کو اسلام نے آخری نتائج کے اعتبار سے نیکی قرار دیا ہے اور ان گناہوں سے بچنے کی تاکید کرتا ہے جن کو اس نے آخری نتائج کا لحاظ کرتے ہوئے گناہ ٹھہرایا ہے۔

قرآن میں جگہ جگہ اس عقیدے کو مکارم اخلاق کی تعلیم کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ تقویٰ اور پرہیزگاری کا حکم دیا جاتا ہے تو ساتھ ہی ارشاد ہوتا ہے کہ:

”وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ مُفْلِقُونَ“

اللہ سے ڈرو اور جان رکھو کہ تم کو اس کے پاس

(البقرہ - ۲۳۳)

راہ خدا میں سرفروشی کے لئے ابھارا جاتا ہے تو ساتھ ہی یہ بھی یقین دلایا جاتا ہے کہ اگر تم مارے جاؤ گے تو درحقیقت مرنے جاؤ گے بلکہ ہمیشہ زندگی پاؤ گے۔

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے جائیں ان کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں، لیکن تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں ہوتا۔

”وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ“
(البقرہ - ۱۵۴)

مصائب پر صبر کی تلقین کی جاتی ہے تو ساتھ یہ بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ صابرین کے لئے خدا کی طرف سے عنایت اور رحمت ہے:

یہ وہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی جانب سے بڑی عنایات ہوگی اور رحمت الہی ان پر سایہ کرے گی۔

”أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ“
(البقرہ - ۱۵۷)

بے خوفی اور بہادری کا جذبہ اس طرح پیدا کیا جاتا ہے کہ:

جو لوگ سمجھتے تھے کہ انہیں اللہ کے پاس حاضر ہونا ہے انہوں نے کہا کہ اللہ کے حکم سے جھوٹی عجات بڑی جماعت پر غالب آجاتی ہے۔

”قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُّلْقُوا۟ ۖ اللَّهُ لَكُمْ مِّنْ قَبْلِ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فَئْتَهُ كَثِيرَةٌ ۖ بِإِذْنِ اللَّهِ“
(البقرہ - ۲۳۹)

سخت سے سخت مشکلات کے مقابلہ میں ڈٹ جانے کی قوت یہ کہہ کر پیدا کی جاتی ہے کہ:

”نَارُ جَهَنَّمَ أَشَدُّ حَرًّا“ (التوبہ - ۸۱)

نیک کاموں میں مال خرچ کرنے کیلئے ابھارتے ہوئے یوں ارشاد ہوتا ہے:

جو کچھ تم خیرات کرو گے اس کا پورا اجر تم کو ملے گا اور تمہارے ساتھ ظلم نہ ہوگا۔

”وَمَا تَنْفِقُوا۟ مِنْ خَيْرٍ يُّؤْتِكُمْ إِلَيْكُمْ ۖ وَأَنْتُمْ لَا تَظْلَمُونَ“
(البقرہ - ۲۷۲)

بخل سے روکنے کے لئے فرمایا جاتا ہے:

جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے مال دار کیا ہے اور پھر وہ اس میں بخل کرتے ہیں، وہ یہ نہ سمجھیں کہ ان کے لئے اچھا ہے بلکہ درحقیقت یہ ان کے حق میں برا ہے جس مال میں وہ بخل کرتے ہیں وہی عبادت کے روزانہ کے گلے میں طوق بنا کر ڈال دیا جائیگا۔

”وَلَا يَحْسِبَنَّ الَّذِينَ يَبْخُلُونَ بِمَا أَنَّهُمْ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخُلُوا۟ بِهِ يَوْمَ الْقِيَمَةِ“
(آل عمران - ۱۸۰)

سو دشواری کے ظاہری فائدوں سے دست بردار ہونے کے لئے یہ کہہ کر آمادہ کیا جاتا ہے کہ:

اس دن سے ڈرو جس میں تم اللہ کے پاس لوٹائے جاؤ گے۔

”فَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ“
(البقرہ - ۲۸۱)

متدع دنیا سے بے نیازی اور بدکاروں کی خوش حالی پر رشک نہ کرنے کی تعلیم اس طرح دی جاتی ہے کہ:

”لَا يَغْوِيكَ قَلْبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي
الْبِلَادِ مَتَاعٌ قَلِيلٌ ثُمَّ مَا أُوتِيَهُمْ
جَهَنَّمُ وَيُسْأَلُ الْيَهُودَ لَكِنَّ الَّذِينَ
اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا
الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا نُزُلًا مِنْ عِنْدِ
اللَّهِ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ بَرَّاهِ

(آل عمران - ۱۹۶ - ۱۹۷ - ۱۹۸)

دنیا کے ملکوں میں کفر کی روش اختیار کرنے والے
کی چلت پھرت تھیں کسی دھوکے میں نہ ڈالے، یہ محض
چند روزہ زندگی کا تھوڑا سا نطفہ ہے، پھر یہ سب
جہنم میں جائیں گے جو بدترین جائے قرار ہے، لیکن جو
لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرتے ہیں
ان کیلئے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان
باغوں میں وہ ہمیشہ رہیں گے، ان کیلئے اللہ کی طرف سے
یہ سامان ضیافت ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے
نیک لوگوں کیلئے وہی سب سے بہتر ہے۔

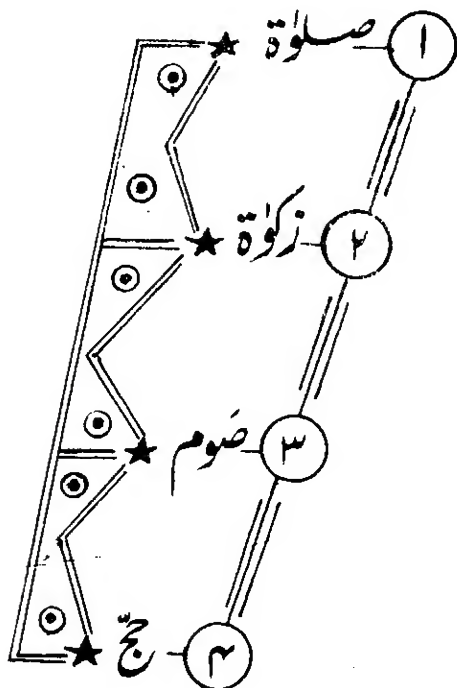
عقیدہ آخرت کی اس اہمیت و افادیت کے پیش نظر اس عقیدہ پر ایمان و ایقان رکھنا
ایک مسلمان کے لئے ناگزیر ہے۔ اور جب تک اس پر ایمان نہ لائے، کوئی انسان مسلمان نہیں ہو
سکتا۔ بلکہ مسلمان تو خیر بڑی چیز ہے۔ سچ یہ ہے کہ آخرت کا انکار انسان کو انسانیت سے
گرا کر حیوانیت سے بھی بدتر درجے میں لے جاتا ہے۔

سوالات متعلقہ باب دوم

- (۱) اسلام کے بنیادی عقائد پر ایک مفصل مقالہ سپرد قلم کیجئے۔
- (۲) توحید کی اہمیت کتاب و سنت کی روشنی میں ثابت کیجئے نیز بتائیے کہ توحید کے زیر اثر انسانی زندگی پر کیا اثرات مترتب ہوتے ہیں۔
- (۳) تعلق باللہ سے کیا مراد ہے اور اس کی بنیاد کن امور پر قائم ہے۔
- (۴) رسالت کی ضرورت و اہمیت اور انبیاء کی خصوصیات قلمبند کیجئے۔
- (۵) مندرجہ ذیل میں سے کسی تین پر جامع نوٹ لکھئے :-
عصمت - بشریت - وجہیت - معلم و مربی۔
- (۶) رسول اکرمؐ کے ساتھ ہمارے تعلق کی بنیاد کیا ہے تفصیلاً لکھئے۔
- (۷) مندرجہ ذیل میں سے کسی دو پر جامع نوٹ لکھئے :-
ایمان - اطاعت - اتباع - محبت
- (۸) منکرینِ آخرت اپنا موقف کن دلائل سے ثابت کرتے ہیں اور آپؐ ان کا کیا جواب دے سکتے ہیں۔
- (۹) ہندومت، یہودیت اور عیسائیت کے تصورِ آخرت پر ایک مقالہ قلمبند کیجئے۔
- (۱۰) عقیدہ آخرت انسانی زندگی پر کیا اثرات ڈالتا ہے اور کیوں؟
- (۱۱) ایک مومن اور منکر آخرت کی زندگی میں کیا فرق ہوتا ہے۔ دونوں کا تقابل کیجئے۔

باب سوم

اسلام کا تصور عبادت اور اسلامی عبادات



اسلام کا تصورِ عبادت اور اسلامی عبادت

قرآن کی رو سے عبادت وہ اصل مقصد ہے جس کی خاطر انسانوں کو پیدا کیا گیا ہے، ”وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ“ (میں نے جنوں اور انسانوں کو محض عبادت کے لئے پیدا کیا ہے) لہذا ہمارے لئے اس بات کا سمجھنا بڑا ضروری ہے کہ عبادت کیا ہے اور اس کا صحیح تصور کیا ہے۔

عبادت کا ایک تصور وہ ہے جسے جاہلی تصورِ عبادت کہا جاسکتا ہے۔ اس تصور کی رو سے عبادت محض پوجا پاٹ تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ جاہل لوگ اپنے معبودوں کو انسانوں پر قیاس کرتے ہوئے یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح بڑے آدمی، سردار یا بادشاہ خوشامد سے خوش ہوتے ہیں، نذرانے پیش کرنے سے مہربان ہو جاتے ہیں، ذلت اور عاجزی کے ساتھ ہاتھ جوڑنے اور سر جھکانے سے سچ جاتے ہیں اور ان سے یونہی کام نکالا جاسکتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی انسانوں سے خوشامد، نذر و نیاز اور عاجزی کا طالب ہے۔ اس تصور کی بناء پر جاہلی مذہب چند مخصوص اوقات میں مخصوص مراسم ادا کرنے کو عبادت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

عبادت کا دوسرا تصور جسے جوگیانہ یا راہبانہ تصورِ عبادت کہنا موزوں ہوگا، یہ ہے کہ انسان دنیاوی زندگی سے الگ ہو کر خدا سے لو لگائے، مراقبہ، نفس کشی اور مجاہدات و ریاضات کے ذریعے اپنی اندرونی قوتوں کو نشوونما دے اور دنیوی زندگی کی ذمہ داریوں سے سبکدوشی حاصل کر کے اخروی نجات حاصل کرے۔ عبادت کا یہ تصور اُن مذاہب میں پایا جاتا ہے، جن کی بنیاد زندگی کے راہبانہ تصور پر ہے اور جن کے نزدیک دین اور دنیا ایک دوسرے کی ضد ہیں اور جو دنیا کی زندگی اور اس کی ذمہ داریوں اور اس کے علائق سے باہر نجات کا راستہ ڈھونڈتے ہیں۔

اسلام کا تصورِ عبادت ان دونوں سے مختلف ہے۔ اسلام کی نگاہ میں انسان خدائے واحد کا بندہ ہے۔ اس کا خالق، اس کا مالک، اس کا حاکم صرف خداوند عالم ہے جس نے اس زمین پر اس کو اپنے نائب کی حیثیت سے مقرر کیا۔ کچھ اختیارات عطا کئے، کچھ ذمہ داریاں دیں، کچھ خدمتیں سپرد کیں۔ اپنی مملکت اور رعیت کے حصے پر اقتدار دیا۔ اس دنیا میں اس کا کام اپنے مالک کے مقصد کو پورا کرنا ہے، اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنا اور ادا کرنا ہے۔ آقا کی

سپرد کی ہوئی خدمتوں کو انجام دینا ہے۔ اس کی آئندہ ترقی کا انحصار اسی پر ہے کہ اپنی تقرری کی مدت ختم کرنے کے بعد جب وہ مالک کے سامنے حساب کے لئے پیش ہو تو اس کے کارنامہ زندگی سے یہ ثابت ہو کہ وہ ایک فرض شناس مطیع اور فرماں بردار بندہ تھا، نہ یہ کہ سست، کام چور، فرض ناشناس یا باغی و نافرمان تھا۔

اس نقطہ نظر سے عبادت کے وہ دونوں تصور ہو اوپر بیان کئے گئے ہیں، ناقص ہیں جو شخص اپنے اوقات میں سے تھوڑا سا وقت خدا کو پوجنے میں صرف کر کے یہ سمجھتا ہے کہ اب وہ آزاد ہے کہ جو چاہے کرے، اس کی مثال ایک ایسے ملازم کی ہے جسے آپ نے رات دن کے لئے رکھا ہو اور جسے پوری تنخواہ دے کر آپ پرورش کر رہے ہوں لیکن وہ بس صبح شام آکر آپ کو جھک جھک کر سلام کر دیا کرے اور اس کے بعد آزادی کے ساتھ جس جس کی چاہے نوکری بجالائے۔ اسی طرح جو شخص دنیا اور اس کے معاملات سے الگ ہو کر ایک گوشے میں جا بیٹھتا ہے اور اپنا سارا وقت پوجا پاٹ اور ریاضت میں صرف کر دیتا ہے۔ اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جسے آپ اپنے باغ کی رکھوالی کے لئے مقرر کریں مگر وہ باغ کو اور اس کے کام کاج کو چھوڑ آپ کے سامنے ہر وقت ہاتھ باندھے کھڑا رہے، صبح سے شام اور شام سے صبح تک آقا پکارتا رہے اور باغبانی کے متعلق جو ہدایات آپ نے اسے دی ہیں ان کو خوش الحانی اور ترقیل کے ساتھ پڑھتا رہے لیکن باغ کی اصلاح و ترقی کے لئے کچھ نہ کرے دے۔ ایسے ملازموں کے متعلق جو کچھ رائے آپ قائم کریں گے وہی رائے اسلام بھی، ایسے عبادت گزاروں کے متعلق قائم کرتا ہے۔

اسلام کا تصور عبادت یہ ہے کہ آپ کی ساری زندگی خدا کی بندگی میں بسر ہو، آپ اپنے آپ کو دائمی اور ہمہ وقتی ملازم سمجھیں، آپ کی زندگی کا ایک لمحہ بھی خدا کی عبادت سے خالی نہ ہو، اس دنیا میں آپ جو کچھ بھی کریں خدا کی شریعت کے مطابق کریں، آپ کا سونا جاکنا، اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، غرض کہ سب کچھ خدا کے قانون کی پابندی میں ہو۔ خدا نے جو خدمات آپ کے سپرد کی ہیں۔ اور زندگی کے جو فرائض آپ سے متعلق کئے ہیں، ان سب کا بار آپ نفس کی پوری رضامندی کے ساتھ اٹھائیں اور ان کو اس طریقے سے ادا کریں جس کی طرف خدا نے اپنے رسولوں کے ذریعے آپ کی رہنمائی کی ہے۔ آپ ہر دقت اور ہر کام میں خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری محسوس کریں اور سمجھیں کہ آپ کو اپنی ایک ایک حرکت کا حساب دینا ہے۔ اپنے گھر میں بیوی بچوں کے ساتھ، اپنے محلے میں ہمسایوں کے ساتھ، اپنی سوسائٹی میں دوستوں کے ساتھ، اپنے کاروبار میں اہل معاملہ کے ساتھ برتاؤ کرتے وقت ایک ایک بات اور ایک ایک کام میں خدا کی مقرر

کردہ حدود کا آپ کو خیال رہے۔

پس دنیا کو چھوڑ کر کونوں اور گوشوں میں جا بیٹھنا اور ریاضت کرنا عبادت نہیں ہے۔ بلکہ دنیا کے دھندوں میں بھینس کر اور دنیوی زندگی کی ساری ذمہ داریوں کو سنبھال کر خدا کے قانون کی پابندی کرنا عبادت ہے۔ ذکر الہی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ محض زبان پر اللہ اللہ جاری ہو بلکہ اصل ذکر الہی یہ ہے کہ جو چیزیں خدا سے غافل کرنے والی ہیں ان میں آپ بھینس اور پھر خدا سے غافل نہ ہوں۔ دنیا کی زندگی میں جہاں قانون الہی کو توڑنے کے بے شمار مواقع، بڑے بڑے فائدوں کا لالچ اور بڑے بڑے نقصانوں کا خوف لئے ہوئے سامنے آتے ہیں، وہاں خدا کو یاد رکھیے اور اس کے قانون کی پیروی کرتے رہیے۔ حکومت کی کرسی پر بیٹھیں لیکن یہ ذہن میں رہے کہ میں بندوں کا خدا نہیں، خدا کا بندہ ہوں۔ عدالت کے منصب پر متمکن ہوئیے اور ظلم کرنے پر قدرت رکھنے کے باوجود یہ خیال رکھئے کہ میں خدا کی طرف سے عدل قائم کرنے پر مامور ہوں، زمین کے خزانوں پر قابض و متصرف ہوئیے اور پھر یاد رکھئے کہ میں ان خزانوں کا مالک نہیں ہوں بلکہ امانت دار ہوں اور پائی پائی کا حساب مجھے اصلی مالک کو دینا ہے۔ فوجوں کے کمانڈر بنیے اور خوفِ خدا آپ کو طاقت کے نشے میں مدہوش ہونے سے بچاتا رہے، سیاست و جہاں بانی کا کٹھن کام ہاتھ میں لیجئے اور پھر سچائی، انصاف اور حق پسندی کے اصول پر عمل کر کے دکھائیے۔ تجارت، صنعت و مالیات کی بائیس سنبھالئے اور پھر کامیابی کے ذرائع میں پاک و ناپاک کا امتیاز کرتے ہوئے چلیے۔ ہر طرف ظلم و دغا اور فریب و بدکاری کے راستے آپ کے لئے کھلے ہوں اور دنیاوی کامیابیاں اور مادی لذت ہر طرف سے دعوت دے رہی ہوں اور پھر خدا کی یاد اور آخرت کی باز پرس کا خوف آپ کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دے۔ حدودِ اللہ میں سے ایک ایک کے قائم کرنے میں ہزاروں شکنیں کھاٹی دیں، حق کا دامن تھامنے اور عدل و صداقت پر قائم رہنے میں جان و مال کا زیاں نظر آئے، خدا کے قانون کی پیروی کرنا زمین و آسمان کو دشمن بنالینے کا ہم معنی ہو جائے پھر بھی آپ کا ارادہ متزلزل نہ ہو اور آپ کی جبینِ عزم پر شکن نہ آئے۔ یہ ہے اصلی عبادت!

اسلام نے روحانی ترقی اور خدا کی یافت کا بھی یہی راستہ بتایا ہے۔ انسان خدا کو جنگلوں اور پہاڑوں میں یا گوشہ ہائے عزلت میں نہیں پاسکتا۔ خدا اس کو انسانوں کے درمیان اور دنیوی زندگی کے ہنگاموں میں ملے گا اور اس قدر قریب ملے گا کہ گویا وہ اپنی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا ہے۔ جس انسان کے سامنے حرام کے فائدے اور ظلم کے مواقع قدم قدم پر آئے اور ہر قدم پر وہ خدا سے ڈر کر ان سے بچتا ہوا چلا، اسے خدا کی یافت ہو گئی۔ جس نے گھر میں تفریح کے لمحوں اور کاروبار کے ہنگاموں میں، ہر کام اس احساس کے ساتھ کیا کہ خدا مجھ سے دور نہیں

ہے، اس نے خدا کو ہر لمحہ اپنے اپنے قریب سے قریب تر پایا۔ جس نے سیاست اور حکومت اور صلح و جنگ اور مالیات اور صنعت و تجارت جیسے ایمان کی سخت آزمائش کرنے والے کام کئے اور یہاں کامیابی کے شیطانی ذرائع سے بچ کر خدا کے مقرر کئے ہوئے حدود کا پابند رہا اس سے بڑھ کر مضبوط اور سچا ایمان اور کس کا ہو سکتا ہے؟ اس سے زیادہ خدا کی معرفت اور کسے حاصل ہو سکتی ہے؟ اور اس سے زیادہ خدا کا مقرب اور کون ہو گا؟

اسلامی نقطہ نظر سے انسان کی روحانی قوتوں کے نشوونما کا راستہ یہی ہے۔ روحانی ارتقاء اس کا نام ہے کہ آپ اپنے نفس کی خواہشات پر قابو پائیں، اپنے ذہن اور جسم کی تمام طاقتوں سے صحیح کام لیں، اپنے اخلاق میں خدا کے اخلاق سے قریب تر ہونے کی کوشش کریں، دنیوی زندگی میں، جہاں قدم قدم پر آزمائش کے مواقع پیش آتے ہیں، اگر آپ حیوانی اور شیطانی طریق کار سے بچتے ہوئے چلیں اور پورے شعور اور تمیز سے اُس طریقے پر کاربند رہیں جو انسان کے شایان شان ہے تو آپ کی روحانیت روز بروز ترقی کرتی چلی جائے گی اور آپ روز بروز خدا سے قریب تر ہوتے چلے جائیں گے۔ حتیٰ کہ وہ آپ کا ہاتھ ہو جائے گا، جس سے آپ کام کرتے ہیں، وہ آپ کی آنکھ ہو جائے گا جس سے آپ دیکھتے ہیں اور وہ آپ کے پاؤں ہو جائے گا جس سے آپ چلتے ہیں یہ وہ مقام ہے جہاں بندہ اللہ کے رنگ میں رنگ جاتا ہے اُس کی مرضیات کا پابند ہو جاتا ہے وہ رب سے راضی ہو جاتا ہے اور رب اس سے راضی۔ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔

اس بحث سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اسلام انسان کی پوری زندگی کو عبادت میں تبدیل کر دینا چاہتا ہے، اس کا مطالبہ یہ ہے کہ آدمی کی زندگی کا کوئی لمحہ بھی خدا کی عبادت سے خالی نہ ہو۔ "لا الہ الا اللہ" کا اقرار کرنے کے ساتھ ہی یہ بات لازم آ جاتی ہے کہ جس اللہ کو آدمی نے اپنا معبود تسلیم کیا ہے اس کا بعد یعنی بندہ بن کر رہے۔ اور بندہ بن کر رہنے کا نام ہی عبادت ہے۔ کہنے کو تو یہ بات بہت بھٹی سی ہے اور بڑی آسانی سے اسے زبان ہلا کر ادا کیا جاسکتا ہے مگر عملاً انسان کی پوری زندگی کا اپنے تمام گوشوں کے ساتھ عبادت بن جانا آسان کام نہیں؛ اس کے لئے بڑی زبردست تربیت کی ضرورت ہے؛ اس کے لئے ضروری ہے کہ خاص طور پر ذہن کی تربیت کی جائے، مضبوط کردار بنایا جائے، عادات و خصائل کو ایک خاص سانچے میں ڈھالا جائے اور صرف انفرادی سیرت ہی کی تعمیر پر اکتفا نہ کر دیا جائے۔ بلکہ ایک ایسا اجتماعی نظام قائم کیا جائے جو بڑے پیمانے پر افراد کو اس عبادت کے لئے تیار کرنے والا ہو اور جس میں جماعت کی طاقت فرد کی پشت پناہ، اس کی مددگار، اور اس کی کمزوریوں کی تلافی کرنے والی ہو۔ یہی غرض ہے جس کے لئے اسلام میں نماز، روزہ، حج اور

زکوٰۃ کی عبادتیں فرض کی گئی ہیں۔ ان کو عبادات کہنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ بس عبادات یہی ہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اس اصلی عبادت کے لئے انسان کو تیار کرتی ہیں، یا یہ کہ یہ اس کے لئے تربیت کا لازمی نصاب ہیں، انہی سے وہ مخصوص ذہنیت بنتی ہے، اُس خاص کردار کی تشکیل ہوتی ہے، منظم عادات و خصائص کا وہ پختہ سا پچہ بنتا ہے اور اُس اجتماعی نظام کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں جس کے بغیر انسان کی زندگی کسی طرح عبادت الہی میں تبدیل نہیں ہو سکتی۔ نیز یہ کہ ان کے ذریعے بندہ رب سے قریب تر آتا ہے، اس کی روح کو بایستگی حاصل ہوتی ہے اور وہ زمین و آسمان کے مالک کا محبوب اور پسندیدہ بندہ بن جاتا ہے، ان چار چیزوں کے سوا اور کوئی ذریعہ ایسا نہیں، جس سے یہ مقصد حاصل ہو سکے۔ اسی بناء پر ان کو ارکان اسلام قرار دیا گیا ہے، یعنی یہ وہ ستون ہیں جن پر اسلامی زندگی کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔

آئیے، اب ہم دیکھیں کہ ان میں سے ایک ایک رکن اسلامی زندگی کی عمارت کو کس طرح قائم کرتا ہے اور کس طرح انسان کو اس بڑی عبادت کے لئے تیار کرتا ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

۱۔ صلوٰۃ

۱۔ مقصدِ حیات کی یاد دہانی | انسان کی پوری زندگی کو عبادت میں تبدیل کر کے کیلئے سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ اس کے ذہن میں یہ شعور ہر وقت تازہ رہے کہ وہ خدا کا بندہ ہے۔ یہ ضرورت اس لئے ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانی حواس سے بالاتر ہے لیکن گمراہی کی طاقتیں ہر سمت پھیلی ہوئی ہیں۔ لہذا ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ انسان کو بار بار اس بات کی یاد دہانی کی جاتی رہے کہ اسے اپنی زندگی ایک مخصوص انداز سے گزارنی ہے۔ یہ نماز کا سب سے بڑا فائدہ ہے۔ جیسے ہی آپ صبح کو اٹھیں وہ آپ کو یہ بات یاد دلاتی ہے۔ شام اور رات کو جب تقریر یا آرام کا وقت ہوتا ہے تو نماز آپ کو آگاہ کرتی ہے کہ تم خدا کے بندے ہو، شیطان نفس کے بندے نہیں ہو۔ نماز کی اسی خصوصیت کی بناء پر قرآن میں اسے ذکر کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے معنی یاد دہانی کے ہیں۔

۲۔ فرض شناسی: چوں کہ انسان کے سپرد یہ کام ہوا ہے کہ وہ ہر قدم پر خدا کے احکام کو بجالائے لہذا ضروری ہے کہ اس میں فرض شناسی اور مستعدی پیدا ہو بلکہ اس کی فطرت ثانیہ بن جائے۔ مثال کے طور پر فوج کو دیکھئے، وہاں کن کن طریقوں سے فرائض کو سمجھنے اور ادا کرنے کی مشق کرائی جاتی ہے۔ رات دن میں کئی بار بگل بجایا جاتا ہے۔ سپاہیوں کو ایک جگہ جمع ہونے کا حکم دیا جاتا ہے، ان سے قواعد کرائی جاتی ہے! آخر کس لئے؟ اس لئے کہ سپاہیوں میں فرض شناسی پیدا ہو اور جو لوگ ان صفات سے محروم ہوں ان کی آزمائش نہ ہو جائے تاکہ ان کی اصلاح کی کوشش ہو یا بالآخر ان کو فوج سے نکال دیا جائے دیوبند فوج کے لئے کام کا وقت تو کبھی برسوں میں آتا ہے، تب بھی قواعد روزانہ کرائی جاتی ہے، لیکن اسلام کی تیار کردہ فوج تو ہر وقت برسرِ کار ہے۔ اسے زندگی کے ہر آن شیطانی قوتوں سے لڑنا ہے، فرائض بجالانے ہیں، حدود اللہ کی حفاظت کرنی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی فوج کے لئے زیادہ سخت تنظیم، تربیت اور آزمائش کی ضرورت ہے اور انہی مقاصد کے تحت نماز دن اور رات میں پانچ بار فرض کی گئی ہے تاکہ ایک طرف تو مسلمانوں کی تربیت ہو اور دوسری طرف سچے اور جھوٹے مسلمانوں میں امتیاز ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ:

”بین العبد وبين الكفر ترك الصلوة | بندے اور کفر کے درمیان ترکِ صلوٰۃ واسطہ ہے“

یعنی ترک صلوٰۃ وہ پل ہے جسے پار کر کے آدمی ایمان سے کفر کی طرف جاتا ہے۔
 ۳۔ تعمیر سیرت: نماز کا تیسرا اہم کام یہ ہے کہ وہ انسان کی سیرت کو اس خاص ڈھنگ پر تیار کرتی ہے جو انسانی زندگی بسر کرنے کے لئے ضروری ہے۔

دنیا میں ہر جگہ جیسا کام کسی جماعت کو کرنا ہوتا ہے اسی کے لحاظ سے اس کی تربیت کی جاتی ہے۔ مثلاً سول سروس کا مقصد وفاداری کے ساتھ ملک کا انتظام کرنا ہوتا ہے لہذا وہاں سارا زور نظم مملکت کی صلاحیت پیدا کرنے پر دیا جاتا ہے، سپاہیوں کا کام جنگ کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے انہیں اسلحہ کا استعمال سکھایا جاتا ہے اور اطاعت امیر اور تنظیم کی تربیتی جاتی ہے۔ اسلام کا مقصد ایک ایسی جماعت کی تیاری ہے جس کا مقصد اولین نیکی کو قائم کرنا اور بدی کو مٹانا ہے اور جسے سیاست، عدالت، تجارت، صنعت، صلیح و جنگ غرض یہ کہ ہر شعبہ زندگی میں خدا کے قوانین کی پابندی کرنی ہے اور انہیں پوری دنیا میں نافذ کرنے کی ذمہ داری سنبھالنی ہے۔ یہ عظیم کام اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک انسان میں خدا کا خوف، اس کی محبت اور اس کی خوشنودی کی خواہش نہ پیدا ہو اور جب تک آدمی یہ جان نہ لے کہ خدا حاکم اصلی ہے اور ہر انسان کے سامنے جو ابدہ ہے مسلمان اسلام کے طریقے پر ایک قدم بھی نہیں چل سکتا جب تک کہ اسے یقین نہ ہو کہ خدا ہر جگہ ہر حال میں اسے دیکھ رہا ہے۔ اس کی ہر ہر حرکت سے باخبر ہے، اندھیرے میں بھی اس کو دیکھتا ہے، تنہائی میں بھی اس کے ساتھ ہے اور اس کے دل میں جو نیت چھپی ہوئی ہے اس کو بھی وہ جانتا ہے۔ یہی یقین انسان کو خدا کے احکام کی اطاعت اور اس کے قانون کی پیروی کے لئے تیار کرتا ہے، اور نماز کا مقصد یہ ہے کہ وہ اسی یقین کو بار بار انسان کے ذہن میں تازہ کرے۔

نماز کا ارادہ کرنے کے ساتھ ہی روح کی تربیت اور اسلامی سیرت کی تعمیر کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اور پھر ایک ایک حرکت، ایک ایک فعل اور ایک ایک قول جو نماز سے متعلق ہے کچھ اس طور پر رکھا گیا ہے کہ اس سے خود بخود انسان کی سیرت اسلام کے سانچے میں ڈھلتی چلی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے قرآن میں دعوئے کیا گیا ہے کہ:

”إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ“ (العنکبوت- ۲۵)
 یقیناً نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے۔

اسی بنا پر نماز قدیم ترین زمانے سے انبیاء کی تعلیمات کا جزو رہی ہے۔ جتنے انبیاء خدا کی طرف سے آئے ہیں ان سب کی شریعت میں نماز اولین رکن اسلام تھی۔ اسلامی تحریک بس جب بھی کبھی زوال آیا نماز کا نظام تربیت ٹوٹ جانے کی وجہ ہی سے آیا کیوں کہ اسلام

کے طریقے پر چلنے کے لئے اسلامی سیرت ضروری ہے، اور اسلامی سیرت نماز کے نظام تربیت ہی سے بنتی ہے اور جب یہ نظام ٹوٹے گا تو سیرتیں بگڑ جائیں گی اور اس کا لازمی نتیجہ زوال و انحطاط ہوگا۔

۴۔ ضبط نفس اور تقویٰ: تعمیر سیرت کے ساتھ نماز انسان میں ضبط نفس کی قوت بھی پیدا کرتی ہے۔ نماز میں دعاؤں اور تسبیحوں کے ساتھ اوقات کی پابندی، طہارت وغیرہ کی شرائط اور جسمانی حرکات کا جوڑا اسی لئے لگایا گیا ہے کہ انسان اپنے نفس پر پوری طرح قابو یافتہ رہے، اور اسے اپنے ارادے کے تحت چلانے میں مشاق ہو جائے صبح کا وقت ہے، نیند آرہی ہے، آرام طلب نفس کہتا ہے، پڑے رہو، اب کہاں اٹھ کر جاؤ گے، نماز کہتی ہے کہ وقت آچکا ہے، بیداری طرح اٹھو، وضو کرو، جازمے کا موسم ہے تو ہوا کرے، پانی گرم نہیں ہے، نہ سہی، ٹھنڈا ہی پانی استعمال کرو اور چلو مسجد کی طرف۔ ان دو مطالبات میں سے اگر کسی نے نفس کے مطالبے کو پورا کر دیا تو اس کا نفس اس سے جیت گیا ورنہ اس نے نفس پر قابو پایا۔ اسی طرح ظہر، عصر، مغرب، عشاء ہر وقت کسی نہ کسی مشغولیت، فائدے، نقصان، لطف، لذت، مشکلات وغیرہ کے بہانے دھونڈتا ہے لیکن نماز ہر وقت تازیانہ بن کر آجاتی ہے اور آپ کی اونگھتی ہوئی قوت ارادی کو جگاتی ہے۔ اگر آپ نماز کا مطالبہ پورا کرتے رہے تو آپ خواہشات نفس کا زور توڑ دیں گے، ان پر حکم راں ہو جائیں گے اور آپ میں یہ طاقت پیدا ہو جائے گی کہ اپنے علم و ارادے کے مطابق انہیں تبدیل کر سکیں۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ نماز چھوڑ کر آدمی خواہشات نفس کا پیرو بن کر گمراہ ہو جاتا ہے۔

”فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهْوَاتِ فَسُوفَ يَلْقَوْنَ غِيَاً“ (مریم - ۵۹)

پھر ان کے بعد ایسے ناخلف لوگ آئے جنہوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور خواہشات نفس کی پیروی اختیار کر لی۔ لہذا عنقریب وہ گمراہی میں مبتلا ہوں گے۔

یہاں تک ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ نماز کے فوائد و منافع کا صرف ایک پہلو ہے، یعنی یہ کہ نماز افراد کو کس طرح تیار کرتی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ نماز:

(۱) آدمی کے ذہن میں اس حقیقت کو تازہ رکھتی ہے کہ وہ دنیا میں خود مختار نہیں ہے بلکہ اللہ رب العالمین کا بندہ ہے اور اسی حیثیت سے کام کرتا ہے۔

(۲) انسان کو فرض شناس بناتی ہے۔

(۳) فرض شناس اور فرض ناشناس میں تمیز کا ذریعہ ہم پہنچاتی ہے۔

(۴) خیالات کا ایک پورا نظام ترتیب دیتی ہے تاکہ اس کی سیرت بچتے ہو سکے۔

(۵) انسان میں یہ قوت پیدا کرتی ہے کہ وہ اپنے عقیدے اور بصیرت کے مطابق جس طرز عمل کو صحیح سمجھتا ہے اس پر عمل کر سکے۔

(۶) بندے کو رب سے قریب لاتی ہے اور اس کے قلب کو پاکیزگی اور روح کو بالیدگی عطا کرتی ہے۔

۵۔ اجتماعی فوائد: اب ہمیں نماز کے ایک دوسرے پہلو پر نظر ڈالنی چاہیے۔ یہ ظاہر ہے کہ انفرادی سیرت تنہا کوئی نتیجہ نہیں پیدا کر سکتی جب تک کہ جماعت میں بھی وہی سیرت موجود نہ ہو۔ آدمی دنیا میں کوئی کام اکیلا نہیں کر سکتا۔ اس کی ساری زندگی اپنے بھائی بندوں، دوستوں اور ہمسایوں، معاملہ داروں اور ساتھیوں کے ساتھ ہزاروں قسم کے تعلقات میں جکڑی ہوئی ہے۔ اب اگر ایک انسان ایسے لوگوں کے درمیان گھرا رہے جو خدا کے قانون کو تسلیم ہی نہیں کرتے یا اس کی نافرمانی پر تکیے ہوئے ہیں تو اکیلے آدمی کے لئے اپنی زندگی میں اس قانون کو جاری کرنا دشوار ہو جائے گا، حالاں کہ مسلمانوں کے ذمے کام نہ صرف یہ ہے کہ اسے اپنی زندگی میں جاری کریں بلکہ پوری دنیا پر غالب و نافذ کریں۔ اس کام کے لئے ایک آدھ مسلمان کافی نہیں ہے بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ سب مسلمان مل کر ایک جتھا بنیں اور پھر اس کام کے لئے کوشش کریں۔

نماز ہماری اس ضرورت کو بھی پورا کرتی ہے۔ وہ اس اجتماعی نظام کا پورا ڈھانچہ بناتی ہے، اس کو قائم کرتی اور رکھتی ہے اور اسے روزانہ پانچ مرتبہ حرکت میں لاتی ہے تاکہ وہ ایک مشین کی طرح چلتا رہے۔ اس لئے بیچ وقت نماز کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا واجب قرار دیا گیا ہے، حکم ہے کہ اذان کی آواز سنتے ہی دوڑ جاؤ۔ جیسے فوجی سپاہی بگل سنتے ہی سمجھ لیتا ہے کہ کمانڈر نے ہمیں طلب کیا ہے اور اس کی تعمیل کے لئے دوڑتا ہے اسی طرح ہر مسلمان جہاں بھی اذان کی آواز مٹنے سب کام چھوڑ کر قریب کی مسجد کا رخ کرے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ جب کبھی کوئی ہم درپیش آئے تو سارا گروہ ایک منظم جتھے کی صورت میں جمع ہو سکے اور اس کیلئے کام کر سکے۔

یہ تو محض اذان کا فائدہ تھا۔ اب آپ مسجد میں جمع ہوتے ہیں، یہاں ایک دوسرے کو دیکھتے اور پہچانتے ہیں۔ اور اس حیثیت سے متعارف ہوتے ہیں کہ سب ہم مقصد اور ایک ہی راہ کے مسافر ہیں۔ اس نظر سے جب آپ دیکھیں گے کہ میرا کوئی بھائی پچھٹے پرانے کپڑوں میں ہے، کوئی پریشان صورت ہے، کوئی فاقہ زدہ ہے تو آپ کے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوگا اور جو لوگ خوشحال ہیں وہ غریبوں کی مدد کر سکیں گے۔

پھر مسجد میں تمام مسلمان مساوی الحیثیت ہیں۔ ایک چمار اگر پہلے آیا تو وہ اگلی صف میں

ہوگا اور ایک رئیس اگر بعد میں آئے تو پچھلی صفوں میں رہے گا، کوئی بڑے سے بڑا آدمی بھی مسجد میں اپنی نشست محفوظ نہیں کرا سکتا اور نہ کوئی شخص اس بات کا مجاز ہے کہ کسی شخص کو اس کی جگہ سے ہٹا دے۔ تمام مسلمان ایک ہی صف میں کھڑے ہوں گے۔ یہاں نہ کوئی بڑا ہے نہ چھوٹا، نہ اونچ نہ نیچ، کسی کے چھو جانے سے کوئی ناپاک نہیں ہوتا اور نہ کسی کے برابر کھڑے ہونے سے کسی کی عزت کو بڑھ لگتا ہے۔ اس طرح سوسائٹی کے فرد کو یاد دلایا جاتا ہے کہ خدا کی نگاہ میں تم سب برابر ہو طبقاتی امتیاز یا نسل، قبیلہ، رنگ اور وطن کی عصبیتیں غلط ہیں۔

مسجد میں ہر مسلمان امام بن سکتا ہے۔ البتہ مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے شریعت میں وہ صفات بیان کی گئی ہیں جن کا لحاظ رکھنا چاہیئے۔ یہ صفات، جن کا ذکر ہم کریں گے، انتہائی معنی خیز ہیں، ان کے ذریعے مسلمانوں کو یہ بتایا گیا ہے کہ اس چھوٹی سی مسجد کے باہر اس وسیع مسجد میں، جس کا نام زمین ہے، مسلمانوں کا اجتماعی نظام کیسا ہونا چاہیئے، انہیں کیسا امام یا ایسڈر منتخب کرنا چاہیئے اور اس کے ساتھ کس قسم کا تعلق رکھنا چاہیئے۔

مداہنت دی گئی ہے کہ امام ایسے شخص کو منتخب کیا جائے جو پرہیزگار ہو، نیک سیرت ہو، دین کا علم رکھتا ہو۔ حکم دیا گیا ہے کہ امام ایسے شخص کو نہ بنایا جائے جس سے جماعت کی اکثریت ناراض ہو۔ یوں تو تھوڑے بہت مخالف کس کے نہیں ہوتے لیکن، اگر جماعت میں زیادہ تر آدمی کسی شخص کی اقتدار کرنے سے کراہت کرتے ہوں تو اسے امام نہ بنایا جائے۔ ان ساری ہدایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سردار قوم کے انتخاب میں کن چیزوں کا لحاظ کرنا چاہیئے۔

حکم ہے کہ جو شخص امام بنے وہ نماز پڑھانے میں جماعت کے ضعیف لوگوں کا بھی لحاظ رکھے، محض جوان، مضبوط اور فرصت والے آدمیوں کو پیش نظر رکھ کر لمبی لمبی قراءت اور لمبے لمبے رکوع اور سجدے نہ کرنے لگے بلکہ یہ بھی خیال رکھے کہ جماعت میں بوڑھے بھی ہیں، بیمار بھی ہیں اور کمزور اور مشغول آدمی بھی ہیں، جو اپنا کام چھوڑ کر آتے ہیں۔ اس طرح گویا سردار قوم کو تعلیم دی ہے کہ جب وہ سردار بنایا جائے تو افراد کے ساتھ اس کا طرز عمل کیسا ہونا چاہیئے۔

حکم دیا گیا ہے کہ امام کی سختی سے پیروی کرنی چاہیئے۔ اس کی حرکت سے پہلے حرکت کرنا منع ہے۔ اس طرح قوم کو بتایا جا رہا ہے کہ اسے سردار کی اطاعت کس طرح کرنی چاہیئے۔ البتہ اگر امام غلطی کرے تو مقتدیوں کی فرض ہے کہ اسے سحان اللہ کہہ کر لوگ دیں ”سحان اللہ“ کے معنی ہیں کہ ”اللہ پاک ہے“ مطلب کہ تم نے غلطی ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں، غلطیوں سے برائیات تو صرف خدا کی ہے۔ امام کا فرض ہے کہ اپنی غلطی کا اصلاح کرے لیکن اگر وہ سمجھتا ہے کہ وہ صحیح ہے تو مقتدیوں کی فرض

ہے کہ اس کی پیروی کرتے رہیں۔ یہ تو چھوٹی موٹی غلطیوں کی بات ہے لیکن اگر غلطی سنگین ہو اور کفر و شرک تک پہنچتی ہو تو جماعت کا فرض ہے کہ فوراً علیحدہ ہو جائے اور اس امام کو ہٹا کر دوسرا امام مقرر کرے۔ قومی زندگی میں بھی یہی حیثیت ہے۔ جب تک سردار قوم حدود اللہ میں کام کر رہا ہو اس کی اطاعت واجب ہے لیکن اگر حدود کو توڑ دے تو ملت اسلامیہ کا فرض ہے کہ ایسے رہنماؤں اور اکابر کو ان کے عہدوں سے اتار دے اور ان کی جگہ خدا ترس لوگ منتخب کرے۔

نماز کے انہی فوائد کی بناء پر اس کو دین میں بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔ اسے 'عماد الدین' یعنی دین کا ستون کہا گیا ہے۔ جس نے اسے گرا دیا اس نے دین کی عمارت ڈھادی اور جس نے اس کی حفاظت کی اس نے دین کی عمارت محفوظ رکھی۔

مزید برآں نماز کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگائیے کہ نماز کو قرآن پاک میں "ایمان" تک کہا گیا ہے اور فقہاء و ائمہ نے فرمایا ہے کہ ترک نماز اور ایمان ساتھ ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ نماز روحانی ترقی اور قرب الہی کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔ اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے احسان کی تعریف ہی یہ فرمائی ہے کہ نماز اس طرح پڑھی جائے جیسے آپ خدا کو دیکھ رہے ہیں اور اگر یہ کیفیت نہ ہو تو کم از کم یہ کہ خدا آپ کو دیکھ رہا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کو آنکھوں کی ٹھنڈک قرار دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نماز ایمان بھی ہے اور ایمان کی پہچان بھی ہے۔ دل کا نور اور آنکھوں کی ٹھنڈک بھی ہے اور انفرادی اور اجتماعی سیرت کی صورت گار بھی۔ نماز دین کا وہ ستون ہے جس کے قیام سے دین قائم ہے اور جس کے منہدم ہو جانے سے دین کی عمارت بھی منہدم ہو جاتی ہے۔

۶۔ نماز کے معاشرتی و اخلاقی حکم و مصالح | ۱۔ ستر پوشی :- نماز کے

معاشرتی فوائد میں بالکل ابتدائی چیز ستر پوشی کا خیال ہے۔ بشرم و حیا کے پیش نظر اپنے جسم کے بعض حصوں کو چھپانا نہایت ضروری ہے۔ عرب کے بدو اس تہذیب سے ناواقف تھے۔ بلکہ شہروں کے باشندے بھی اس سے بے پرواہ تھے۔ یہاں تک کہ جب دیہاتی عورتیں حج کے لئے آتی تھیں تو اپنے کپڑے اتار دیتی تھیں اور اکثر سنگی ہو کر طواف کرتی تھیں۔ اسلام آیا تو اس نے ستر پوشی کے بغیر اس کے نزدیک نماز ہی درست نہیں۔ قرآن کریم میں فرمایا:

"خُذُوا زِينَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ" | ہر مسجد میں زینت لگا کر جاؤ

(الاعراف - ۳۱)

مردوں کے لئے کم از کم ناف سے گھٹنے تک اور عورتوں کے لئے پیشانی سے لے کر پاؤں تک پھیپھار نماز میں ضروری قرار پایا۔ اس تعلیم نے جاہل اور وحشی عربوں کو اور جہاں جہاں اسلام گیا وہاں کے برہنہ باشندوں کو ستر پوشی پر مجبور کیا اور نماز کی تاکید نے دن میں پانچ دفعہ ان کو اس فرض سے آشنا کر کے ہمیشہ کے لئے ان کو ستر پوش بنا دیا۔

۲۔ طہارت و پاکیزگی: نماز کا دوسرا معاشرتی فائدہ طہارت اور پاکیزگی ہے پہلی وحی کے بعد جب جبریل علیہ السلام دوسری مرتبہ نازل ہوئے تو یہ حکم لائے:-
”وَتَيَّابًا لَّكَ فَطَهِّرْ (المدثر-۳) | اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھ۔

پنچاںچہ اسلام نے طہارت اور پاکیزگی کے اصول مقرر کئے۔ نماز کی درستی کے لئے یہ ضروری قرار دیا کہ انسان کا بدن اس کے کپڑے اور نماز کی جگہ نجاست اور آلودگی سے پاک ہو۔ اہل عرب کو دوسری وحشی قوموں کی طرح طہارت و نظافت کی بالکل تمیز نہ تھی۔ یہاں تک کہ ایک بدو نے مسجد میں آکر سب کے سامنے بیٹھ کر پیشاب کر دیا صحابہ اس کو مارنے دوڑے۔ آپ نے ان کو روکا اور اس بدو کو اپنے پاس بلا کر نہایت مہربانی سے فرمایا کہ یہ نماز پڑھنے کی جگہ ہے۔ اس قسم کی نجاستوں کے لئے موزوں نہیں ہے۔ اور صحابہ سے فرمایا کہ اس نجاست پر پانی بہا دو۔ غرض اس تعلیم نے جو صرف نماز کے لئے تھی اہل عرب اور مسلمان کو پاک و صاف رہنے کا خوگر بنایا۔

۳۔ پابندی وقت: انسان کی کامیاب عملی زندگی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ اس کے تمام کام مقررہ اوقات پر انجام پائیں۔ انسان فطرتاً آرام پسند اور راحت طلب واقع ہوا ہے۔ اس کو پابند اوقات بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے بعض کاموں کے اوقات جبراً مقرر کر دیئے جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے دوسرے کاموں کے اوقات بھی ان کی خاطر مقرر کر لیتا ہے اور اس طرح اس کی زندگی باقاعدہ ہو جاتی ہے۔ نماز کے اوقات چونکہ مقرر ہیں اس لئے وہ لوگ جو نماز کے پابند ہیں، خصوصاً نماز باجماعت کے، ان کے اوقات خود بخود منظم ہو جاتے ہیں۔ ان کے شب و روز کے کام باقاعدہ انجام پاتے ہیں اور نماز کے اوقات ان کے کاموں کا معیار بن جاتے ہیں۔ وقت پر سونا اور وقت پر اٹھنا ان کے لئے ضروری ہو جاتا ہے۔

مشہور صحابی حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا مقولہ ہے۔

”اَلصَّلٰوَةُ مُكِّيَالٌ فَمَنْ اَوْفَىٰ وُقُوْٓيْہِ وَمَنْ طَفِفَ فَقَدْ عَلِمْتُمْ مَا لِلْمُطَفِّفِيْنَ۔“
(کنز العمال جلد ۴ صفحہ ۲۳)

نماز ایک پیمانہ ہے جس نے اُسے پورا ناپا
اس کو پورا ناپ کر دیا جائے گا اور جس نے
ناپنے میں کمی کی تو تمہیں کم ناپنے والوں کی سزا
معلوم ہے۔

۴۔ **سحر خیزی** : طب اور حفظانِ صحت کے اعتبار سے رات کو سویرے سونا اور صبح کو طلوع آفتاب سے پہلے بیدار ہونا جس درجہ ضروری ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ جو لوگ نماز کے پابند ہیں وہ اس اصول کی خلاف ورزی کبھی نہیں کر سکتے۔ جب رات کو وقت پر سویا نہ جائے گا۔ صبح کو وقت پر آنکھ نہیں کھل سکتی۔ اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کو نماز عشاء کے بعد بیکار باتیں کرنے سے اور قصہ کہانی سے منع فرمایا ہے تاکہ وقت پر سونے سے وقت پر آنکھ کھل سکے اور صبح خیزی مسلمانوں کی عادت ہو جائے صبح کو مؤذن کی پُرتاثر آواز: ”الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ“ | نماز سونے سے بہتر ہے۔

ان کو بے تابانہ نیند کے بستر سے اٹھا دے۔

۵۔ **خوف خداوندی** : ایک مسلمان جو نماز پڑھتا ہے۔ جب کبھی غلطی سے یا بشری کمزوری سے اس کا قدم دگم گاتا ہے تو رحمت الہی اس کا ہاتھ تھام لیتی ہے، اس کو اپنے فعل پر ندامت ہوتی ہے۔ اس کو اپنے خدا کے سامنے جاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اس کا ضمیر اس کو ملامت کرتا ہے۔ وہ لوگوں سے اس لئے شرماتا ہے کہ وہ کہیں گے کہ یہ نمازی ہو کر اس قسم کے افعال کا مرتکب ہوا ہے۔ غرض نماز انسان کے اخلاقی احساس کو بیدار کرتی ہے اور برائیوں سے بچاتی ہے۔ خود خدا نے نماز کا وصف یہ بیان کیا ہے:

”إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ“ (عنکبوت - ۴۵) | بے شک نماز بے حیائی اور بُری باتوں سے روکتی ہے۔

۶۔ **تربیت جہاد** :- باطل کو شکست دینا اور حمایتِ حق کی خاطر لڑنا انسان کا فرض ہے۔ اس فرض کی انجام دہی کے لئے انسان کو ہر وقت تیار رہنا چاہیے، اس تیاری کا نقشہ ہماری روزانہ کی نمازیں ہیں۔ حدیث میں آیا ہے۔

”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کا لشکر جب پہاڑی پر چڑھتا تو تکبیر اور جب نیچے اترتا تو تسبیح کہتا تھا۔ اسی طریقہ پر نماز قائم کی گئی ہے۔“ (ابوداؤد)

صف بندی ایک افسر (امام) کی اطاعت تمام سپاہیوں (نمازیوں) کی باہمی محبت اور ایک تکبیر کی آواز پر سب کی حرکت اور نشست و برخاست مسلمانوں کو صف جنگ کے اوصاف کھاتی اور ان کے قولے عمل کو بیدار کرتی ہے۔

۷۔ **آلفت و محبت** : نماز مسلمانوں میں باہمی الفت و محبت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے محلہ کے تمام مسلمان جب کسی ایک جگہ دن میں پانچ دفعہ جمع ہوں اور باہم ایک دوسرے سے ملیں تو ان کی بیگانگی دُور ہوگی۔ ان میں آپس میں محبت اور آلفت پیدا ہوگی۔ اسی طرح وہ ایک دوسرے کی

امداد کے لئے ہر وقت تیار رہیں گے۔ قرآن پاک نے نماز کے اس وصف اور اثر کی طرف خود اشارہ کیا ہے۔

قرآن کریم میں فرمایا:

وَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيعًا (الانعام: ۱۵۹)

خدا سے ڈرتے رہو۔ نماز قائم کرو اور شرکوں میں سے نہ بنو۔ ان میں سے جنہوں نے اپنے دین میں بھٹوٹ ڈالی اور بہت سے گروہوں میں بٹ گئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نماز کا اجتماع مسلمانوں کو جتنا بندی اور فرقہ آرائی سے روکتا ہے کہ جب دوسرے سے ملاقات ہوتی رہے گی تو غلط فہمیوں کا موقع کم ملے گا۔

۸۔ نظم جماعت: کسی قوم کی زندگی نظم جماعت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی۔ یہ گروہ جب کھل جاتی ہے تو قوم کا شیرازہ منتشر و پرآگندہ ہو جاتا ہے۔ اسلام میں نماز باجماعت مسلمانوں کی زندگی کی عملی مثال ہے۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی عملی مثال کو عربوں کے سامنے پیش کر کے ان کی زندگی کا خاکہ کھینچا اور بتایا کہ مسلمانوں کا صف بصف کھڑا ہونا۔ شانہ سے شانہ ملانا اور یکساں حرکت و جنبش کرنا ان کی قومی زندگی کی مستحکم و مضبوط دیوار کا مسالہ جس طرح نماز کی درستگی، صف کے سیدھا ہونے پر موقوف ہے۔ اسی طرح پوری قوم کی زندگی باہمی تعاون، مشارکت، میل جول اور باہمی ہمدردی پر موقوف ہے۔

۹۔ مساوات: نماز باجماعت مسلمانوں کے لئے برادرانہ مساوات اور انسانی برادری کی درسگاہ ہے۔ یہاں امیر و غریب، کلمے گورے، رومی حبشی، عرب و عجم کی کوئی تمیز نہیں ہے۔ سب ایک ساتھ، ایک درجہ اور ایک صف میں کھڑے ہو کر خدا کے آگے سرنگوں ہوتے ہیں۔ جماعت کی امامت کے لئے حسب نسب، نسل و خاندان، رنگ و روپ، قومیت اور جنسیت، عہدہ اور منصب کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ علم و دانش، فضل و کمال اور تقویٰ و طہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں شاہ و گدا اور شریف و رذیل کی تفریق نہیں۔ سب ہی ایک زمین پر ایک امام کے پیچھے ایک صف میں دوں بدوش کھڑے ہوتے ہیں اور کوئی کسی کو اس کی جگہ سے ہٹا نہیں ہو سکتا۔ اس انسانی برادری کی مشق دن میں پانچ دفعہ ہوتی ہے۔

www.KitaboSunnat.com

۱۰۔ مجلس عمومی: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں یہ قاعدہ تھا کہ جب کوئی اہم واقعہ پیش آتا یا کوئی سیاسی و قومی مشکل پیدا ہوتی یا کوئی مذہبی بات سنائی ہوتی تو مسلمانوں میں منادی کرائی جاتی تھی کہ ”اَلصَّلَاةُ جَامِعَةٌ“ (نماز جمع کرنے والی ہے) سب لوگ وقت پر جمع ہو جاتے اور اس ضروری امر سے اطلاع پاتے یا اس کے متعلق اپنے مشورے عرض کرتے۔ یہ گویا

مسلمانوں کے مذہبی، اجتماعی، سیاسی مسائل کے مخلصانہ حل کا بھی ذریعہ تھا۔

ان تمام امور کو سامنے رکھنے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نماز اسلام کا اولین شعار اور اس کے مذہبی و اجتماعی و تمدنی و سیاسی و اخلاقی مقاصد کی آئینہ دار ہے۔ اس کی شیرازہ بندی سے مسلمانوں کا شیرازہ بندھا تھا اور اس کی گرہ کھل جانے سے اس کی نظم جماعت کی ہر گرہ کھل گئی ہے۔ مسجد مسلمانوں کے ہر قومی اجتماع کا مرکز اور نماز اس مرکزی اجتماع کی ضروری رسم تھی مسلمان جب نہ تھے تو ان کے ہر اجتماع کا افتتاح نماز سے ہوتا تھا۔ ان کی ہر چیز اس کے تابع اور اسی کے زیر نظر ہوتی تھی مسجد ہی ان کا دارالامارت تھا، وہی دارالشوریٰ تھا، وہی بیت المال تھا، وہی صیغہ جنگ کا دفتر تھا۔ وہی درس گاہ اور وہی مسجد تھا۔

نماز کے ان ہی ثمرات و برکات کی بناء پر ایک دفعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمثیل میں صحابہؓ سے فرمایا کہ ”اگر کسی شخص کے گھر کے سامنے ایک صاف شفاف نہر بہتی ہو جس میں وہ دن میں پانچ دفعہ نہاتا ہو تو کیا اس کے بدن پر میل رہ سکتی ہے؟“ صحابہؓ نے عرض کیا۔ نہیں یا رسول اللہ! ارشاد ہوا کہ نماز بھی اسی طرح گناہوں کو دھو دیتی ہے جس طرح پانی میل کو۔ (کنز العمال جلد ۶ صفحہ ۶ نیز حکم ابن جریر طبرانی) دین اسلام میں نماز کے بارے میں جو تاکیدیں احکام آئے ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ روز قیامت سب سے پہلے نماز کی باز پرس ہوگی۔

روز محشر کہ جاں گداز بود

اولیں پرسش نماز بود

۲۔ زکوٰۃ

۱۔ زکوٰۃ کا لغوی و اصطلاحی مفہوم | زکوٰۃ عربی زبان میں مصدر ہے۔ یہ دو معنی کے لئے مستعمل ہے۔ (۱) پاک صاف کرنا (۲) پھلنا پھولنا اور بڑھانا۔

شرعی اصطلاح میں زکوٰۃ اس مال کی امداد کو کہتے ہیں جو ہر مسلمان پر فرض ہے جو مال کی ایک خاص مقدار کا مالک ہو۔ اس کو زکوٰۃ کا نام اس لئے دیا گیا ہے کہ مال میں سے زکوٰۃ کا مقررہ حصہ نکالنے کے بعد باقی ماندہ مال پاک و صاف ہو جاتا ہے۔ گویا زکوٰۃ ایک میل تھا جس کے نکالنے کے بعد مال پاک ہو گیا یا اس لئے زکوٰۃ کہتے ہیں کہ زکوٰۃ نکالنے سے مال میں برکت پیدا ہو جاتی ہے اور بظاہر وہ کم ہو جاتا ہے۔ مگر حقیقت میں برکت بڑھ جاتی ہے۔ جس طرح سود کے بارے میں ارشاد ہوا۔
 ”وَيَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا وَيُزِيلُ | اللَّهُ تَعَالَى سُدَّ كُومَثَاتَاہے اور صدقات
 الصَّدَقَاتِ۔ (سورۃ البقرہ ۲۷۶) | کو بڑھا دیتا ہے۔

حالانکہ بظاہر سود سے مال میں اضافہ ہوتا ہے اور صدقہ سے مال کم ہوتا ہے مگر قرآن کریم کا بیان ہماری ظاہر بینی کے برعکس ہے۔ زکوٰۃ کو صدقہ بھی کہتے ہیں۔ صدقہ کا اطلاق ہر مالی اور جسمانی امداد اور نیکی پر کیا جاتا ہے۔

۲۔ زکوٰۃ کی اہمیت : زکوٰۃ بھی ان عبادات میں سے ہے جو تمام مذاہب کی کتابوں میں فرض قرار دی گئی ہے لیکن ان کی پیرویوں نے اس فرض کو اس حد تک بھٹلایا تھا کہ ان کے مذہبی احکام کی فہرست میں اس کا نام تک نظر نہیں آتا۔ حالانکہ قرآن پاک کا دعویٰ ہے کہ جس طرح نماز ہر مذہب کا لازمی جزو تھی اسی طرح زکوٰۃ بھی تمام مذاہب میں شامل رہی ہے۔ بنی اسرائیل سے خدا کا جو عہد تھا اس میں نماز اور زکوٰۃ دونوں تھیں۔

”أَقِمُْوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ“ | (ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا کہ نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیتے رہو۔ (البقرہ ۸۳)

دین اسلام کی تعلیمات میں نماز کے ساتھ ساتھ جو فریضہ سب سے اہم نظر آتا ہے وہ زکوٰۃ ہے نماز حقوق اللہ میں سے ہے اور زکوٰۃ حقوق العباد میں شامل ہے۔ دونوں فریضوں کا باہم لازم و ملزوم ہونا اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ اسلام میں حقوق اللہ کے ساتھ ساتھ حقوق العباد کا بھی یکساں لحاظ رکھا گیا ہے۔ قرآن کریم میں ایمان کے بعد جہاں اعمال صالحہ کا ذکر آتا ہے بالعموم صرف دو اعمال کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ایک نماز کا دوسرا زکوٰۃ کا۔

قرآن کریم میں فرمایا:

”إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ
لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ“

(البقرہ - ۲۷۷)

بلاشبہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں
نے نیک کام کیے اور نماز قائم کی اور زکوٰۃ
دی، ان کے لئے ان کے رب کے پاس
اجر ہے۔

حضرت جریر بن عبد اللہ بخلی روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی
خدمت میں حاضر ہو کر تین باتوں پر بیعت کی تھی۔

(۱) نماز پڑھنا (۲) زکوٰۃ دینا (۳) ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنا۔

وفد عبد القیس نے شہ ۳۵ میں آستانہ نبوت پر حاضر ہو کر جب اسلامی تعلیمات دریافت
کیں تو آپ نے اعمال میں پہلے نماز اور پھر زکوٰۃ کو جگہ دی۔

(صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ جلد اول صفحہ ۱۸۸)

شہ ۳۵ میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کو اسلام کا داعی بنا کر مین بھیجا تو اسلام
کے مذہبی فرائض کی یہ ترتیب بتائی کہ ”پہلے ان کو توحید کی دعوت دینا۔ جب وہ یہ جان لیں تو ان
کو بتانا کہ دن میں پانچ وقت کی نماز ان پر فرض ہے۔ جب وہ نماز پڑھنے لگیں تو انہیں بتانا کہ اللہ تعالیٰ
نے ان کے مال پر زکوٰۃ فرض کی ہے جو ان کے دو ہمتندوں سے لے کر ان کے غریبوں کو دی جائیگی۔

(صحیح بخاری جلد دوم صفحہ ۱۰۹۶)

صحابہ میں جو لوگ شریعت کے راز داں تھے وہ زکوٰۃ کی اہمیت سے بخوبی آگاہ تھے چنانچہ
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب اہل عرب نے بغاوت کی اور زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار
کر دیا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کے خلاف تلوار کھینچ لی حضرت عمرؓ نے کہا کہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا ”جو توحید کا قائل ہو اس کا خون بہانا روا نہیں۔ اس کا معاملہ خدا کے
ساتھ ہے“ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا ”خدا کی قسم جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھیڑ کا ایک
بچہ بھی دیتا وہ اس کو دینا پڑے گا۔“ (صحیح بخاری جلد اول صفحہ ۱۸۰)

حقیقت میں یہ ایک لطیف نکتہ تھا جس کو شریعت کا محرم اسرار ہی سمجھ سکتا تھا۔ اس نے
سمجھا اور امت کو سمجھایا اور سب نے اس کے آگے گردن تسلیم خم کر دی۔

۳۔ زکوٰۃ کی تدریجی فرضیت: جس طرح نماز کا آغاز اسلام کے ساتھ ساتھ ہوا اور مدینہ آکر
رفتہ رفتہ تکمیل کو پہنچی۔ اسی طرح زکوٰۃ یعنی مطلق خیرات کی ترغیب بھی آغاز اسلام ہی سے شروع
ہوئی لیکن اس کا پورا انتظام آہستہ آہستہ فتح مکہ کے بعد قائم ہوا۔ آغاز اسلام میں زکوٰۃ کا لفظ صرف

خیرات کا ہم معنی تھا اس کی مقدار نصاب مال اور دوسری خصوصیات جو زکوٰۃ کی حقیقت میں داخل ہیں بعد کو رفتہ رفتہ تکمیل کو پہنچیں۔ بعثت کے پانچویں سال جب حضرت جعفرؓ وغیرہ ہجرت کر کے حبشہ پہنچے اور نجاشی نے اپنے دربار میں بلا کر ان سے اسلام کی حقیقت اور اس کی تعلیمات دریافت کیں تو حضرت جعفرؓ نے اس کے جواب میں یہ تقریر کی۔

”وہ پیغمبرؐ کو یہ سکھاتا ہے کہ ہم نماز پڑھیں، روزے رکھیں اور زکوٰۃ دیں“ (مسند احمد جلد اول ص ۱۲۸) اس سے معلوم ہوا کہ عام زکوٰۃ یا مالی خیرات کا آغاز اسلام کی ابتداء ہی میں ہو چکا تھا۔ وفد عبدالقیسؓ کو بارگاہ رسالت میں پہنچا تھا۔ آپ نے ان کو جن احکام کی تعلیم دی ان میں ایک زکوٰۃ بھی تھی۔ رستمہ بن نجاشی نے نامہ مبارک پہنچنے کے بعد ابوسفیان سے جو اس وقت شرفِ اسلام نہیں ہوئے تھے، اسلام کی تعلیمات دریافت کیں تو انہوں نے ”دوسری چیزوں کے ساتھ زکوٰۃ و صدقہ کا تذکرہ بھی کیا۔“ (صحیح بخاری جلد اول)

ان واقعات سے واضح ہوتا ہے کہ ۸ھ سے پہلے بلکہ ہجرت سے بھی پہلے بعثت کے بعد ہی نماز کے ساتھ صدقہ و خیرات کی تعلیم بھی موجود تھی۔ مدینہ منورہ آکر جب مسلمانوں کو کسی قدر اطمینان ہوا اور انہوں نے اپنا کاروبار شروع کیا تو روزہ کے ساتھ ساتھ ۲۵ھ میں صدقہ و فطر واجب ہوا اور اس کے بعد مسلمانوں کو صدقہ اور خیرات کی عام طور سے تاکید کی گئی صحابہؓ نے دریافت کیا، یا رسول اللہؐ ہم کیا خیرات کریں؟ ”يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ“ (سورہ بقرہ ۲۱۷) | وہ پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خیرات کریں۔

فرضیت زکوٰۃ کی راہ میں اسلام کا یہ پہلا قدم ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا قول نقل کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ کی مقدار و نصاب کے احکام نازل ہونے سے پہلے مسلمانوں کو یہ حکم تھا کہ جو کچھ بچے وہ خدا کی راہ میں خیرات کر دیں۔ آئندہ کے لئے کچھ بچا کر نہ رکھیں کیونکہ اس وقت اسلام اور مسلمانوں کی حالت اسی کی مقتضی تھی۔ کچھ دنوں بعد جب فتوحات کا آغاز ہوا، زمینیں اور جاگیریں ہاتھ آئیں، تجارت کی آمدنی شروع ہوئی تو حکم نازل ہوا:

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ“ (سورہ بقرہ ۲۶۷) | اے ایمان والو! اپنی کمائی میں سے کچھ اچھی چیزیں اور جو ہم نے تمہارے لئے زمین سے پیدا کی ہیں ان میں سے کچھ خیرات میں دیں۔

اب تک تمام عرب اسلام کے جھنڈے کے نیچے جمع نہیں ہوا تھا۔ رمضان ۳ھ میں مکہ کی فتح نے تمام عرب کو ایک شیرازہ میں پرودیا۔ اب وہ وقت آیا کہ اسلام اپنا خاص نظام قائم کرے۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

”خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً“ | ان کے مال میں سے زکوٰۃ وصول کرو کہ اس کے ذریعے سے تم ان کو پاک و صاف کر سکو۔ (التوبہ ۱۰۳)

چنانچہ اس سے اگلے سال یعنی محرم ۱۳۵۷ھ میں زکوٰۃ کے تمام احکام و قوانین مرتب ہوئے اس کی وصولی کے لئے تمام عرب میں محصلوں اور عاملوں کا تقرر ہوا اور باقاعدہ ایک بیت المال کی صورت پیدا ہوئی یہ تمام احکام سورہ توبہ میں مذکور ہیں جو شہ کے آخرین نازل ہوئی ہے۔

۳۔ نماز اور زکوٰۃ کا ربط و تعلق | احکام دین کی اصولی تقسیم کیجئے تو ان کی دو قسمیں ہو سکیں گی۔ ایک قسم کے احکام وہ ہیں جن کا تعلق اللہ

کے حقوق سے ہے۔ دوسری قسم کے احکام حقوق العباد سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس طرح دین کی بڑی دراصل اس بات کا نام ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے حقوق اور بندوں کے حقوق دونوں سے عہدہ برآ ہو جائے۔ نماز اور زکوٰۃ دونوں کی حقیقت سے صاف عیاں ہے کہ نماز اللہ کا حق ہے۔ بخلاف ازیں زکوٰۃ حقوق العباد کا مغز اور جوہر ہے۔ اگر ایک شخص نے مسجد میں نماز کا حق ادا کر دیا تو ممکن نہیں کہ وہ مسجد سے باہر آ کر اللہ کے حقوق بھول جائے اس سے تو یہ حقوق اسی طرح ادا ہوتے رہیں گے جس طرح چشمہ سے پانی اُبلتا رہتا ہے۔ اسی طرح جس نے زکوٰۃ کا حق ادا کر دیا اس سے یہ ممکن نہیں کہ وہ بندگانِ خدا کے حقوق پامال کرنا ہے گا۔ جو شخص اپنے بھائیوں، بیروسیوں پر اپنی کمائی خود اپنی خوشی سے صرف کرے گا اور صرف کرے گا ان کو اپنا احسان مند بنانے کے بجائے اُنہی کا شکر گزار ہو گا وہ تو ان کا ایک ایک حق ادا کر کے ہی چین پاسکے گا۔

۵۔ نصاب زکوٰۃ | محنت اور سرمایہ سے جو دولت پیدا ہوتی ہے۔ اس میں سب سے پہلی چیز زمین کی پیداوار ہے۔ تورات نے ہر قسم کی پیداوار پر عشر یعنی دسواں حصہ

مقرر کیا تھا۔ شریعت محمدیہ نے نہایت نکتہ سنجی کے ساتھ پیداوار کی مختلف شرح کے مطابق زکوٰۃ فرض کی۔ سب سے پہلے پیداوار کے ان اوصاف پر زکوٰۃ مقرر ہو جو کچھ عرصہ تک محفوظ رہ سکتے ہیں تاکہ ان سے حسب ضرورت خانگی اور تجارتی فائدہ اٹھایا جاسکے اور نقصان کا اندیشہ نہ ہو۔ اسی بناء پر سبزیوں اور ترکاریوں پر جو دو ایک روز سے زیادہ نہیں رہ سکتیں۔ کوئی زکوٰۃ مقرر نہیں کی گئی۔ مثلاً مکان کا ساز و سامان، لباس، اسباب سواری بلکہ بعض فقہاء کے نزدیک سونے چاندی کے مستعمل زیور پر زکوٰۃ نہیں رکھی گئی۔

کچھ دنوں تک باقی رہنے والی اور نشوونما پانے والی چار چیزیں ہیں۔ زمین، جانور، سونا، چاندی یا ان کے سکے اور تجارتی مال۔

چنانچہ ان چاروں چیزوں پر زکوٰۃ مقرر ہوئی۔ زمین کی دو قسمیں کی گئیں۔

۱۔ زمین کی ایک قسم وہ ہے جس کے سیراب کرنے میں کاشت کار کی کسی بڑی محنت اور مزدوری کو دخل نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ بارش یا نہر کے پانی یا زمین کی نمی اور شبنم سے خود بخود سیراب ہوتی ہے اُس میں سے عشر یعنی ۱۰ بطور زکوٰۃ مقرر کیا گیا ہے۔

۲۔ زمین کی دوسری قسم وہ ہے جس کی سیرابی کاشت کار کی خاصی محنت اور مزدوری سے ہو مثلاً کنوئیں سے پانی نکال کر لانا یا نہر بنانا پانی لانا تو اس میں پہلی قسم سے نصف یعنی بیسواں حصہ مقرر ہوا نقدی جس کی ترقی حفاظت اور افزائش میں انسان کو شب و روز کی سخت محنت کرنی پڑتی ہے اور جس میں ہر قدم پر چوری، گمشدگی، لوٹ اور نقصان کا اندیشہ رہتا ہے زمین کی دوسری قسم سے بھی آدھا یعنی پالیسواں حصہ (بم) مقرر ہوا۔ نقدی اور سونا پانڈی پر زکوٰۃ اس وقت فرض ہوتی جب سال بھر تک کسی کے پاس پڑا رہے۔ سونے کی مقدار جب ساڑھے سات تولہ اور چاندی دو سو درہم ہو تو اس پر ایک سال کے بعد زکوٰۃ فرض ہوتی ہے۔

باقی رہا یہ کہ جانوروں کی مختلف اقسام میں زکوٰۃ کی شرح کیا ہے اور اس قسم کے دیگر جزوی احکام تو ان کی تفصیلات معلوم کرنے کیلئے کتب حدیث و فقہ کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ ہر دست یہ ہمارے موضوع بحث سے خارج ہیں۔

۴۔ مصارف زکوٰۃ | قرآن مجید میں زکوٰۃ کے آٹھ مصارف قرار دیئے گئے ہیں۔ ارشاد فرمایا:

”إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَ الْمَسْكِينِ وَ الْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَ الْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَ فِي الرِّقَابِ وَ الْغَارِمِينَ وَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَ ابْنِ السَّبِيلِ قَرِيبَةً مِّنَ اللَّهِ وَ اللَّهِ عَلِيمٌ“
(التوبة - ۶۰)

زکوٰۃ کا مال تو غریبوں، مسکینوں اور زکوٰۃ کے شعبہ میں کام کرنے والوں اور ان لوگوں کیلئے ہے جن کے دلوں کو اسلام کی طرف لانا ہے اور غلام آزاد کرانے اور جو تاناؤں بھریں ان میں اور خدا کی راہ میں اور مسافروں کیلئے یہ خدا کی طرف قومی و مذہبی لحاظ سے رقم کو خرچ کرنے کی تاکید ہے۔

اسلام کا اقتصادی نظام اور زکوٰۃ

مقاصد زکوٰۃ | ۱۔ تزکیہ نفس: زکوٰۃ کا حقیقی و بنیادی مقصد یہ ہے کہ زکوٰۃ دینے والے کا دل دنیا کی حرص سے پاک ہو جائے۔ قرآن کریم میں فرمایا:

”وَسَيُجَنَّبُهَا الَّذِي تَقَىٰ الَّذِي يَأْتِي بِؤُوتِ مَالِهِ يَتَزَكَّىٰ“
(سورة الليل - ۱۷)

اور اس (جہنم) سے اس شخص کو دور رکھا جائے گا جو اللہ سے بہت ڈرنے والا ہے جو پاک ہونے کے لئے اپنا مال دوسروں کو دیتا ہے۔

قرآن کریم میں دوسری جگہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا:

”خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً“
ان کے مالوں میں سے صدقہ لو جس کے ذریعے

میں شامل ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں جگہ جگہ یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ
 ”وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ ۖ وَاللَّهُ يَسْتَبِيلُ الْكُفْرَ“ (البقرہ - ۲۱۷)
 تم اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کرو۔

اہل ایمان کی جب بنیادی صفات بیان کی جاتی ہیں تو ان میں ”اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے جہاد کرنے“ کی صفت بھی لازماً موجود ہوتی ہے۔ اللہ کی راہ میں اپنے مالوں کے ذریعے جہاد کرنے کا مفہوم بالکل واضح ہے اور وہ یہ کہ دین کی خاطر جہاد کرنے کے لئے جن مصارف کی بھی ضرورت پڑے انہیں اپنے اس سے ہٹا کر دے ہر شخص جانتا ہے کہ دین کی نصرت و حفاظت کوئی چھوٹے درجے کا کام نہیں۔ اس لئے اس کی خاطر اپنی دولت کا خرچ کرنا بھی کوئی معمولی جہاد نہیں ہو سکتا۔ قرآن حکیم نے جہاد کا حکم دیتے وقت ایک جگہ فرمایا ہے:-

”وَأَنْفَقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ“ (البقرہ - ۱۹۵)
 اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور ہاتھ روک کر اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ دین کی نصرت و حفاظت کے لئے مصارف کا فراہم نہ کرنا، ہلاکت مول لینا ہے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ جو کام دنیا اور آخرت دونوں جہانوں کی ہلاکت سے محفوظ رہنے کی شرط ہو اسے جہاد کو نہ معمولی کام ٹھہرا سکتا ہے۔

۴۔ اشتر اکیث کا علاج: دنیا میں امیر و غریب کی جنگ ہمیشہ سے قائم ہے۔ ہر تمدن کے آخری دور میں قوم کے مختلف افراد کے درمیان دولت کی غیر مساوی صورت یقیناً پیدا ہو جاتی ہے۔ بعض نہایت دولت مند ہو جاتے ہیں۔ جن کے خزانوں کیلئے زمین کا پورا طبقہ بھی کافی نہیں ہوتا اور دوسری طرف وہ غریب ہوتے ہیں۔ جن کے پاس کھانے کے لئے ایک ٹوکھا ٹکڑا اور سونے کے لئے ایک باشت زمین بھی نہیں ہوتی۔ دولت مند طبقوں کی خود غرضی، خود پسندی اور عیاشی اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ اپنے ٹھکانوں اور ننگے بھائیوں کے لئے روٹی کا ایک ٹکڑا اور کپڑے کا ایک پتیٹرا دینے کے روادار نہیں ہوتے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ دولت خدا کی طرف سے نہیں بلکہ ان کے علم و ہنر، سعی و جہد اور دوست و بازو سے حاصل ہوئی ہے۔ اس لئے ان کا کارہ افراد کا ان میں کوئی حصہ نہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قارون کو جب زکوٰۃ کا حکم سنایا تو اس نے جواب دیا:

”إِنَّمَا أُوتِيْتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ ۖ“ (قصص - ۷۸)
 مجھ کو تو ایک ہنر سے جو میرے پاس ہے یہ سب کچھ ملا ہے۔

چنانچہ ہر زمانہ کے قارونوں کا اپنی دولت کے متعلق یہی تصور اور اعتقاد ہوتا ہے۔ یونان کے آخری دور میں یہی صورت پیدا ہوئی۔ ایران کے انتہائی زمانہ میں یہی شکل نمودار ہوئی

یورپ کی موجودہ فضا میں بھی آب و ہوا اقتصادی مشکلات کے ابر و باد کا طوفان سبب کر رہی ہے۔ مزہ دور و سرمایہ کی جنگ پورے زور سے ہو رہی ہے۔ سوشلزم، کمیونزم، انارکزم اور اشتورم کے طوفان جگہ جگہ اٹھ رہے ہیں۔

۵۔ اقتصادی فوائد: زکوٰۃ اخلاقی و روحانی فوائد کے علاوہ بیش بہا اقتصادی فوائد

کی بھی موجب ہے۔ ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ زکوٰۃ ان ہی چیزوں میں فرض ہے جن میں دو صفیں پائی جائیں۔ (۱) بقاء (۲) نمو

بقاء سے مقصود یہ ہے کہ وہ ایک مدت تک اپنی حالت پر باقی رہ سکیں کیونکہ جو چیز ایسی نہ ہوگی اس کی تجارت میں نہ چننا فائدہ ہے اور نہ وہ دوسروں کے استعمال کیلئے دیر تک ذخیرہ بن سکتی ہے۔ اسی لئے سبز یوں اور ترکاریوں پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ نمونہ کا مقصد یہ ہے کہ ان میں یا تو پیداوار یا تناسل یا مبادلہ کی بناء پر افزائش کی صلاحیت ہو۔ اسی لئے جو اہل ت اور دیگر قیمتی پتھروں میں یا غیر مزدور زمین اور مکان میں بھی زکوٰۃ نہیں ہے۔

اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ شریعت نے زکوٰۃ کے فرض کرنے سے یہ مقصد بھی پیش نظر رکھا ہے کہ لوگ اپنے سرمایہ کو بیکار نہ رکھیں، بلکہ محنت، کوشش اور جدوجہد سے اس کو ترقی دیں۔ ورنہ اصل سرمایہ میں سال بہ سال کمی ہوتی جائے گی۔ جس کو فطر تا کوئی برداشت نہیں کر سکتا۔ اس طرح زکوٰۃ کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ تجارت و زراعت کو جو دولت کا اصل سرچشمہ ہیں، ترقی دی جائے کیونکہ جب ہر شخص کو لازمی طور پر سال میں ایک خاص رقم ادا کرنی پڑے گی تو وہ کوشش کریگا کہ جہاں تک ممکن ہو یہ رقم منافع سے ادا کرے اور اصل سرمایہ محفوظ رکھے۔ اسی بناء پر اسلام نے زکوٰۃ کو ان چیزوں کے ساتھ مخصوص کیا جن میں نمو اور اضافہ کی صلاحیت ہو اور اسی بناء پر زکوٰۃ کے ادا کرنے کے لئے ایک سال کی وسیع مدت مقرر کی تاکہ ہر شخص اپنے مال یا جائیداد سے پوری طرح فائدہ اٹھا سکے صحابہ کرامؓ اس نکتہ کو سمجھ کر ہمیشہ تجارت اور کاروبار میں مصروف رہتے تھے حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں ان لوگوں کو جو عتیقوں کے سرمایہ کے منتول تھے ہدایت کی کہ وہ ان کو تجارت میں لگائیں تاکہ ان کے بالغ ہونے تک ان کا اصل سرمایہ زکوٰۃ میں سب صرف نہ ہو جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تعلیمات کا نتیجہ یہ ہوا کہ دولت مند صحابہؓ میں یہ فیاضی آگئی کہ وہ دین و ملت کی خدمت کیلئے اپنی ساری دولت نسا کر بھی سیر نہ ہوتے تھے۔ دوسری جانب غریب صحابہؓ میں وہ قناعت اور خود داری پیدا ہو گئی کہ وہ کسی سے کسی کام کا سوال کرنا بھی عیب سمجھتے تھے۔ دولت مند اپنی زکوٰۃ آپ کے بیت المال کے دروازوں تک آتے تھے اور غریب اپنے افلاس کو خدا کے سوا دوسروں کے سامنے پیش کرنا توکل کے منافی سمجھتے تھے۔ خلافت راشدہ کے زمانہ میں بیت المال میں

انسان سرمایہ رہتا تھا کہ زکوٰۃ کے کسی مصرف کے لئے کسی محسوس نہیں ہوتی تھی جنزورت مندوں کو اسی رقم سے قرض بھی دیا جاتا تھا۔ اسی طرح یہ ایک ایسا مالی و اقتصادی نظام تھا جس میں سود کا عمل دخل بالکل نہ تھا اور اس لعنت کے بغیر سی لین دین کے سب کام انجام پاتے تھے۔

۶۔ زکوٰۃ معاشی نقطہ نظر سے

اسلام دین اور دنیا کے امتزاج کا داعی ہے اس لئے اس کی عبادات بھی اخلاقی فوز و فلاح کے ساتھ دنیوی زندگی کی اصلاح اور اس کی صحیح خطوط پر تعمیر کی بھی ضامن ہیں۔ زکوٰۃ جہاں حب مال کو کم کرتی اور خدا کی راہ میں خرچ کرنے اور مال قربان کرنے کا جذبہ پیدا کرتی ہے وہیں معاشی نقطہ نظر سے سماجی فلاح کی ایک ہمہ گیر اسکیم ہے جس کے ذریعہ ملک مملکت کے غریب اور نادار افراد کی مدد کی جاتی ہے اور انہیں زندگی کی جدوجہد میں برابر کی شرکت کے لائق بنایا جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ ذہنیت سے یہ بات پیدا کرتی ہے کہ ہر شخص کی دولت صرف اسی کے لئے ہے اور معاشی دوسروں میں جو پیچھے رہ جائے اور جو گر جائے اسے فنا ہو جانا چاہیئے کشمکش حیات میں زندہ رہنے کا حق صرف اس کو ہے جو مسابقت میں دوسروں سے آگے بڑھ جائے۔ اسلام اس ذہنیت کی نفی کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے: ”جو کچھ دولت تم کماتے ہو وہ صرف تمہاری محنتوں کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس میں فطرت کے بے شمار قوانین شریک کار ہیں۔ نیز پورا معاشرہ ہزاروں طریقے پر تمہارا معاون و مددگار ہے۔ اس لئے تمہارے مال میں تمہارے علاوہ دوسروں کا بھی حق ہے۔ اہل ثروت کی ذمہ داری ہے کہ معاشی دوسروں کو پیچھے نہ رہ جائے اسے سہارا دیں اور آگے بڑھائیں۔ جو معاشرہ کمزوروں کی مدد نہ کرے، ناداروں کو سہارا نہ دے، اور گرتوں کو ہٹانے نہ لے وہ انسانی معاشرہ کہے جانے کا مستحق نہیں۔ اسلام نظام زکوٰۃ کے ذریعہ معیشت کو صحت مند بنیادوں پر استوار کرتا ہے اور اس میں امداد باہمی کی روح کو جاری و ساری کرتا ہے۔

جدید علم معیشت میں سماجی فلاح کا تصور بہت نیا ہے۔ لیکن اسلام نے پہلے ہی دین سے فلاحی اور خدمتی ریاست کا تصور پیش کیا اور زکوٰۃ کی شکل میں امداد باہمی کا ایک ایسا نظام قائم کیا جس کے ذریعے تمام شہریوں کی بنیادی ضروریات کی ضمانت دی گئی۔ اسلامی حکومت نے ابتدا سے ہی اس نظام کو عملاً قائم کیا، آبادی کی مردم شماری کی، ناداروں کے رجسٹر بنائے، ہر ضرورت مند کو سرکاری وظیفے دیئے اور تھوڑے ہی عرصے میں یہ حال ہو گیا کہ بقول مورخ طبری زکوٰۃ لینے والے نہ ملتے تھے۔

پھر زکوٰۃ دولت کی تقسیم میں غیر فطری عدم مساوات کو ختم کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اس کے ذریعے امیروں کی دولت غریبوں کی طرف منتقل ہوتی ہے اور اس طرح تقسیم دولت صحت مند

بنیادوں پر واقع ہوتی ہے۔

• - بشت کا ایک اور بنیادی مسئلہ دولت کی ذخیرہ اندوزی کو روکنا اور سرمایہ کاری کو بڑھانا رہا ہے۔ آج کی دنیا میں جہاں جہاں معاشی پس ماندگی ہے اس کا بڑا سبب دولت کی غلط تقسیم اور صحیح سرمایہ کاری کا فقدان ہی ہے۔ زکوٰۃ کا ایک معاشی وظیفہ یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعے دولت آپ سے آپ سرمایہ کاری کی طرف منتقل ہوتی ہے اس لئے کہ اگر اسے ذخیرہ کیا جائے تو ۳۰ سال میں وہ آپ سے آپ ختم ہو جائے گی۔ اس لئے اس کا فطری تقاضا یہ ہوتا ہے کہ دولت کو روک رکھنے کی بجائے کاروبار میں لگایا جاتا ہے اور اس سے معاشی ترقی رونما ہوتی ہے۔

پھر معاشی بحران کے جس چکر میں سرمایہ دارانہ دنیا گرفتار ہے اس کو دور کرنے میں بھی زکوٰۃ بڑی مفید و معاون ہو سکتی ہے۔ تجارتی چکر سرمایہ کاری اور قوت صرفہ میں عدم توازن کی بناء پر رونما ہوتا ہے لیکن زکوٰۃ جہاں ایک طرف پیداواری عمل کو تیز تر کرتی ہے وہیں دوسری طرف عوام میں قوت خرید کا اضافہ بھی کرتی ہے۔ اس طرح یہ معیشت میں معاشی توازن قائم کرنے کا ایک خود کار آلہ بن جاتی ہے۔

زکوٰۃ ایک انقلابی معاشی تصور ہے اور یہ حقیقت بڑی افسوسناک ہے کہ خود مسلمانوں نے ابھی تک اس کے ہمہ جہتی معاشی پہلوؤں کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ اگر اس کے معاشی فوائد پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ پورے نظام معاشی کی قلب ماہیت کر دیتی ہے۔ اسے صحت مند اور انسانی بنیادوں پر قائم کرتی ہے اور ایک ایسا نظام قائم کرتی ہے جس میں جدوجہد کے دروازے سب کے لئے کھلے ہوں اور زندگی کی نعمتیں تمام انسانوں کے لئے عام ہوں۔

۳۔ صوم

روزے کا مقصد

نماز کی طرح روزہ بھی زمانہ قدیم سے انبیاء کی شریعتوں کا لازمی جزو رہا ہے۔ نماز روزہ کا عمومی نظام تربیتی ہے اور روزہ سال بھر میں ایک ماہ کا غیر معمولی نظام تربیت ہے جو آدمی کو تقریباً ۲۰ گھنٹے تک اپنے ضبط و ضبط کے شکنجے میں کسے رکھتا ہے تاکہ روزانہ کی تربیت سے جو خرابیاں رہ گئی ہوں وہ دور ہو جائیں۔ روزے کا قانون یہ ہے کہ آخر شب طلوع سحر کی پہلی علامات ظاہر ہوتے ہی آدمی پر یکایک کھانا پینا اور مباشرت کرنا حرام ہو جاتا ہے اور غروب آفتاب تک پورے دن حرام رہتا ہے۔ شام آتے ہی حرمت کا بند اچانک ٹوٹ جاتا ہے جو چیزیں ایک لمحہ پہلے تک حرام تھیں اب حلال ہو جاتی ہیں تا آنکہ دوسرے روز کی مقررہ ساعت آجاتی ہے۔ ماہ رمضان کی پہلی تاریخ سے یہ عمل منقطع ہوتا ہے اور ایک مہینہ تک مسلسل اس کی تکرار جاری رہتی ہے گویا پورے تیس دن انسان ایک شدید ترین ڈسپلن کے تحت رہتا ہے۔

۱۔ احساس بندگی: اس نظام تربیت پر غور کرنے سے جو بات پہلی نظر میں واضح ہو جاتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام اس طریقے سے انسان کے شعور میں اللہ کی حاکمیت کے اقرار و اعتراف کو مستحکم کرنا چاہتا ہے اور اس شعور کو اتنا مستحکم بنا دیتا ہے کہ احکام الہی کے روبرو انسان اپنی آزادی اور خود مختاری سے دست بردار ہو جائے۔ خدا کا وجود محض ایک مابعد الطبعی عقیدہ نہ رہے بلکہ عملی زندگی میں محسوس و کار فرما ہو جائے۔ کفر اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان خدا کے مقابلے میں اپنے آپ کو خود مختار محسوس کرے اور اس کے مقابلے میں اسلام یہ ہے کہ انسان ہر آن اپنے آپ کو خدا کا بندہ اور محکوم محسوس کرے۔ اور جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا نماز کا مقصد اس شعور بندگی کی یاد دہانی ہے اسی طرح رمضان کے روزے سال میں ایک مرتبہ پورے ۲۰ گھنٹے سیرم اس شعور کو ذہن پر قائم رکھتے ہیں تاکہ سارے سال انسان کے ذہن پر قائم رکھتے ہیں تاکہ سارے سال انسان کے ذہن پر اس کے اثرات قائم رہیں۔

۲۔ اطاعت امر: احساس بندگی کے ساتھ ساتھ جو چیز لازمی پیدا ہوگی وہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو جس خدا کا بندہ سمجھ رہا ہے اس کی اطاعت کرے۔ ان دونوں میں فطری طور پر ایسا ربط ہے کہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ آپ جس کی خداوندی کا اعتراف کریں گے لازماً اطاعت بھی اسی کی کریں گے۔ اور احساس بندگی جس طرح شدید ہوگا اطاعت امر بھی

انتی ہی شدت سے ہوگی۔ چنانچہ روزے کا مقصد احساس بندگی کی یاد دہانی کے ساتھ ہی ساتھ اطاعت امر کی تربیت دینا بھی ہے۔ روزہ انسان کو ہمیشہ عہد بھر کئی کئی گھنٹے اس حالت میں رکھتا ہے کہ اس کو اپنی ابتدائی ضروریات پوری کرنے کے لئے بھی خداوند عالم سے اذن و اجازت کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اپنی خواہش ہو یا دوسروں کی، انسان بلا اذن خداوندی روزہ نہیں چھوڑ سکتا! اس طرح اس کی اطاعتیں ہر طرف سے سمٹ کر ایک مرکزی اقتدار کی طرف پھیر جاتی ہیں۔

روزے میں اگرچہ بہ ظاہر صرف دو خواہشات (غذا اور صنفی خواہش) پر پابندی لگائی گئی ہے لیکن اس کی اصل روح یہ ہے کہ انسان پر بندگی کا احساس پوری طرح طاری رہے۔ اس کے بغیر اگر انسان محض بھوکا پیاسا رہے تو یہ روزہ لاش کی طرح بے روح ہوگا۔ نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس نے تھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑا تو خدا کو کوئی حاجت نہیں کہ وہ شخص اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔ اسی طرح ایک حدیث میں آیا ہے کہ کتنے ہی روزہ دار ہیں کہ روزے سے بھوک اور پیاس کے سوا انہیں کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

ان دونوں احادیث میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ روزے کا مقصد بھوکا پیاسا رہنا نہیں بلکہ تقویٰ اور طہارت ہے۔

۳۔ **تعمیر سیرت:** روزے کا تیسرا مقصد انسان کی سیرت کی تعمیر ہے۔ اس سیرت کی بنیاد تقویٰ پر ہے۔ تقویٰ سے مراد کوئی خاص شکل و صورت اختیار کرنا نہیں ہے بلکہ قرآن اس کو بڑے وسیع معنوں میں استعمال کرتا ہے۔ وہ پوری انسانی زندگی کے ایسے رویے کو تقویٰ کے نام سے تعبیر کرتا ہے جس کی بنیاد احساس بندگی اور ذمہ داری پر ہو (اس کے مخالف رویے کا نام قرآن کی رو سے فجور ہے)۔ دنیا کے فساد کا سبب فجور ہے۔ اور دیگر عبادات کی طرح روزے کا مقصد بھی یہ ہے کہ انسان میں فجور کے رجحانات ختم کئے جائیں اور تقویٰ کو نشوونما دیا جائے۔ اب دیکھئے کہ روزہ کس طریقے سے اس کام کے سرانجام دینے میں مدد دیتا ہے۔

ایک شخص سے کہا جاتا ہے کہ خدا نے تم پر پابندی لگائی ہے کہ صبح سے شام تک کچھ نہ کھاؤ۔ نہ صرف جلوت میں بلکہ خلوت میں بھی اکل و شرب سے پرہیز کرو۔ اب ایسی صورت میں اگر کوئی شخص روزے کی تمام شرائط پوری کرتا ہے تو غور کیجئے کہ اس کے نفس میں کس قسم کی کیفیات ابھرتی ہیں۔

اول، تو یہ کہ اسے خدا کے عالم الغیب ہونے کا پورا یقین ہے اور یہی یقین ہے جو اسے تنہائی میں بھی روزے کے حدود کا پابند رکھتا ہے۔

دوم۔ اس کو آخرت اور حساب و کتاب پر پورا ایمان ہے اس لئے کہ اس کے بغیر کوئی ۱۲، ۱۳ گھنٹے بھوکا نہیں رہ سکتا ہے۔

سوم۔ اس کے اندر اپنے فرض کا احساس ہے۔ بغیر اس کے کوئی شخص اس پر کھلنے پینے کی پابندی لگائے اس نے خود سے اپنے ۱۴، ۱۵ اوپر یہ پابندی عائد کر لی۔

چھارم۔ مادیت اور روحانیت کے انتخاب میں اس نے روحانیت کو منتخب کر لیا اور دنیا اور آخرت کے درمیان ترجیح کا سوال جب اس کے سامنے آیا تو اس نے آخرت کو ترجیح دی۔ اس کے اندر اتنی طاقت تھی کہ اخلاقی فائدے کی خاطر مادی نقصان برداشت کر لیا۔

پنجم۔ وہ اپنے آپ کو اس معاملے میں آزاد نہیں سمجھتا کہ سہولت دیکھ کر مناسب موسم میں روزے رکھ لے بلکہ جو بھی وقت مقرر کیا گیا ہے اس نے اس کی پابندی کی ہے۔

ششم۔ اس میں صبر و استقامت، تحمل، یکسوئی اور فزونی تحریرات کے مقابلے کی طاقت کم از کم اتنی ہے کہ رمضان المبارک کے بلند نصب العین کی خاطر وہ ایک ایسا کام کرتا ہے جس کا نتیجہ مرنے کے بعد دوسری زندگی پر ملتی کر دیا گیا ہے۔

یہ کیفیات جو روزہ رکھنے کے ساتھ انسان کی زندگی میں ابھرتی ہیں، روزوں میں عملاً ایک طاقت بن جاتی ہیں اور ہر سال ایک ماہ روزہ رکھتے رکھتے یہ انسان کی فطرت ثانیہ بن جاتی ہیں۔

۴۔ ضبط نفس : اس تربیت کے ضابطے میں کسے کے لئے دو خواہشوں کو خاص طور پر منتخب کیا گیا ہے یعنی بھوک اور جنسی خواہش۔ اور ان کے ساتھ تیسری خواہش آرام کرنے کی خواہش بھی اس کی ذیل آجاتی ہے اس لئے کہ تراویح پڑھنے اور سحری کے لئے اٹھنے سے اس پر بھی کافی ضرب پڑتی ہے۔

بقائے نفس کے لئے غذا اور آرام اور بقائے نسل کے لئے تولید و تناسل حیوانی زندگی کے مطالبات میں اصل و بنیاد کا حکم رکھتے ہیں۔ انسان کے حیوانی جسم کے اہم ترین مطالبات یہی ہیں اور چوں کہ وہ ذرا اونچے قسم کا حیوان ہے لہذا وہ صرف غذا ہی نہیں مانگتا بلکہ اونچی قسم کی اور نئی غذائیں تلاش کرتا ہے۔ یہی حال دیگر خواہشات کا ہے کہ ان میں بھی انسان کا مطالبہ محض جسمانی تسکین نہیں رہ جاتا، ہزاروں نزاکتیں اور باریکیاں نکل آتی ہیں۔ اب اگر انسان کا سطح نظر یہ بن جائے کہ کسی طرح ان خواہشات کی تسکین کرتا رہے تو یہ خواہشات نفس انسانی پر سوار ہو جاتی ہیں۔ اس کے برخلاف اگر انسان ارادے کی باگیں مضبوطی سے تھامے رہے تو ان خواہشات کو اپنے پیچھے اور مرضی کے مطابق چلا سکتا ہے۔ روزے کے مقاصد میں سے ایک

اہم مقصد انسان کو اس کے حیوانی جسم پر اقتدار بخشنا ہے۔ مذکورہ بالا تین خواہشات جو انسان کی تمام حیوانی خواہشات میں سب سے زیادہ اہم ہیں، روزہ ان تینوں کو گرفت میں لے لیتا ہے اور ان کے منہ میں مضبوط لگام دے کر راسیں ہمارے ہاتھ میں دے دیتا ہے تیس دن کی مسلسل مشق کا مقصد یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ ہمارا نفس ہم پر غلبہ حاصل کر لے ہم اپنے خادم پر پورا اقتدار حاصل کر لیں، جس خواہش کو چاہیں روک دیں اور اپنی جس قوت سے جس طرح چاہیں کام لے سکیں اس لئے کہ وہ شخص جسے اپنی خواہشات کا مقابلہ کرنے کی کبھی عادت نہ رہی ہو اور جو نفس کے ہر مطالبے پر بے چون و چرا سر جھکا دینے کا خوگر رہا ہو اور جس کے لئے حیوانی جبلت کا داعیہ ایک فرمان واجب الاذعان کا حکم رکھتا ہو، دنیا میں کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا۔

یہاں روزے اور غیر اسلامی نفس کشی کی مشقوں کا اصولی فرق ذہن میں رکھنا چاہیئے۔ اس لئے کہ یہ دوسری قسم کا اقتدار تو در ایسی جاہل، مطلق العنان خودی کا استبداد ہے جو اپنے سے بالاتر کسی حاکم کی مطیع اور کسی ضابطہ و قانون کی پابند نہیں ہے۔ اس اقتدار کے لئے انسان خود اپنی فطرت سے لڑتا ہے اور جسم اور نفس سے ان کے جائز حقوق چھینتا ہے۔ اس کے برخلاف اسلامی روزہ جس خودی کو نفس اور جسم پر اقتدار دیتا ہے وہ مطلق العنان خودی نہیں بلکہ خدا اور اس کے قانون کی اطاعت کرنے والی خودی ہے۔ ایسی خودی جو خدا کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت، علم اور کتابِ نبی کی رہنمائی میں چلنے والی ہے۔ وہ خدا کے دیئے ہوئے نفس و جسم کو اپنی ملکیت نہیں سمجھتی بلکہ اسے خدا کی امانت مان کر اس پر خدا کی منشا کے مطابق حکومت کرتی ہے۔ ایسی خودی کا حامل اپنے جسم پر ظلم نہیں کرتا بلکہ اس کو تمام جائز راحتیں ہم پہنچاتا ہے لیکن وہ اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ حدود اللہ کو توڑ ڈالے۔

انفرادی اثرات | یہاں تک جو کچھ کہا گیا ہے وہ افراد کی تربیت سے متعلق تھا۔ ہم نے دیکھا کہ

اول: اس تربیت کے ذریعے جماعت کے ہر فرد کو خداوندِ عالم کی حاکمیت کے مقابلے میں اپنی خود مختاری سے عملاً دست بردار ہو جانے کے لئے تیار کیا جائے۔

دوم: ہر فرد کے ذہن میں خدا کے عالم الغیب والشہادۃ ہونے اور آخرت کی باز پرس کا عقیدہ عملی مشق و تمرین کے ذریعے اس طرح جاگزیں کر دیا جائے کہ وہ خود اپنی شخصی مرداری کے احساس کی بنا پر (نہ کہ خارجی دباؤ کی وجہ سے) قانونِ الہی کی اطاعت کرنے لگے۔

سوم: ہر فرد میں روح پھونک دی جائے کہ ماسوا اللہ کی بندگی و اطاعت سے اعتقاداً و عملاً منکر ہو جائے اور اس کی بندگی اللہ کے لئے خالص ہو جائے۔

چھہارم: ہر فرد کی اخلاقی تربیت اس طرح کی جائے کہ اسے اپنی خواہشات پر مکمل اقتدار حاصل ہو جائے اور اس میں صبر و تحمل، جفاکشی، توکل علی اللہ، ثابت قدمی و کیسوٹی کی صفات پیدا ہو جائیں اور اس کے کردار میں اتنی قوت آجائے کہ وہ خارجی ترغیبات اور میلانات نفس کا مقابلہ کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ روزے ہر عاقل و بالغ فرد پر فرض کئے گئے ہیں۔ اگرچہ ضروری نہیں کہ تمام افراد میں مندرجہ بالا خصوصیات بدرجہ اتم پیدا ہو جائیں جو اس سے پیدا کرنی مطلوب ہیں۔ اس لئے خارجی عوامل کے علاوہ ذاتی استعداد اور خواہش بھی ضروری ہے، لیکن خارجی طور پر اس سے بہتر نظام تربیت دنیا میں ممکن نہیں ہے۔

اجتماعی فوائد اگرچہ روزہ انفرادی فعل ہے لیکن نماز کے باجماعت ہونے کی وجہ سے جس طرح نماز اجتماعی فعل بن جاتی ہے اسی طرح روزہ رکھنے کے لئے ایک خاص پسینے کے تقررنے اس فعل کو ایک اجتماعی عمل بنا دیا ہے۔ اس حکیمانہ تدبیر سے روزے کے اخلاقی و روحانی منافع میں جو اضافہ ہوا ہے اس کی طرف یہاں چند مختصر اشارات کئے جاتے ہیں۔

۱۔ تقویٰ اور پاکیزگی کی فضا اس عمل کی خصوصیت یہ ہے کہ ایک خاص قسم کی نفسیاتی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک شخص انفرادی طور پر کسی ذہنی کیفیت کے تحت کوئی کام کر رہا ہو اور اس کے گرد و پیش دوسرے لوگوں میں وہ ذہنی کیفیت نہ ہو تو وہ اس ماحول میں اجنبی بن کر رہ جائے گا۔ اور ماحول نہ صرف یہ کہ اس کے بڑھانے میں کوئی مدد نہ دے گا بلکہ اس کی کیفیات کو گھٹا دے گا۔ لیکن اگر پورے ماحول پر وہی فضا طاری ہو اور تمام لوگ ایک ہی خیال اور ایک ہی ذہنیت کے ماتحت ایک ہی عمل کر رہے ہوں تو معاملہ برعکس ہوگا۔ اس وقت ایک ایسی اجتماعی فضا بن جائے گی جس میں پوری جماعت پر وہی ایک کیفیت چھائی ہوئی ہوگی اور ہر فرد کی اندرونی کیفیت ماحول کی خارجی اعانت سے غذائے کر بے حد و حساب بڑھتی چلی جائے گی۔ ایک ایک سپاہی کا الگ الگ جنگ کرنا اور جہانک جنگ کا برداشت کرنا کس قدر مشکل ہے؟ لیکن جہاں فوج کی فوج ایک ساتھ مارچ کر رہی ہو وہاں جذبات شہادت و حماسہ کا ایک طوفان اُمنڈاتا ہے جس میں ہر سپاہی متوازن وار بہتا چلا جاتا ہے۔

روزے کے لئے رمضان کا مہینہ مقرر کر کے شارع نے یہی کام لیا ہے جس طرح آپ دیکھتے ہیں کہ ہر غلہ اپنا موسم آنے پر خوب پھلتا پھوٹتا ہے اسی طرح رمضان کا مہینہ گویا غر و صلاح اور تقویٰ و طہارت کا موسم ہے جس میں برائیاں دبتی اور نیکیاں پھلتی پھوٹی ہیں۔ اسی لئے احادیث میں آیا ہے کہ جب رمضان آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے

بند کر دیئے جاتے ہیں۔

۲۔ جماعتی احساس | اجتماعی عمل کا ایک دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس سے لوگوں میں فطری اور اصلی وحدت پیدا ہوتی ہے۔ نسل یا زبان کا اشتراک فطری قومیت پیدا نہیں کرتی۔ آدمی کا دل صرف اسی سے ملتا ہے جو خیالات اور عمل میں اس سے ملتا ہے۔ یہی وہ اصلی رشتہ ہے جو دو آدمیوں کو ایک دوسرے سے باندھتا ہے۔ جب کوئی شخص اپنے گرد پیش کے لوگوں کی ذہنیت اور عمل میں اپنے سے مختلف پاتا ہے تو صریح طور پر اپنے آپ کو ان کے درمیان اجنبی محسوس کرتا ہے مگر جب بہت سے لوگ مل کر ایک ہی ذہنی عمل کے ساتھ ایک ہی عمل کرتے ہیں۔ تو ان میں باہمی یگانگت، رفاقت، یکجہتی اور برادری کے گہرے تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں۔ نیکی ہو یا بدی دونوں صورتوں میں اجتماعی نفسیات اسی طرح کام کرتی ہے مگر فرق یہ ہے کہ بدی کے راستے میں افراد کی نفسیات کا دخل رہتا ہے جس کا فطری میلان فرد فرد کو بھاڑ کر الگ کر دینے کی طرف ہے۔ اس بنا پر برادری مستحکم نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف نیکی کے راستے میں نفسیات دہتی ہے اور نیک خیالات و افعال کا اشتراک بہترین رشتہ اخوت پیدا کرتا ہے۔

۳۔ امداد باہمی کی رُوح | اس اجتماعی جہادت کا تیسرا زبردست کام یہ ہے کہ یہ عارضی خوشکے طور پر تمام لوگوں کو ایک سطح پہلے آتی ہے، اگرچہ امیر امیر ہی رہتا ہے اور غریب غریب، لیکن روزہ چند گھنٹوں کے لئے امیر پر بھی وہی کیفیت طاری کر دیتا ہے جو اس کے فاقہ کش بھائی پر گذرتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کی مصیبت حقیقی طور پر محسوس کرتا ہے اور خدا کی رضا کا جذبہ اسے غریب بھائیوں کی مدد پر اکساتا ہے جس قوم کے امیروں میں غریبوں کی تکلیف کا احساس اور ان کی عملی ہمدردی کا جذبہ ہو اور جہاں صرف اداروں ہی کو خیرات نہ دی جاتی ہو بلکہ فرداً فرداً بھی حاجت مندوں کو تلاش کر کے مدد پہنچائی جاتی ہو، وہاں نہ صرف یہ کہ قوم کے کمزور حصے تباہ ہونے سے بچ جاتے ہیں اور اجتماعی فلاح برقرار رہتی ہے بلکہ غربت اور امارت میں حسد و نفرت کے بجائے محبت اور شکر گزاری کے تعلقات استوار ہوتے ہیں۔ اور وہ طبقاتی کشمکش کبھی رونما نہیں ہو سکتی جو ان قوموں میں برپا ہوتی ہے جن کے مالدار لوگ جانتے ہی نہیں کہ فقر و فاقہ کیا چیز ہوتی ہے اور جو قحط کے زمانے میں تعجب سے پوچھتے ہیں کہ لوگ بھوکے کیوں مر رہے ہیں۔ انہیں روٹی نہیں ملتی تو وہ کیک کیوں نہیں کھاتے ؟

۴- حج

حج کی اہمیت اور اس کا مقصد | حج بھی اسلام کا ایک ضروری رکن ہے۔ حج

کعبہ کی زیارت کو اسی لئے یہ نام دیا گیا ہے کہ اس میں انسان بیت اللہ کی زیارت کا ارادہ رکھتا ہے۔ حج ہر اس بالغ مسلمان پر زندگی میں ایک بار فرض ہے جو مکہ تک آنے جلنے کی قدرت رکھتا ہو مگر کوئی شخص قدرت رکھنے کے باوجود حج نہیں کرتا تو وہ اپنے مسلمان ہونے کو بھٹلاتا ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا:

لوگوں پر اللہ کا حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچ سکتا ہو وہ اس کا حج کرے اور جس نے کفر کی روش اختیار کی تو وہ جان لے کہ اللہ سب اہل جہان سے بے نیاز ہے۔

”وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفِيْرٌ عَنِ الْعَالَمِيْنَ“

آل عمران - ۹۷

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:-

”جس شخص کو کسی بیماری نے یا کسی واقعی ضرورت نے یا کسی ظالم حکمران نے روک نہ رکھا ہو اور وہ اس کے باوجود حج نہ کرے تو چاہے وہ یہودی مرے چاہے نصرانی“ (سنن کبریٰ جلد ۴)

حج کی فضیلت ان الفاظ میں بیان فرمائی:

مقبول حج کا بدلہ جنت کے سوا کچھ نہیں۔ (مسلم کتاب الحج)

”اَلْحَجُّ الْمَبْرُوْرُ لَيْسَ لَهٗ جَزَاءٌ اِلَّا الْجَنَّةُ“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جس نے اس گھر کا حج کیا اور اس دوران اس نے نہ تو کوئی شہوانی حرکت کی نہ کسی گناہ کا ارتکاب کیا وہ جب حج کر کے لوٹتا ہے تو یوں ہوتا ہے گویا آج ہی پیدا ہوا ہے۔

”مَنْ حَجَّ هَذَا الْبَيْتَ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَمَا وَلَدَتْهُ اُمُّهُ“

(مصیح بخاری)

یہ جاننے کے لئے کہ اللہ و رسول نے حج کعبہ کو ایسی آخری درجہ کی اہمیت کیوں دی ہے؟ اس کے بغیر اسلام کی پیروی کا دعویٰ کیونکہ درست نہیں؟ اور وہ جنت کی ضمانت کیوں دی؟ کس طرح ہے؟ ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ حج کیا پیر ہے؟ دین کی روح سے اس کا کیا رابطہ ہے؟

اسلامی ذہن، اسلامی سیرت اور اسلامی کردار پیدا کرنے میں وہ کیا حصہ لیتا ہے؟ حج کے بارے میں یہ باتیں ہمیں دو چیزوں سے معلوم ہو سکیں گی۔

۱۔ ایک تو یہ خود کعبہ کیا چیز ہے جس کا حج کیا جاتا ہے؟ وہ کس لئے بنایا گیا؟ اسلام سے اس کا کیا رشتہ ہے؟

۲۔ دوسری یہ کہ حج میں جو مراسم ادا کئے جاتے ہیں وہ کیا ہیں؟ اور ان کے پیچھے کون سے تصورات کام کرتے ہیں؟

اگر ان باتوں کی وضاحت ہو جائے تو وہ سب کچھ آپ سے آپ نظر آ جائے گا۔ حج کی اس بلند ترین اہمیت کا سبب ہے۔

تاریخ کعبہ | کعبہ کی تعمیر آج سے تقریباً ساڑھے چار ہزار برس قبل حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمعیل علیہما السلام کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ تعمیر کا حکم اور جگہ کا تعین دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوئے تھے اور اسی وقت انہیں یہ ہدایت بھی کر دی گئی تھی کہ جب یہ گھر بن جائے تو لوگوں میں منادی کر دینا کہ اس کا حج فرض ہے۔ اس گھر کی جو حیثیت اور غرض و غایت اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائی ہے اس کا اظہار ان آیتوں سے ہوتا ہے۔
 ”وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرٰہِیْمَ مُصَلًّی“ (سورہ بقرہ ۱۲۵)

نیز فرمایا:
 ”إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِّلنَّاسِ لَٰلَّذِیْ بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعٰلَمِیْنَ“
 (آل عمران ۹۶)

یقیناً پہلا گھر جو لوگوں کیلئے امر کر عبادت کی حیثیت سے) بنایا گیا تھا وہی ہے جو مکہ میں واقع ہے جس کا حال یہ ہے کہ وہ برکتوں والا اور سارے جہاں کے لئے ہدایت کا سرچشمہ ہے۔

مندرجہ بالا آیات سے معلوم ہوا کہ یہ گھر سرایا خیر و برکت ہے ساری دنیا کے لئے ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ اللہ کے پرستاروں کا مرجع ہے۔ نماز قائم کئے جانے کی اصل جگہ اور توحید کا خالص مرکز ہے ذرا غور کیجئے تو محسوس ہوگا کہ یہ صفتیں آپس میں گہری مناسبت رکھتی ہیں۔ جو چیز توحید خالص کا مرکز ہوگی، درحقیقت نماز کی اصل جگہ بھی وہی ہوگی اور جو چیز توحید اور نماز کا مرکز ہو کوئی شک نہیں کہ وہ سرایا ہدایت اور محسم برکت ہی ہوگی۔

قبل ازیں آپ پڑھ چکے ہیں کہ اعتقادی طور پر توحید اور عملی طور پر نماز۔ یہی دونوں چیزیں پورے

دین کا مغز ہیں۔ اس لئے کعبہ اگر توجید اور نماز دونوں کا مرکز ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ پورے دین کا مرکز ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے صراحتاً ”بَلِّغْتِی“ لایا گھر فرمایا ہے جس کا مطلب واضح طور پر یہی ہے کہ وہ اللہ کے دین کا گھر یا مرکز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری جگہ جہاں کہیں بھی نماز پڑھی جائے ضروری ہے کہ رخ اسی گھر کی طرف ہو تا کہ اگر نماز کے اس اصل مقام پر نماز پڑھنے کی آسانی میسر نہیں تو کم از کم چہرے کا رخ تو اس طرف رہے۔ اصل ”مُصَلًّی“ یعنی حقیقی مسجد بھی ہے اور دنیا کی دوسری تمام مسجدیں اس کی قائم مقام ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بنایا ہوا یہ کعبہ اللہ کے دین کا گھر اور اسلام کا مرکز کیوں اور کس طرح ہے؟ یہ سمجھنے کے لئے ایک طرف تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس کی تعمیر کے بعد اس کے مقصد تعمیر کی خاطر عملی قدم کیا اٹھایا گیا؟

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا آبائی وطن عراق تھا جہاں کلدانیوں کی حکومت تھی۔ یہاں بدستور سناروں کی پوجا ہوتی تھی۔ حضرت ابراہیم جب منصب بتوت سے سرفراز ہوئے تو ستارہ پرستی کے خلاف دنیا میں سب سے پہلی آواز بلند کی۔ ان کے خاندان اور قوم کے لوگوں نے ان کو تکلیفیں دیں۔ ان کو اپنا وطن چھوڑ کر شام، مصر اور عرب کی طرف ہجرت کرنی پڑی۔ آپ مختلف علاقوں میں دعوت حق کی منادی کرتے ہوئے مکہ کی چٹیل وادی میں پہنچے یہیں اس مشہور خواب کا واقعہ پیش آیا جس میں آپ نے اپنے اکلوتے فرزند حضرت اسمعیلؑ کو اپنے ہاتھوں ذبح کرتے دیکھا تھا یہ خواب جب آپ نے اپنے تخت جگر کو سنایا تو سعادت مند بچے نے کہا کہ: ”ابا جان اللہ کا جو حکم ہو اس پر بے دریغ عمل کیجئے، یہ گردن انشاء اللہ صبر و رضا کی گردن ثابت ہوگی“ باپ نے بیٹے کو زمین پر بچھاڑ کر چھری گردن پر رکھ دی۔ ہاتھ چلنے کو ہی تھے کہ اوپر سے ندا آئی ”ابراہیم! بس ہاتھ روک لے، تو نے اپنے خواب کو سچ کر دکھایا۔ ہم نے اسمعیلؑ کو ایک بھاری قربانی کے عوض چھڑا دیا“ حضرت ابراہیمؑ کی پوری زندگی مثالی آزمائشوں کی زندگی تھی۔ یہ ذبح کا واقعہ ان آزمائشوں کی آخری کڑی تھی۔ اس آخری اور سب سے بڑی آزمائش میں بھی جب آپ پورے اتر چکے تو اب اجر پانے کا دور شروع ہوا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت آئی۔

”إِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا۔ ابراہیم! میں تمہیں سارے انسانوں کا امام بنانے والا ہوں۔“ (سورۃ بقرہ - ۱۲۴)

پھر اس امام بنانے کی کارروائی کا آغاز اس طرح ہوا کہ ان اعلانوں اور ہدایتوں کے ساتھ جن کے حوالے ابھی گذر چکے ہیں۔ کعبہ کی تعمیر کا حکم ہوا۔ اس پس منظر کی دو باتیں خاص طور پر ذہن میں رکھنے کی ہیں۔

۱۔ ذبح کا واقعہ مروہ کے مقام پر پیش آیا جو مکہ کے قریب واقع ہے اور کعبہ اس مقام سے صاف نظر آتا ہے۔

۲۔ خواب کے بعد باپ اور بیٹے دونوں نے تسلیم و رضا کے جس جذبے کے ساتھ اس اشارہ غیبی پر عمل پیرا ہونے کا عزم کیا تھا۔ اس کی تعبیر اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لفظ سے کی ہے۔
 ”فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهِ
 (الصافات-۱۱۳) (السمیع) کو) پشانی کے بل لٹا لیا۔

جس وقت کعبہ کی تعمیر شروع ہوئی اسی وقت اس کے مقصد کی تکمیل کے سلسلے میں اس کے مقدس مہماروں نے اللہ تعالیٰ کے حضور یہ دعا کی۔

خدا یا! ہمارے عمل کو قبول فرما یقیناً تو سب کچھ سنتا اور سب کچھ جانتا ہے۔ اے مالک میں تجا
 فرمانبردار بنا اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک
 ایسا گروہ پیدا کر جو تیرا فرمانبردار ہو اور میں اپنی عبادت
 کے طریقہ بتلا۔ ہم پر کرم کی نظر رکھ تو بلاشبہ
 نظر کرم فرماتے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

”رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ
 السَّمِيعُ الْعَلِيمُ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا
 مُسْلِمِينَ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةٌ
 مُّسْلِمَةٌ لَّكَ وَارِنَا مَنَاسِكَنَا
 وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ
 الثَّوَابُ الرَّحِيمُ“ (بقرہ-۱۲۴-۱۲۸)

جب خانہ کعبہ بن چکا تو ایسا نہیں ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسمعیلؑ اور حضرت ہاجرہ کو لے کر اپنے باقی اہل و عیال کے پاس یا کسی اور آباد مقام پر چلے گئے ہوں۔ بلکہ انہوں نے کیا یہ کہ اسی چٹیل میدان میں اور اسی کعبہ کے پاس انہیں بسا دیا۔ تاکہ اللہ تعالیٰ کا وہ سچا فرمانبردار گروہ (اُمۃٌ مُّسْلِمۃٌ) جس کے پیدا کئے جانے کی انہوں نے دعا کی تھی۔ جب پیدا کیا جائے تو اس کعبہ کے پاس وجود میں آئے۔

چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے خود کہا تھا۔

پروردگار! میں نے اپنی اولاد میں سے ایک
 شاخ کو ایک چٹیل میدان میں تیرے باعزت گھر
 کے پاس بسا دیا ہے۔ خدا یا انہیں اس لئے
 بسایا ہے کہ وہ نماز قائم کریں۔

”رَبَّنَا أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي
 بَوَادِئَ عَذْرَى ذِي زُرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ
 الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ“
 (سورہ ابراہیم-۱۳۷)

اولاد اسمعیلؑ میں سے اللہ کا یہ سچا فرمان بردار گروہ (اُمۃٌ مُّسْلِمۃٌ) عملاً کس طرح وجود میں آئے گا۔ یعنی گھنے اللہ رب العزت کی سچی فرمانبرداری (اسلام) کا طریقہ کیسے معلوم ہوگا؟ اس کیلئے ان حضرات نے یہ دعا کی تھی۔

”رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا“
 اے ہمارے پروردگار ان کے اندر اپنی میں سے

ایک ایسا رسول بھی مبعوث کرو جنہیں تیری آیتیں پڑھ کر سنائے، تیرے احکام بتائے، حکمت سکھائے اور ان کا تزکیہ کرے۔

مَنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ“ (سورہ بقرہ - ۱۲۸)

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ حضرت ابراہیم خلیلؑ کی یہی دونوں دعائیں تھیں جو اللہ کے حضور مقبول ہو کر پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شکل میں ظاہر ہوئیں چنانچہ اس مقدس گروہ کا نام ہی مسلم اور اُمت مسلمہ پڑا۔ اور اسی لئے پڑا کہ حضرت ابراہیمؑ اپنی اس دعا میں اسے اسی لفظ اور نام سے یاد کر چکے تھے دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہی اس کا یہ نام رکھ چکے تھے۔ جیسا کہ قرآن میں واضح کیا گیا ہے۔

”هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ“ (اس ابراہیمؑ نے تمہارا نام مسلم تجویز کیا۔)
(الحج - ۷۸)

تغیر کعبہ کے سلسلہ میں ان ساری باتوں کو بہ یک نظر دیکھئے کعبہ کا مرکز دین و سرچشمہ اسلام ہونا دو پہر کے سورج کی طرح خود بخود روشن ہو جائے گا۔

مناسک حج | ۱۔ احرام: جب کوئی شخص حج کے لئے روانہ ہوتا ہے تو مکہ سے کافی دور پہلے ایک متعین مقام پر پہنچ کر باقاعدہ نیت باندھتا ہے جس کو احرام کہتے ہیں۔ احرام باندھتے وقت وہ پہلے غسل یا وضو کرتا ہے پھر عام استعمال کے کپڑوں کے بجائے ایک تہبند اور ایک چادر پہن لیتا ہے۔ اس کے بعد دو رکعت نماز پڑھتا ہے نماز پڑھ کر حج کی باضابطہ نیت کا اعلان و اظہار کرتے ہوئے اپنے خدا کو مخاطب کرتا اور بلند آواز سے پکارتا ہے۔

حاضر ہوں میرے اللہ! میں حاضر ہوں۔ حاضر ہوں۔ تیرا کوئی شریک نہیں ہیں حاضر ہوں۔ کوئی شک نہیں کہ حمد تیرے لئے ہے نعمت تیری ہے بادشاہی تیری ہے تیرا کوئی شریک نہیں۔

لَبَّيْكَ اللَّهُمَّ لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ لَا شَرِيكَ لَكَ لَبَّيْكَ إِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكُ لَا شَرِيكَ لَكَ.

لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ کی پکار اس کی ورد زبان بن جاتی ہے اور وہ ہر لمحہ چلتے پھرتے اُٹھتے بیٹھتے یہ کلمات دہراتا رہتا ہے۔ احرام باندھ چکنے کے بعد اس کے لئے زیب و زینت اور عیش و عشرت کی ایک ایک چیز ممنوع ہو جاتی ہے۔ اپنے عام استعمال کے کپڑے وہ اتار ہی چکا ہے جو دو کپڑے چادر اور تہبند اس کے جسم پر ہیں، ضروری ہے کہ وہ پہلے ہوئے نہ ہوں اور نہ کسی خوشبو اور رنگے ہوئے ہوں۔ اس طرح اب وہ ٹوپی یا عملے یا اور کسی چیز سے اپنے سر کو ڈھک نہیں سکتا۔

نہ منہ چھپا سکتا ہے نہ بال بنوا سکتا ہے نہ ناخن ترشوا سکتا ہے نہ خوشبو استعمال کر سکتا ہے۔ جنسی تعلقات کے قریب بھی نہیں جاسکتا۔ حتیٰ کہ اس کا تذکرہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح اسے شکار کرنے کی اجازت باقی نہیں رہ جاتی بلکہ وہ کسی اور کو بھی شکار کی طرف اشارہ نہیں کر سکتا۔ اس حالت میں وہ مکے کی طرف بڑھنا جاتا ہے۔ جو نہی کعبہ دکھائی دیتا ہے پکار اٹھتا ہے **اَللّٰهُ اَكْبَرُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ**، مکہ میں داخل ہو کر سیدھا کعبہ پہنچتا ہے۔

۲۔ طواف: یعنی خانہ کعبہ کے چاروں طرف گھوم کر دعائیں مانگنا۔ یہ وہ رسم ہے جو حضرت ابراہیمؑ کے عہد میں نذر اور قربانی کو قربان گاہ کے چاروں طرف پھیر کر ادا کی جاتی تھی چونکہ حاجی اپنے آپ کو قربان گاہ پر چڑھتا ہے اس لئے وہ اس کے چاروں طرف پھرتا ہے اور اس گردش کی حالت میں وہ اپنی مغفرت کے لئے دعائیں مانگتا ہے۔

حجر اسود: حجر اسود کے لفظی معنی ”کالے پتھر“ کے ہیں۔ یہ سیاہ رنگ کا ایک پتھر ہے جو خانہ کعبہ کی دیوار کے ایک گوشہ میں قد آدم بلند نصب کیا گیا ہے۔ خانہ کعبہ بیسیوں دفعہ گرا۔ کبھی سیلاب میں بہہ گیا اور کبھی آگ میں جل گیا۔ اس بنیاد کا جو حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں پڑی تھی ایک پتھر بھی اس میں باقی نہیں۔ اس عہد قدیم کی یادگار صرف یہی ایک پتھر رہ گیا تھا جس کو اہل عرب نے جاہلیت میں بڑی حفاظت سے قائم رکھا اور تقریباً چودہ سو برس سے اسلام میں وہ اسی طرح نصب ہے۔ ۳۱ھ میں باطنیہ فرقہ کے لوگ کچھ دنوں کے لئے اس کو نکال کر لے گئے تھے اور پھر واپس کر گئے۔ یہ طواف کے ختم ہونے کے بعد اس پتھر کو بوسہ دیتے اور سینے سے لگاتے ہیں۔ ہاتھ یا کسی لکڑی یا کسی چیز سے اس کو چھو کر بھی اس چیز کو چوم سکتے ہیں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس کو چوم کر فرمایا تھا:

”لئے کالے پتھر! میں خوب جانتا ہوں کہ تو ایک معمولی پتھر ہے۔ نہ تو نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان لیکن میں اس لئے تجھے بوسہ دیتا ہوں کہ میں نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے بوسہ دیتے دیکھا تھا“ (مسلم و ترمذی و مستدرک حاکم)

صفا اور مروہ کے بارے میں فرمایا:

”اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ“ (البقرہ - ۱۵۸) | بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔

۳۔ صفا و مروہ کے درمیان سعی: صفا اور مروہ کعبہ کے قریب دو پہاڑیاں تھیں۔ جو اب بڑے نام باقی ہیں۔ صفا وہ پہاڑی ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ اپنی سواریوں اور نوکرین کو چھوڑ کر اکیلے حضرت اسمعیلؑ کو لے کر آگے بڑھے تھے۔ مروہ وہ پہاڑی ہے جس پر حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمعیلؑ کی قربانی کرنی تھی اور آخر غیبی ندا کے باعث رک گئے اور اسمعیلؑ کی جگہ مینہ صفا قربان کیا۔

بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت ماجرہ حضرت اسمعیل کو لے کر جب یہاں آئی تھیں اور وہ پیاس سے بے تاب ہو گئے تھے تو حضرت ماجرہ صفا و مروہ کے درمیان پانی کی تلاش میں دوڑی تھیں آخر زمر کا چشمہ نظر آیا۔ صفا و مروہ کے درمیان دو ٹنڈاں ہی کی اس مضطر باندہ دوڑ کی یادگار ہے۔ سچ کرتے وقت پہلے صفا پر پھیرا وہ پر چڑھ کر کعبہ کی طرف منہ کر کے خدا کی حمد کرتے اور دعا مانگتے ہیں۔

۴۔ **وقوف عرفہ** : عرفات کے میدان میں ذوالحجہ کی نویں تاریخ کو تمام حاجیوں کو ٹھہرنا اور زوال آفتاب سے غروب تک یہاں دعا اور تہنید کی حمد میں مصروف رہنا پڑتا ہے۔ حج کا اہنی رکن یہی ہے۔ یہاں کوٹوں تک یہاں تک نظر کام کرتی ہے۔ ملک ملک کے لوگ ایک طرز اور ایک لباس میں کھڑے ہو کر رو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگتے اور خدا سے اپنا نیا عہد باندھتے ہیں یہاں جبلِ اُحٹ کے پاس کھڑے ہو کر مسلمانوں کا امیر تمام دنیا سے آئے ہوئے حاجیوں کے سامنے خطبہ دیتا ہے اور ان کے فرائض سے آگاہ کرتا ہے عرفات کے اس قیام میں ایک طرف تو اسلام کی شان و شوکت کی عظیم الشان نمائش ہوتی ہے اور دوسری طرف، یہ اجتماع روزِ حشر کی یاد دلاتا ہے۔

۵۔ **قیام مزدلفہ** : حج کا زمانہ بھیڑ بھاڑ اور دوڑ دھوپ کا ہوتا ہے عرب مغرب کے بعد عرفات سے روانہ ہوتے تھے۔ اسی حالت میں انگریزی کو براہ راست چلے جاتے تو تھک کر پور ہو جاتے اس لئے انہوں نے ذرا سا سکون اور آرام لینے کے لئے مزدلفہ کو ایک درمیانی منزل قرار دے لیا تھا۔ اسلام نے اس کو اس لئے باقی رکھا کہ یہیں وہ مسجد واقع ہے جس کو "مشعر حرام" کہتے ہیں اور یہ عبادت کا خاص مقام تھا۔ اس لئے عرفات سے شام کو لوٹ کر رات بھر یہاں قیام کرنا اور طلوع فجر کے بعد تھوڑی دیر عبادت کرنا ضروری قرار دیا۔

۶۔ **منیٰ کا قیام** : منیٰ مکہ سے چند میل کے فاصلے پر ایک میدان ہے۔ یہاں تمام حاجی دو تین دن ٹھہر کر باہم ملتے جلتے ہیں اور ایک دوسرے سے جان پہچان پیدا کرتے ہیں یہیں قربانی کی جاتی ہے۔ باہم دعوتیں ہوتی ہیں، بازار لگتے ہیں۔ خرید و فروخت ہوتی ہے۔

۷۔ **قربانی** : یہ حضرت اسمعیل علیہ السلام کے ذبح کی یادگار اور اپنی روحانی قربانی کی تمثیل ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ منیٰ کے سہ روزہ قیام میں یہ قومی عید کی عمومی دعوت بن جائے جس میں لوگ ایک دوسرے کو، دوست احباب کو اور فقراء و مساکین کو کھانا کھلائیں۔

۸۔ **حلقِ راس** : منیٰ میں قربانی کے بعد حاجی سر کے بال منڈواتے یا ترشواتے ہیں۔ یہ اس رسم کی تعمیل ہے کہ نذر دینے والے جب نذر کے دن پورے کر لیتے تو اپنے بال منڈواتے۔ ساتھ ہی اس رسم میں ایک اور پرانی یادگار کا اشارہ پوشیدہ ہے۔ تمدن کے ابتدائی عہد میں یہ دستور تھا کہ جو غلام بنا کر آزاد کیا جاتا تھا۔ اس کے سر کے بال منڈوا دیئے جاتے تھے۔ یہ غلامی کی نشانی سمجھی جاتی تھی (سیر ابن شام)

چونکہ حج خدا کی دائمی غلامی اور بندگی کا اقرار و اعتراف ہے اس لئے انسانیت کی پُرانی رسم باقی رکھی گئی۔

۹۔ رمی چمار: ہنٹا کے میدان میں پتھر کے تین ستون کھڑے ہیں کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے حضرت اسمعیل کو قربانی کے لئے چلے تو شیطان نے اس موقع پر ان کے دل میں دوسو سالہ انہوں نے اس کو یہاں جہم کیا جس کے لفظی معنی کنکریاں مارنے کے ہیں اور جو پہلے زمانہ میں لعنت کے اظہار کا ایک طریقہ تھا۔ اسی لئے شیطان کو ”رجیم“ کنکریاں مارا گیا کہتے ہیں۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دنیا میں بت پرستی کا سب سے بڑا مظاہرہ پتھر کے بتوں کی صورت میں ہوا ہے اس لئے پتھر کے ان ستونوں کو کنکری مار کر بت پرستی کے سب سے بڑے مظاہر کو سنگسار کیا جاتا ہے۔ بہر حال تسبیح اور حمد پڑھ کر کنکریوں کو ان کے ستونوں پر پھینکتے ہیں اور شیطان کے دوسو سالہ محفوظ رہنے کی دعا مانگتے ہیں۔

حج کی حقیقت | مذکورہ صدر تفصیلات سے معلوم ہوا کہ حج کی حقیقت خدا کی رحمتوں اور برکتوں کے خاص مقام میں حاضری حضرت ابراہیم کی طرح خدا کی

دعوت پر لبیک کہنا اور اس عظیم الشان قربانی کی رُوح کو زندہ کرنا ہے یعنی ان برگزیدہ نبیوں کی پیروی میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے تسلیم و رضا اور فرماں برداری اور اطاعت کیشی کے ساتھ اپنی گردن جھکا دینا اور اس معاہدہ کو اس طرح بجا لانا جس طرح وہ ہزاروں برس پہلے بجالائے اور خدا کی رحمتوں اور برکتوں سے مالا مال ہوئے۔ یہی ملت ابراہیمی اور یہی حقیقی اسلام ہے۔ یہی روح اور یہی باطنی احساس و جذبہ ہے جس کو حاجی ان بزرگوں کے مقدس اعمال اور قدیم دستور کے مطابق حج میں اپنے اندر عمل اور کیفیت سے محبت کر کے ظاہر کرتے ہیں تمدن کے اسی ابتدائی دور کی طرح وہ ان دنوں بن سٹل اور سادہ کپڑے پہنتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو حضرت اسمعیل کی طرح خدا کے حضور میں نذر کرنے جاتے ہیں۔ اس لئے احرام کے زمانے میں سر کے بال نہ منڈوائے جلتے ہیں نہ ترشوائے ہیں۔ دنیا کے عیش و نشاط اور تکلف کی زندگی سے پرہیز کرتے ہیں، نہ خوشبو لگاتے ہیں نہ ہلے ہوئے کپڑے پہنتے ہیں نہ سر بھپاتے ہیں نہ خوشبودار کھانا کھاتے ہیں نہ شکار کرتے ہیں نہ کسی کی جان لے سکتے ہیں اور حضرت ابراہیم و اسمعیل کی طرح تین دن کے سفر کے گرد و غبار میں اٹے ہوئے خدا کے گھر میں آتے ہیں اور جس طرح حضرت ابراہیم نے خدا کی پکار پر لبیک کہا تھا وہی تین ہزار برس پہلے کا ترانہ ان کے لبوں پر ہوتا ہے پس یہی حج کی حقیقت ہے اور یہ اس عظیم الشان عبادت کے مراسم اور ارکان ہیں۔

حج کی شانِ جامعیت | ۱۔ مرکزیت: خانہ کعبہ اس دیہیں عرش الہی کا سایہ اور اس کی جلوں اور برکتوں کا مرکزی نقطہ ہے۔ یہ وہ آئینہ ہے جس میں اس کی رحمت و غفاری

کی صفیں اپنا عکس ڈال کر تمام گڑے ارض کو اپنی شعاعوں سے منور کرتی ہیں۔ یہ وہ منبع ہے جہاں سے حق پرستی کا چشتہٴ بلا اور اس نے تمام دنیا کو سیراب کیا۔ یہ روحانی علم و معرفت کا وہ منبع ہے۔ جس کی نونے زمین کے ذرہ ذرہ کو درخشاں کیا۔ یہ وہ شیرازہ ہے جس میں ملت کے وہ تمام افراد بندھے ہوئے ہیں جو مختلف ملکوں اور اقلیموں میں بستے ہیں۔ مختلف زبانیں بولتے ہیں۔ مختلف لباس پہنتے، مختلف تمدنوں میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ مگر وہ سب کے سب ان فطری اختلاف کے باوجود ایک ہی خانہ کعبہ کے گرد چکر لگاتے ہیں، اور ایک ہی قبلہ کو اپنا مرکز سمجھتے ہیں۔ یہ وہ برادری ہے جس میں دنیا کی تمام قومیں اور ملکوں کے بسنے والے جو وطنیت اور قومیت کی لعنتوں میں گرفتار ہیں۔ ایک لمحہ اور ایک آن میں داخل ہوتے ہیں جس سے انسانوں کی بنائی ہوئی تمام زنجیریں اور بیڑیاں کٹ جاتی ہیں۔ ایام حج میں تمام قومیں ایک ملک میں، ایک لباس احرام میں، ایک وضع میں، ایک قوم بلکہ ایک خاندان کی برادری بن کر کھڑی ہوتی ہیں۔ یہ وحدت کا وہ رنگ ہے جو ان مادی امتیازات کو مٹا دیتا ہے۔ اس لئے یہ حرم ربانی نہ صرف اسی معنی میں امن کا گھر ہے کہ یہاں ہر قسم کی خونریزی اور ظلم و ستم ناروا ہے بلکہ اس لحاظ سے بھی امن کا گھر ہے کہ تمام دنیا کی قوموں کی برادری قائم کر کے ان تمام ظاہری امتیازات کو جو دنیا کی بد امنی کا سبب ہے مٹا دیتا ہے۔

۲۔ حج کی جامعیت: اگر حج کے مراسم کو ایک اور پہلو سے دیکھیں تو محسوس ہوگا کہ یہ حج اگرچہ کہنے کا ایک عبادت ہے لیکن فی الواقع اس میں ہر عبادت اور نیک کام کی روح موجود ہے۔ الف = حج نماز بھی ہے۔ اس لئے کہ نماز کی حقیقت ذکر یا یاد دہانی ہے اور حج میں آدمی مسلسل زبان سے ذکر کرتا رہتا ہے اور ساتھ ہی ان مقامات کی زیارت کرتا ہے جو اس کے اظہارِ عبدیت کو اُبھار دیتی ہے۔ ب = وہ زکوٰۃ بھی ہے۔ اس لئے کہ ہرج کرنے والے کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ قربانی کا گوشت غریبوں کو کھلائے مالی قربانی کے بغیر حج کیا ہی نہیں جاسکتا زکوٰۃ کی حقیقت بھی اس کے سوا کچھ نہیں کہ رضانے الہی کی خاطر اپنی دولت صرف کی جائے۔

ج = وہ روزہ بھی ہے، اس لئے کہ جنسی اختلاط روزے میں اگر صرف دن کو منور ہے تو حج کے دوران راتوں کو بھی منور ہے۔ رہا کھانے پینے کا معاملہ تو روزے کی طرح اگرچہ حج میں کھانا پینا منع نہیں ہے۔ مگر اس کے بجائے اس میں زیب و زینت وغیرہ کی جو دوسری بہت سی پابندیاں عائد ہوتی ہیں وہ بڑی حد تک اس ممانعت کی قائم مقام بن جاتی ہیں۔ اسی طرح نفس کی خواہشوں کو کنٹرول کرنے کی مشق بھی جس طرح روزے میں ہوتی ہے اسی طرح حج میں بھی ہوتی ہے۔

د = مراسم حج کے پیچھے کام کرنے والی سب حقیقتوں کو دیکھتے عبادتِ خداوندی کا کون سا جذبہ ہے۔ جو اس میں لہریں نہیں لے رہا۔ خصوصاً جذبہٴ جہاد جو بندگی کی مہراج کمال ہے وہ تو ان سارے

اعمال میں اس طرح سمویا ہڑا ہے کہ پورا حج جہاد کی علامتی مشق معلوم ہوتا ہے۔ یہی دوسرے کعبے توں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاد کی اجازت چاہی تو آپ نے فرمایا ”کہ تمہارا بہترین جہاد حج ہے“۔

اقتصادی فوائد

ظہور اسلام سے قبل حج کے ایام ایک میلہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ اسلام نے بھی اسے باقی رکھا۔ یہ دعائے ابراہیمی کا مصداق اور اس شور و بے حاصل زمین کے بسنے والوں کے لئے روزی کا سامان تھا۔ اسلام کے بعد تمام دنیا سے مسلمان یہاں آنے لگے چنانچہ سال کے دو تین مہینوں میں یہاں کے رہنے والے تجارت اور سوداگری سے اس قدر کمالات لیتے ہیں کہ وہ سال بھر کے لئے کافی ہوتا ہے۔ مکہ سے مدینہ کو جب قافلہ جاتا ہے تو ادھر ادھر کے بدوائے پھل اور پیداوار لے کر آتے ہیں اور خرید و فروخت سے اپنی زندگی کا سامان حاصل کرتے ہیں۔ تمام حاجی کھانا پینا، مکان، سواری اور دیگر کمزوریات مکہ اور اس پاس سے حاصل کرتے ہیں اور اس کا معاوضہ ادا کرتے ہیں اور یہی زرمعاوضہ ان کی روزی کا باعث بن جاتا ہے۔ قرآن پاک کے معاوہ میں ”خدا کا فضل تلاش کرنے“ سے مقصود تجارت اور حصول رزق بھی قرار دیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

وَلَا آمَنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ
يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنْ تَرَبُّهُمْ
وَرِضْوَانًا (مائدہ - ۲)

اور نہ ان کو (ستاؤ) جو اس ادب والے گھر کے
فصل سے جا رہے ہوں اپنے پروردگار کا فضل
اور خوشنودی تلاش کرتے ہوئے۔

یعنی ان کے مال و اسباب کو لوٹنا جائز نہیں کیونکہ اس بے اطمینانی سے حج کا ایک بڑا مقصد فوت ہو جائے گا۔

تجارت اور روزی حاصل کرنا بظاہر ایک دنیا کا کام معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے اسلام لانے کے بعد بعض صحابہؓ نے اپنے اس خالص مذہبی سفر میں تجارت وغیرہ کسی دنیوی غرض کو شامل کرنا اچھا خیال نہ کیا۔ اس پر یہ اہمیت نازل ہوئی کہ لوگوں سے بھیک مانگ کر حج کرنا اچھا نہیں کہ یہ تقویٰ کے خلاف ہے بلکہ تجارت کرتے ہوئے چلو تو اچھا ہے۔ قرآن پاک میں فرمایا:

”وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ
التَّقْوَىٰ وَالتَّقْوَىٰ يَأْتِي الْآلِبَابَ
لَئِنْ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا
فَضْلًا مِّنْ رَبِّكُمْ“ (سورۃ البقرہ - ۱۹۷)

اور سفر خرچ کے حلو کہ راستہ کا سب سے اچھا
توشہ تقویٰ (دھبیکہ مانگنا) ہے تم پر گناہ نہیں
ہے کہ تم اپنے پروردگار کا فضل تلاش کرتے
ہوئے چلو۔

۱۔ حج دراصل ان ظاہری مراسم کا نام نہیں بلکہ یہ حج کی صرف جہانی روحانی و اخلاقی فوائد اور ظاہری شکل ہے۔ حج کے یہ ارکان ہمارے اندرونی احساسات

کیفیات اور تاثرات کے مظاہر اور تمثیلیں ہیں۔ اسی لئے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اصلی درحج

جج کا نام صرف جج نہیں بلکہ ”جج مبرور“ (پاکیزہ اور مقبول جج) رکھا ہے۔ یہی جج ان تمام برکات اور رحمتوں کا خزانہ ہے۔ جج کی روحانیت درحقیقت توبہ اور گزشتہ کھوئی ہوئی عمر کی تلافی کے عہددار آئندہ کے لئے اطاعت اور فرمانبرداری کے اعتراف اور اقرار کا نام ہے۔

اس کا اشارہ دعائے ابراہیمی میں مذکور ہے:

”رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمِينَ لَكَ وَ
مِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةٌ مُسْلِمَةٌ لَكَ ط
وَآرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ
أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ“ (سورہ بقرہ- ۲۸)

اے پروردگار ہم کو اپنا فرمانبردار کر دہ بنا اور ہماری اولاد میں سے اپنا ایک فرمانبردار کر دہ بنا اور ہم کو اپنے جج کے احکام اور طریقے سکھا اور ہماری طرف رجوع کریشکے تو رجوع کرنے والا اور رجوع کرنے والا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا بھی ان کی دوسری دعاؤں کی طرح قبولیت سے آراستہ ہوئی۔ اس سے واضح ہوا کہ جج درحقیقت خدا کے سامنے اس سرزمین میں حاضر ہو کر جہاں اکثر تہیوں اور رسولوں نے حاضر ہو کر اپنی اطاعت کا اعتراف کیا، اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کا عہد و اقرار ہے۔ ان میں تائبانہ پرکھڑے ہو کر اور چل کر خدا کی بارگاہ میں اپنی سیدہ کاریوں سے توبہ کرنا اور اپنے رویے کو نئے مولا کو منانا ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”جج اور عمرہ گناہوں کو اس طرح صاف کر دیتے ہیں، جس طرح بھٹی لوہے، سوئے اور چاندی کے میل اور کھوٹ کو صاف کر دیتی ہے اور جو مومن عرفہ کا دن احرام کی حالت میں گذارتا ہے جب اس دن کا سورج ڈوبتا ہے تو اس کے گناہوں کو لے کر ڈوبتا ہے۔ (نسائی، ترمذی)

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ آپ نے یہ بشارت دی کہ عرفہ کے دن سے بڑھ کر کوئی دن نہیں جس میں خدا اپنے بندوں کو دوزخ کے عذاب سے آزاد کرتا ہو۔ وہ اس دن اپنے بندوں سے قریب ہو کر جلوہ گر ہوتا ہے اور اپنے بندوں پر فرشتوں کے سامنے فخر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جو انہوں نے مانگا ہم نے قبول کیا۔ (صحیح مسلم و نسائی)

۲۔ جج کے ذریعے انسان اپنی ذمہ داریوں کا احساس کر سکتا ہے۔ جج اس وقت فرض ہوتا ہے جب اہل و عیال کے نفقہ سے کچھ رقم بچتی ہے۔ اس لئے آدمی جج کے لئے اس وقت نکلتا ہے جب اہل و عیال کی ضرورتوں کا سامان کر لیتا ہے۔ اس لئے اس کو اہل و عیال کے مضائقہ کی ذمہ داریاں خود بخود محسوس ہو جاتی ہیں معاملات میں قرض انسان کے سر کا بوجھ ہے اور جج وہی شخص کر سکتا ہے جو اس سے سبکدوش ہو جائے۔ اس لئے معاملات پر اس کا نہایت عمدہ اثر پڑتا ہے۔

۳۔ عام طرز معاشرت اور دنیوی کاموں میں آدمی اپنے سینکڑوں دشمن پیدا کر لیتا ہے لیکن جب خدا کی بارگاہ میں جانے کا ارادہ کرتا ہے تو سب سے پہلے بری الذمہ ہو کر جانا چاہتا ہے۔ اس لئے

رخصت کے وقت ہر قسم کے بغض و حسد سے اپنے دل کو صاف کر لیتا ہے لوگوں سے اپنے قصود متا کر تا ہے۔ روٹیوں کو مناتا ہے۔ قرض خواہوں کے قرض ادا کرتا ہے۔ اس لحاظ سے حج معاشرتی اخلاقی اور روحانی اصلاح کا بھی ایک ذریعہ ہے۔

۴۔ اسلام آج ہر ملک میں ہے۔ اس لئے ہر ملک کی زبان اس کی زبان ہے۔ تاہم اس کی ایک عمومی زبان بھی ہے جو اس ملک کی زبان ہے جہاں دنیا کے ہر ملک سے مسلمان آتے جاتے ہیں اور اس زبان کے بولنے اور سیکھنے پر اس سفر میں کچھ نہ کچھ مجبور ہوتے ہیں۔ اس کا اثر یہ کہ ہر مسلمان قوم جو کوئی بھی بولی بولتی ہو وہ اس ملک کی زبان سے نہ سہی الفاظ سے تو آشنا ہوتی ہے۔ اور یہ اسلام کی عالمگیر اخوت کی ایک مضبوط کڑی ہے۔

۵۔ مساوات اسلام کا منگ بنیاد ہے۔ اگرچہ نماز بھی محدود طریقے پر اس مساوات کو قائم کرتی ہے۔ لیکن پوری وسعت کے ساتھ اس کی اصلی نمائش حج کے زمانہ میں ہوتی ہے جب امیر غریب۔ عالم و جاہل، بادشاہ اور رعایا ایک لباس میں ایک صورت میں ایک میدان میں ایک ہی خدا کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ نہ کسی کے لئے خصوصیت ہوتی ہے نہ آگے پیچھے کی قید۔

۶۔ بہت سی اخلاقی خوبیوں کا سرچشمہ کسبِ حلال ہے چونکہ ہر شخص حج کے مصارف میں مالِ حلال صرف کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لئے خود حلال و حرام کی تفریق کرنی پڑتی ہے اور اس کا بوجھ انسان کی روحانی حالت پر پڑ سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ الغرض حج اسلام کا صرف مذہبی رکن ہی نہیں بلکہ وہ اخلاقی معاشرتی، اقتصادی، سیاسی یعنی قومی و ملی زندگی کے ہر رُخ اور ہر پہلو پر حاوی اور ممانوں کی عالمگیر بین الاقوامی حیثیت کا سب سے بلند مینار ہے۔

ارکانِ اسلام پر ایک نظر

یہ ہیں اسلام کے بنیادی اعمال اور ان کی حقیقتیں اور حکمتیں۔ ان پر جو شخص بھی گہری نظر ڈالے گا محسوس کرے گا کہ یہ اعمال صرف چند نیکیاں اور عبادتیں نہیں ہیں بلکہ نیکی اور عبادت کے سرچشمے بھی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک انسان کے اندر بندگی کا احساس ابھارنے اور اسے مکمل کرنے میں بڑا اہم حصہ لیتا ہے جو اسی کے لئے مخصوص ہے۔ کوئی دوسرا عمل اس کی قائم مقامی نہیں کر سکتا اور پھر یہ سب مل کر مومن کو ایک ایسا ذہن عطا کرتے ہیں جو دین کے حکموں پر برابر کان لگائے رکھتا ہے۔ ایک ایسی رُوح عطا کرتے ہیں جو رضائے الہی کی طلب سے سرشار ہوتی ہے۔

اس طرح وہ شخص اللہ کی اطاعت گزاری کے لئے ایسا مستعد ہو جاتا ہے کہ اس کی جناب سے جو حکم بھی ملے اس کی تعمیل کے لئے دوڑ پڑے۔ اس کے دل کی زمین جُت کر اور کھاد اور پانی پا کر

اس طرح تیار ہو جاتی ہے کہ دینی ہدایات کا جو تخم بھی اس میں ڈالا جائے اسے فوراً قبول کر لے اور نشوونما دینے کے لئے اپنا عمل شروع کر دے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں ”اسلام کے ستون“ کہا گیا ہے یعنی دین کے باقی اجزاء کے لئے مدار حیات قرار دیا گیا ہے۔ یقیناً یہ ایک بہترین تعبیر تھی جو ان اعمال کے لئے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمائی ہے۔

{ اسلام ایک نظر میں از صدر الدین اصلاحی }
{ اسلامی عبادات پر ایک نظر }

سوالات متعلقہ باب سوم

- ۱۔ اسلام کے تصور عبادات پر ایک فاضلانہ مقالہ سپرد قلم کیجئے۔
- ۲۔ اسلامی عبادات کی فلاسفی اور حکمت و مصلحت کتاب و سنت کی روشنی میں بیان کیجئے۔
- ۳۔ نماز کو دین اسلام میں کیا اہمیت حاصل ہے۔ اس کے انفرادی و اجتماعی غایات و مقاصد تفصیلاً تحریر کیجئے۔
- ۴۔ اسلام کے معاشی نظام میں زکوٰۃ کو کیا اہمیت حاصل ہے اور کیوں؟
- ۵۔ زکوٰۃ کے مصارف پر قرآن کریم کے پیش نظر روشنی ڈالئے۔
- ۶۔ زکوٰۃ اشتراکیت کے پھیلاؤ میں سنگ راہ ہے۔ دلائل کی روشنی میں ثابت کیجئے۔
- ۷۔ روزہ کے اسرار و حکم پر ایک شذرہ قلم بند کیجئے۔
- ۸۔ حج کی شان جامعیت پر تفصیلی تبصرہ کیجئے۔
- ۹۔ حج کی اہمیت اور اس کے غایات و مقاصد کتاب و سنت کی روشنی میں ثابت کیجئے۔

باب پہلوا

اسلامی نظام زندگی

۱۔ شریعت کے ماتخذ (قرآن و حدیث)

۲۔ تہذیبِ اخلاق (تصورِ اخلاق - تعلیمِ سیرت کے اسلامی اصول)

۳۔ تدبیر منزل (خاندان کا نظام - نظامِ معاشرت)

۴۔ تعلیم (تعلیم کے اسلامی اصول - تعلیم کی اہمیت اور مقصد)

باب چہارم

اسلامی نظامِ زندگی

۱۔ دینی زندگی | اسلامی نظامِ زندگی کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے ہم یہ معلوم کریں کہ اسلامی شریعت کے ماخذ کیا ہیں؟

اسلام زندگی کا جو نقشہ تجویز کرتا ہے وہ محض انسانی عقل اور تجربے کی روشنی میں ترتیب نہیں پاتا۔ یہاں ابتدائی اور اولین رہنمائی اللہ کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے حاصل کی جاتی ہے اور پھر اس کی روشنی میں عقل اور تجربے کی مدد سے زندگی کا نظام قائم کیا جاتا ہے۔ چونکہ اس نظامِ زندگی کی بنیادی خصوصیت ہی یہ ہے کہ یہ خدا کی دی ہوئی ہدایت پر مبنی ہے اس لئے نظامِ زندگی کے مختلف شعبوں اور ان میں اسلام کے مخصوص مزاج کا مطالعہ کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہونا ہے کہ اسلامی شریعت کی حقیقت اور اصلاح کے لئے اسلام کے طریق کار کا مطالعہ کر لیا جائے اور قدرے تفصیل سے یہ دیکھ لیا جائے کہ ہدایت کے جن سرچشموں سے ہم روشنی حاصل کر رہے ہیں وہ کتنے قابلِ اعتماد ہیں۔ مندرجہ ذیل صفحات میں یہی بحث کی گئی ہے۔

۲۔ شریعت معنی و مفہوم | (شرعہ اور شرع) کے لغوی معنی "کھلے ہوئے، روشن، سیدھے اور صاف راستہ" کے ہیں۔ لیکن مذہبی اصطلاح میں اس سے مراد وہ قوانین و احکام ہیں جو ایک رسول، اللہ تعالیٰ کی اطاعت، اس کی بندگی اور فرمان برداری کے لئے لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے:

”لَعَلَّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شُرْعَةً وَ مِنْهَا جَاءَ“ (المائدہ - ۴۸) | ”ہم نے تم میں سے ہر ایک کیلئے ایک شریعت اور ایک راہ عمل مقرر کی۔“

یعنی تمام انبیاء اور تمام سابقہ کتب الہیہ کا دین تو یہی اسلام تھا۔ لیکن شریعت، یعنی عبادت کے طریقے، معاشرت کے اصول، باہمی معاملات اور تعلقات کے قوانین، حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے حدود وغیرہ امور سے متعلق تفصیلات کا جہاں تک تعلق ہے ان میں اختلاف رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مختلف زمانوں اور مختلف قوموں کے حالات کے مطابق اپنے رسولوں کے پاس مختلف شریعتیں بھیجی تھیں، اور جب تک دینا نے تمدن اور اجتماعی زندگی کے

وہ سارے وسائل پیدا نہیں کر لئے کہ ساری دنیا کو ایک رسول اور ایک شریعت پر جمع کیا جاسکے، اس وقت تک اللہ تعالیٰ الگ الگ قوموں میں رسولوں کو مبعوث فرماتا رہا جو اپنی اپنی قوم کو، الگ الگ، شائستگی اور تہذیب و اخلاق کی تعلیم و تربیت دیتے رہے۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ بسا اوقات ایک ہی زمانے میں ایک سے زائد انبیاء مختلف خطہ ہائے ارضی میں دعوت حق کے فرائض انجام دیتے رہے ہیں۔ جب ان انبیاء کی تعلیم و تربیت سے قوموں کا اخلاقی شعور بیدار ہو گیا اور انسانی معاشرہ اور تمدن کے مادی وسائل اتنے ترقی کر چکے کہ اب ساری دنیا کے لئے ایک ہی رسول و نبی کی بعثت کا وقت آ پہنچا تو اللہ تعالیٰ نے نامہ الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا کہ آپ کے ذریعے ساری انسانیت کو وہ مکمل نظام زندگی عطا فرمایا جو تمام بنی نوع انسان کے مزاج اور حالات و ضروریات کے مطابق ہے اور اب اسی پر عمل پیرا ہو کر خدا کی رضا حاصل کی جاسکتی ہے۔

اس طرح اب دین تو دہی ہے جس کی طرف سلسلہ رسالت کی پہلی کڑی سے سی انسانوں کو ملایا گیا، لیکن پرانی شریعتیں منسوخ کر دی گئیں، اور ان کی جگہ ایسی شریعت قائم کی گئی جس میں رہتی دنیا تک تمام انسانوں کے لئے عبادت کے طریقہ، معاشرت کے اصول اور باہمی معاملات کے قوانین اور حلال و حرام کی حدود دیکھاں ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ شریعت وہ الہی قانون ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے انسانوں تک پہنچا ہے اور اسی لئے شریعت کی اصطلاحی تعریف ان الفاظ میں کی جاتی ہے۔

<p>”القانون الالہی الثابت من النبی صلی اللہ علیہ وسلم لتقویم الحقايد والاعمال وتہذیب الاخلاق وتقدیر المہنزل و سیاست المدن“</p>	<p>غفیہوں کی تقویم اور اعمال کی درستگی اور اخلاق کی تہذیب اور خاندانی زندگی کی بہتری اور ملک سیاست کی استواری کے لئے وہ الہی قانون جو نبی سے ثابت ہو</p>
--	--

۳۔ شریعت کا مقصد اور ہمہ گیری | اسلام، تسلیم و اطاعت کا دوسرا نام ہے۔ اور جو لوگ تسلیم و اطاعت کا یہ فعل کرتے ہیں اسلام

میں داخل ہو جاتے ہیں اور وہ ”مسلم“ کہلاتے ہیں۔ یعنی ایسے لوگ جنہوں نے خدا کی حاکمیت مان لی۔ اپنی خود مختاری سے اُس کے حق میں دست بردار ہو گئے، اور اس بات کو انہوں نے خود اپنے اوپر لازم کر لیا کہ اپنی زندگی کا نظام خدا کے احکام کے مطابق چلائیں گے۔

ایسے تمام لوگ جنہوں نے تسلیم کا یہ فعل کیا ہو ایک وحدت میں منسلک کئے جاتے ہیں اور ان کے اجتماع سے ”مسلم سوسائٹی“ کی تشکیل و تنظیم ہوتی ہے۔ یہ سوسائٹی ان سوسائٹیوں

بالکل مختلف ہے جو اتفاقی حوادث کے نتیجے میں بنتی ہیں۔ اس کی تشکیل ارادی فعل سے ہوتی ہے اور اس کی تنظیم ایسے معاہدے کے ذریعے عمل میں آتی ہے جو خدا اور بندوں کے درمیان شعوری طور پر واقع ہوتا ہے۔ اس معاہدے میں بندے یہ تسلیم کرتے ہیں کہ خدا ان کا حاکم ہے، اس کی ہدایت ان کے لئے دستور زندگی ہے، اس کے احکام ان کے لئے قانون ہیں۔ وہ اسی کو خیر مانیں گے جسے خدا خیر بتائے گا، اور اسی کو شر تسلیم کریں گے جسے خدا شر کہے گا۔ صحیح و غلط اور جائز و ناجائز کا معیار وہ خدا ہی سے لیں گے۔ اور اپنی آزادی کو ان حدود کے اندر محدود رکھیں گے جو خدا ان کے لئے کیمنچ دے گا۔ منقشر یہ کہ اس معاہدے کی بنیاد پر جو سوسائٹی بنتی ہے وہ

یہ اقرار کرتی ہے کہ وہ اپنے معاملات زندگی میں ”کیا ہونا چاہیئے“ کا جواب خود تجویز نہیں کریں گی۔ بلکہ اس جواب کو قبول کرے گی جو خدا کی طرف سے ملے گا۔ اس واضح اقرار کی بنیاد پر جب ایک سوسائٹی بن جاتی ہے تو خدا کی طرف سے ”الکتاب“ اور ”الرسول“ اسے ایک ضابطہ زندگی دیتے ہیں جو ”شریعت“ کہلاتا ہے۔ اور سوسائٹی پر خود اپنے ہی اقرار کی وجہ سے یہ لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے معاملات زندگی کو اس نظام اور اس اسکیم کے مطابق چلائے جو اس شریعت میں تجویز کی گئی ہے۔

جس زمانے میں جس رسول کی جو شریعت تھی اس کا اصل مقصود معروفات کا پروان چڑھانا اور منکرات کا استیصال تھا، اور شریعت محمدیہ کا مقصود بھی انسانی زندگی کے نظام کو معروفات پر قائم کرنا اور منکرات سے پاک کرنا ہے۔ معروفات سے مراد وہ نیکیاں، خوبیاں اور بھلائیاں ہیں جو انسانی فطرت کو جلا بخشتی ہیں اور جن کو انسانی فطرت ہمیشہ سے بھلائی کی حیثیت سے جانتی ہے اور منکرات سے مراد وہ برائیاں ہیں جن کو ہمیشہ سے انسانیت کا ضمیر برا جانتا ہے۔ وہ ”سببہ الفاظین“ معروف ”فطرت انسانی سے مناسب رکھنے والی چیز ہے جو خدائی فطرت ہی کی طرف سے اس کی تابناکی کے لئے تجویز کردہ ہے۔ اور ”منکر“ اس کے خلاف ہے۔

”شریعت“ ہمارے لئے انہی چیزوں کو بھلائی قرار دیتی ہے۔ جو خدا کی بنائی ہوئی فطرت کے مطابق ہیں اور انہی چیزوں کو برائی قرار دیتی ہے جو اس فطرت سے موافقت نہیں رکھتیں۔ وہ بھلائیوں اور برائیوں کی محض ایک فہرست ہی بنا کر ہمارے حوالے کر دینے پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ زندگی کی پوری اسکیم ایسے نقشے پر بناتی ہے کہ اس کی بنیادیں معروف (بھلائیوں) پر قائم ہوں اور معروفات اس میں پروان چڑھ سکیں۔ اور منکرات کو اس کی تعمیر میں شامل ہونے سے روکا جائے۔ اور نظام زندگی میں ان کے در آنے اور ان کا زہر پھیلنے کے مواقع باقی نہ رہنے دیئے جائیں۔ اس غرض کے لئے وہ معروفات کے ساتھ ان اسباب اور ذرائع کو بھی اپنی اسکیم میں شامل

کرتی ہے جن سے وہ قائم ہو سکتے اور پروان چڑھ سکتے ہیں اور ان موانع کو ہٹانے کا انتظام بھی تجویز کرتی ہے جو معروفات کے قیام اور نشوونما میں کسی طور پر سد راہ ہو سکتے ہیں اس طرح اصل معروفات کے ساتھ ان کے قیام و ترقی کے وسائل بھی معروف شمار ہو جاتے ہیں، اور ان کے موانع منکرات کی فہرست میں شامل کر دیئے جاتے ہیں۔ یہی معاملہ منکرات کے ساتھ بھی ہے۔ اصل منکرات کے ساتھ وہ چیزیں بھی منکر قرار پاتی ہیں جو کسی منکر کے وقوع یا ظہور یا نشوونما کا ذریعہ ہیں۔ معاشرے کے پورے نظام کو شریعت اس طرز پر ڈھالتی ہے کہ ایک ایک معروف اپنی حقیقی صورت میں قائم ہو، زندگی کے تمام متعلقہ شعبوں میں اس کا ظہور ہو، ہر طرف سے اس کو قائم ہونے اور پروان چڑھنے میں مدد ملے اور ہر وہ رکاوٹ دور کی جائے جو کسی طرح سے اس کی راہ میں حائل ہو سکتی ہو۔ اسی طرح ایک ایک منکر کو چون چن کر زندگی سے نکالا جائے، اس کی پیدائش اور نشوونما کے اسباب روکے جائیں، بدھر جدھر وہ زندگی میں گھس سکتا ہے اس کا راستہ بند کیا جائے، اور اگر وہ سر اٹھا ہی لے تو پھر سختی کے ساتھ اسے دبا دیا جائے۔

معروفات کو شریعت تین قسموں میں تقسیم کرتی ہے :

(۱) واجب یا فرض : یعنی وہ معروفات جو مسلم معاشرے پر نازم کئے گئے ہیں۔ ان کے متعلق شریعت صاف صاف اور قطعی احکام دیتی ہے۔

(۲) مندوب یعنی مطلوب : یعنی وہ معروفات جن کو شریعت چاہتی ہے یا پسند کرتی ہے کہ وہ معاشرے میں قائم اور جاری ہوں۔ ان میں سے بعض کو صاف الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اور بعض کا اشارہ شارع کے ارشادات سے نکلتا ہے۔ بعض کے قیام و نشوونما کا بندوبست کیا گیا ہے۔ اور بعض کی معرف سفارش کی گئی ہے تاکہ معاشرہ بحیثیت مجموعی یا اس کے صالح لوگ ان کی طرف خود توجہ کریں۔

(۳) مباح : شریعت کی زبان میں ہر وہ چیز اور فعل مباح ہے جس کی ممانعت نہ کی گئی ہو۔ اس تعریف کی بنا پر مباحات صرف وہی نہیں ہیں جن کی اجازت کی تصریح ہو یا جن کے معاملے میں یہیں صاف طور پر اختیار دیا گیا ہو بلکہ ان کا دائرہ بہت وسیع ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ چند بیان کردہ ممتنع کو قبوڑ کر، دنیا میں سب کچھ مباح ٹھہرتا ہے یہی مباحات کا وہ دائرہ ہے جس میں شریعت نے ہم کو آزادی عمل دی ہے۔ اور اسی دائرے میں ہم کو اپنی ضرورتوں کے مطابق قوانین و ضوابط اور طریقہ کار خود تجویز کر لینے کے اختیارات حاصل ہیں۔

منکرات کو شریعت میں دو قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے :

(۱) حرام یعنی قطعی ممنوع : جس سے باز رہنا اور اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی

کو اس سے پاک رکھنا مسلمانوں پر لازم کر دیا گیا ہے اور شریعت میں اس کے متعلق صاف صاف احکام دے دیئے گئے ہیں۔

(۲) مکروہ: یعنی اس کے متعلق شارع کسی نہ کسی طور پر صراحتاً یا کنایتاً ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہے جس سے بہ آسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کس درجے میں ناپسندیدہ ہے یعنی مکروہات حرام کے قریب ہیں، اور بعض مباح کی سرحد سے ملے ہوئے ہیں اور بہت سے ان کے درمیانی مراتب پر ہیں۔ بعض کو روکنے اور بند کرنے کا شریعت کے نظام میں بندوبست کیا گیا ہے، اور بعض کو ناپسندیدہ بنا کر چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ معاشرہ خود یا اس کے صالح عناصر سد باب کریں

معروف و منکر کے یہ احکام ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مذہبی عبادات، شخصی کردار، اخلاق و عادات، کھانا، پینا، پہننا، اور رخصت، نشست و برخاست، بات چیت، خاندانی زندگی، معاشرتی تعلقات، معاشی معاملات، ملکی انتظام، شہریت کے حقوق و واجبات، قیام، بدل کا نظام، حکومت کے طریقے، صلح و جنگ اور دوسری قوموں کے ساتھ تعلقات، غرض زندگی کا کوئی شعبہ اور پہلو ایسا نہیں ہے جس کے متعلق شریعت نے ہم پر نیکی اور بدی کے طریقے، بھلائی اور برائی کے راستے اور پاک و ناپاک کے امتیازات واضح نہ کر دیئے ہوں۔ وہ ہمیں ایک صالح نظام زندگی کا پورا نقشہ دیتی ہے جس میں صاف صاف بتا دیا گیا ہے کہ وہ کون سی بھلائیاں ہیں جنہیں ہم کو قائم کرنا، بڑھانا اور نشوونما دینا ہے اور وہ کون سی برائیاں ہیں جن کو دبانا اور مٹانا ہے کہیں حدود کے اندر ہماری آزادی عمل کو محدود کرنا چاہیے اور عملاً ہمیں کون سے طریقے اختیار کرنے چاہئیں جن سے ہماری زندگی میں ملحدہ بھلائیاں پر دان پڑھیں اور برائیوں کا استیصال ہو۔

یہ پورا نقشہ زندگی ایک ہی نقشہ زندگی ہے۔ اور اس کا ایک مجموعی مزاج ہے جو تقسیم ہو کر قائم نہیں رہ سکتا۔

ہم شریعت اسلامی کے مصاد | شریعت کی اصطلاحی تعریف اور پرکھ چکی ہے، جس سے بہ آسانی سمجھا جاسکتا ہے کہ صاحب شریعت رسول تو خدا ہے نہ کہ کوئی امام یا مجتہد۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اصطلاحاً شریعت موسوی اور شریعت محمدی وغیرہ تو کہہ سکتے ہیں، لیکن شریعت حنفی اور شریعت مالکی وغیرہ نہیں کہہ سکتے۔ البتہ فقہ حنفی اور فقہ مالکی وغیرہ کہہ سکتے ہیں اور کہتے ہیں کیوں کہ فقہ کی اصطلاحی تعریف یہ ہے کہ:

حکمة شرعیة فرعیة عملیة | وہ علم جس کا تعلق ایسے امور سے ہو جو عملی ہوں (فروعی ہوں)

اور شریعت کی طرف منسوب اور اس سے ماخوذ ہوں۔

جیسا کہ اصول فقہ کی اصطلاحی تعریف یہ ہے کہ:

ان قواعد و ضوابط کا علم جو ذریعہ و وسیلہ بنتے ہیں اس بات کے معلوم کرنے کے کہ مسائل کو ان کے تفصیلی دلائل سے کس طرح مستنبط کیا جانا چاہیئے۔

”علم بقواعد یتوصل بہا الی کیفیۃ استنباط المسائل عن دلائلہا التفصیلۃ“

اس سے معلوم ہوا کہ شریعت اور فقہ (اور اصول فقہ) خالص اصطلاحی معنوں میں ایک دوسرے کے مماثل نہیں ہیں۔ شریعت اور فقہ کے درمیان فرق ان کی تعریفوں کے الفاظ پر ذرا گہری نظر ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے، کیوں کہ فقہ میں جن احکام سے بحث ہوتی ہے وہ خود شارع کے امر و حکم پر مبنی ہوتے ہیں اور شریعت سے ماخوذ و مستنبط ہوتے ہیں (شرعیۃ)۔ دوسرے یہ کہ فقہ کے دائرہ بحث میں صرف وہ امور آتے ہیں جو فروعی ہوتے ہیں (فرعیۃ) اور جو صرف عملی ہوتے ہیں (عملیۃ)۔ لیکن شریعت کی اصطلاحی تعریف میں جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ”عقائد و اعمال“ دونوں داخل ہیں۔

یہ تو ہیں شریعت اور فقہ کے اصطلاحی معنی، لیکن عوامی استعمال کی رو سے فقہ اور شریعت کو مترادف یعنی ایک ہی مفہوم کا خیال کیا جاتا ہے۔ اس بنا پر جب ”شریعت اسلامیہ کے ماخذ“ کا فقرہ بولا جاتا ہے تو اس وقت لفظ ”شریعت“ علمی و فنی اصطلاح میں نہیں بلکہ عوامی استعمال کی حیثیت سے بولا جاتا ہے اور اس کا مطلب دراصل ”فقہ اسلامی کے ماخذ“ ہوتا ہے۔

شریعت یعنی اسلامی قانون کا پہلا ماخذ سب سے پہلی دلیل، سرچشمہ اول اور ماخذ اسلامی ”الکتاب“ یعنی قرآن کریم ہے۔

۵۔ ماخذ اول الکتاب

جو خدا کا کلام ہے۔

(یہ) کتاب یقیناً خدا رب العالمین کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔

”تَنْزِيلُ الْكِتَابِ لَادَيْبَ فِيهِ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ“ (السجده-۲)

(یہ) کتاب ہے جسے ہم نے تمہاری طرف نازل کیا ہے، تاکہ لوگ اس کی آیات میں تدبر کریں،

”كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ“ (ص-۲۹)

(یہ کتاب) زمین و آسمان کے پیدا کرنے والے کی نازل کردہ ہے۔

”تَنْزِيلًا مِمَّنْ خَلَقَ الْأَرْضَ وَالسَّمُوتِ الْعُلَى“ (طہ-۱۱۳)

اور یہ اسلامی شریعت و قانون کا اصل الاصول ہے۔ اس میں شریعت کی بنیادیں بیان کی گئی ہیں۔ عقائد کے باب میں اس کے اندر پوری تفصیل و وضاحت ہے اور عبادات و حقوق کو اختصار سے بیان کیا گیا ہے۔

اسلامی شریعت میں اس قرآن کی وہی حیثیت ہے جو ملکی قوانین میں دستور کی ہوتی ہے۔ یہ قرآن خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سارے مسلمانوں کے لئے پیشوا ہے۔

(لے بنی) آپ کہیں کہیں تو بس اسی پر چلتا ہوں جو میرے پروردگار کی طرف سے مجھ پر وحی کیا گیا ہے یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے سمجھ بوجھ کی باتیں ہیں۔ اور (یہ) ایماندار لوگوں کے لئے ہدایت اور رحمت ہے۔

”قُلْ إِنَّمَا أَتَّبِعُ مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ مِنْ رَبِّي هَذَا بَصَاطٌ مِّنْ رَبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ“
(الاعراف - ۲۰۳)

اور بے شک یہ (قرآن۔ الکتاب) تیرے اور تیری قوم کے لئے نصیحت ہے
بے شک ہم نے آپ پر یہ کتاب حق کے ساتھ اتاری ہے تاکہ لوگوں کے درمیان آپ اس طرح فیصلہ کریں جس طرح اللہ آپ کو دکھائے۔

”وَإِنَّهُ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ“
(الزمر - ۲۳)
”إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَادَ اللَّهُ“
(النساء - ۱۰۵)

اس لئے یہ قانون شرعی کا اصل سرچشمہ ہے۔

اور بے شک ہم ان کے پاس (ایک) ایسی کتاب لائے ہیں جس کو ہم نے علم کے ساتھ ایماندار لوگوں کے لئے ہدایت اور رحمت بنا کر بھیجا ہے اور مفصل بیان کیا ہے۔
بے شک یہ قرآن اس (اداء) کی ہدایت کرتا ہے جو بہت ہی سیدھی ہے۔

”وَلَقَدْ جِئْتُم بِكِتَابٍ فَصَّلْنَاهُ عَلَىٰ عِلْمٍ هُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ“
(الاعراف - ۵۲)
”إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ“
(نبی اسرائیل - ۹)

اس قرآن کی وہی خصوصیت و صفت ہے جو ایک دستور کی ہوتی ہے، یعنی یہ کہ اس میں مخصوص احکام کا بیان مجمل ہے۔ جزئیات و تفصیل سے اس میں بہت کم بحث کی گئی ہے اس کا اصل یہ ہے کہ بنیادی چیزوں کو پوری وضاحت کے ساتھ پیش کرے۔ وہ زندگی کے ایک ایک پہلو کے مطابق تفصیلی ضابطے اور قوانین نہیں بتاتا بلکہ ہر شعبہ زندگی کے حدود و اربعہ بتا دیتا ہے اور نمایاں طور پر چند گوشوں میں سنگ نشان کھڑا کر دیتا ہے جو اس بات کا تعین کر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ان شعبوں کی تشکیل و تعمیر کن خطوط پر ہونی چاہیئے ان ہدایات کے مطابق عملاً اسلامی زندگی کی صورت گری کرنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کام تھا۔ انہیں امور ہی اس لئے کیا گیا تھا کہ دنیا کو اس انفرادی میرٹ و کردار اور اس معاشرے اور ریاست کا نمونہ دکھادیں جو قرآن کے دیئے ہوئے اہل دلوں کی عملی تعبیر و تفسیر ہو۔

۶۔ قرآن: موضوعات، مقصد اور انداز مخاطب | عام طور پر ہم جن کتابوں کے پڑھنے کے عادی ہیں، ان میں

ایک متعین موضوع پر معلومات، خیالات اور دلائل کو ایک خاص تصنیفی ترتیب کے ساتھ مسلسل بیان کیا جاتا ہے۔ اسی بنا پر جب کوئی شخص پہلی مرتبہ قرآن کا مطالعہ اس توقع کے ساتھ کرتا ہے کہ ”کتاب“ ہونے کی حیثیت سے اس میں بھی عام کتابوں کی طرح پہلے موضوع کا تعین ہوگا پھر اصل مضمون کو ابواب اور حصص میں تقسیم کر کے ترتیب وار ایک ایک مسئلے پر بحث کی جائے گی اور اسی طرح زندگی کے ایک ایک شعبے کو لے کر اس کے متعلق بھی احکام و ہدایات سلسلہ وار درج ہوں گی تو یہاں اسے اپنی توقع کے بالکل برخلاف ایک دوسرے ہی انداز بیان سے سانبھ پیش آتا ہے۔ جس سے وہ اب تک بالکل نا آشنا تھا۔

یہاں وہ دیکھتا ہے کہ اعتقادی مسائل، اخلاقی ہدایت، شرعی احکام، دعوت و نصیحت، عبرت، تنقید، ملامت، تحریف، بشارت، تسلی، دلائل، شواہد، تاریخی قصے، آثار و کائنات کی طرف اشارے، بار بار ایک دوسرے کے بعد آ رہے ہیں۔ ایک ہی مضمون مختلف طریقوں سے مختلف الفاظ میں دہرایا جا رہا ہے۔ ایک مضمون کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا اچانک شروع ہو جاتا ہے، بلکہ ایک مضمون کے بیچ میں دوسرا مضمون یکایک آ جاتا ہے۔ مخاطب اور متکلم بار بار بدلتے ہیں اور خطاب کا رخ رہ رہ کر مختلف سمتوں میں پھرتا ہے۔ بابوں اور فصول کی تقسیم کا کہیں نشان نہیں۔ تاریخ ہے تو تاریخ نگاری کے انداز میں نہیں، فلسفہ اور ابجد الطبیعیات کے طریقہ پر نہیں، تمدن و سیاست اور معیشت و معاشرت کی گفتگو ہے تو علوم و معانی کے طرز پر نہیں۔ قانونی احکام اور اصول قانون کا بیان ہے تو مقننوں کے ڈھنگ سے بالکل مختلف، چنانچہ یہ کتاب فی الحقیقت تمام دنیا کے لٹریچر میں اپنے طرز کی ایک ہی کتاب ہے۔ اس کی ترتیب دنیا کی ساری کتابوں سے بالکل مختلف طور پر ہوئی ہے۔ اپنے موضوع اور مضمون و ترتیب کے لحاظ سے بھی یہ ایک نرالی چیز ہے۔

مذہباً مرکزی مضمون اور قرآن کے موضوع کو معلوم کرنے کے لئے اس کی اصل کی طرف توجہ ضروری ہے۔ اس ترتیب کا سبب یہ ہے کہ قرآن کا مخاطب انسان کا شعور رکھتی ہے اس کا کوئی شعبہ نہیں ہے وہ بیک وقت وجدان و عقل پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ایک عام مصنف اپنے خیالات کو کسی منطقی تقسیم کے ساتھ پیش کرتا ہے تو ابواب قائم کرتا ہے، وجدان و کیفیات کا ذکر کرتا ہے تو انداز بیان دوسرا ہوتا ہے اور اس میں منطق کو دخل کم ہوتا ہے اور ترتیب بھی دوسری ہوتی ہے۔ افسانہ یا تاریخ لکھتا ہے تو اس میں واقعات کے تسلسل کا خیال رکھتا ہے، غرض کتاب کی ترتیب کا تعلق

نفس مضمون سے ہے۔ اخلاق کی کتاب میں ابواب داخل کئے جاسکتے ہیں لیکن جو کتاب بیک وقت انسان کی جملہ شعوری و لاشعوری قوتوں سے مخاطب ہو وہ کسی ایسی تقسیم کو مفید نہیں پاسکتی۔ اس لئے قرآن کا انداز دوسری کتابوں سے مختلف ہے، قرآن پڑھنے والے کو قلب و دماغ، ہوش و وجدان سب کو بیک وقت حاضر رکھنا چاہیئے ورنہ وہ پورا فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

اس کتاب کو سمجھنے کے لئے اسے نقطہ آغاز کے طور پر اس کی وہی اصل قبول کرنی ہوگی جو خود اس کے پیش کرنے والے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کی ہے۔ اور مختصر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عقلی و ارادی قوتوں سے مالا مال کر کے انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ بنایا ہے تاکہ وہ خدا ہی کو اپنا حاکم و آقا تسلیم کرے اور اس عطا کردہ اختیارات سے سرمو تجاوز نہ کرے کیوں کہ اس کی زندگی کا اصل مقصد اللہ تعالیٰ کے آخری فیصلے میں کامیاب ہونا ہے۔ اس کے برعکس ہر رویہ غلط اور مختلف ہوگا (جسے اختیار کرنے کے لئے انسان آزاد ہے)۔ پھر اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی جو ہمیشہ ہے گی اور وہاں ابدی راحت یا ابدی رنج و عذبت کے علاوہ کچھ نہ ملے گا جس کا مدار اس بات پر ہے کہ انسان دنیا میں کون سا رویہ اختیار کرتا ہے۔ پھر انسانی فلاح و بہبود اور اس کی ہدایات کے لئے اللہ تعالیٰ نے پیغمبر بھیجے جن کا کام یہ تھا کہ صحیح رویے کی طرف انسان کو دعوت دیں جس ہدایت کو انسانوں نے کم کر دیا ہے یا متبع کر دیا ہے اسے پھر اصلی صورت میں پیش کریں۔ پیغمبر پر لازم یا برس تک دنیا میں آتے رہے اور وہی ایک دعوت اور ایک ہدایت پیش کرتے رہے۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کام کے لئے مبعوث فرمایا جس کے لئے کچھلے انبیاء آتے رہے تھے۔ عام انسان اور کچھلے انبیاء کی بگڑی ہوئی امتیں سب ان کے مخاطب تھے۔ سب کو صحیح رویے کی دعوت دینا، سب کو از سر نو خدا کی ہدایت پہنچا دینا اور جو اس دعوت و ہدایات کو قبول کریں انہیں ایک ایسی امت بنا دینا ان کا کام تھا جو ایک طرف خود اپنی زندگی کا نظام خدا کی ہدایت پر قائم کرے اور دوسری طرف اس ملاح دنیا کی جدوجہد کرے۔ پس اسی دعوت اور اسی ہدایت کی کتاب یہ قرآن ہے جو اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی اور اس کتاب کے لئے اس نے ایسا انتظام کر دیا کہ نہ یہ کم ہو سکتی ہے اور نہ منسج کی جاسکتی ہے۔

اس اصل کی وضاحت کے بعد آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے کہ قرآن کا موضوع ”انسان“ ہے۔

اس اعتبار سے کہ بحاظ حقیقت نفس الامری اس کی فلاح اور اس کا خسران کس چیز میں ہے۔ اس کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ ظاہر بینی یا قیاس آرائی یا خواہش کی غلامی کے سبب سے انسان نے خدا اور نظام کائنات اور اپنی ہستی اور حیات دنیوی کے مآل و انجام وغیرہ کے متعلق جو نظریات قائم کئے ہیں، اور ان کی بنا پر جو رویے اختیار کئے ہیں، وہ سب حقیقت نفس الامری کے لحاظ

سے غلط اور نتیجے کے اعتبار سے خود انسان ہی کے لئے تباہ کن ہیں۔ حقیقت وہ ہے جو انسان کو خلیفہ بنائے وقت خدا نے بتا دی تھی۔ اور اس حقیقت کے لحاظ سے انسان کے لئے وہی رویہ درست اور خوش انجام ہے جس کی تعلیم اللہ کے برگزیدہ رسول نے دی ہے اور جسے ”صراطِ مستقیم“ کہا جاتا ہے۔

ان بنیادی امور کو ذہن میں رکھ کر کوئی شخص قرآن کو دیکھے تو اسے صاف نظر آئے گا کہ یہ کتاب کہیں اپنے موضوع سے بال برابر بھی نہیں ہٹی ہے۔ اول سے آخر تک اس کے مختلف النوع مضامین اس کے مرکزی مضمون سے مربوط ہیں۔ خواہ وہ زمین و آسمان کی ساخت، انسان کی خلقت، آثارِ کائنات کے مشاہدات پیش کرے، خواہ گزری ہوئی قوموں کے واقعات، مختلف قوموں کے عقائد و اخلاق اور اعمال پر تنقید، مابعد الطبیعی امور و مسائل کی تشریح اور بہت سی دوسری چیزوں کا ذکر کرے، وہ ہمیشہ ان چیزوں کا ذکر بقدر ضرورت کہنے کے بعد غیر متعلق تفسیلات کو چھوڑ کر اپنے مقصد اور مرکزی مضمون کی طرف رجوع کرتا ہے۔

پھر قرآن اس نوعیت کی کتاب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیک وقت اُسے لکھ کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دیا ہو، نیز یہ اس نوعیت کی کتاب بھی نہیں ہے کہ اس میں تجزیہ و طریقے پر موضوع اور مرکزی مضمون کے متعلق بحث کی گئی ہو بلکہ اس کی نوعیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک نبی کو پیغمبری کی خدمت کے لئے منتخب کیا۔ اس کام کے آغاز میں جن ہدایات کی ضرورت تھی صرف وہی دی گئیں اور وہ زیادہ تر تین مضامین پر مشتمل تھیں۔ ایک، پیغمبر کو خود اس عظیم شان کا کام کی تیاری کے لئے تعلیم۔ دوسرے، حقیقت نفس الامری کے متعلق ابتدائی معلومات اور حقیقت کے بارے میں غلط فہمیوں کی مہل تردید۔ تیسرے، ”صحیح رویہ“ کی طرف دعوت اور ہدایت الہی کے بنیادی اصول اخلاق کا بیان۔

شروع شروع کے یہ پیغامات بہت چھوٹے چھوٹے لوگوں پر مشتمل تھے جن کی زبان نہایت سست، پُر اثر، اور مخاطب قوم کے مذاق کے مطابق بہترین ادبی رنگ لینے ہوئے تھی، تاکہ دلوں میں یہ بول نشتر کی طرح پیوست ہو جائیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پُر جوش خطبوں کی شکل میں پیغامات بھیجنے شروع کئے، جن میں دریا کی سی روانی، سیلاب کی سی قوت اور تیز و تند آگ کی سی تاثیر تھی۔ ان خطبوں میں ایک طرف اہل ایمان کو ان کے فرائض بتائے گئے، ان کے اندر جماعتی شعور پیدا کیا گیا، انہیں تقویٰ، فضیلت اخلاق اور پاکیزگی سیرت کی تعلیم دی گئی۔ ان کو دین کی تبلیغ کے طریقے بتائے گئے، کامیابی کے وعدے کئے گئے اور جنت کی بشارت دی گئی۔ صبر و ثبات اور بلند حوصلگی کی تعلیم دیتے ہوئے راہِ خدا میں جدوجہد کرنے

پہرا بھاریا گیا۔ دوسری طرف مخالفین اور راہ راست سے منہ موڑنے والے اور غفلت کی نذر ہونے والے لوگوں کو ان پچھلی قوموں کے انجام سے ڈرایا گیا جن کی تاریخ سے وہ خود واقف تھے۔ پھر ہجرت کے بعد سے تو حالات کا نقشہ بدل گیا تھا۔

امت مسلمہ ایک باقاعدہ ریاست کی بنا ڈالنے میں کامیاب ہو گئی، پچھلے انبیاء کی امتوں سے سابقہ پڑنے پر اپنی جاہلیت کے علم برداروں سے جنگ کی نوبت آئی۔ خود امت مسلمہ کے اندرونی نظام میں مختلف قسم کے تناقی گھس آئے اور کئی سال کی شدید کشمکش سے گذر کر آخر کار یہ امت کامیابی کی اس منزل پر پہنچی کہ سارا عرب اس کے زیر نگیں ہو گیا اور عالمگیر دعوت و اصلاح کے دروازے اس کے سامنے کھل گئے۔ اس مرحلے اور ان ادوار کی بھی مخصوص ضرورتوں کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے پیغامات آئے جن کا انداز کبھی آتشیں خطابت کا، کبھی شامانہ فرامین و احکام کا، کبھی علما نہ درس و تعلیم کا اور کبھی مصلحانہ افہام و تفہیم کا ہوتا تھا۔ اس میں نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ریاست و مدنیت صالحہ کی تعمیر، زندگی کے مختلف شعبوں کے اصول و ضوابط، کفار، منافقین، اہل کتاب سے سلوک، مسلمانوں کو زندگی کے مختلف معاملات و احوال میں صحیح طرز عمل کی تقبیلی ہدایت دی گئی۔ غرض ایک طرف عالمگیر دعوت و اصلاح کی اور دوسری طرف جماعت مسلمین کے سردار کی اور تیسری طرف انہیں حکومت کی مختلف حیثیتوں کا تعین کیا گیا۔

غرض، اسی طرح دعوت و اصلاح کے ادوار کی ضروریات کے مطابق قرآن کے مختلف حصے نازل ہوتے رہے اور تیس سال کی مدت میں تکمیل ہوئی۔ (مقدمہ تفہیم القرآن)

تدوین، جمع و ترتیب اور حفاظت | یہ بات صرف قرآن سے ہی مخصوص ہے کہ یہ کتاب جس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

پر نازل ہوئی، من و عن بغیر کسی تبدل و تغیر اور تحریف و تقسیم یا ترسیم و تنسیخ کے بالکل اصلی و محفوظ حالت میں ہمارے پاس موجود ہے۔ اس پر سب کا اتفاق ہے، حالاں کہ اس سے پہلے کی آسمانی کتابیں اب تو اپنی شکل و صورت اور اصلیت بالکل کھو چکی ہیں۔ پھر چونکہ قرآن سے پیشتر کی آسمانی کتابوں کے برعکس اس کتاب (قرآن) کی حفاظت کی ضمانت خود اس کے نازل کرنے والے نے لے لی ہے، تو پھر اس میں ادنیٰ تغیر تبدل اور سر موٹو غاوت کی بھی کیا گنجائش رہ جاتی ہے۔

”لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ
وَمِنْ خَلْفِهِ“

قرآن میں نہ سامنے سے باطل کے گھسنے کی
گنجائش ہے نہ پیچھے سے۔

(حم السجد ۵-۳۲)

بلاشبہ ہم پر قرآن کے جمع رکھنے کی ذمہ داری ہے۔
 بے شک ہم نے اس الذکر (قرآن) کو اتارا ہے
 اور ہم ہی اس کی قطعاً حفاظت کرنے والے ہیں۔
 بلکہ وہ تو بلند و بالا، برتر قرآن لوح
 لوح محفوظ میں ہے۔

”إِنَّا عَلَيْنَا جَمْعَهُ“ (القیامہ - ۱۷)
 ”إِنَّا جَمَعْنَاهُ الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ
 لَحَافِظُونَ“ (الحجر - ۹)
 ”بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ ۚ فِي لَوْحٍ
 مَّحْفُوظٍ“ (البروج - ۲۱-۲۲)

اور قرآن کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ اس کی حفاظت، جمع و ترتیب اور کتابت کا سلسلہ اس کے
 نزول کے ساتھ ہی جاری ہوا اور آخری مرحلے تک جاری رہا، جب کہ اس کے پہلے کی آسمانی کتابیں
 ابتداً زبانی یادداشتوں اور گیتوں اور قصوں کی شکل میں رہیں اور صدیوں بعد قلمبند ہوئیں۔
 لیکن قرآن اول تا آخر ابتدائی دور ہی میں لکھ دیا گیا تھا۔

اس سلسلے میں سورۃ فاتحہ کے بعد قرآن کی پہلی سورۃ (البقرہ) کی پہلی آیت میں اولین شہادت ہے:-
 ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ ۚ فِيهِ
 (البقرہ - ۲)

پیش کرنے والا اس کو ابتدا ہی سے نوشتہ اور مکتوبہ (کتاب) شکل میں پیش کرنا چاہتا ہے اور کتاب
 یا نوشتہ کا یہ لفظ کچھ اسی ایک مقام پر استعمال نہیں ہوا بلکہ قرآن کی ہر بڑی سورۃ کتابت نوشتہ
 ہونے کا مسائل ذکر کرتا چلا جائے گا۔ پھر:

لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ
 (الواقفہ - ۷۹)

اس (قرآن) کو صرف پاک لوگ ہی چھو سکتے
 ہیں۔

کافقرہ بھی اس بات پر کافی دلیل ہے کہ خود قرآن نے اپنے آپ کو ایک ایسی نوشتہ اور مکتوبہ
 شکل میں پیش کیا ہے جس کے چھو جانے کا بھی امکان تھا۔
 پھر اس کی کتابت و حفاظت کا اہتمام دیکھئے کہ دو شنبہ ربیع الاول ۳۰ سنہ نبوی کو دوسری
 وحی اور تبلیغ کا حکم ہوا۔ پنج شنبہ کو خالد بن سعید مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ان سے حضور اکرم صلی اللہ
 علیہ وسلم نے کتابت شروع کرائی۔ ان کی دختر ام خالد بنت سعد نے بیان کیا ہے کہ سب سے پہلے
 بسم اللہ میرے باپ نے لکھی۔ اس طرح نزول وحی سے چوتھے دن کتابت شروع ہوئی جو نزول قرآن
 کے اختتام تک برابر جاری رہی۔ اور ایک دو نہیں بہت سے اصحاب سے کتابت وحی کا کام لیا
 جاتا تھا بلکہ مورخین نے ان کی تعداد ۴۲ تک بتائی ہے (وگنا بہ اثنتان واربعون) اور کتابتوں
 کی اتنی بڑی تعداد مقرر کرنے کی وجہ یہی تھی کہ وقت پر ایک نہ ملے تو دوسرا اس کو انجام دیدے۔
 حتیٰ کہ ایک صحابی حضرت بن ربیع تمام کتابتوں کے خلیفہ اور سردار تھے اور ان کو حکم یہ تھا کہ کوئی ایسے

یا نہ رہے وہ ضرور حاضر رہیں تاکہ کتابت وحی میں رکاوٹ نہ ہو۔ اس انتظام کا نتیجہ نفاذِ نزول کے ساتھ ہی ہر قرآنی آیت قلم بند ہو جاتی تھی۔ حضرت ام سلمہؓ کہتی ہیں کہ جبریل علیہ السلام قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھواتے تھے۔

مزید احتیاط یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف لکھوانے پر ہی قناعت نہ فرماتے تھے بلکہ کاتب جب لکھ لیتے تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) پڑھوا کر سنتے۔ اگر کوئی حرف یا لفظ لکھنے سے چھوٹ جاتا تو اس کو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) درست کراتے۔ جب یہ سب کام پورا ہو جاتا تب اشاعت عام کا حکم دے دیا جاتا تھا۔ پھر جو لکھا جانتے تھے لکھ لیا کرتے تھے۔ حضرت زید بن ثابتؓ کے الفاظ میں ”جب کوئی آیت نازل ہوتی تھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بلاتے تھے، میں تختی اور دو ات قلم لے کر حاضر ہوتا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) لکھاتے، لکھا کر پھر سنتے اگر کوئی غلطی ہوتی تو صحیح کرا دیتے۔“ پھر یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ قرآن کی کتابت کے لئے بغایت احتیاط بہترین چیزوں کا انتخاب کیا گیا تھا۔ جن میں رقائق، لحاف، کتف، عیبہ، ادیم، اقباب، وغیرہ عام طور پر مستعمل تھیں تاکہ ایک طویل مدت تک آفات و حوادث سے حفاظت رہے۔

غرض، اس حزم و احتیاط، اور انتظام و انصرام کے ساتھ قرآن کریم اپنی مدتِ نزول میں بصورتِ تحریر جمع ہوتا رہا۔ اور آیات و سُوَر کی جمع و ترتیب کی تکمیل بحکمِ خداوندی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی اور پورا قرآن موجودہ ترتیب آیات و سُوَر کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زیرِ ہدایت و نگرانی قیدِ تحریر میں آ گیا۔ چنانچہ تمام اہل اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ آج تک اسی نبوی جمع و ترتیب کے مطابق ایک نقطہ اور شوشہ کی بھی کمی بیشی کے بغیر قرآن محفوظ و موجود ہے، جیسا کہ مولانا بکر العلوم ”شرح مسلم الثبوت میں لکھتے ہیں:

”قرآن کی یہ ترتیب جس پر وہ آج ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور اس کی صحت پر تمام امت کا اتفاق ہے۔“

لے چڑھا (چرمی قطعات) لے پھر کی سفید پتلے تختیاں۔ سہ اونٹ کے مونڈھے کی گول ہڈی (طشتری کی طرح) لے کھجور کی شاخوں کی جڑ کا وہ کشادہ اور عریض حصہ جس میں کانٹے والے پتے نہیں ہوتے۔ سہ باریک کھال سے دباغت کے عمل سے تیار ہوتا تھا (اور عرب میں گوشتِ خور ملک ہونے کی وجہ سے ان کا کافی ذخیرہ تھا۔ چنانچہ خیمہ بھی صرف ادیم کے چمڑوں سے تیار کیا جاتا تھا، لے قتب کی جمع۔ اونٹ کے کجاوہ کے چوڑے اور پتلے تختوں کے ٹکڑے۔

اور مشہور شیعی فاضل علامہ سید محمد امجدی کتاب ”تنزیہ الفرقان“ میں مشہور شیعہ مجتہد علم القرآن علامہ سید مرتضیٰ سے ناقل ہیں کہ :

”قرآن جس ترتیب پر آج ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں بھی وہ اسی طرح مرتب تھا، اور اسی طرح سے اس وقت پڑھا جاتا تھا، اور اسی طرح سے یاد کیا گیا، اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح سے سنایا جاتا اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے پڑھا جاتا اور صحابہ کی بڑی جماعت نے اکثر بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پورا قرآن اسی طرح سنایا، جس سے صاف روشن ہے کہ قرآن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مرتب تھا نہ کہ متفرق وغیرہ مرتب“

پھر نہ صرف یہ کہ اس کا صرف ایک ہی نسخہ تھا جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے لکھا گیا تھا، جس کو سرکاری جلد کہا جاسکتا ہے، بلکہ بہت سے صحابہ کے پاس بھی پورا قرآن مکتوبہ شکل میں تھا اور بہت سے ایسے صحابہ بھی تھے جن کے پاس اگرچہ مکمل قرآن لکھا ہوا نہ تھا لیکن اس کا بہت بڑا حصہ تحریری شکل میں تھا، اور یہ سب ایسی تاریخی حقیقتیں ہیں کہ وقت کے بڑے بڑے مستشرقین تک ان کا اعتراف کرتے اور ان کی شہادت دیتے ہیں، چنانچہ سر ولیم مہیور نے لکھا ہے کہ :

”اس بات کے ماننے کی زبردست وجہ ہیں کہ رسول کی زندگی میں متفرق طور پر قرآن کے لکھے ہوئے نسخے صحابہ کے پاس موجود تھے، اور ان نسخوں میں یہ پورا قرآن یا تقریباً تمام قرآن لکھا ہوا تھا“

اور ڈاکٹر اڈ ویل رقم طراز ہیں کہ :

”قرآن کے لکھے ہوئے نسخے عہد رسول میں عام طور پر زیر استعمال تھے“

پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اس قرآن کے لکھے جانے اور اس کی نشر و اشاعت میں جتنی عظیم شان و وسعت ہوئی ہے اسے علامہ ابن حزم اپنی مشہور کتاب ”انفصل بین المثل والتمثل“ میں اس طرح بیان کرتے ہیں :

”جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو اس وقت کا کل جزیرہ عرب

مسلمان ہو گیا تھا، جو مغرب میں بحر قلزم سے لے کر سواحل یمن سے اور مشرق میں بحر

فارس سے دریائے فرات پر گزرتا ہوا شام کے کنارے بحر قلزم پر ختم ہوتا ہے

اس جزیرہ عرب میں بے شمار شہر اور مواضع ہیں، جیسے یمن، بحرین، عمان، نجد، قبیلہ طے کے دو پہاڑ (اجا۔ سلمیٰ) قبائلی مضر و ربیعہ و قضاعہ کے قصبیات، طائف، مدینہ وغیرہ، غرض

یہ تمام جزیرہ مسلمان ہو گیا تھا، اور اس میں کوئی شہر اور کوئی گاؤں اور کوئی آبادی ایسی نہ تھی جہاں مسجد نہ ہو، اور ان تمام مسجدوں میں پانچوں وقت نمازیں قرآن پڑھا جاتا تھا، اور مسلمان اپنے بچوں اور عورتوں اور مردوں کو قرآن کی تعلیم دیتے تھے۔

پھر حضرت ابو بکرؓ خلیفہ ہوئے اور ڈھائی سال خلیفہ رہے، فارس اور روم سے جہاد کیا، یمامہ کو از سر نو فتح کیا اور اب قرآن کو جاننے والے اور زیادہ ہو گئے۔ بے شمار صحابہ نے جس طرح قرآن کو لکھا تھا، اسی طرح بعد میں دیگر بلاد اسلامیہ میں بہت سے لوگ تھے جنہوں نے قرآن لکھا، اور کوئی شہر مسلمانوں کا ایسا نہ تھا جس میں قرآن کے نسخے لکھے ہوئے نہ ہوں پھر خلیفہ اول کا انتقال ہوا اور حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے اور تمام فارس، تمام شام، جزیرہ اور تمام مصر کو فتح کیا۔ ان تمام بلاد اسلامیہ میں مسجدیں بنائی گئیں اور کوئی شہر ایسا نہ تھا جس میں قرآن کے نسخے لکھے نہ گئے ہوں۔ ہر ہرقریہ میں امیر نے قرآن سکھایا، مشرق و مغرب کے بے شمار مکتبوں میں بچوں کو قرآن کی تعلیم دی جاتی۔ اس طرح قرآن کے بے شمار نسخے لکھے گئے، بدستور قرآن پڑھایا جاتا رہا، اور دس سال کچھ جینیسی بھی حالت رہی، اور عہد عمر میں مصر و عراق اور شام و یمن کی وسیع و عریض سرزمین میں ایک لاکھ سے کم نسخے قرآن کے مسلمانوں کے پاس نہ ہونگے۔ پھر حضرت عمرؓ کا انتقال ہوا اور حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے اور فتوحات اسلام بہت زیادہ ہوئیں اور اسی کے ساتھ قرآنی نسخوں اور مساجد وغیرہ تمام باتوں میں اضافہ ہوا۔ اس زمانے میں قرآن کے اس قدر نسخے لکھے گئے اور مسلمانوں کے پاس موجود تھے کہ کوئی اس پر قادر نہیں کہ اس کا شمار بتا سکے اور اس کی تعداد کا اندازہ لگا سکے۔“

۱۔ ماخذ دوم السنۃ | تعریف - معنی: "سنت" کے لغوی معنی طریقہ اور راستہ کے ہیں۔ خواہ وہ اچھا ہو یا برا۔ سچا یا کھٹا۔

میں ہے کہ جن نے کوئی اچھی سنت قائم کی اسے خود اپنے عمل کا بھی اجر ملے گا اور قیامت تک اس سنت کی پیروی کرنے والے کے عمل کا بھی ثبوت، لیکن عرف میں اس لفظ (سنت) سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ثابت شدہ اور معلوم طریقہ ہے جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم عام طور پر پابند رہے۔ اور پھر محدثین کی اصطلاح میں اگر اس لفظ (سنت) کے مفہوم کا دائرہ پھیل گیا، اور اس سے رسول کا قول، فعل، تقریر اور آپ کی صفات اور سیرت کے بارے میں جو کچھ بھی بیان کیا گیا ہے مراد لیا گیا۔ اس اصطلاح کی رو سے "سنت" لفظ "حدیث" کا مترادف ہے۔

لہٰذا وہ کام جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کیا گیا اور آپ نے اس سے منع نہیں فرمایا، اصطلاح میں تقریر کہلاتا ہے۔

قرآن کے بعد سنت اسلامی شریعت کا دوسرا ماخذ ہے۔ اور قرآن کے بعد اس کا درجہ آتا ہے۔ کیونکہ سنت اپنی اصل حیثیت سے قرآن کے اجمال کی تفصیل اور اس کے اشکال کی توضیح و تفسیر ہے۔ لیکن قرآن سے مرتبہ میں موخر ہونے کے اعتبار سے سنت بجائے خود ایک مستقل مصدر قانون ہے۔ کیوں کہ سنت میں ایسے احکام بھی وارد ہوئے ہیں جن پر قرآن خاموش ہے مگر اس لحاظ سے مستقل قانون سازی کا منبع ہونے کے باوجود سنت قرآن کے تابع ٹھہرتی ہے۔ کیوں کہ وہ قرآن کا بیان و تفسیر ہونے کے علاوہ ان مقامات پر بھی قرآن کے مبادی اور اس کے قواعد عامہ سے متجاوز نہیں ہوتی جہاں قرآن خاموش ہے۔

۲۔ حُجَّتِ حدیث و سنت

حدیث اور سنت دونوں مترادف ہیں، جیسا کہ محدثین کی اصطلاح ہے، یا سنت کو رسول کے طریق عمل کے لئے خاص سمجھا جائے اور حدیث کو قول رسول کے لئے۔ بہر حال حدیث و سنت کی حیثیت دین میں سند اور حجت ہونے کی ہے، اور ہر ثابت شدہ سنت اور ہر وہ ارشاد یا عمل جس کی رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف نسبت ہو اور وہ قرآنی معیار اور اصول روایت و درایت کی رو سے بظن غالب بھی صحیح ٹھہرے، تو وہ جمہور امت مسلمہ کے عقیدے میں واجب التسلیم ہے اور یہ بات ایسی نہیں جس کے لئے کسی قسم کی باریک بینی اور علم و بصیرت کی ضرورت ہو۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ خدا کو خدا مان لینے کے بعد اس کی فرماں برداری ضروری ہو جاتی ہے، کیونکہ عقل عام تک اس بات کو جائز اور ممکن نہیں سمجھتی کہ ایمان تو ہو مگر وہ اپنے اندر کسی طرح کی اطاعت کا مطالبہ نہ رکھتا ہو۔ اسی طرح رسول کو رسول مان لینے کے بعد رسول کے ہر قول اور ہر عمل کو رضائے الہی کی یقینی اور واحد کلید باور کرنا ضروری ہے۔ اور رسول پر ایمان بھی اپنے اندر رسول کی اطاعت و اتباع کا مطالبہ رکھتا ہے، خواہ رسول کا جہانی وجود بھی ہو یا اس کا صرف ارشاد یا طریق عمل سامنے ہو۔

تاہم حدیث و سنت کی حُجَّت اور ان کے دینی سند ہونے سے متعلق بنیادی نکات کے طور پر چند دلائل درج ذیل ہیں۔ ان دلائل کو ہم آسانی سے دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:-

(الف) قرآن کی اندرونی شہادت

(ب) خارجی شہادت

اور پھر خارجی شہادت کے دو شعبے ہوتے ہیں:

(۱) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور صحابہ کرام کے بعد علمائے امت کی حدیث و سنت

کے حجت ہونے کی شہادت

(۲) عقلی حیثیت سے اس کی حجیت

۳۔ اندرونی شہادت | جہاں تک قرآنی تصریحات کا تعلق ہے، تو اس سلسلے میں ہمارے سامنے قرآن کی بے شمار آیات میں سے چند یہ ہیں۔

”لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ
إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ
يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَ
يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ“
(آل عمران - ۱۶۳)

یقیناً اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر احسان کیا،
جب کہ اس نے ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا
جو ان پر اللہ کی آیات تلاوت کرتا ہے اور ان
کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی
تعلیم دیتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ فریضہ رسالت محض اللہ کی آیات کا دوسروں تک پہنچا دینا ہی نہیں ہے بلکہ جو لوگ ایمان لے آئیں ان کے معاملے میں رسول کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ ان کو ان آیات الہی کی تعلیم بھی دیں۔ اور تعلیم الفاظ کے سادہ سادہ نام نہیں ہے بلکہ مشکل مطالب کا حل کرنا اور محیل و مبہم باتوں کی تفصیل و تشریح کو تعلیم کہتے ہیں۔ اور تعلیم کبھی صرف زبان سے ہوتی ہے، کبھی صرف عمل سے ہوتی ہے اور کبھی زبان و عمل دونوں سے ہوتی ہے۔ اور یہی وہ ”تعلیم کتاب و حکمت“ ہے جو احادیث و سنن کے نام سے مشہور ہے۔ لہذا اللہ کی جانب سے مامور کئے ہوئے اس معلم الکتاب (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات کو درمیان سے ہٹا کر محض اپنی عقل و فکر کے بل بوتے پر الکتاب (قرآن) کا کوئی مفہوم متعین کیا جائے گا تو اس کے بارے میں یہ ضمانت نہیں دی جاسکتی کہ وہ یقیناً خدا کی مراد و منشاء کے مطابق ہے۔ لیکن رسول کی زبان و عمل سے بیان کئے ہوئے قرآنی مفہوم کے متعلق ایک لمحہ کے لئے بھی یہ شک نہیں کیا جاسکتا کہ وہ خدا کی مراد و منشاء کے ٹھیک ٹھیک مطابق نہ ہو کیوں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ کام وحی کی نگرانی میں کرتے تھے:

”إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ
لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ“
(النساء - ۱۰۵)

(اے محمد) ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف
بھیجی ہے تاکہ لوگوں کے درمیان تم اس طرح فیصلے
کرو جس طرح اللہ تم کو دکھائے۔

اس آیت میں ”بما أَرَاكَ اللَّهُ“ کا جملہ خاص طور پر قابل غور ہے۔ بما رأيت (جیسا کہ تم دیکھو) نہیں کہا گیا ہے، بلکہ بما أراك اللہ (جیسا کہ اللہ تم کو دکھائے) کہا گیا ہے، اِذَاءَةً (دکھانا) اور تنزیل (نازل کرنا) استعمال و مفہوم اور معنی کے لحاظ سے دو مختلف چیزیں ہیں۔ تنزیل کا تعلق اس وحی سے ہے جو الفاظ میں نازل ہو، اور اِذَاءَةً میں وہ الہام و القا داخل ہے

ہے جو بذریعہ الفاظ نہ ہو - لفظ وحی اخذ اور حقیقت کے لحاظ سے تنزیل اور اراءہ دولوں کو شامل ہے۔ یہی وہ ”بمآ اراک اللہ“ ہے جس کو محدثین اور ائمہ مجتہدین اپنی اصطلاح میں ”وحی خفی“ یا ”وحی غیر مُشَلَّو“ سے تعبیر کرتے ہیں یعنی اللہ کی وہ ”اراءہ“ (دکھانا) جس کا اظہار و بیان نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے الفاظ و اعمال (حدیث و سنت) کے ذریعے متوسط سے کیا، اللہ کی اراءہ تو ہے، مگر الفاظ نہیں جس کی تلاوت کی جائے۔ لہذا کسی بات سے متعلق رسول کی تعلیم کسی امر سے متعلق رسول کی تفصیل و تشریح اور کسی معاملے سے متعلق رسول کا فیصلہ محض ایک بشر کا فیصلہ نہیں ہے، بلکہ اللہ کی اراءہ کا نتیجہ اور فراست نبویہ کا وہ فیصلہ ہے جس میں کوئی دوسرا شخص رسول کا شریک مہیم نہیں اور نہ ہو سکتا ہے۔

پس یہ آیت اس بات پر صراحتاً دلالت کر رہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک تو تنزیل (انا انزلنا...) ہوئی، اور اس کا مصداق قرآن ہے، اور دوسری چیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اراءہ الہی (بمآ اراک اللہ) عطا ہوئی، جو اپنے معنی و مفہوم کے لحاظ سے تنزیل سے جداگانہ حیثیت رکھتی ہے، لہذا اس اراءہ الہی (وحی خفی یا وحی غیر مُشَلَّو) کا بھی کوئی مصداق ہونا چاہیئے اور وہ یہی حدیث و سنت ہے۔

اور پھر اس ”اراءہ الہی“ کی شہادت خود قرآن میں بکثرت ہے، بہ طور مثال سرف دو آیتیں درج ذیل ہیں:

سورة القيامة میں ارشاد ہوا ہے:

”إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ فَإِذَا قَرَأَهُ فَأَتَّبِعُ قُرْآنَهُ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ“ (القيامة ۱۷-۱۸-۱۹)

اس قرآن کا جمع کرنا اور پڑھوانا ہمارے ذمہ ہے جب ہم چڑھ چکیں تو اس کے بعد آپ پڑھیں۔ پھر اس (کے معانی) کا بیان بھی ہمارے ذمہ ہے۔

اس آیت میں تین باتیں فرمائی گئی ہیں، اور ان تینوں کو اللہ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔

(۱) جمع قرآن (۲) قرآن کا پڑھوانا (۳) قرآن کا بیان

جمع و ترتیب قرآن سے متعلق کوئی ایسی آیت نہیں جس سے یہ واضح ہو کہ اللہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ تنزیل یہ ہدایت دی ہو کہ فلاں آیت کو فلاں فلاں مقام پر رکھو۔ یہ کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بغیر تنزیل کے کیا، لیکن کون یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ رسول کا یہ کام محض نجی حیثیت سے تھا اور اس کو رسالت سے کوئی تعلق نہ تھا، اور یہ کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قرآن کی آیات اور اس کی سورتوں کو جس ترتیب سے جمع کیا، اس کی نگرانی و رہنمائی خدا نے نہیں کی تھی۔

اس کے برخلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کام کو اللہ نے اپنی طرف (علینا) منسوب فرمایا۔ اسی طرح قرآن کا بیان اللہ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے (ثم ان علینا بیان)، اور بیان کہتے ہیں توضیح و تشریح کو۔ مجمل کی تفصیل کو، اس کے منشا کی تعیین کو اور اشارات کی وضاحت کو۔ اب سوال یہ ہے کہ قرآن میں جو اصولی اور مجمل احکام ہیں، اس آیت کی رو سے ان کا بیان اور ان کی تفصیل و تشریح من جانب اللہ ہونی چاہیے یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ جواب اثبات میں ہوگا۔ کیوں کہ ان کے بیان و تفصیل اور تشریح کو اللہ نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے لیکن قرآن ان کی تفصیل و تشریح سے خاموش ہے، اور حدیث و سنت ان کی تفصیل و تشریح پیش کرتی ہیں۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حدیث و سنت تنزیل نہ ہونے کے باوجود اراءۃ الہی اور وحی میں داخل ہے۔ جب ہی قرآن کے مجمل اور اصولی احکام کی تشریح و بیان کی نسبت اللہ کی طرف (ثم ان علینا بیان) صبیح ہوگی باوجودیکہ وہ تشریح و بیان حدیث و سنت میں ہے۔

حدیث و سنت کا بیان انقرآن ہونا دوسری آیتوں سے بھی معلوم ہوتا ہے، مثلاً:

”وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ
مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ“
(النحل - ۴۴)

”وَمَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ اِلَّا
لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوا فِيهِ“
(النحل - ۱۶)

ہی تفسیر جب اپنے مکانات سے نکال بیٹھے اور ان کے کھجوروں کے درختوں میں سے کچھ کاٹ دے گئے اور کچھ چھوڑ دیئے گئے تو اس واقعے سے متعلق قرآن یہ اعلان کرتا ہے کہ:

”مَا قَطَعْتُمْ مِنْ لَبَنٍ اَوْ تَرَكَتُمْوهَا
قَائِمَةً عَلَى اَصُولِهَا فَبَاذِنِ اللّٰهُ“
(الحشر - ۵)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اُس موقع پر درختوں کو کاٹ ڈالنے کا حکم دینا از روئے وحی تھا، مگر قرآن میں کوئی ایسی آیت نہیں جو اس حکم خداوندی پر دلالت کر رہی ہو۔ معلوم ہوا کہ وہ حکم خداوندی بذریعہ تنزیل نہ تھا، بلکہ بذریعہ اراءۃ الہی یا دوسرے لفظوں میں بذریعہ وحی خفی تھا۔

اب اخیر میں سورۃ آل عمران کی وہ آیت بھی پیش نظر رکھنے کی ہے جس میں صحابہ کرام

رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو اہل کتاب کے تھکنڈوں سے ہوشیار کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ :

”وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَأَنْتُمْ تُتْلَىٰ
عَلَيْكُمْ آيَاتُ اللَّهِ وَفِيكُمْ رَسُولُهُ“

اور تم کس طرح کفر سکتے ہو جب کہ تم کو اللہ کی آیتیں سنائی جاتی ہیں اور تمہارے درمیان اس کا رسول موجود ہے۔

(آل عمران: ۱۰۱)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کفر سے بچانے والی دو مستقل چیزیں ہیں۔ ایک تو اللہ کی آیات اور دوسری خود رسول کا مستقل وجود، جو اپنی تعلیم و تلقین اور فیض صحبت اور اثر سے لوگوں کو بھٹکنے نہیں دیتا۔ لہذا آج جب کہ اللہ کی آیات، یعنی قرآن تو ہے مگر رسول کا جہانی وجود ہمارے درمیان نہیں تو ہدایت کا وہ دوسرا سرچشمہ حدیث و سنت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے ؟

پس جب حدیث و سنت کا یہ مقام و مرتبہ متعین ہو گیا کہ وہ تعلیم الکتاب ہے، بیان و تشریح کتاب ہے اور اراءۃ الہی کی مصداق ہے، تو اب اس میں کیا شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ حدیث و سنت کی حیثیت محض تاریخی نظائر کی نہیں ہے، بلکہ وہ دینی مقام رکھتی ہے، دینی سند ہے اور دین میں حجت ہے۔

رہا حدیث و سنت کا واجب التسلیم ہونا، تو اگرچہ ان کے دینی سند و حجت کے ثبوت کے بعد اس کی ضرورت نہیں رہتی کہ ان کے واجب التسلیم ہونے کے بھی دلائل ذکر کئے جائیں، پھر بھی چند قرآنی تصریحات درج ذیل ہیں :-

”وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ“ (النساء-۶۴)

ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لئے بھیجا ہے کہ باذن الہی اس کی اطاعت کی جائے۔

اس سے اصولی طور پر معلوم ہوا کہ رسالت اور مطاع (جس کی اطاعت کی جائے) ہونا لازم و ملزوم ہے کسی رسول کی رسالت کی تصدیق کرنا ہی اسے واجب لاطاعت یقین کرنا ہے۔

دوسری بات یہاں یہ پیش نظر رکھنے کی ہے کہ اطاعت کے لئے اصل وسیلے کی حیثیت سے مرکزی اہمیت نبی کی ذات، اس کے اسوہ اور مثال کو دی جا رہی ہے۔ یعنی یوں نہیں کہا گیا ہے کہ ”وما انزلنا من کتاب الا لیعمل بہ“ (ہم نے کسی کتاب کو نہیں نازل کیا مگر اس لئے کہ اس پر عمل کیا جائے)۔ بلکہ فرمایا گیا ہے کہ ”وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ“ ہم نے نہیں بھیجا کوئی رسول مگر اس لئے کہ خدا کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح اللہ کی طرف سے نازل کی ہوئی کتب واجب الاتباع ہوتی ہیں، اسی طرح انبیاء و رسل کی ہستیاں بھی بالاستقلال واجب اللاطاعت اور واجب الاتباع ہوتی ہیں، اور ایسا کیوں نہ ہو جب کہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اللہ نے کتاب کے بغیر

تو انبیاء کو مبعوث فرمایا ہے مگر نبی کے بغیر کوئی کتاب نازل نہیں کی گئی ہے۔ اور ہر نبی، عام ازیں کہ اس پر کتاب نازل کی گئی ہو یا بغیر کتاب کے اس کی بعثت ہوئی ہو چوں کہ وہ واجب الطاعت ہوتا ہے، اس لئے فرمایا کہ ”وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ۔“

اس کے علاوہ قرآن میں متعدد مقامات پر ”اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول“ اور ”اطیعوا اللہ ورسولہ“ جیسے جملوں کے ذریعہ اطاعت الہی کے ساتھ ساتھ اطاعت رسول کا بھی حکم ہے، لہذا جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر الرسول اور رسولہ کا اطلاق ہوگا، جتنے لوگ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رسالت کی تصدیق کریں گے، ان پر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت واجب ہوگی اور اطاعت رسول کے الفاظ بولیں، یا حدیث و سنت پر عمل کہیں،

بات ایک ہی ہے محض لفظی تعبیر کا فرق ہے۔

اور کسی مومن مرد اور مومنہ عورت کیلئے یہ گنجائش نہیں کہ جب اللہ اور اس کے رسول کسی امر کا فیصلہ کر دیں تو ان لوگوں کو اپنے معاملے میں (اس فیصلے کے قبول و عدم قبول کا) کوئی اختیار باقی رہے۔

”وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا لِمُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَىٰ اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ“
(الاحزاب - ۳۶)

یہ آیت اس امر کے لئے نص ہے کہ جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر رسولہ (اللہ کا رسول) کا اطلاق ہوگا اور قیامت تک ہوگا) اس وقت تک آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہر اس بات کو بے چون و چرا تسلیم کرنا لازم ہے جس پر ”ما قضیٰ رسولہ“ (جو اللہ کا رسول فیصلہ کر دے) صادق آتا ہے، اور کسی مومن اور مومنہ کو حق استرداد حاصل نہیں، اور حدیث و سنت یہی ما قضیٰ رسولہ ہی تو ہے۔

نہ صرف رسول کی اطاعت کا حکم ہے، بلکہ رسول کے اتباع کا بھی حکم ہے۔

اطاعت: حکم کی تعمیل کرنے اور سر تسلیم خم کر دینے کو کہتے ہیں اور اتباع کے معنی ہیں کسی کے پیچھے پیچھے چلنا، نہ صرف کسی کے عمل کی طرح عمل کرنا بلکہ اس لئے اس کے عمل کی طرح عمل کرنا کہ اس نے وہ عمل کیا ہے۔

(مسلمانو!) تمہاری پیروی کیلئے رسول اللہ کی ذات میں بہترین اُسوہ ہے۔

”لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ“ (الاحزاب - ۲۱)

اور یہ ناکید اس لئے کی گئی کہ قرآن پر پوری طرح عمل کر کے ہی خدا کی فرماں برداری کا حق ادا کیا جاسکتا ہے، اور خدا کی

فرماں برداری ہی کر کے کوئی شخص خدا کا محبوب بندہ بن سکتا ہے۔ اور خدا کا محبوب بندہ بننے کے لئے اتباع رسول کو شرط لازم ٹھہرایا گیا ہے۔

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ (آل عمران - ۳۱)

(لے بنی) کہہ دو کہ اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو۔ تب اللہ تم کو اپنی محبت سے نوازے گا۔

لہذا اس کا واضح نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ خدا کی اطاعت کی واحد شکل اتباع رسول یعنی

سُنَّتِ رَسُولِکَ پیروی ہے۔

فَاتَّبِعُوا إِيَّاهُ وَرَسُولَهُ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ (الاعراف - ۱۵۸)

پس ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول نبی امی پر جو خدا اور اس کے تمام کلام پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کا اتباع کرو۔

اس آیت میں اللہ پر ایمان کا مطالبہ ہے اور رسول کے اتباع کا حکم ہے، اس میں باریک نکتہ یہ ہے کہ ایمان باللہ کے بعد آپ سے آپ اطاعت الہی لازم ٹھہر جاتی ہے۔ اس اطاعت الہی کے باب میں بتایا کہ اس کی واحد شکل اتباع رسول ہے۔

صرف یہی نہیں، بلکہ قرآن نے جس طرح اللہ کی معصیت کو ضلالت کہا ہے اور اس کے مرتکب کو وعید سنائی ہے اسی طرح رسول کی معصیت کے ارتکاب کو بھی ضلالت قرار دیا ہے اور ارتکاب کرنے والوں کو وعید کا مستوجب ٹھہرایا ہے۔

”وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُبِينًا“ (الاحزاب - ۳۶)

اور جو کوئی بھی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے وہ کھل گمراہی میں مبتلا ہو گیا۔

”وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَإِنَّ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيهَا أَبَدًا“ (النجم - ۲۳)

اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو ایسے شخص کے لئے نارہیم ہے، جس میں یہ ہمیشہ رہیں گے۔

اس (قیامت کے) دن وہ سب لوگ جو رسول سے سرکشی کرتے ہوئے رسول کی نافرمانی کرتے ہیں تننا کریں گے کہ کاش زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائیں۔

”يَوْمَئِذٍ يَوْمَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَعَصُوا الرَّسُولَ لَوْ شِئْنَا لَنُفِثَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ“ (النساء - ۴۲)

ان آیات، خصوصاً آخر الذکر آیت سے صراحتاً معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح قرآن ہے

انحراف ضلالت اور باعث سزا ہے، اسی طرح حدیث و سنت سے بے نیازی اور اعراض بھی ضلالت ہے اور اس سے سرکشی کا نتیجہ دردناک عذاب اور آخرت میں رسوائی ہے۔

۴۔ خارجی شہادت | قرآن کی اندرونی شہادت کے بعد خارجی شہادت کے ”تاریخی شواہد“ والے شعبہ پر بھی اس لئے طائرانہ نظر ڈال لینی مناسب ہے کہ قرآن نے یہ اعلان کیا ہے کہ:

”وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَ نُصْلِهِ جَهَنَّمَ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ۝“

(النساء - ۱۱۵)

جو شخص رسول کی مخالفت پر کمر بستہ ہو حالانکہ اس پر راہ راست واضح ہو چکی اور مومنین کی روش کے سوا کسی اور روش پر چلے تو اس کو ہم اسی طرف چلائیں گے جہنم پر اور اسے جہنم میں جھونکیں گے۔

صحابہ کرامؓ اور ان کے بعد دینی روش پر چلنے والے علماء و صلحاء نے حدیث و سنت کو دینی حجت و سند باور کیا اور چوں کہ حدیث و سنت کا دین میں سند و حجت باور کرنا بھی ایک ”سبیل المومنین“ ہے، اور چوں کہ صحابہ اور ان کے بعد جمہور علماء حدیث و سنت کو سرمایہ دین سمجھتے تھے تو پھر حدیث و سنت کی حجت سے انکار کرنا ”سبیل المومنین“ سے روگردانی کرنے کے مترادف ہو گا۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے رویہ کو دیکھئے۔ صحابہ ہر معاملے میں یہ دیکھتے تھے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا رویہ کیا ہے اور ہر موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے اسوہ کی پیروی کرتے تھے اور انسانیت کے یک گھائے سرسبز جس کو صاحب امر بناتے تھے وہ پہلی بات یہ کہتا تھا کہ ”میری اطاعت کرو اگر میں خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کروں اور اگر میں خدا کے احکام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے سرمو بھی انحراف کروں تو نہ میری اطاعت ہے اور نہ تقلید“

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بعد ہر دور کی معتبر و معتمد تاریخ کا ناطق فیصلہ ہے کہ محدثین و فقہاء اور ائمہ مجتہدین نے حدیث و سنت کو دینی سند تسلیم کیا ہے اور وہ حدیث و سنت کو قرآن کے بعد اسلامی قانون کا ایک مستقل ماخذ قرار دیتے رہے ہیں، چنانچہ امام شافعی فرماتے ہیں کہ مجھے کسی ایسے شخص کا پتہ نہیں ملتا جس نے بجائے خود حدیث و سنت کا انکار کیا ہو۔

اب رہ جاتا ہے عقلی ثبوت، تو جیسا کہ ابتداء میں اشارہ کیا جا چکا ہے، عقل عام

تک کا تقاضا اور فیصلہ یہ ہے کہ حدیث و سنت کو محبت اور سند کا مرتبہ حاصل ہو۔ اور محض تاریخی یا علمی نظائر کی حد تک اس پر توجہ نہ دی جائے، کیونکہ سب سے پہلے غور طلب امر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن اور اس سے پہلے تمام آسمانی کتابوں کو رسولوں کے واسطے سے کیوں نازل کیا؟ کیا خدا اس پر قادر نہ تھا کہ مطبوعہ کتابیں یکایک زمین پر اتار دیتا اور ان کا ایک ایک نسخہ نوع بشری کے ہر فرد کے پاس آپ سے آپ پہنچ جاتا؟۔ یقیناً وہ اس پر قادر تھا۔ تو سوال یہ ہے کہ اس نے نشر و اشاعت کا یہ ذریعہ کیوں نہ اختیار کیا؟ کیوں کہ یہ تو بلا ہر ہدایت کا یقینی ذریعہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اس کا جواب خود کلام اللہ دیتا ہے کہ خدا نے جتنے رسول بھیجے ہیں ان کی بعثت کا مقصد یہ رہا ہے کہ وہ فرامین خداوندی کے مطابق حکم دیں اور لوگ ان کے احکام کی اطاعت کریں۔ وہ الہی قوانین کے مطابق زندگی بسر کریں اور لوگ انہی کے نمونے کو دیکھ کر اس کا اتباع کریں۔

”وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا رَٰحِيماً“ (النساء - ۶۴) (یعنی ہم نے ہر رسول بھیجا اسی لئے بھیجا۔ کہ اللہ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے۔ اگر محض کتاب اللہ اتار دی جاتی اور کوئی رسول نہ آتا تو لوگ آیات کے معانی میں اختلاف کرتے اور کوئی اس کا فیصلہ کرنے والا نہ ہوتا، لوگ احکام کے منشاء سمجھنے میں غلطیاں کرتے اور کوئی ان کو صحیح منشاء بتانے والا نہ ہوتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تنہا کتاب اللہ کافی نہیں ہے اس کے ساتھ رسالت کا رشتہ ناقابل انقطاع ہے۔ احکام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی بھی اسی طرح لازم ہے جس طرح خود کتاب اللہ کے احکام کی اطاعت فرض ہے۔ جو شخص کہتا ہے کہ ہم صرف کتاب اللہ کو لیں گے اور حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ لیں گے وہ دراصل رسالت سے ایسا تعلق منقطع کرتا ہے اور وہ اُس واسطے کو کاٹتا ہے جسے خود اللہ نے اپنے بندوں اور اپنی کتاب کے درمیان ایک لازمی واسطے کے طور قائم فرمایا ہے۔ وہ گویا یہ کہتا ہے کہ خدا کی کتاب اس کے بندوں کے لئے کافی تھی مگر خدا نے بلا ضرورت یہ فعل عبث کیا کہ (معاذ اللہ) کتاب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے نازل فرمایا۔

کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لازمی تعلق ثابت ہو جانے کے بعد اب اس سوال پر غور کیجئے کہ آیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی اطاعت اور ان کے اسوۂ حسنہ کی پیروی صرف ان کی حیات جسمانی تک تھی؟ اگر ایسا ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت صرف اسی عہد کے لئے تھی جس میں

آپ (ﷺ) اپنے جسم مبارک کے ساتھ زندہ تھے، اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رحلت فرما کر ہی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رسالت کا تعلق علماً دنیا سے منقطع ہو گیا۔ اس صورت میں رسالت کا منصب بے معنی ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام اگر محض ایک نامہ بردار کی طرح کتاب اللہ کو پہنچا دینا تھا، اور اس سے بڑھ کر کسی چیز کی ضرورت نہ تھی تو بیساکہ پہلے کہا گیا کہ اس صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ضرورت ہی نہ تھی یہ کام کوئی فرشتہ کر سکتا تھا، بلکہ بلا واسطہ بھی ممکن تھا۔ (سیرۃ النبی جلد چہارم)

لیکن، اگر کتاب پہنچا دینے کے علاوہ بھی کسی شے کی ضرورت تھی اور اس کے لئے اتباع کے احکام دیتے تھے، اور اگر ہدایت نوع بشری کے لئے قرآن کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات اور سیرت نبوی کے عملی نمونے کی بھی ضرورت تھی تو پھر سب صرف بیس یا چوبیس سال کے لئے ہونا کیا معنی رکھتا ہے محض ایک صدی کے چوتھائی حصے کے لئے ایک رسول مبعوث کرنا اور اتنی سی مدت کے لئے رسالت کا اتنا بڑا منصب قائم کرنا اور ایک چیز کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم و جان کا تعلق منقطع ہوتے ہی دنیا کے لئے غیر ضروری ہو جانے والی تھی، اتنی شدہ مدد کے ساتھ ذریعہ ہدایت قرار دینا، یہ سب کچھ بچوں کا کھیل معلوم ہوتا ہے جو دم ماہ اللہ خدا نے سلیم دانا کے ہرگز شایان شان نہیں ہے۔ اور جب ایسا ہے (یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت ہمیشہ کے لئے ہے) تو وہ تمام آیات اور احکام بھی ہمیشہ کے لئے ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی اطاعت ضروری قرار دی گئی ہے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات کو اسوۂ حسنہ بتایا گیا ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اتباع کو رضائے الہی کے حصول کا واحد ذریعہ کہا گیا ہے۔ اور ہدایت کا دامن آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے۔ (وان تطیعوه تھتدوا)۔ تو رضائے الہی حاصل کرنے اور ہدایت پانے کی ضرورت ظاہر ہے کہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عہد لوگوں کو بھی اسی طرح آج کے لوگوں کو بھی ہے اور قیامت تک جو لوگ آئیں گے ان سب کو بھی رہے گی۔

کتنی موٹی سی بات ہے کہ اگر قرآن کے علاوہ دین میں کوئی چیز حجت اور سند نہیں ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول دینی حیثیت سے کوئی مقام نہیں رکھتا تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قرآن کے بارے میں یہ کہنا بھی حجت ہونا نہ چاہیے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ پس جب قرآن کے علاوہ ہی کا ایک قول بھی حجت بن گیا تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیگر اقوال کی حجت کا کس طرح انکار کیا جاسکتا ہے؟ حجت کا دروازہ ایک قول کے لئے

کھلتا ہے تو سب کے لئے کھلے گا اور بند ہوگا تو ہر قول کے لئے بند ہو جائے گا اور یہ بات تو بالکل قطعی ہے۔ جن کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے کہ حدیث و سنت کے بغیر تو دراصل قرآن سے بھی اکتساب ہدایت ممکن نہیں ہے۔ احادیث و آثار اور روایات کے بغیر تو خود آیات کا مفہوم و مطلب مبہم اور بڑی حد تک تشنہ رہ جائے گا۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی پیروی جس طرح آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حیات میں ضروری تھی آج بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صاف تاکید ہے کہ ”میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ چلا ہوں، جب تک تم انہیں تھامے رہو گے گمراہ نہ ہو گے۔ کتاب اللہ اور میری سنت“ حضرت ابن عباس کے واسطے سے یہ فرمان نبوی قابل غور ہے۔ ”جب تمہارے سامنے کتاب اللہ سے کچھ رکھا جائے تو وہ واجب التعمیل ہے۔ اس کے ترک میں کسی کے لئے عذر جائز نہیں، اگر کوئی چیز کتاب اللہ سے نہ ہو لیکن نبی کی سنت سے ہو تو وہ بھی ویسی ہی واجب التعمیل ہے۔“ ایک روز صبح کی نماز کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”سو میرے بعد زندہ رہے گا وہ بہت زیادہ اختلافات دیکھنے لیں تم میری سنت اور میرے راستہ کو ہدایت یافتہ خلفاء کے طریقے پر چمے رہنا اور خبردار محدثات اور بدعات سے بچنا کیونکہ ہر بدعت گمراہی ہے۔“

ان تفصیلات سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ نے جب اسوۂ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی کی تاکید فرمائی، جب اتباع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا محبوب بندہ بننے کے لئے شرط لازم قرار دیا، جب معصیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وعید سنائی، جب اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم دیا، جب حدیث و سنت کو بیان القرآن اور تعلیم الکتاب قرار دیا تو ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث و سنت کو محفوظ ہونا چاہیئے، ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و اتباع اور تعلیم و تشریح قرآن پر عمل ایک ناقابل عمل حکم ہو کر رہ جائے گا۔ چنانچہ خدا نے اس کی حفاظت کے سامان بھی فراہم کر دئے اور وہ آج تک محفوظ ہے۔ یہ (سنت) قرآن میں محفوظ ہے۔ امت کے تعامل کی شکل میں محفوظ ہے، تو اتر کی صورت میں محفوظ ہے، اور ان روایات و آثار کے اندر محفوظ ہے جو قرآنی معیار اور روایت و درایت کے مسلمہ اصول پر پوری اتریں۔

۵۔ کتابت، حفاظت، تدوین | اوپر کی تفصیل سے یہ بات تو واضح ہو گئی ہوگی کہ حدیث کا تعلق براہ راست ایک خاص تخلیقی وجود

یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے ہے اور صرف ایک واحد شخص کی

زندگی کے واقعات کا بیان اس کا اصل دائرہ کار ہے۔ جب کہ عام تاریخی ذخیروں کا تعلق کسی حکومت، کسی عظیم الشان جنگ وغیرہ یا اسی قسم کی اور منتشر اور پراگندہ چیزوں سے ہے جن کا احاطہ احادیث کے برخلاف آسان نہیں ہے۔

یہ بات بھی بالکل روشن ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے مورخین یعنی صحابہ کرام کا باہمی تعلق ایک عینی شاہد کا تھا جس کی بنیادیں عشق و سمرستی، والہانہ محبت، اور عظمت و اطاعت کے جذبات پر قائم تھیں اور جو ہر چیز سے دست بردار ہو کر صرف اس کی آوازیں گم ہونے کا آخری اور قطعی فیصلہ کر چکے تھے۔ فریقین کے درمیان کسی قسم کا حجاب حائل نہ تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ مسجدیں، بازاریں، گھر میں، سفر میں، حضر میں، ہر جگہ ملتے تھے اسی لئے اس تاریخ (حدیث) کے ہر ہر واقعہ اور جزو کو، اور ایک ایک خد و خال کو انہوں نے محفوظ رکھا تھا۔ اور اس کو اسی طرح دوسروں تک پہنچانے کی ذمہ داری بھی وہ قبول کر چکے تھے۔ ہر حاضر غائب کو اور ہر پہلے پچھلوں کو بتلاتا تھا۔ کیوں کہ متی کے میدان میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود اعلان فرما چکے تھے ”اللہ اس بندے کو تروتازہ رکھے جس نے میری بات سنی پھر اسے یاد رکھا اور جس نے نہیں سنا ہے اس تک انہیں پہنچا دیا۔“

پھر حکم تھا ”الافیہ سلیم الشاہد الغائب“ (تم میں سے جو حاضر ہے وہ غائب کو پہنچاتا جائے) اور ”ان باتوں کو یاد رکھو اور جو تمہارے پیچھے ہیں انہیں اس سے مطلع کرتے رہنا، کیوں کہ ”تم مجھ سے سُن رہے ہو تم سے بھی سنا جائے گا اور جن لوگوں نے تم سے سنا ہے ان سے بھی لوگ سنیں گے“ (حدیث) چنانچہ صحابہ کرام جن حقائق و تعلیمات (حدیث) کی نشر و اشاعت کے ذمہ دار ٹھہرائے گئے تھے اس کا پھیلانا وہ گناہ خیال کرتے تھے۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد انہیں یاد تھا کہ ”جس کسی سے علم کی کوئی بات پوچھی جائے اور اسے وہ چھپائے تو قیامت کے دن آگ کی لگام اسے پہنائی جائے گی“۔ اس کا نتیجہ تھا کہ سکرات میں مبتلا ہیں لیکن بعض سے یہ مروی ہے کہ اس وقت بھی محض اس خیال سے کہ ”علم چھپانے“ کا الزام ان پر نہ رہ جائے حدیث بیان کرتے جاتے تھے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ”جس ذات گرامی کے ہر قول کو وہ خدا کی بات اور خدا کا حکم سمجھتے تھے اس نے بار بار بہ کثرت ان کی فطرت میں یہ تبدیلی خوف اس طرح راسخ کر دیا تھا کہ ”جو مجھ پر قصداً جھوٹ باندھے گا، اس کا ٹھکانا آگ (جہنم) میں ہوگا“۔ عقل بھی لٹکا عا کرتی ہے کہ جس قسم کے ایمان و ایقان کی دولت سے یہ لوگ سرفراز تھے اس کی موجودگی میں خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنے کی جرأت ان کو نہیں ہو سکتی تھی۔ اور جس

اعلیٰ مرتبہ رکے وہ مالک تھے اس سے غلام بیانی کی توفیق کون کر سکتا تھا۔ جیسا کہ قرآن نے بھی صریحاً بیان کیا (خدا پر جھوٹ باندھ دینا کو سب سے بڑا ظالم قرار دیا ہے)۔ بعض صحابہ اپنی اس ناکام تاریخی ذمہ داری کا احساس اس طرح کرتے کہ ذخیرہ حدیث کے سب سے بڑے راوی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ دوائی تاعدہ تھا کہ حدیث جس وقت بیان کرنی شروع کرتے تو کہتے ”خیر ایہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صادق و مصدوق ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس نے مجھ پر قصداً اچھٹ باندھا، چاہیے کہ اپنا ٹھکانا آگ میں تیار کرے۔ پھر جو کچھ بیان کرنا چاہتے بیان فرماتے۔

جن مومنین کا تعلق اپنی تاریخ سے اس قدر ہوا اور جن لوگوں کا تعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس قسم کا ہوا انہوں نے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی کی نگہداشت میں جس کے خدا کی طرف سے بھی وہ محافظ اور مبلغ قرار دیئے گئے تھے، کس اہتمام و انتہاک اور توجہ سے کام لیا؟ نگاہ ایک ایک ”مومن مبارک“ جن کے نزدیک دنیا و مافیہا سے زیادہ محبوب تھا۔ ان کے نزدیک آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اقوال و افعال کی کیا قیمت ہوگی۔

ان حقائق کی روشنی میں عام تاریخی ذخیرے کیسے غیر معتبر نظر آتے ہیں جن کی بنیاد صرف پرانی قلم کے کتبوں، سکوں کے ٹھپوں، کھنڈرات، سنگی یا برنجی تختیوں یا خود نوشت سوانح عمریوں پر قائم کی گئی ہے جن کے مندر کی کوئی ذمہ داری نہیں لیتا بلکہ روایت اس قسم کی بھی پائی جاتی ہے کہ یہ پرانی تختی کچھ دن ہونے گا ڈی گئی تھی“ پھر اس سے قطع نظر معاملہ ایک شخصی بیان سے آگے نہیں بڑھتا۔ یعنی شاہدوں کا تو سوال ہی پیچیدہ ہے۔

لیکن مسلمانوں کا یہ تاریخی سرمایہ ”حدیث“ ایک امدادی نشان رکھتا ہے جس کو قدرتی عوامل نے تدوین و تحفظ میں پوری مدد دی تھی۔ اس کے چشم دید گواہوں اور اس کے مورخین کی تعداد ایک لاکھ سے تجاوز کرتی ہے جس میں مرد اور عورت دونوں کا حصہ ہے۔ ہر ندرگی کے ہر پہلو پر محیط ہے اور باسورتحہ امتھ کے الفاظ میں ”یہاں پورے دن کی روشنی ہے ہر چیز پر پڑ رہی ہے اور ہر ایک تک وہ پہنچ سکتی ہے“

جہاں تک حدیث کی کتابت کا تعلق ہے ایک عام غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ حدیث کی تدوین و ترتیب دو ڈھائی سو سال بعد صحابہ کرام کے زمانے سے ہوئی یا بیسویں صدی کے بڑھاپا تو

لے صحاح ستہ سے مراد حدیث کی چھ صحیح ترین اور قابل اعتماد کتابیں ہیں جو (بائیں طرف کے نیچے)

ابن شہاب زہری سے سلسلہ ملا دیا جاتا ہے لیکن یہ بات جہنی مشہور ہے اتنی ہی غلط ہے۔ حدیث کی تدوین، جیسا کہ اوپر کے مختصر سے جائزہ سے معلوم ہو گیا ہوگا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے ہی شروع ہو چکی تھی اور بعد کی پیداوار بالکل نہیں ہے۔

صحابہ کرام، جن کا تعلق اوپر بتایا جا چکا ہے، کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کس قسم کا تھا، حدیث کے زندہ نسخے تھے اور تدوین حدیث کی پہلی صورت وہی قرار پاتے ہیں اور حدیث کا بہت بڑا ذخیرہ دراصل ان ہی کی حفاظت و روایت کا مہم جو بن منت ہے۔ اگر کوئی صورت میں احادیث کا ذخیرہ محفوظ نہ کیا جاتا تو یہ ذریعہ بھی دراصل بہت کافی تھا۔ ہمارے یہاں حدیث کا بڑا حصہ تو اتر ہی کے ذریعے پہنچا ہے۔

حفاظت حدیث کے اس ذریعے کے علاوہ دوسرا ذریعہ حفاظت کتابی شکل میں تدوین ہے۔ اس سلسلے میں ذیل کی چند شہادتیں کافی ہوں گی۔

ہجرت مدینہ کے فوراً بعد ہی ”پہلا تحریری دستور مملکت“ کتابت حدیث کا پہلا ثبوت ہے جو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ریاست مدینہ میں نافذ فرمایا اور جس میں قریش، مدینہ کے مسلمانوں اور انصار و یہود کے حقوق کا تعین ہے۔ اسی طرح ہجرت کے ابتدائی زمانے میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مردم شماری کرائی۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے الفاظ میں ”مجھے ان لوگوں کے نام نکلے دو جو اسلام کا اقرار کرتے ہیں“ سرکاری دستاویزوں اور معاہدوں، پروانوں وغیرہ کا آغاز تو ہجرت سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ چنانچہ تیم داری کو فلسطین کا شہر جبرون بذریعہ پروانہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جاگیر میں دیا تھا۔ سفر ہجرت میں سراقہ بن مالک کو پروانہ امن عطا فرمایا۔ اس سے قطع نظر سنہ ہجری میں قبیلہ جہینہ سے حلیف کا معاہدہ، اور بنی صفرہ سے معاہدہ کا مخطوطہ اب تک ملتا ہے، یہ معاہدوں کا سلسلہ زندگی بھر جاری رہا۔

سنہ ہجری میں خندق کے زمانے میں بنی فزارہ اور غطفان نے آپؐ نے ایک توثیق طلب یا مسودہ معاہدہ کیا تھا جسے بعد میں محو کر دیا گیا یا سنہ ہجری کا صلح نامہ حدیبیہ اور اس کے بعض الفاظ پر آپس کا بحث مباحثہ مشہور ہے سنہ ہجری میں آل اُکیدر دوسرے الجندل سے اعلیٰ کا معاہدہ، اور قیصر و کسریٰ، مقوقس و نجاشی وغیرہ حکمرانوں کو تبلیغی خطوط کی روانگی معروف چیزیں ہیں۔ کسریٰ نے نامہ مبارک کے جو تحریری صورت میں تھا، چاک کر دیا تھا۔ انتظامی ضرورتوں

دلفیہ حاشیہ سابقہ صفحہ) اپنے مؤلفین کے نام سے جانی جاتی ہیں یعنی بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ۔

سے اکثر مواقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جزیرہ نما عرب کے اطراف و اکناف میں اپنے ہر جگہ کے گورنروں اور قاضیوں وغیرہ کو وقتاً فوقتاً جو ہدایات و فرامین تحریری صورت میں روانہ کئے، تاریخ میں محفوظ ہیں۔ خطوط پر ثبت کرنے کے لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مہر تیار کرنا بھی معروف واقعہ ہے۔ غرض ایسی سیاسی و غیر سیاسی دستاویزوں وغیرہ میں تحریری حدیثوں کو اکٹھا کرنے کی کوششوں کا آغاز حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور عہد صحابہ میں شروع ہو چکا تھا۔

عہد نبوی میں ان مندرجہ بالا سرکاری طور پر لکھی ہوئی احادیث کے علاوہ کئی طور پر اور اتفاقی حیثیت سے مرتب شدہ احادیث کے نسخوں کی بھی بہ کثرت شہادتیں ملتی ہیں۔ مثلاً فتح مکہ کے موقع پر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جو اہم خطبہ دیا تھا ایک یمنی شخص ابو شاہ کی درخواست پر انہیں لکھوا کر دے دیا۔ یا عتبہ بن مالک انصاری کو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ایک خطبے کی بات بڑی اچھی لگی انہوں نے اسے لکھ لیا۔

اگرچہ چند ایسی روایتیں بھی ملتی ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو قرآن کے سوا آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سنی ہوئی کسی چیز کے لکھنے کی ممانعت فرمائی، جس پر لکھی ہوئی چیزیں مٹا دی گئیں بلکہ ایک مرتبہ تو کہتے ہیں کہ خاصی تعداد میں جلا بھی دی گئیں۔ لیکن غور سے چھان بین کرنے پر نظر آتا ہے کہ ان کا تعلق یا تو ابتدائے اسلام سے تھا یا ایسے لوگوں کے متعلق تھا جو تازہ مسلمان ہوئے تھے اور قرآن و حدیث میں فرق نہ کر سکتے تھے۔ جنہیں قرآن خوب یاد تھا اور جن کی صلاحیتوں پر اطمینان تھا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حدیث لکھنے کی نہ صرف اجازت دی بلکہ ترغیب بھی دی ہے۔ مثلاً ایک انصاری نے اپنے حافظے کی کمزوری کی شکایت کی تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا ”اپنے داہنے ہاتھ سے مدد لو“ (لکھ لو)۔

اسی طرح عبداللہ بن عمرو بن العاص حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے ملفوظات نبوی لکھا کرتے تھے تاکہ انہیں یاد رکھ لیں۔ لوگوں نے انہیں منع کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بشر ہیں کبھی خوشی اور کبھی غم کی حالت میں ہوتے ہیں، اس لئے بلا امتیاز آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہر بات کو لکھ لینا مناسب نہیں ہے۔ عبداللہ بن عمرو نے اس پر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا ”کیا رضامندی اور غضب ہر حالت میں جو آپ کہیں لکھ لیا کروں؟“ تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا ”ہاں، بخدا اس سے (منہ سے) جو کچھ بھی نکلتا ہے حق ہی ہوتا ہے۔“ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرو نے ایک ہزار حدیثوں کا مجموعہ مرتب کیا جس کا نام ”صادقہ“ لکھا اسی طرح حضرت علی، حضرت انس بن مالک، حضرت عبداللہ بن مسود، حضرت

سعد بن عبادہ، حضرت ابو ہریرہ، حضرت سعد بن ربیع، حضرت سمحہ بن جندب، حضرت عبداللہ بن ربیعہ اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہم وغیرہ نے حدیثیں جمع کیں اور مجموعے مرتب کئے۔

وہب بن منبہ شاگرد حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ہمام بن منبہ شاگرد حضرت ابو ہریرہؓ، سلمان بن قیس شاگرد جابرؓ وغیرہ کے مجموعے مشہور و معروف ہیں۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو پڑھنا تو آتا تھا مگر خود لکھتی نہ تھیں چنانچہ ان کے بھانجے عروہ بن زبیر نے ان کے علاوہ دیگر صحابہ کی حدیثیں بھی لکھی تھیں جو جنگ ُحَرَّة میں تلف ہو گئیں جن کا انہیں ساری عمر یاد رہا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے دوسرے شاگرد عمرہ بن عبدالرحمن اور قاسم بن محمد تھے۔ ان کے پاس بھی احادیث کا ذخیرہ تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کوئی پانچ سو احادیث کا مجموعہ تیار کیا تھا لیکن پھر یہ سوچ کر تلف کر دیا کہ کہیں سہو سے کوئی غلط لفظ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب نہ ہو گیا ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی احادیث نبویہ کو حکومت کی جانب سے جمع کرنے کا اہتمام کیا اور صحابہ کرام نے اس کی حمایت میں مشورہ بھی دیا لیکن پھر آپ نے یہ ارادہ منسوخ کر دیا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے تو وفات کے بعد ایک بار شتر تالیفات کا چھوڑا تھا۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے غلام نافع بھی حدیث لکھا کرتے تھے۔ غرض حدیث کی کتابت، اس کی حفاظت، اور جمع و تدوین کا آغاز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے ہی میں شروع ہو چکا تھا جسے صحابہ کرام نے وسعت دی اور تابعین نے اضافے کئے لیکن صحاح ستہ کے مرتبین نے اسے بام عروج پر پہنچا دیا اور آج خدا کی کتاب کے بعد انسانی ذخیرہ علم میں جو چیز سب سے زیادہ معتبر اور صحیح ترین شکل میں محفوظ ہے وہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہے۔

{ تدوین حدیث مولانا مناظر احسن گیلانی }
{ وصحیفہ ہمام بن منبہ }

۲- تہذیبِ اخلاق

۱۔ اسلام کا تصورِ اخلاق | جو علم بھلائی اور برائی کی حقیقت کو ظاہر کرے، انسانوں کو آپس میں کس طرح معاملہ کرنا چاہیئے، اس کو بیان کرے، لوگوں کو اپنے اعمال میں کس منہائے نظر اور مقصدِ عظمیٰ کو پیش نظر رکھنا چاہیئے، اس کو واضح کرے۔ نیز مفید اور کارآمد باتوں کے لئے دلیل راہ بنے، بلکہ مختصر الفاظ میں جو فضائل و رذائل کا علم بخشنے اور یہ بتائے کہ انسان جس طرح فضائل سے مزین اور رذائل سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ اس کو ”علمِ اخلاق“ کہتے ہیں۔

لیکن بہ ادنیٰ غور یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تمام انسانی اعمال اس قسم کے نہیں ہیں کہ ان کے اچھے یا برے ہونے کا حکم دیا جاسکے۔ مثلاً سانس لینا، دل کا حرکت کرنا، تاریکی سے روشنی میں اچانک آجانے سے ہلک جھپکنا وغیرہ ایسے اعمال ہیں جو انسان سے غیر ارادی طور پر صادر ہوتے ہیں، اس لئے ان امور کے پیش نظر انسان کو نہ نیکو کار کہہ سکتے ہیں اور نہ غلط کار۔ اور نہ اس سلسلے میں اس سے کوئی محاسبہ کیا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں یہ اعمال علمِ اخلاق کا موضوع نہیں ہو سکتے۔ البتہ انسان سے جو اعمال ارادی طور پر انجام پاتے ہیں اور وہ ان کو ان کے نتائج و ثمرات پر غور کرنے کے بعد کرتا ہے، مثلاً شفا خانے کی تعمیر یا اپنے دشمن کے قتل کا ارادہ اور اس کی تدابیر میں کامیابی وغیرہ۔ چوں کہ یہ ”ارادی اعمال“ ہیں اس لئے ان پر ہی اچھے یا برے ہونے کا حکم لگایا جاسکتا ہے۔ انسان اس قسم کے اعمال کے لئے خدا اور مخلوق کے سامنے جوابدہ ہے، اور یہی علمِ اخلاق کا موضوع قرار پاتے ہیں۔

ہر ایک علم کا یہ خاصہ ہے کہ وہ اپنے اندر شغف رکھنے والے کو ان امور کے بارے میں جن پر اس علم میں بحث ہوتی ہے ناقدانہ نظر عطا کرتا ہے۔ چنانچہ علمِ اخلاق کی بھی یہی شان ہے کہ جو شخص اس کے ساتھ شغف رکھتا ہے یہ اس کو اعمال کے کھرے کھوٹے کی پرکھ پر قدرت عطا کرتا ہے اور ان کی صحیح اور پائدار تقویم پر اُسے ایسا حاوی کر دیتا ہے کہ ان کے متعلق حکم نافذ کرنے میں وہ لوگوں کے رجحانات اور تعلیمات کے زیر اثر نہیں رہتا بلکہ اپنے فیصلے میں علمِ الاخلاق کے نظریات، قواعد و قانون اور قیاسات سے مدد حاصل کرتا

ہے۔ لیکن یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ علم اخلاق کی غرض صرف نظریوں اور قاعدوں کی معرفت کے اندر ہی محصور نہیں ہے بلکہ اس کے مقاصد عظمے میں یہ بھی شامل ہے کہ ہمارے ارادے میں تاثیر اور ہدایت کا فرما ہو، کہ یہی تاثیر ارادے کو عمل خیر پر آمادہ کرتی ہے۔ اور ہم میں یہ جذبہ پیدا ہو جائے کہ ہم اپنی حیات کی تشکیل کریں، اپنے اعمال کو پاک اور عمدہ بنائیں اور حیات انسانی کے لئے ایک اعلیٰ مثال قائم کر دیں، یعنی اپنے اندر حسن عمل، حسن کمال اور اخوت و مواصلات عامہ جیسے فضائل پیدا کریں۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ ”تاثیر“ کو ہر موقع پر کامیابی حاصل نہیں ہوتی اور فطرت انسانی اس سے متاثر نہیں ہوتی۔

علم اخلاق کا اصل و طیفہ یہ ہے کہ وہ انسان کے سامنے خیر و شر اور نیکی و بدی کو واضح کر دیتا ہے۔ اور اس طرح نیکی اور سچائی کی راہ کو آسان کر دیتا ہے۔ اس کا کام جبری طور پر صالح بنادینا نہیں، انسان کو صالحیت کی راہ دکھانا ہے جس پر چلنے یا نہ چلنے کا انحصار فرد کے ارادے پر ہے۔ یہ علم ایک طیب کی طرح انسان کو اچھے اور برے میں امتیاز کر دیتا ہے اور اس کی چشم عبرت و بصیرت کو کھول دیتا ہے تاکہ انسان خیر و شر اور اس کے آثار و لوازم کو جان لے۔ اب آگے اس کی قوت ارادی کا کام ہے جو علم اخلاق کے اوامر (احکام) کے اختیار اور اس کے نواہی (ممنوعات) سے پرہیز پر آمادہ کر سکے۔

انسان کے اندر اخلاقی جہت ایک فطری جہت ہے جس کی بنا پر انسان بعض صفات کو پسند اور بعض کو ناپسند کرتا ہے۔ یہ انفرادی طور پر انسانوں میں کم و بیش ہو سکتی ہے لیکن ہمارا مشاہدہ ہے کہ مجموعی طور پر انسانیت کے شعور نے اخلاق کے بعض اوصاف پر خوبی کا اور بعض پر برائی کا ہمیشہ یکساں حکم لگایا ہے۔ سچائی، انصاف، پاس عہد اور امانت کو ہمیشہ سے انسانی اخلاقیات میں تعریف کا مستحق سمجھا گیا اور کبھی کوئی ایسا دور نہیں گذرا جب جھوٹ، ظلم، بدعہدی اور نیات کو پسند کیا گیا ہو۔ ہمدردی، فیاضی اور فراخ دلی کی ہمیشہ قدر کی گئی اور خود غرضی، سنگ دلی، بخل اور تنگ نظری کو کبھی عزت کا مقام حاصل نہیں ہوا۔ صبر و تحمل، استقلال و بردباری، اولوالعزمی و شجاعت ہمیشہ سے وہ اوصاف رہے ہیں جو داد کے مستحق سمجھے گئے اور بے صبری، چھپورا پن، تنوُّن مزاجی، پست حوصلگی اور بزدلی پر کبھی تحقیر و آفرین کے پھول نہیں برسائے گئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسانی اخلاقیات دراصل وہ عالمگیر حقیقتیں ہیں جن کو سب انسان جانتے چلے آ رہے ہیں۔ نیکی اور بدی کوئی ڈھکی چھپی چیزیں نہیں ہیں کہ انہیں کہیں سے ڈھونڈ نکالنے کی ضرورت ہو۔ وہ تو انسان کی جانی پہچانی چیزیں ہیں جن کا شعور آدمی کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید اپنی زبان میں نیکی کو ”مَعْرُوف“ اور بدی کو ”مَنْكَر“ کہتا

ہے یعنی نیکی وہ چیز ہے جسے سب انسان بھلا جانتے ہیں اور منکر وہ جسے کوئی خوبی اور بھلائی کی حیثیت سے نہیں جانتا۔ اسی حقیقت کو قرآن مجید دوسرے الفاظ میں یوں بیان کرتا ہے کہ فالہمہا فجورہا وتقواہا (سورۃ الشمس)، یعنی نفس انسان کو خدا نے برائی اور بھلائی کی واقفیت الہامی طور پر عطا کر رکھی ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اگر برائی اور بھلائی جانی اور پہچانی چیزیں ہیں اور دنیا ہمیشہ سے بعض صفات کے بنک اور بعض کے بدھونے پر مشفق رہی ہے تو پھر دنیا میں مختلف اخلاقی نظام اور نظریے کیوں ہیں؟ اور اخلاق کے معاملے میں آخر اسلام کا وہ خاص خطیہ کیا ہے جسے اس کی امتیازی خصوصیت کہا جاسکے۔

اس مسئلے کو سمجھنے کے لئے جب ہم دنیا کے مختلف اخلاقی نظاموں پر نگاہ ڈالتے ہیں تو پہلی نظر میں جو فرق ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ مختلف اخلاقی صفات کو زندگی کے مجموعی نظام میں سمونے اور ان کی حضانہ کا مقام اور ان کا مصرف تجویز کرنے اور ان کے درمیان تناسب قائم کرنے میں، یہ سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ پھر زیادہ گہری نگاہ سے دیکھنے پر اس فرق کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ دراصل وہ اخلاقی حسن و قبح کا معیار تجویز کرنے اور خیر و شر کے علم کا ذریعہ متعین کرنے میں مختلف ہیں اور ان کے درمیان اس امر میں بھی اختلاف ہے کہ قانون کے پیچھے وہ قوت نافذہ کون سی ہے جس کے زور سے وہ جاری ہو اور وہ کیا محرکات ہیں جو انسان کو اس قانون کی پابندی پر آمادہ کریں۔ لیکن جب ہم اس اختلاف کا کھوج لگاتے ہیں تو آخر کار یہ حقیقت ہم پر کھلتی ہے کہ وہ اصلی چیز جس نے ان سب اخلاقی نظاموں کے راستے الگ کر دیئے ہیں یہ ہے کہ ان کے درمیان، کائنات کے تصور، کائنات کے اندر انسان کی حیثیت اور انسانی زندگی کے مقصد میں اختلاف ہے اور اسی اختلاف نے جڑ سے لے کر شاخوں تک ان کی روح، ان کے مزاج اور ان کی شکل کو ایک دوسرے سے مختلف کر دیا ہے۔

کائنات کے متعلق اسلام کا تصور یہ ہے کہ اس دنیا کا ایک خالق و ناظم ہے۔ وہی ہم سب انسانوں کا آقا ہے۔ وہ حکیم ہے، قادر مطلق ہے، کھلے اور چھپے کا جاننے والا ہے، سلوچ و قدوس ہے اور اس کی خدائی ایسے طریقے پر قائم ہے جس میں ٹیڑھ نہیں ہے۔ انسان اس کا بندہ اور نائب ہے لہذا انسان کا فرض ہے کہ اپنی زندگی کا نظام خدا کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق ڈھالے۔ انسان اپنی زندگی کے پورے کارنامے کے لئے خدا کے سامنے جوابدہ ہے اور اسے یہ جواب دہی اپنی ممکن ترین شکل میں آخرت میں کرنی ہے۔ چنانچہ انسان کی تمام سعی و کوشش اس مقصد پر مرکوز ہونی چاہیے کہ وہ آخرت کی جواب دہی میں اپنے خدا کے حضور کامیاب

ہو۔ دنیا کی موجودہ زندگی دراصل امتحان کی ہمت ہے۔ اس امتحان میں انسان اپنے پورے وجود کے ساتھ شریک ہے۔ اس کی تمام قوتوں اور قابلیتوں کا امتحان ہے۔ زندگی ہر پہلو کا امتحان ہے۔ پوری کائنات میں جس چیز سے جیسا کچھ بھی اس کو سابقہ پیش آتا ہے اس کی بے لاگ جانچ ہونی ہے کہ انسان نے اس کے ساتھ کیسا معاملہ کیا۔ اور جانچ وہ ہستی کرنے والی ہے جس نے کائنات کی ہر چیز کو انسان کی خدمت لگاری کے لئے مسخر کر دیا ہے اور جس نے خود انسان کو اُس کے دل و دماغ پر اور دست و پا پر اختیار بخشا ہے اور اُس ہستی کو انسان کی حرکات و سکنات ہی کا نہیں، اُس کے خیرِ آلا اور ارا دونوں تک کا پورا پورا علم ہے اور ان کی ہر تفصیل اُس ہستی کے پاس محفوظ ہے۔

مقصد: یہ تصور کائنات و انسان اُس اصلی بھلائی کو متعین کرتا ہے جس کا حصول انسانی سعی و عمل کا مقصد ہونا چاہیے اور وہ ہے خدا کی رضا۔ یہی وہ معیار ہے جس پر اسلام کے اخلاقی نظام میں کسی طرزِ عمل کو پرکھ کے فیصلہ کیا جاتا ہے کہ وہ خیر ہے یا شر۔ اس کے تعین سے اخلاق کو وہ محور مل جاتا ہے جس کے گرد پوری اخلاقی زندگی گھومتی ہے اور اس کی حالت بے لنگر جہاز کی سی نہیں رہتی کہ ہوا کے بھونکے اور موجوں کے تھپیڑے اسے ہر طرف دوڑاتے پھریں۔ اس کی بنا پر انسان کے سامنے ایک مرکزی مقصد آ جاتا ہے جس کی روشنی میں زندگی میں اخلاقی صفات کی مناسبیت یا مناسب جگہیں اور مناسب عملی صورتیں مقرر ہو جاتی ہیں اور ہمیں وہ مستقل اقدار ہاتھ لگ جاتی ہیں جو تمام بدلتے ہوئے حالات میں اپنی جگہ قائم رہ سکیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ رضائے الہی کے مقصد قرار پا جانے سے اخلاق کو ایک بلند ترین غایت مل جاتی ہے جس کی بدولت اخلاقی ارتقاء کے امکانات لامتناہی ہو سکتے ہیں اور کسی مرحلے پر بھی اغراضِ پستوں کی آلائشیں اس کو طوٹ نہیں کر سکتیں۔

ماخذ: معیارِ دین کے ساتھ اسلام اپنے اسی تصور کائنات و انسان سے ہم کو اخلاقی حسن و قبح کے علم کا ایک مستقل ذریعہ بھی دیتا ہے۔ اس نے ہمارے علم اخلاق کو محض عقل یا خواہشات یا تجربے یا علوم انسانی پر منحصر نہیں کر دیا ہے کہ ہمیشہ ان کے بدلتے ہوئے فیصلوں سے ہمارے اخلاقی احکام بھی بدلتے رہیں اور انہیں کوئی پائیداری نصیب ہی نہ ہو سکے، بلکہ وہ ہمیں ایک معین ماخذ دیتا ہے۔ یعنی خدا کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت، جن سے ہم کو ہر حال اور ہر زمانے میں اخلاقی ہدایات ملتی ہیں اور یہ ہدایات ایسی ہیں کہ خاگی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات سے لے کر بین الاقوامی سیاست کے بڑے سے بڑے مسائل تک زندگی کے ہر پہلو اور شعبے میں وہ ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔ ان کے اندر معاملات زندگی پر اخلاق کے اصولوں کا وسیع ترین الطباق پایا جاتا ہے جو کسی مرحلے پر کسی دوسرے ذریعہ علم

احتیاج ہمیں محسوس نہیں ہوتے دیتا۔

قوتِ نافذہ: پھر اسلام کے اسی تصور کائنات و انسان میں وہ قوت نافذہ بھی موجود ہے جس کا قانون اخلاق کی پشت پر ہونا ضروری ہے، اور وہ ہے خدا کا خوف، آخرت کی باز پرس کا اندیشہ، اور ابدی مستقبل کی خرابی کا خطرہ۔ اگرچہ اسلام ایک طاقتور رائے عام بھی تیار کرنا چاہتا ہے جو اجتماعی زندگی میں اشخاص اور گروہوں کو اصول اخلاق کی پابندی پر مجبور کرنے والی ہو اور ایک ایسا سیاسی نظام بھی بنانا چاہتا ہے جس کا اقتدار اخلاقی قانون کو بزور نافذ کرے۔ لیکن اس کا اصل اعتماد اس خارجی دباؤ پر نہیں ہے بلکہ اس اندرونی دباؤ پر ہے جو خدا اور آخرت کے عقیدے میں مضمر ہے۔ اخلاقی احکام دینے سے پہلے اسلام آدمی کے دل میں یہ بات بٹھاتا ہے کہ تیرا معاملہ اس خدا کے ساتھ ہے جو ہر وقت، ہر جگہ تجھے دیکھ رہا ہے۔ تو دنیا بھر سے چھپ سکتا ہے مگر اس سے نہیں چھپ سکتا، دنیا بھر کو دھوکہ دے سکتا ہے مگر اسے دھوکہ نہیں دے سکتا۔ دنیا بھر سے بھاگ سکتا ہے مگر اس کی گرفت سے بچ کر کہیں نہیں جاسکتا۔ دنیا محض تیرے ظاہر کو دیکھتی ہے مگر وہ تیری نیتوں اور ارادوں تک کو دیکھ لیتا ہے۔ دنیا کی مقبوضی ہی زندگی میں تو چاہے کچھ کرے بہر حال ایک دن تجھے مرنا ہے اور اس عدالت میں تجھے حاضر ہونا ہے جہاں وکالت، رشوت، سفارش، بھٹی شہادت، دھوکہ اور فریب کچھ نہ چل سکے۔ اور تیرے مستقبل کا بے لاگ فیصلہ ہو جائے گا۔ یہ عقیدہ دل میں جاگزیں کر کے اسلام گویا ہر آدمی کے دل میں پولیس کی ایک چوکی بٹھا دیتا ہے جو اندر سے اس کو احکام کی تعمیل پر مجبور کرتی ہے۔ خواہ باہر ان کے احکام کی پابندی کرانے والی کوئی پولیس، عدالت اور جیل موجود ہو یا نہ ہو۔ اسلام کے قانون اخلاق کی پشت پر اصل قوت یہی ہے جو اسے نافذ کراتی ہے۔ رائے عام اور حکومت کی طاقت اس کی تائید میں موجود ہو تو نور علی نور، ورنہ تنہا یہی ایمان مسلمان افراد اور مسلمان قوم کو سیدھا چلا سکتا ہے بشرطیکہ واقعی ایمان دلوں میں جاگزیں ہو۔

محرمات: اسلام کا یہ تصور کائنات و انسان وہ محرکات بھی فراہم کرتا ہے جو انسان کو قانون اخلاق کے مطابق عمل کرنے کے لئے ابھارتے ہیں۔ انسان کا اس بات پر راضی ہو جانا کہ وہ خدا کو اپنا خدا مانے اور اس کی بندگی کو اپنی زندگی کا طریقہ بنائے اور اس کی رضا کو اپنا مقصد زندگی سمجھائے، یہ اس بات کے لئے کافی محرک ہے کہ وہ ان کے احکام کی اطاعت کرے جن کے متعلق اسے یقین ہو کہ خدا کے احکام ہیں۔ اس محرک کے ساتھ آخرت کا یہ عقیدہ بھی ایک طاقتور محرک ہے کہ جو شخص احکام الہی کی اطاعت کرے گا اس کے لئے ابدی زندگی میں ایک شاندار مستقبل یقینی ہے۔ خواہ دنیا کی اس عارضی زندگی میں اسے کتنی ہی مشکلات، نقصانات اور

تکلیفوں سے دوچار ہونا پڑے اور اس کے برعکس جو یہاں سے خدا کی نافرمانیاں کرتا ہوا جائے گا، اسے ابدی سزا بھگتنا پڑے گی، چاہے دنیا کی چند روزہ زندگی میں وہ کیسے ہی مزے لوٹ لے۔ یہ امید اور یہ خوف اگر کسی کے دل میں جاگزیں ہو تو اس میں اتنی زبردست قوتِ محرکہ موجود ہے کہ وہ ایسے مواقع پر بھی اسے نیکی پر ابھار سکتی ہے، جہاں نیکی کا نتیجہ دنیا میں سخت نقصان دہ نکلتا ہو نظر آتا ہے اور ان مواقع پر بھی بدی سے دور رکھ سکتی ہے جہاں بدی نہایت پر لطف اور نفع بخش دکھائی دے۔

اس بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام اپنا تصور کائنات، اپنا معیار خیر و شر، اپنا ماخذ علم اخلاق، اپنی قوت نافذہ اور اپنی قوت محرکہ الگ رکھتا ہے۔ ان ہی چیزوں کے ذریعے معروف اخلاقیات کے مواد کو اپنی قدروں کے مطابق ترتیب دے کر زندگی کے تمام شعبوں میں جاری کرتا ہے۔ اسی بناء پر یہ کہنا صحیح ہے کہ اسلام اپنا ایک مکمل اور مستقل بالذات اخلاقی نظام رکھتا ہے۔

۲۔ اخلاق و ایمان کا باہمی تعلق ایمان اگرچہ مذہب کا اصل الاصول ہے مگر وہ ایک باطنی چیز ہے جس کو کوئی دوسرا نہیں جانتا اور زبان سے ظاہری اقرار ہر شخص کر سکتا ہے۔ اس لئے اخلاق حسنہ کو ایمان کی پہچان قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ سورہ مومنوں میں عبادات کے ساتھ ساتھ اخلاق کو بھی اہل ایمان کی ان ضروری صفات میں شمار کیا گیا ہے جن پر ان کی کامیابی کا مدار ہے۔ قرآن میں فرمایا:

”بے شک وہ ایمان والے کامیاب ہوئے جو اپنی نماز میں خشوع و خضوع کرتے ہیں اور جو نیک بات پر دھیان نہیں دیتے اور جو زکوٰۃ دیا کرتے ہیں اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں اور جو اپنی امانتوں اور اپنے وعدوں کا لحاظ رکھتے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں“ (مومنون - ۱- ۵)

ان آیات میں اہل ایمان کی کامیابی جن اوصاف کا نتیجہ بتائی گئی ہے۔ ان میں وقار و تمکنت، لغویات سے اعراض، قیاضی، پاکدامنی اور ایفائے عہد کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک تعلیم میں اللہ کے نیک اور مقبول بندے وہی قرار دیئے گئے ہیں جن کے اخلاق بھی اچھے ہوں اور وہی باتیں اللہ کے نزدیک ان کے مقبول ہونے کی نشانی ہیں۔

www.KitaboSunnat.com

قرآن میں فرمایا:

اہل ایمان کے اوصاف ”اور رحمن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر بے پاؤں چلتے ہیں اور جب بے عقل ان سے مات کریں تو وہ سلام کہتے ہیں اور جو اپنے

پروردگار کی عبادت کی خاطر قیام اور سجدہ میں رات گزارتے ہیں۔ اور جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم سے جہنم کا عذاب دور کر کہ اس کا عذاب بڑا تاوان ہے۔ اور جہنم بڑا ٹھکانا اور مقام ہے۔ اور جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کریں اور نہ تنگی کریں بلکہ دونوں کے درمیان سے وہ سیدھے گزریں اور جو اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہیں پکارتے اور جو کسی کا بے گناہ خون نہیں کرتے جس سے خدا نے منع کیا ہے اور نہ بدکاری کرتے ہیں۔ جو ایسا کرے گا وہ گناہ سے آلودہ ہوگا۔ اور جو جھوٹے کام میں شامل نہیں ہوتے اور جب کسی لغو بات پر گنذر رہے ہوں تو سنجیدگی اور وقار سے گنذر جاتے ہیں۔ اور جب اللہ کی نشانیاں اُن کو سنائی جائیں تو وہ اندھے اور بہرے نہ ہو پڑیں۔ اور یہ دعا مانگتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو ہمارے بیوی بچوں سے آنکھ کی ٹھنڈک عطا کر اور ہم کو پرہیزگاروں کا پیشوا بنائے۔

(الفرقان ۶۳-۶۸)

وہ لوگ جو اللہ کے پیارے اور مقبول بندے ہیں اُن کے اخلاقی اوصاف یہ بیان ہوئے ہیں:-

”اور وہ اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں اور بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں۔ اور جو غصہ کی حالت میں معاف کرتے ہیں اور اپنے پروردگار کی پکار کا جواب دیتے ہیں۔ نماز ادا کرتے ہیں اور اُن کے کام باہم مشورہ سے ہوتے ہیں، اور ہم نے اُن کو جو دیا ہے اس میں سے کچھ اللہ کی راہ میں دیتے ہیں، اور جب اُن پر حملہ ہو تو بدلہ لیتے ہیں اور بُرائی کا بدلہ ویسی ہی بُرائی ہے، تو جو کوئی معاف کر دے اور نیکی کرے تو اس کا ثواب اللہ کے ذمے ہے۔ اللہ ظلم کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا اور اگر کوئی مظلوم ہو کر بدلہ لے لے تو اس پر کوئی ظلمت نہیں۔ ظلمت تو اُن پر ہے جو لوگوں پر از خود ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق فساد مچاتے ہیں، ان کے لئے بڑا دردناک عذاب ہے۔ اور بے شک جو مظلوم ہونے پر بھی ظالم کو معاف کر دے اور صبر کرے تو یہ ہمت کا کام ہے۔ (ثوری)

ان آیات اور اس قسم کی دیگر آیات کی جو تشریح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک سے فرمائی وہ احادیث میں محفوظ ہے۔ ہم چند احادیث ذکر کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلیمی نصاب میں اخلاق و ایمان کے مابین کیا ربط و تعلق پایا جاتا ہے۔

اخلاق و ایمان میں جو ربط پایا جاتا ہے وہ اس سے ظاہر ہے کہ آنحضرتؐ نماز میں جو دعا مانگتے تھے اس میں یہ فقرہ بھی شامل ہوتا تھا:-

”اے میرے پروردگار تو مجھ کو بہتر سے بہتر اخلاق کی رہنمائی کر، تیرے سوا کوئی یہ راہ نہیں دکھا سکتا اور بُرے اخلاق کو مجھ سے پھیر دے اور تیرے سوا اُن کو کوئی نہیں پھیر سکتا۔“

ایمان سے بڑھ کر اسلام میں کوئی چیز نہیں، لیکن اس کی تکمیل بھی اخلاق ہی سے ممکن ہے۔ فرمایا

”اکمل المؤمنین ایماناً احسنہم | مسلمانوں میں کامل ایمان اس کا ہے جس کا

”حَلَقًا“ (ترمذی - ابوداؤد)

اخلاق سب سے اچھا ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اسلام میں ایمان کے کمال کا معیار جس چیز کو کھڑا یا لگیا ہے وہ حسنِ اخلاق ہے کہ یہی وہ پھل ہے جس سے ایمان کے درخت کی پہچان ہوتی ہے۔ اسلام میں نماز اور روزے کی جو اہمیت ہے وہ ظاہر ہے لیکن اخلاقِ حسنہ کو بھی اُن کی قائم مقامی کا شرف حاصل ہو جاتا ہے۔ ارشاد فرمایا:

”اِنَّ الرَّجُلَ لَيَدْرِكُ بِحَسَنِ حَلَقِهِ

دَرَجَةَ قَائِمِ اللَّيْلِ وَصَائِمِ النَّهَارِ

(ابوداؤد - طبرانی - ابنِ جرّان)

انسان حسنِ اخلاق سے وہ درجہ پا سکتا ہے جو دن بھر روزہ رکھنے اور رات بھر عبادت کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

اس حدیث سے مستفاد ہوتا ہے کہ نفل نمازوں میں رات بھر کی شب بیداری اور نفل روزوں میں دن بھر کی بھوک پیاس سے جو درجہ حاصل ہو سکتا ہے، وہی درجہ حسنِ خلق سے بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ حسنِ اخلاق کی یہ حیثیت اس کو یک گونہ عبادات کی کثرت سے بڑھا دیتی ہے۔ اسلام میں اخلاق ہی وہ معیار ہے جس سے باہم انسانوں میں درجہ اور مرتبہ کا فرق نمایاں ہوتا ہے۔

”خِيَارُكُمْ أَحْسَنُكُمْ اخْلَاقًا“

(بخاری کتاب الادب)

تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔

ارشاد دیو:

”أَحَبُّ عِبَادِ اللَّهِ إِلَى اللَّهِ أَحْسَنُهُمْ

اخْلَاقًا“ (طبرانی)

اللہ کے بندوں میں اللہ کو سب سے عزیز وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں دو صحابیات تھیں۔ ایک رات بھر نماز پڑھتیں، دن کو روزہ رکھتیں اور صدقہ دیتیں، مگر اپنی زبان درازی سے پڑوسیوں کا دم ناک میں کئے رکھتی تھیں۔ دوسری صحابیہ صرف فرض نماز پڑھتیں اور غریبوں کو چند کپڑے بانٹ دیتیں مگر کسی کو تکلیف نہ دیتیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان دونوں کی نسبت پوچھا گیا تو آپ نے پہلی کی نسبت فرمایا کہ ”اس میں کوئی نیکی نہیں وہ اپنی بد خلقی کی سزا بھگتے گی اور دوسری کی نسبت فرمایا کہ وہ جنتی ہے۔“

(ادب المفرد امام بخاری)

ان دونوں صحابیات کی سیرتوں کے جو مختلف نتیجے رسولِ کریم کی زبانِ فیض ترجمان سے ظاہر ہوئے ہیں وہ اسلام میں اخلاق کی حیثیت کو پوری طرح نمایاں کر دیتے ہیں۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دیہاتی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ مجھے وہ کام سکھائیے جو مجھے جنت میں لے جائے فرمایا ”انسان کو

غلامی سے آزاد کر، انسان کی گردن کو قرض کے بندھن سے چھڑا، اور ظالم رشتہ دار کا ہاتھ پکڑا۔ اگر یہ نہ ہو سکے تو بھوکے کو کھلا اور پیاسے کو پلا اور نیکی بتا اور بُرائی سے روک۔ اگر یہ بھی نہ کر سکے تو بھلائی کے سوا اپنی زبان بند رکھ۔“ غور کیجئے کہ یہ حدیث اخلاقی عظمت کو کہاں تک بڑھا رہی ہے۔
(مشکل الآثار لطحاوی ج ۴ ص ۲)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”مومن وہ ہے جس کو لوگ امین سمجھیں، مسلم وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے لوگ سلامت رہیں۔ ہجرا جو وہ ہے جس نے برائی کو چھوڑ دیا ہو، اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، کوئی اُس وقت تک جنت میں نہیں جاسکتا جب تک اس کا پُروسی اس کے عقد سے محفوظ نہ رہا ہو یا
(کنز العمال ج ۱ کتاب الایمان)

مذکورہ صدر احادیث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان و اخلاق میں کس قدر گہرا ربط و تعلق پایا جاتا ہے۔

۳۔ اسلامی تصور کی امتیازی خصوصیات

۱۔ اسلام ضائع الہی کو مقصود بنا کر اخلاق کے لئے ایک ایسا بلند معیار فراہم کرتا ہے جس کی وجہ سے اخلاقی ارتقاء کے امکانات کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ پھر ایک ماخذ علم مقرر کر کے اخلاق کو وہ پائیداری اور استقلال بخشتا ہے جس میں ترقی کی گنجائش تو ہے مگر تلوں اور بے ربطی کی گنجائش نہیں ہے۔ نیز خوف خدا کے ذریعے سے اخلاق کو وہ قوت نافذ دیتا ہے جو خارجی دباؤ کے بغیر انسان سے اس کی پابندی کراتی ہے اور خدا و آخرت کے عقیدے سے وہ قوت محکم فراہم کرتا ہے جو انسان کے اندر خود بخود قانون اخلاق پر عمل کرنے کی رغبت اور آمادگی پیدا کرتی ہے۔

۲۔ اسلام خواہ مخواہ کی اچھ سے کام لے کر نرالے اخلاقیات نہیں پیش کرتا اور نہ اسلام کے معروف اخلاقیات میں سے بعض کو بلا وجہ گھسنے اور بعض کو بلا سبب بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ان ہی اخلاقیات کو لیتا ہے جو معروف ہیں، جن کو انسانیت کے اجتماعی ضمیر نے قبول کیا ہے اور ان میں سے بھی محض چند کو نہیں، بلکہ سب کو لیتا ہے۔ پھر زندگی میں پورے توازن اور تناسب کے ساتھ ایک ایک کا محل، مقام اور مصرف تجویز کرتا ہے اور ان کے انطباق کو اتنی وسعت دیتا ہے کہ انفرادی کردار، خانگی معاشرت، شہری زندگی، ملکی سیاست، معاشی کاروبار، بازار، مدرسہ، عدالت، پولیس لائن، چھاؤنی، میدان جنگ، صلح کانفرنس، بین الاقوامی معاملات، غرض زندگی کا کوئی پہلو اور شعبہ اسانہم، رہ جاتا جو اخلاق

کے ہمہ گیر اثر سے بچ جائے نہ ہر جگہ، ہر شعبہ زندگی میں وہ اخلاق کو حکمراں بناتا ہے اور اس کی کوشش یہ ہے کہ معاملات زندگی کی باگیں خواہشات، اغراض اور مصلحتوں کی بجائے اصول اخلاق کے ہاتھوں میں ہوں۔

۳۔ اسلام انسانیت سے ایک ایسے نظام زندگی کے قیام کا مطالبہ کرتا ہے، جو معروف پر قائم اور منکر سے پاک ہو۔ اس کی دعوت یہ ہے کہ جن بھلائیوں کو انسانیت کے ضمیر نے ہمیشہ بھلا جانا ہے انہیں قائم کرے اور پروان چڑھائے، اور جن بھلائیوں کو انسانیت ہمیشہ سے برا سمجھتی چلی آئی ہے اس کی بیخ کنی کرے۔ اس دعوت پر جنہوں نے لبیک کہا ان کو جمع کر کے اس نے ایک امت بنائی جس کا نام امت مسلمہ ہے۔ اور ان کو ایک امت بنانے کی واحد غرض بھی ہے کہ وہ معروف کو جاری و قائم کرے اور منکر کو دبانے اور مٹانے کے لئے منظم سعی کرے۔ اب اگر کسی امت کے ہاتھوں معروف دے اور منکر قائم ہونے لگے تو مقام افسوس ہے، خود اس امت کے لئے بھی اور ساری دنیا کے لئے بھی۔

۴۔ اسلام نے اخلاق کی تنظیم ایسے طریقے سے کی ہے کہ فضائل میں سے ہر اچھے خلق اور رذائل میں سے ہر بُرے خلق کا وہ اصلی مقام اجاگر ہو گیا ہے جو فی الحقیقت ہونا چاہیے تھا اسلام کے سواسخی اور مذہبی یا اخلاقی نظام نے یہ کام نہیں کیا۔

۵۔ اسلام نے اخلاق اور قانون میں وہ توازن و تناسب قائم کیا ہے جو دوسرے کسی اخلاقی نظام میں ہمیں نظر نہیں آتا۔ وہ اخلاق کو ایمان اور عبادت سے جڑا نہیں کرتا بلکہ ان کے باہمی تلازم کا قائل ہے۔ صحیح حدیث میں وارد ہے کہ لا ایمان لمن لا عہد لہ ولا ایمان لمن لا امانۃ لہ ”جس میں پابندی عہد نہیں اس میں ایمان نہیں اور جو دیانت و امانت سے خالی ہے۔ اس میں کوئی ایمان نہیں“ ایک اور حدیث میں ہے کہ:-

آیۃ المنافق ثلاثۃ اذا حدث کذب و اذا عاہد غدر و اذا اتمن خان۔ (صحیح بخاری)	منافق کی تین نشانیاں ہیں، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب عہد کرے تو غداری کرے اور جب اسے امانت دی جائے تو خیانت کرے۔
---	---

ایک اور مقام پر حضور نے ان تین پر ایک پوچھتی علامت کا اضافہ کر کے چار علامات نفاق شمار کی ہیں۔ وہ پوچھتی یہ ہے: وَاِذَا اَخَاصَمَ فَجَرَ ”اور جب جھگڑے تو گایاں بکے“ ان احادیث سے اخلاق و ایمان کے باہمی روابط کا پتہ چلتا ہے اور ثابت ہو جاتا ہے کہ اسلام کے نزدیک اخلاق کی جو قدر و قیمت ہے وہ کسی اور اخلاقی نظام یا مذہب میں نہیں ہے یہیں سے اس امر کی حقیقت بھی کھل جائیگی کہ اسلامی قانون و اخلاقی کے لئے شدید سزائیں کیوں تجویز کرتا ہے؟

۶۔ اسلامی نظریہ اخلاق میں سادگی اور عملیت کا پہلو بہت واضح ہے۔ اس کے شکیبہ اخلاق تکلف اور ریاکاری سے پاک ہیں۔ وہ ہر ایک کیلئے قابل عمل ہیں۔ ان میں ترک دنیا اور رہبانیت کی تعلیم کیلئے کوئی گنجائش نہیں۔ اسی دنیا میں رہ کر اور اس کے ہنگاموں سے دوچار ہو کر انسان ان پر عمل پیرا ہو سکتا ہے زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے لوگ بلا تکلف ان پر عمل سکتے ہیں۔ مختلف طبقوں کے لئے مختلف معیار نہیں بلکہ ہر مسلمان کے لئے ایک ہی معیار اخلاق ہے۔

۷۔ اسلام نے خوش اخلاق کا مقصد ان دیکھے خالق کی رضا کھڑا کر اخلاق میں سے ریاکاری اور خود غرضی کے عنصر کو کسر خارج کر دیا ہے۔ انفرادی و اجتماعی اصلاح میں جتنا یہ تصور عمیق اور مؤثر ہے دوسرا کوئی نظریہ اس کی گہرائی اور گیرائی کو نہیں پاسکتا۔

۸۔ یہ نظریہ اخلاق کسی غیر فطری اور سطحی بنیاد پر قائم نہیں ہوتا، بلکہ ایک واضح اور روشن معیار اس کے سامنے موجود ہے یعنی کتاب و سنت جسور کا خلق عظیم جسے قرآن مجید نے ﴿اِنَّكَ لَعَلٰی خَلْقٍ عَظِيْمٌ﴾ کہہ کر سراہا ہے اس نظریہ کا عملی معیار ہے مسلمانوں کو اس معیار پر اپنے آپ کو پرکھنے کا حکم یوں دیا گیا ہے۔ ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (لقینہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس میں تمہارے لئے بہترین نمونہ موجود ہے! ایسا کامل اور بلند معیاری نمونہ دنیا کے اور کسی نظریہ اخلاق کے سامنے موجود نہ تھا۔

۹۔ اسلام نے اخلاق کی انفرادی اصلاح سے آگے گزر کر مسلمانوں کو ایک میلی عجا بننے کا حکم دیا ہے۔ اس جماعت کا مقصد یہ ٹھہرایا گیا ہے کہ: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَلْيَعْلَمِ كُلُّ شَيْءٍ مِّنكُمْ أَنَّهُ مِمَّنِ اتَّقِيَ اللَّهَ يَرْزُقْهُ مِمَّا يَحْتَسِبُ﴾ (مائدہ) (اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جانو کہ ہر شے تم میں سے اللہ سے ڈرنے والی ہے اور اللہ ہی تم کو تمہاری توقع سے بڑھ کر دے گا)۔ اس آیت کا اصل مقصد ایک اصلاح یافتہ معاشرے کا قیام ہے۔ دنیا کے کسی دوسرے اخلاقی نظریہ نے اخلاق کی بنیاد پر تہذیب و معاشرے کے قیام کو اپنا مقصد نہیں بنایا۔ یہ خصوصیت اسی نظریہ اخلاق کو دوسرے نظریات سے ممتاز کرتی ہے۔

نتائج مطالب صالح انسان کا وجود ہر خیر و برکت کی کچی اور ہر مشکل کا حل ہے۔ سیاسی و اجتماعی مقصد کو لے کر دنیا میں مبعوث ہوئے کہ انسان کو انسان بنایا جائے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تعمیر سیرت اور مردم سازی کا کام اس سطح سے شروع کیا جہاں کسی نبی یا مصلح کو نہیں کرنا پڑتا تھا۔ اس لئے کہ دیگر انبیاء کو قوموں کی معاشرتی سطح، زمانہ جاہلیت سے بلند تھی، اس کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اس عظیم کام کو اس سطح تک پہنچا دیا جہاں تک کسی نبی نے نہیں پہنچایا تھا۔ آپ نے اس سطح سے کام شروع کیا جہاں حیوانیت کی انتہا اور انسانیت کی ابتداء ہوتی ہے۔ اور اس اعلیٰ سطح پر پہنچا دیا جو انسانیت کی انتہائی منزل ہے اور جس کے بعد نبوت کے سوا کوئی

اور درجہ پہن اور جسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے ختم کر دیا گیا ہے۔
 اُمّتِ محمدیہ کا ہر فرد اپنی ذات سے ایک مستقل معجزہ نبوت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی اور نفع
 انسانی کے اشرف و افضل ہونے کی ایک روشن دلیل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی دعوت
 و رسالت کے ذریعے ایسے صالح افراد پیدا کئے جو خدا پر ایمان رکھنے والے اللہ سے ڈرنے والے دیندار و امانتدار
 اور دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے والے تھے، گو یا دنیا ان کیلئے پیدا کی گئی ہے اور وہ آخرت کیلئے خلق
 ہوئے ہیں۔ چنانچہ جب یہ فرد تجارت کے میدان میں آتا تو راست باز اور امانت دار تا جبر ہوتا اگر اس
 کو فقر و فاقہ سے واسطہ پڑتا تو وہ ایک شریف و محنتی انسان نظر آتا۔ وہ جب مالدار ہوتا تو سخی و ہمدرد
 مالدار ہوتا۔ جب عدالت کی کرسی پر بیٹھتا تو انصاف کا دھن باتھ سے نہ چھوڑتا۔ وہ حاکم ہوتا تو مخلص اور
 امانت دار حاکم ہوتا اور جب وہ عوام کے مال کا امانتدار بنتا تو ایماندار محافظ ثابت ہوتا۔

انہی ایشیوں سے اسلامی معاشرت کی عمارت بنی تھی اور اسلامی حکومت انہی بنیادوں پر قائم
 ہوئی تھی۔ یہ معاشرہ جیسے آپ کی تربیت نے کھنکھایا تھا، انسانیت کی پوری تاریخ میں بہترین انسانی
 معاشرہ ثابت ہوا۔ اور یہ تمام انسانی محاسن کا جامع تھا۔ اس معاشرے کا تعارف اس کے
 ایک فرد حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نہایت بلیغ اور جامع الفاظ میں
 اس طرح کرایا ہے:-

”وہ لوگ تمام لوگوں میں پاکیزہ ترین دل، عمیق ترین علم اور کم سے کم تکلف والے
 تھے۔ ان کو اللہ نے اپنے نبی کی صحبت و برکت اور دین کی سر بلندی کے لئے منتخب
 فرمایا تھا“ (مسند دارمی)

۴۔ تعمیر سیرت کے اسلامی اصول اور طریقہ

۱۔ اسلام اور تعمیر سیرت | جملہ مذاہب کی غرض و غایت یہ بتائی جاتی ہے کہ انسان کی
 سیرت و کردار کی تشکیل و تعمیر کی جائے اور اُسے صحیح معنی
 میں انسان بنایا جائے۔ دین اسلام جس طرح دیگر امور میں مذاہب عالم پر برتری رکھتا ہے اسی
 طرح تعمیر سیرت و کردار کے سلسلہ میں بھی یہ فوقیت اُسے حاصل ہے۔ دین اسلام کی دعوت و
 تبلیغ کے لئے جس داعی اعظم کو مبعوث کیا گیا اُس کی شان میں فرمایا ”وَرَأٰتَكَ لَعَلِّي
 خَلَقْتُ عَظِيْمًا“ (القلم- ۴) ”آپ عظیم اخلاق کے مالک ہیں“
 سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے بارے میں فرمایا کہ ”مجھے تکمیل اخلاق کے لئے
 مبعوث کیا گیا ہے“ اس سے واضح ہوتا ہے کہ دین اسلام تعمیر سیرت و اخلاق کو کیا اہمیت دیتا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ضمن میں مزید کچھ کہنا غیر ضروری ہے۔ اب یہ دیکھنا باقی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بحیثیت معلم اخلاق کون سی خدمات جلیلہ انجام دیں۔

رسول اکرم بحیثیت معلم اخلاق | جو بات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیگر معلمین و مصلحین سے ممتاز کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زبان سے

زیادہ عمل سے تبلیغ فرمائی۔ انسان کی عملی سیرت کا نام خلق (اخلاق) ہے۔ قرآن کے سوا کسی اور مذہب کے صحیفے نے اپنے شارع کی نسبت اس بات کی کھلی شہادت دی ہے کہ وہ اپنے عمل کے لحاظ سے بھی بدرجہا بلند انسان تھا؛ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا سب سے روشن پہلو یہ ہے کہ آپ نے بحیثیت ایک پیغمبر کے اپنے پیروؤں کو جو نصیحت فرمائی اس پر خود عمل کر کے دکھایا۔

آپ نے لوگوں کو خدا کی یاد اور محبت کا درس دیا تو شب و روز میں کوئی لمحہ ایسا نہ تھا جب خدا کی یاد سے آپ کا دل اور خدا کے ذکر سے آپ کی زبان غافل ہو، اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے، سوتے جاگتے، پہنتے اڑھتے، ہر حالت میں اور ہر وقت خدا کا ذکر اور اس کی حمد زبان مبارک پر جاری رہتی تھی۔ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ ہر وقت اور ہر لمحہ خدا کی یاد میں مصروف رہتے تھے، آپ نے لوگوں کو نماز کا حکم دیا مگر خود آپ کا حال کیا تھا؟ عام پیروؤں کو پانچ وقت کی نماز کا حکم تھا مگر خود آٹھ وقت نماز پڑھتے تھے، طلوع آفتاب کے بعد اشراق، کچھ اور دن چڑھنے پر چاشت، پھر ظہر، عصر، مغرب، عشاء، پھر تہجد، پھر صبح کی نماز ادا کرتے۔ اور نماز بھی کیسی کہ رات بھر خدا کے حضور میں کھڑے ہی جتنی کہ کھڑے کھڑے پائے مبارک میں درم آجاتا۔ حضرت عائشہ عرض کرتیں ”اللہ نے تو آپ کو ہر طرح معاف کر دیا ہے، پھر اس قدر تکلیف کیوں اٹھاتے ہیں“ فرماتے ”اے عائشہ! کیا میں خدا کا شکر گزار بندہ نہ ہوں؟“ رکوع میں اتنی دیر جھکے رہتے کہ دیکھنے والے کہتے کہ شاید آپ سجدہ کرنا بھول گئے۔

آپ نے روزہ کا حکم دیا۔ عام مسلمانوں پر سال میں تیس دن کے روزے فرض ہیں مگر خود آپ کی کیفیت کیا تھی؟ کوئی مہینہ روزوں سے خالی نہیں جاتا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہتی ہیں۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم روزے رکھنے پر آتے تو معلوم ہوتا تھا کہ اب کبھی افطار نہ کریں گے۔ آپ نے مسلمانوں کو دن بھر سے زیادہ روزہ رکھنے کی ممانعت فرمائی مگر خود آپ کا یہ حال تھا کہ کبھی کبھی دو دو تین تین دن بغیر کھائے پیئے متصل روزے رکھتے اور اس عرصے میں ایک دانہ بھی منہ میں نہ جاتا تھا۔

آپ نے لوگوں کو زکوٰۃ و خیرات کا حکم دیا تو پہلے خود اس پر عمل کر کے دکھایا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی شہادت مشہور ہے ”یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ قرابت

دالوں کا حق پورا کرتے ہیں، مقرضوں کا قرض ادا کرتے ہیں، غریبوں کی مدد کرتے ہیں، بھانوں کی خاطر تواضع کرتے ہیں، ہمیشہ یہ آپ کا عمل یہ رہا کہ جو کچھ آتا سب خدا کی راہ میں خرچ کر دیتے حالانکہ غزوات اور فتوحات کی وجہ سے مال و اسباب میں کمی نہ تھی مگر وہ سب غیروں کیلئے تھا اپنے لئے کچھ تھا تو بس وہی فقر و فاقہ تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ آپ تمام لوگوں سے زیادہ سخی تھے۔ اور سب سے زیادہ سخاوت آپ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان المبارک میں فرماتے تھے۔ تمام عمر کسی کے سوال کے جواب میں ”نہیں“ کا لفظ نہیں فرمایا۔

حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ رات کو میں آپ کے ساتھ ایک راستے سے گزر رہا تھا۔ راہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ابوذر اگر اُمید کا یہ پہاڑ میرے لئے سونا ہو جائے تو کبھی میں پسند نہ کروں گا کہ تین راتیں گزر جائیں اور اس میں سے ایک دینار بھی میرے پاس رہ جائے، البتہ یہ کہ کسی قرض کے ادا کرنے کے لئے کچھ چھوڑ دوں۔ یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خوش نما الفاظ ہی نہ تھے، بلکہ عمل تھا۔ ایک دفعہ عصر کی نماز کے بعد خلاف معمول اندر تشریف لے گئے اور باہر آگئے۔ لوگوں کو تعجب ہوا، فرمایا ”مجھ کو نماز میں یاد آیا کہ سونے کا چھوٹا سا ٹکڑا گھر میں پڑا رہ گیا ہے، خیال ہوا، ایسا نہ ہو کہ رات ہو جائے اور محمد کے گھر میں پڑا رہ جائے۔“ اس سے بڑھ کر یہ کہ آپ مرض الموت میں ہیں، بیماری کی سخت تکلیف اور بے چینی ہے، لیکن اُسی وقت یاد آیا کہ کچھ اشرفیاں گھر میں پڑی ہیں۔ حکم ہوتا ہے کہ ”انہیں خیرات کر دو کیا محمد اپنے رب سے اس طرح ملے گا کہ اس کے پیچھے اس کے گھر میں اشرفیاں پڑی ہوں۔“

آپ نے زہد و قناعت کی تعلیم دی لیکن اس راہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا طرز عمل کیا تھا؟ آپ سُن چکے ہیں کہ عرب کے گوشہ گوشہ سے جزیہ، خراج، عشر اور زکوٰۃ و صدقات کے خزانے لدے چلے آتے تھے۔ مگر امیر عرب کے گھر میں وہی فقر تھا اور وہی فاقہ تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہا کرتی تھیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ مگر دو وقت بھی سیر ہو کر آپ کو کھانا نصیب نہ ہوا۔ جب آپ نے وفات پائی تو گھر میں اس دن کے کھانے کے لئے تھوڑے سے جو کے سوا کچھ موجود نہ تھا اور چند سیر جو کے بدلے میں آپ کی زرہ ایک یہودی کے یہاں رہن تھی۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ ”فرزند آدم کو ان چیزوں کے سوا اور کسی چیز کا حق نہیں۔ رہنے کو ایک جھونپڑا، تن ڈھانکنے کو کپڑا، پیٹ بھرنے کو روکھی سوکھی روٹی اور پانی۔“ یہ محض الفاظ کی خوشنمابندش نہ تھی۔ بلکہ یہی آپ کی طرز زندگی کا عملی نقشہ تھا۔ رہنے کا مکان ایک حجرہ تھا، جس میں کچی دیوار اور کھجور کے پتوں اور اونٹ کے بالوں کی چھت تھی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں، آپ کا کپڑا

کبھی تہہ کر کے نہیں رکھا جاتا تھا۔ یعنی جو بدن مبارک پر کپڑا ہوتا تھا اس کے سوا کوئی اور کپڑا ہی نہیں ہوتا تھا جو تہہ کیا جاتا۔ ایک دفعہ ایک سائل خدمتِ اقدس میں آیا اور عرض کیا کہ سخت بھوکا ہوں۔ آپ نے ازواجِ مطہرات کے پاس کھلا بھیجا کہ کچھ کھانے کو ہو تو بھیج دیں۔ ہر جگہ سے یہی جواب آیا کہ ”گھر میں پانی کے سوا کچھ نہیں ہے۔“ میں جب اسلام کی حکومت میں سے شام تک پھیلی ہوئی تھی، آپ کے توشہ خانہ کی مالیت یہ تھی کہ جسم مبارک پر ایک تہبند، ایک کھری چار پائی، سر ہانے ایک تکیہ جس میں خرے کی پھال بھری تھی۔ ایک طرف تھوڑے سے جو، کھونٹی میں پانی کا مشکیزہ اور بس!

آپ نے لوگوں کو ایثار کی تعلیم دی تو ساتھ ہی ان کے سامنے اپنا نمونہ پیش کیا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے آپ کی محبت معلوم ہے، مگر جب انہوں نے اپنی عسرت اور ننگدستی کی وجہ سے ایک خادمہ کی خواہش ظاہر کی تو کاٹنا نہ بتوت سے جواب ملا۔ ”اے فاطمہ! اب تک صفہ کے غریبوں کا انتظام نہیں ہوا ہے۔“ ایک دفعہ آپ کے پاس چادر نہ تھی۔ ایک صحابیہ نے لاکر پیش کی۔ اس وقت ایک صاحب نے کہا، کیسی اچھی چادر ہے۔ آپ نے فوراً اتار کر ان کی نذر کر دی۔ ایک صحابی کے گھر کوئی تقریب تھی مگر کوئی سامان نہ تھا۔ ان سے کہا، عائشہ کے پاس جا کر آٹے کی ٹوکری مانگ لاؤ۔ وہ گئے اور جا کر لے آئے، حالاں کہ آپ کے گھر میں اس آٹے کے سوا رات کے کھانے تک کو کچھ نہ تھا۔

غرض، تمام دنیا میں یہ فخر صرف اسلام کے پیغمبر کو حاصل ہے کہ وہ تعلیم اور اصول کے ساتھ اپنے عمل اور اپنی مثال کو پیش کرتا ہے۔ آخری حج کے موقع پر جب کہ شیخِ نبوت کے گرد ایک لاکھ پردانوں کا ہجوم تھا، انسانوں کو خدا کا آخری پیغام سنایا جاتا ہے۔ عرب کے باطل رسوم اور نہ ختم ہونے والی لڑائیوں کا سلسلہ توڑا جاتا ہے مگر تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنی ذاتی نظیر اور عملی مثال بھی ہر قدم پر پیش کی جاتی ہے:

”آج عرب کے تمام انتقامی خونِ باطل کر دیئے گئے یعنی تم سب ایک دوسرے کے قاتلوں کو معاف کر دو“ اور سب سے پہلے میں اپنے خاندان کا خون اپنے بھتیجے ربیعہ بن حارث کے بیٹے کا خون معاف کرتا ہوں۔ جاہلیت کے تمام سودی لین دین اور کاروبار آج باطل کئے جاتے ہیں اور سب سے پہلے میں اپنے چچا عباس بن عبدالمطلب کا سودی بیوپار توڑتا ہوں۔“

بہر حال آدم علیہ السلام سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام تک اور شام سے لے کر ہندوستان تک ہر ایک تاریخی انسان کی مصالحتِ زندگی کا جائزہ لیا جائے لیکن ایسا معلمِ اخلاق جو ان صفات کا حامل ہو آپ کو کہیں نہیں ملے گا۔

۵۔ حضور کی سیرت کے اثرات و نتائج | اخلاقی معلم کے کمال کی ایک شرط یہ ہے کہ اُس کی تعلیم میں یہ تاثیر ہو کہ وہ دوسروں کو

بھی اپنے فیض سے بہرہ مند کر سکے یعنی وہ خود کامل ہو اور دوسرے ناقصوں کو بھی کامل بناتا ہو۔ وہ خود پاک ہو اور دوسرے ناپاکوں کو بھی پاک و صاف کر دیتا ہو۔ تمام محلمین اخلاق کی فہرست پر ایک نظر ڈال جائیے اور دیکھئے کہ تکمیل کی یہ شان سب سے زیادہ کس میں تھی؟ کیا اُس میں جس کو قدم قدم پر بنی اسرائیل کی سنگدلی اور کج روی کا گلہ کرنا پڑا۔ (یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام) کیا اس میں جس کے پورے گیارہ شاگرد بھی امتحان کے وقت پورے نہ اُتر سکے (یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام) یا اُس میں تھی جس کی نسبت اُس کے صحیفہ وحی نے بار بار اعلان کیا:

”يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ“ (المجموعہ ۱۲) | وَهُ أُن كُو خَدَا كِي آيَتِيْن مُنَاتَا، اُنْ پَاك و صَا ف كَرْتَا اور اُن كُو كِتَاب و حَكْمَت سَكْهَاتَا هِي۔

اس اعلان میں صرف یہی بات نہیں کہ دین اسلام کا معلم اعظم لوگوں کو اللہ کے احکام سناتا ہے۔ بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ اُن کو اپنے فیض و اثر سے پاک و صاف بھی بنا دیتا ہے وہ ناقصوں کو کامل، گنہگاروں کو نیک، اندھوں کو بینا اور تاریک دلوں کو روشن دل بنا دیتا ہے، چنانچہ جس وقت اُس نے اپنی حیات طیبہ کا کارنامہ ختم کیا کم از کم ایک لاکھ انسان اُس کی تعلیم سے عملاً بہرہ مند ہو چکے تھے۔ اور وہ عرب جو اخلاق کے پست ترین نقطہ پر تھا تبس برس کے بعد وہ اخلاق کے اُس اوج کمال پر پہنچا جس کی بلندی تک کوئی ستارہ آج تک نہ پہنچ سکا۔

ایک معلم کا فرض صرف اپنی ذات ہی کو آگ سے بچانا نہیں بلکہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی بچانا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صریح طور سے تمام مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا ”كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ“ یعنی تم میں سے ہر ایک دوسرے کا ذمہ دار اور نگران ہے اور اُس سے اس کی ذمہ داری اور نگرانی میں آئے ہوئے لوگوں کی نسبت پوچھا جائے گا۔ امیر اپنی رعیت کا چرواہا، مرد اپنے اہل و عیال کا رکھوالا، اور بیوی اپنے شوہر کے گھر کی نگہبان ہے۔ (صحیح بخاری ج ۲ کتاب النکاح ص ۸۳)

۶۔ صحابہ کرام کی ایمانی تربیت | ان احکام کے پیش نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کی ایمانی تربیت فرماتے رہے۔ قرآن برابر اُن کے قلوب کو

طاقت اور گرمی بخشتا رہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس سے ان کو استحکام، خواہشات نفس پر قابو و رنلئے الہی کی سچی طلب اور اس کی راہ میں اپنے کو مشائخ عادت، جنت سے عشق، علم کی حرص دین کی سمجھ اور احتساب نفس کی دولت حاصل ہوئی۔ مسلمانوں کی طبیعتوں کا یہ زبردست انقلاب ہو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر انجام پایا اور مسلمانوں کے ذریعہ سے انسانی معاشرہ میں پیش آیا، انسانی تاریخ کا ایک انوکھا واقعہ تھا۔ اس انقلاب کی ہر چیز نرالی اور انوکھی تھی۔

امانت و دیانت: تاریخ طبری کی روایت ہے کہ مسلمان جب مدائن پہنچے اور مال غنیمت جمع کرنے لگے تو ایک شخص اپنے جھنڈا مال غنیمت لایا اور خازن کے سپرد کر دیا۔ لوگوں نے کہا ایسا قیمتی سامان تو دیکھنے میں نہیں آیا۔ ہمارے پاس جو مال ہے اُس کو اس سے کچھ نسبت نہیں۔ اُن لوگوں نے اُس شخص سے دریافت کیا کہ تم نے اس مال میں سے کچھ لیا بھی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ خدا کی قسم اگر اللہ کا ذکر نہ ہوتا تو تم کو اس کی خبر بھی نہ ہوتی۔ ان لوگوں نے اندازہ کر لیا کہ یہ چوری شخص نہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ اُس نے کہا میں یہ نہیں سنا سکتا اس لئے کہ تم غریف کرو گے۔ میں تعریف اللہ کی ہے۔ اسی لئے میں خدا کے دیئے ہوئے اجر و ثواب پر راضی ہوں۔ (تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۶)

شعبان احمد شاہ: آئندہ کے عقیدے نے مسلمانوں کے قلوب میں ایسی شجاعت بھری تھی کہ گویا وہ جنت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں۔ معرکہ اُحُد میں جب کہ بہت سے مسلمان میدان چھوڑ چکے تھے، حضرت انس بن نصر آگے بڑھے انہوں نے سعد بن معاذ کو سامنے دیکھا تو کہنے لگے اے سعد بن معاذ! خدا کی قسم جنت کی خوشبو اُحد پہاڑ کی طرف سے آ رہی ہے۔ انس بن مالک کہتے ہیں کہ ہم نے اسی سے زیادہ زخم اُن کے جسم پر پائے، کچھ تلوار کے تھے اور کچھ تیروں کے، ہم نے اُن کو اس حال میں دیکھا کہ مشرکین نے جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا، جس کی وجہ سے سوائے ان کی بہن کے۔ جس نے اُن کو انگلی کے پور سے شناخت کیا۔ اور کوئی نہ پہچان سکا۔ (صحیح بخاری و مسلم)

غزوہ بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب فرمایا، ”برھو اس جنت کی طرف جس کی وسعت زمین و آسمان کے برابر ہے، تو عمر بن خطاب انصاری نے کہا یا رسول اللہ کیا اُس کی وسعت زمین و آسمان جیسی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں کیا تم کو شک ہے؟ کہنے لگے نہیں یا رسول اللہ میری یرثتا تھی کہ میں اُس کو پالیتا۔ آپ نے فرمایا ہاں ہاں پالو گے۔ وہ کھجور کے چند دانے نکال کر کھانے لگے، پھر بولے اگر ان کھجوروں کے کھالینے کا انتظار کروں تو بہت سا وقت لگے گا۔ پھر تمام کھجور الگ پھینکے اور میدان میں کود پڑے اور نہاد پائی۔ (صحیح مسلم)

ابو بکر بن ابوموسیٰ اشعری راوی ہیں کہ میرے والد دشمن کے مقابل تھے اور فرما رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جنت کے دروازے تلواروں کے سایہ میں ہیں۔ یہ سن کر ایک شخص اٹھا، اُس کا لباس نہایت بوسیدہ تھا اُس نے کہا ابوموسیٰ تم نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے؟ انہوں نے جواب دیا ہاں! وہ شخص اپنے ساتھیوں کے پاس گیا

اور کہا میرا سلام قبول ہو اور تلوار کا غلاف توڑ کر ڈال دیا اور تلوار لے کر دشمن کے مقابلہ میں آگئے اور شہادت پائی۔ (صحیح مسلم)

اُحد کے روز ابوجہان نے اپنی بیٹھک کو رسول اللہ کے لئے ڈھال بنا دیا تھا۔ تیرا اس پر لگتے تھے اور وہ حرکت نہ کرتے۔ ابوجہان جب مدینہ آئے اور اپنی بیٹی اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ ایوبؓ کے پاس پہنچے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر پر بیٹھنا چاہا تو انہوں نے اس کو پلٹ دیا۔ ابوجہان نے کہا اے بیٹی! مجھے خبر نہیں کہ تم نے بستر میرے لائق نہ سمجھا۔ یا مجھ کو اس کے لائق نہ سمجھا۔ انہوں نے کہا انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر سچا ہے اور تم شرک ہو نے کی وجہ سے نجس ہو۔ (سیرت ابن ہشام)

عروہ بن مسعود ثقفی نے حدیث نبی سے واپسی کے بعد مشرکین کو کہہ کر کہا کہ لوگو! ابیاسیلاطین کے یہاں گیا کہ عربی، قسری، رنجاشی کے دربار میں دیکھے۔ خدا کی قسم میں نے ابیاسیلاطین کو دیکھا جس کے ساتھ اس کی اتنی عزت کرتے ہوں جتنے محمد کے ساتھ محمد کی۔ خدا کی قسم یہ وہ شخص ہے جس کے لئے قرآن میں سے کسی شخص کے ہاتھ پر گستاخ ہے وہ اپنے چہرے اور جسم پر ملتا ہے۔ اور جب وہ اُن کو حکم دیتے ہیں تو وہ سب اُن کے حکم پر چلتے ہیں۔ اور جب وہ وضو کرتے ہیں تو اس کے پانی پر لڑتے رہ جاتے ہیں، اور جب بات کرتے ہیں تو وہ اپنی آوازیں بست کر لیتے ہیں اور وہ غرطہ ادب سے آپ پر گہری نظر نہیں ڈال سکتے۔ (سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۱۲۵)

صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) دین کے بارے میں بڑے خوش قسمت واقع ہوئے تھے کہ دین کے بارے میں انہوں نے رسول اللہ کی تعلیم پر پورا اعتماد کیا اور اپنی محنت و کاوش کو پوری احتیاط کے ساتھ دین و دنیا کے مفید میدانوں میں صرف کیا۔ نوع انسانی کے افراد ایک خاندان میں تبدیل ہو گئے وہ سب ایک باپ کی اولاد تھے اور آدم کی اصل مٹی سے ہے۔ نہ کسی عرب کو کسی عجمی پر فضیلت تھی اور نہ کسی عجمی کو کسی عرب پر فضیلت تھی تو محض تقویٰ کی بناء پر۔

درحقیقت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کی کبھی انسانی فطرت کے فعل پر رکھ دی تھی بس وہ کھل گیا اور اُس کے تمام خزانے عجائبات، طاقتیں اور کمالات دنیا کے سامنے آ گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جاہلیت کی رگ کاٹ دی اور اس کے ظلم کو پاش پاش کر دیا۔ آپ نے سرکش اور ضدی دنیا کو خدا کی طاقت سے مجبور کر دیا کہ زندگی کی ایک نئی شاہراہ پر گامزن اور تاریخ میں انسانیت کے ایک بالکل نئے دور کا آغاز کرے۔ یہ وہ اسلامی دور ہے جو تاریخ کی پیشانی پر ہمیشہ دکھتا رہے گا۔

۳۔ تدبیر منزل

۱۔ معاشرتی زندگی | انسان ایک معاشرتی حیوان ہے، یا یوں کہیے کہ ہمیشہ سے مدنی الطبع ہے اور اپنی فطرت میں جماعتی زندگی کا محتاج ہے بغیر جماعت کے اس کی زندگی ناممکن ہے۔ انسان اپنی بیدارش سے لے کر موت تک معاشرے کا محتاج ہے۔ اس کا جسم، عقل اور خلق جیسے اہم عطیات بھی ”خالق کائنات“ جماعتی علائق ہی کے لئے عطا فرماتا ہے۔ دنیا میں آتے ہی وہ ایک خاندان میں آنکھیں کھولتا ہے۔ اپنی پرورش کے لئے دوسرے لوگوں (ماں، باپ، بھائی بہن یا رشتہ داروں) کا محتاج ہوتا ہے۔ پھر ہوش سنبھالتے ہی اس کو ایک سوسائٹی سے، ایک برادری سے، ایک بستی سے، ایک قوم سے، ایک نظام تمدن اور نظام معیشت و سیاست سے واسطہ پیش آتا ہے۔ نیز ”فرد“ یا ”انسان“ اپنی ہر متعلقہ شے مثلاً خوراک، لباس، مکان اور زندگی کے دوسرے ہر شعبے میں جماعت کا ”دست نگر“ ہے۔ اور اگر اس سے وہ تمام علائق حذف کر دیئے جائیں جو جماعت کی بدولت اس کو حاصل ہوتے ہیں تو پھر اس کے پاس کچھ بھی باقی نہیں رہتا اور اس کی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔ انسان کے اعمال، اغراض، اور عادات کی جماعتی زندگی کے بغیر کوئی قیمت نہیں ہے۔

تھوڑے سے غور و فکر سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ ہر ایک فرد یا انسان دوسروں کی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے اور ان سے متاثر بھی ہوتا ہے اور اس لئے اس کو فطری طور پر مدنی الطبع تسلیم کر لینا بے دلیل نہیں ہے۔ چنانچہ جماعت کا وجود افراد جماعت پر موقوف ہے اور افراد جماعت میں سے ہر فرد کا نفع و نقصان جماعت کے نفع و نقصان پر اثر انداز ہوتا ہے اور دونوں ایک دوسرے کے سہارے قائم ہیں۔ چھوٹی جماعتوں سے لے کر بڑی جماعتوں تک ہر جگہ یہ تعلق موجود ہے۔ مثلاً سب سے چھوٹی جماعت خاندان اور کنبہ ہے جو والدین، اولاد اور قریبی اعزہ سے بنتی ہے اور جن میں باہمی اعتماد اور خدمت گزاری کا معاملہ رہتا ہے۔ اس کی حیثیت بالکل انسانی جسم کی طرح ہے کہ اگر ایک عضو کو مضرت پہنچ جاتی ہے تو تمام اعضا تکلیف محسوس کرتے ہیں۔ مثلاً ایک لڑکا بد طینت ہو جائے تو وہ سارے کنبہ کو سعادت و خوش بختی سے محروم کر دیتا ہے یا اگر باپ شرابی یا جواری ہو

تو اس کی یہ خصلت بد پورے کنبے کی معاشرت کو تنگ اور گھر کے پورے مالی و انتظامی نظام اور ماحول کو درہم برہم کر دیتی ہے۔ پھر کنبے سے بڑی جماعتوں میں بھی صورت حال مختلف نہیں ہے۔ مثلاً ”مدرسہ“ جہاں طلبہ، مدرسین، اور عملہ ایک جسم واحد ہیں۔ ان میں ہر شخص اپنے شخصی عمل سے مدرسے کی عظمت و پستی کا باعث بن سکتا ہے۔

یہی حال ایک بڑی جماعت یا گروہ کا ہے کہ ایک فرد کا کوئی نمایاں کام ساری ”جماعت“ یا ”ہجرہ“ کی قدر و قیمت کو بڑھا دیتا ہے، اور ایک شخص کی ہی دعائے سے پوری جماعت یا ہجرہ کی ذلت و رسوائی ہو جاتی ہے۔ مثل مشہور ہے۔ ”ایک مردہ مچھلی سارے تالاب کو کندہ کر دیتی ہے“ پھر ان اجتماعی علاقوں میں ملت یا قوم ایک بڑا علاقہ ہے جو دین یا زبان یا تمدن کے ذریعے وحدت کا داعی ہے۔ اس راہ سے تمام افراد پر ایک ہی قانون عائد کرتا ہے، اور اس کے تمام افراد پر ایک ہی قانون عائد کرتا ہے۔

اس کے تمام افراد نفع و نقصان میں مشترک ہوتے ہیں۔ اور ”ملت“ جو جغرافیائی حدود سے بالاتر ہے اور دین کے رشتے سے انسانوں میں اخوت عام کے تعلق کو استوار کرتی ہے اس کی وحدت اجتماعی تو اس قدر دور رس ہے کہ اگر حقیقی وحدت اسی کو کہا جائے تو بجا ہے۔ جس طرح جسم کو اس کا کوئی عضو فائدہ یا نقصان پہنچاتا ہے اسی طرح قوم اور امت کو بھی اپنے افراد سے نفع و نقصان حاصل ہوتا ہے۔ طلبہ، مدرسین، تاجر، کاشت کار، صنعت کار، بڑھئی وغیرہ سب قوم کے اہم افراد ہیں جو اس کا جسم سنوارتے اور بناتے ہیں اور اس کے نفع و نقصان پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور یہ اثر انسان کے اچھے اور بُرے اعمال کے مختلف درجات کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے۔ قوم کی ترقی کا پیمانہ اس کے افراد کے مجموعہ اعمال کے اعتبار سے ہی بنتا ہے۔ اب اس سے آگے بڑھیے۔ ”تمام عالم انسانی“ جنس، رنگ، روپ، بول چال اور مذہب کے اختلاف کے باوجود ایک ہی جسم ”انسانیت“ کے افراد و اعضاء ہیں۔ اسی لئے ہر قوم دوسری اقوام پر اثر ڈالتی ہے اور صنعت و حرفت، تجارت، معارف و علوم و اخلاق میں ایک دوسرے کو متاثر کرتی رہتی ہے۔ اقوام کے درمیان خصائل و عادات کا طبعی اختلاف فی الحقیقت ان کے درمیان الفت و محبت پیدا کرنے سے مانع نہیں ہے۔ جس طرح ایک کنبے کے افراد میں مرد و عورت کا تند و نرم ہونا ان کی یکتائی اور ان کے جسم کے واحد ہونے کے منافی نہیں ہے۔

غرض معاشرے کے یہ بے شمار روابط ہیں جو ایک انسان کو دوسرے انسانوں سے جوڑے ہوئے ہیں۔ ان ہی کی درستی پر، ایک ایک انسان کی، ایک ایک معاشرے کی اور

مجموعی طور پر تمام انسانوں کی فلاح و بہبود کا انحصار ہے۔ اور وہ صرف خدا ہی ہے جو انسانوں کو ان روابط کے لئے صیغ اور منصفانہ اور پائدار اصول اور حدود بتاتا ہے۔ جہاں انسان اس کی ہدایت سے بے نیاز ہو کر خود مختار بننا اور اس نے بزعم خود انصاف کرنا چاہا تو پھر نہ تو کوئی مستقل اصول باقی رہتا ہے اور نہ انصاف و راستی۔ اس لئے کہ خدا کی رہنمائی سے محروم ہوجانے کے بعد نفسانی خواہش اور ناقص علم و تجربہ کے سوا کوئی چیز ایسی باقی نہیں رہتی جس کی طرف انسان رہنمائی کے لئے رجوع کر سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جس سوسائٹی کا نظام لادینیت یا مذہب سے انحراف کے اصولوں پر قائم ہوتا ہے، اس کے اصول غیر مستقیم ہوتے ہیں اور روتہ بنتہ یا ٹوٹتے رہتے ہیں۔ انسانی تعلقات کے ایک ایک گوشے میں ظلم، نا انصافی، بے ایمانی اور آپس کی بے اعتمادی پیدا ہونے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ تمام انسانی معاملات میں انفرادی، طبقاتی، قومی اور نسلی خود غرضیاں اور انتشار و رونا ہوا جاتا ہے اور دو انسانوں کے تعلق سے لے کر قوموں کے تعلق تک کوئی رابطہ ایسا نہیں رہتا جس میں کجی نہ آ جاتی ہو۔

۲۔ خاندان کا نظام | اسلام اپنا ایک مضبوط اور پائدار نظام معاشرت رکھتا ہے جس کے اصول و ضوابط مستقل و محکم ہیں، جس کا پورا مزاج

عدل و انصاف سے مرکب ہے، اور جس کے تمام اجزاء باہم مربوط و ہم آہنگ ہیں۔ یہ نظام ایسا جامع و ہمہ گیر ہے کہ زندگی کے تمام مظاہر اور ہر طرح کی سرگرمیاں اس کے دائرے میں آ جاتی ہیں۔ یہ انسان کے قلب و ضمیر اور اس کے معاملات زندگی دونوں پر محیط ہے اور اپنی ہدایات اور قانون سازی میں دین اور دنیا دونوں پر حاوی ہے۔ معاشرہ افراد کے مجموعے کا نام ہے اس لئے اسلام جہاں جماعتی اور معاشرتی اصلاح کرتا ہے وہیں فرد کو بھی نظر انداز نہیں کرتا بلکہ اس کی اصلاح کو نقطہ آغاز قرار دیتا ہے کیوں کہ وہ معاشرے کی بنیادی اکائی ہے اور اس کی اصلاح معاشرے کا سدھار ہے۔ اس لئے اس کی نظر میں فرد اور سماج دونوں کی اصلاح و تربیت یکساں اہمیت رکھتی ہے۔

اسلام ہر فرد کی جداگانہ شخصیت کا قائل ہے۔ وہ انسان کو محض نظام اجتماعی کا ایک بے جان اور معطل پرزہ یا ماحول کا ایک پر تو محض نہیں سمجھتا بلکہ اسے معاشرے کا انتہائی اہم جزو اور اصل "تاریخ ساز" قرار دیتا ہے۔ وہ ایک طرف تو اس میں یہ احساس بیدار کرتا ہے کہ انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار اور اپنی پوری زندگی کے لئے خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔ خدا کے سامنے ہر فرد کی ذمہ داری انفرادی ہے۔ اور اس طرح خود معاشرے میں بھی ہر فرد کی شخصیت کے تحفظ اور نشو و ارتقا کا پورا پورا موقع ہونا چاہیے۔

”مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا“ (حکم سجدہ - ۴۶)

جس کسی نے نیک کام کیا تو اپنے لئے کیا اور جس کسی نے برائی کی تو خود اس کے آگے آئے گی۔

ایک حدیث میں انسان کی زندگی کو اس طرح ذمہ دار بنایا گیا :

کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ (بخاری)

تم میں سے سب گلہ بان (ذمہ دار اور نگران) ہیں اور ہر ایک گلہ بان سے اس کے گلہ (ذمہ داری) کے بارے میں باز پرس ہوگی۔

اور اس احساس ذمہ داری کے پیدا کرنے کے بعد دوسری طرف ضرورت اس امر کی ہے کہ بندے کا ایمان خدا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اور آخرت پر برابر تازہ کیا جاتا رہے۔ اس سلسلے میں علم دین سے واقفیت سب سے اہم ہے۔ چنانچہ اسلام حصول علم کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تو یہ دعا مستقل طور پر سکھائی گئی کہ

”وَقُلْ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا“ (لکھ - ۱۴۴)

اور کہیئے (دعا کیجئے) کہ پروردگار! میرے علم میں زیادتی فرما۔

اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

”طالب العلم فريضة على كل مسلم“ (ابن ماجہ)

علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

چنانچہ امام غزالی فرماتے ہیں کہ دین کا اتنا علم کہ اسلام کیا ہے اور اس کے بنیادی معاملات کیا ہیں فرض عین کا درجہ رکھتا ہے۔ پھر علم دین کے ساتھ ساتھ اس علم کا حصول بھی واجب ہے جو زندگی کے قیام اور تمدن کے فروغ کے لئے ضروری ہے۔ گویا اسلام ایک فرد کو ایسے خطوط پر چلانا چاہتا ہے جس پر اس کے استحکام اور عملی زندگی کی تعمیر کا انحصار ہے۔

علم دین کا ایک بڑا مقصد عملی زندگی کی اصلاح ہے۔ اس لئے اسلام ہر فرد میں جذبہ عمل بیدار کرتا ہے، اور سعی و جدوجہد کی اہمیت اس کے ذہن پر نقش کرتا ہے۔

”وَأَنْ تَكُنْ مِنَ الْفَاسِقِينَ“ (النجم - ۳۹)

انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ”جو کوشش کرے گا اس کو اس کی کوشش کا پھل ملے گا اور ہر کوشش کرنے والے کو کچھ نہ کچھ ملتا ہے“ ایک حدیث میں ارشاد ہے ”کوشش کرو، اس لئے کہ اللہ نے تم پر کوشش فرض کی ہے“ جذبہ عمل کو بیدار کر کے اسلام فرد میں یہ احساس بھی پیدا کرتا ہے کہ ایمان کا لازمی تقاضا ہے کہ وہ اچھے اعمال کرے کیونکہ

وہ ایمان جس کے نتیجے میں اچھے اعمال (اعمال صالحہ) رونما نہ ہوں اس بیچ کی طرح ہے جو بار آور نہ ہو سکے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ارشاد ہے، ”ایمان، دل سے تصدیق، زبان سے اقرار اور اعضاء سے عمل کا نام ہے“ اور ”اللہ ایمان کو بغیر عمل اور عمل کو بغیر ایمان قبول نہیں کرتا“ گویا ایمان و عمل لازم و ملزوم ہیں۔

فرد کی اصلاح کا ایک موثر ترین ذریعہ اور اس کی تربیت کا ایک مستقل نظام اسلامی عبادات ہیں جس کا اسلام نے ایک مفصل پروگرام دیا ہے اور جس میں کسی کی بیشی کی ضرورت نہیں کیوں کہ افراط و تفریط سے بچانا بھی اسلام کا ایک خاصہ ہے۔ اس کے نزدیک فرد کو نہ صرف دنیا کا ہو کر رہ جانا چاہیئے۔ دنیا داری اور دنیا سے اجتناب، دونوں سے بچنا ضروری ہے۔ اس لئے اعتدال کی راہ سب سے بہتر ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہیں ”ہر ایک کام میں اوسط درجہ (اعتدال کی راہ) بہتر ہے“ اسلام ہر فرد میں میاں زوی کی صفت دیکھنا چاہتا ہے۔

پھر اسلام کی نظر میں چوں کہ امت مسلمہ کی حیثیت ”امت وسط“ اور خیر امت کی ہے اس لئے وہ ہر فرد پر یہ ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ وہ اقامت دین کی جدوجہد کرے۔ اور اپنی زندگی کو دنیا کمانے کے بجائے دین کو قائم کرنے کے لئے وقف کر دے اور اس راہ میں جس قربانی کی بھی ضرورت پڑے اسے پیش کرنے سے بالکل دریغ نہ کرے۔

سورہ توبہ رکوع ۶ میں مومنوں کو حکم دیا گیا ہے کہ دین کی دعوت اعلیٰٰ علیہ السلام کی لئے ہوئی چاہئے۔

”إِنْفِرُوا خِفَافًا وَثِقَالًا وَجَاهِدُوا
بِمَا مَوَالِكُمْ وَانْفُسُكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ“

گھروں سے نکلو اور چل پڑو خواہ تم ہلکے ہو یا بھاری ہو، اور اللہ کی راہ میں جان اور مال سے کوشش کرو (جہاد) کرو۔

توبہ - آیت (۴)

یہاں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ دین اسلام کے قیام سے دنیا میں بھی فلاح حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اسلام میں اعتدال اور زندگی کی ضروریات کی پوری رعایت موجود ہے۔

یہ وہ موٹی موٹی باتیں ہیں جو ایک فرد کی اصلاح کیلئے اسلام کو مطلوب ہیں۔

۳۔ معاشرتی اصلاح | جیسا کہ پہلے کہا گیا، اسلام انفرادی اصلاح کے ساتھ ساتھ اجتماعی زندگی کی تعمیر و تشکیل کے لئے بھی واضح ہدایت اور سوچا سمجھا منصوبہ دیتا ہے۔ اس کے نزدیک معاشرے کی اصلاح اتنی ہی ضروری ہے جتنی خود فرد کی اصلاح۔ اس کے برعکس جدید مغربی تحریکات کی سب سے

بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ محض خارج میں تبدیلی کمرے کے نظام زندگی میں انقلاب لانا چاہتی ہیں۔ انہوں نے فرد کو نظر انداز کیا۔ نتیجتاً ان کا اصلاحی پروگرام کامیاب نہ ہو سکا۔ دوسری طرف مشرق کے مذہبی نظاموں نے نہ صرف فرد کی اصلاح کی اور اس کی روح کو جلا بخشنے کے پروگرام بنائے لیکن اجتماعی زندگی کی درستگی سے بالکل صرف نظر کیا، اور نتائج کے اعتبار سے یہ نظام بھی ناکام رہے لیکن اسلام دونوں کو یکساں اہمیت دیتا ہے۔

عمومی طور پر اسلام ایک ایسے معاشرے کا طالب ہے جو ہمہ گیر، مصنوعی اختلافات سے پاک، تعصبات و مکروہات سے منزہ، نسل، رنگ، وطن اور زبان کی حد بندیوں اور جغرافیائی سرحدوں سے پرے، مساوات، اجتماعی عدل و انصاف اور ایک عالمگیر برادری کی بنیاد پر قائم ہو اور ایک فکری، اخلاقی، نیز اصولی معاشرہ ہو جس کے افراد میں باہم ہمدردی انسانیت، اور مواساتہ کا رشتہ ہو۔ اس سلسلے میں وہ حسب ذیل بنیادیں فراہم کرتا ہے۔

۴۔ نظام معاشرت کی بنیادیں | ۱۔ مساوات: اسلامی معاشرے کی

سب سے پہلی اور سب سے اہم خصوصیت اور اس کا سنگ بنیاد یہ ہے کہ سب انسان ایک نسل سے ہیں پوری انسانیت آدم کی اولاد ہے۔ رنگ، زبان، نسل، قبیلہ، برادری، ملک، قوم کی فطری تقسیم باہمی تعارف کے لئے ہے۔ لیکن ان اختلافات کی وجہ سے تعصب یا تفریق یا امتیاز اور اونچ نیچ پیدا کرنا غلط ہے، کیوں کہ اسلام مساوات انسانی اور وحدت انسانی کی بنیاد پر اپنے تمام معاشرتی تعلقات استوار کرتا ہے۔ قرآن میں ہے:

”يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَىٰ“

(الحجرات - ۱۳)

ایک دوسری جگہ ہے:

”يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً“ (النساء - ۱)

لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا پھر تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ ایک دوسرے کی شناخت کر سکو، تم میں سب سے زیادہ باعزت اور فضیلت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے۔

لوگو! اپنے رب سے ڈرو، وہ رب جس نے تم کو اکیلی جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کر دیا پھر ان دونوں کی نسل سے مردوں اور عورتوں کی ایک بڑی تعداد دنیا میں پھیلا دی۔

ایک حدیث میں ہے ”لوگو! بے شک تمہارا رب ایک ہے اور بے شک تمہارا باپ ایک ہے۔ اور ماں! عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر، سفید کو سیاہ پر اور سیاہ کو سفید پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ مگر (بخاری، ترمذی کے) ”کہ وہی وجہ امتیاز ہے۔ ایک دفعہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا ”لوگو! تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے“

نظریہ توحید صرف نظام کائنات میں وحدت اور ایک خدا ہی کا تصور پیش نہیں کرتا بلکہ وحدت انسان کا تصور بھی اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ شان وحدت کی حامل یہ کائنات ایک ہی ارادے کا فیض ہے۔ انسان اسی کائنات کا ایک جزو ہے۔ جو دوسرے اجزاء سے مربوط ہے۔ فرداً فرداً نظام کائنات سے ہم آہنگ و مربوط ہونے کا لازمی تقاضا ہے کہ افراد انسانی باہم بھی ہم آہنگ اور مربوط ہو کر رہیں۔ اس بنا پر اسلام وحدت انسانیت کے نظریے کا قائل ہے۔ اس وحدت کے اگر اجزاء مختلف ہیں تو یہ بھی اتفاق، اتحاد ہی کی خاطر اور متفرق ہیں تو اسی لئے کہ مجتمع ہو سکیں مختلف راہیں اختیار کر کے ایک دوسرے سے تعاون سب کی منزل مقصود ہے۔ غرض انسان بحیثیت ایک نوع بھی وحدت ہے اور بحیثیت فرد بھی۔

اسلام کے اس تصور انسانیت کے ہوتے ہوئے ظاہر ہے کہ تمام انسان صاحب عز و شرف ہیں اور سب کا سلسلہ ایک ہی ماں باپ پر منتهی ہوتا ہے۔ اس لئے نہ تو یہ جائز ہے کہ کسی کو ہدف تعریض بنایا جائے، نہ کسی قسم کا لونی، نسلی، وطنی، لسانی امتیاز کوئی حیثیت رکھتا ہے۔ شاہانہ خون کا دعویٰ آپ سے آپ باطل ہو جاتا ہے۔ ہر قسم کی عصبیت خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔ ماں آدمی کو بزرگی صرف اس وجہ سے حاصل ہوگی کہ اس کے اخلاق زیادہ اچھے ہیں اور وہ خدا ترسی میں دوسروں سے زیادہ بڑھا ہوا ہے۔

۲۔ اخوت: تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ دین کا رشتہ تمام مسلمانوں کو ایک وحدت میں جوڑ دیتا ہے:

وہ لوگ جو مومن (اللہ پر ایمان رکھنے والے) ہیں	”إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ“
آپس میں بھائی بھائی ہیں۔	(الحجرات - ۱۰)
سب مل جل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پھامے	”وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا“
رہو اور جدا جدا نہ ہو جاؤ۔	(آل عمران - ۱۰۳)

ایک حدیث میں ہے ”ایک مومن دوسرے مومن کے لئے ایسا ہے جیسے دیوار (یا بنیاد) کہ ہر جزو (اینٹ) دوسرے جزو کو تقویت پہنچاتا ہے“ ”تو اللہ پر ایمان رکھنے والوں کو ایک دوسرے سے رحم اور محبت اور مہربانی میں ایسا دیکھے گا، کہ جیسے بدن (کہ) ایک عضو (بدن کا)

مریض ہو جائے تو سارے اعضا بخار اور درد و کرب کے ساتھ شب بیداری میں اس کے شریک (مبتلا) ہو جاتے ہیں۔

اس طرح ایک عقیدہ ہے اور ایک اخلاقی ضابطہ کو تسلیم کرنے والے اسلامی معاشرہ تعمیر کرتے ہیں جس میں انسان اور انسان کے ملنے کی بنیاد پر یہ عقیدہ و ضابطہ ہوتی ہے جو انہیں تسلیم کرے۔ تو وہ خواہ کسی نسل، کسی رنگ، کسی زبان کا ہو اس معاشرے میں شامل ہوگا، اس میں سب کے حقوق اور معاشرتی مرتبہ یکساں ہوں گے۔ یہ معاشرہ جغرافیائی سرحدوں کو توڑ کر روئے زمین کے تمام خطوں پہنچا سکتا ہے اور اس کی بنیاد پر ایک عالمگیر برادری قائم ہو سکتی ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ اس عقیدے اور ضابطے کو نہ مانیں یہ معاشرہ انہیں اپنے دائرے میں نہیں لیتا۔ مگر انسانی برادری کا تعلق ان کے ساتھ قائم کرنے اور انسانیت کے حقوق انہیں دینے میں اسے کوئی تکلیف نہیں۔ ان کا علیحدہ معاشرہ بن جاتا ہے۔

۲۔ رشتہ نکاح : عورت اور مرد معاشرت کے دوستوں ہیں۔ دونوں کی اپنی اپنی شخصیت ہے اور دونوں سماج کے بھائی ہیں۔ خورتوں اور مردوں میں قانونی مساوات ہے۔ اور دونوں کے ایک دوسرے پر کچھ حقوق و ذمہ داریاں ہیں اور خاندان کے نظام میں مرد کی حیثیت قوام اور نگران کی ہے۔ عورت اور مرد کا عام رشتہ بھائی اور بہن کا رشتہ ہے، اور وہ ایک دوسرے کے لئے اس طرح حرام ہیں جس طرح گئے بھائی بہن لیکن نکاح وہ طریقہ (یا معاہدہ) ہے جس سے یہ ایک دوسرے کے شریک زندگی ہو سکتے ہیں۔ اور یہی وہ جائز اور صحت مندرشتہ ہے جس کے ذریعے یہ ایک دوسرے کے لئے حلال ہو سکتے ہیں۔ اس رشتے سے خاندان کی بنیاد پڑتی ہے۔

۴۔ خیر خواہانہ فضا : معاشرے کی عام فضا خیر خواہی، تعاون، امداد، اشتراک عمل، مواساۃ، ایثار اور بھائی چارہ کی ہونی چاہیئے۔ لوگ جب آپس میں ملیں تو ایک دوسرے پر سلامتی بھیجیں، شہرخص اپنے بھائی کے لئے وہی چاہے جو وہ اپنے لئے چاہتا ہے، ظلم، غیبت، چغل خوری، کتبہ پردہ، سوءظن، دھوکہ دہی، بُرا نام رکھنے، رشک، حسد، بغض، تجسس، الزام تراشی، بے حرمتی دے عزی کرنے اور بے جا حرف گیری وغیرہ سے سب پرہیز کریں، نیکیوں میں ایک دوسرے سے تعاون کریں بلکہ سبقت لے جانے کی کوشش کریں اور برائیوں سے ایک دوسرے کو روکیں۔ چنانچہ قرآن کا حکم ہے کہ:

”وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ“
(۱۱۰۰ - ۱۱۰۱)

بھلائی اور نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور ظلم اور لگائوں کی باتوں میں ہرگز باہمی مدد و تعاون نہ کرو۔

اور سورۃ قصص رکوع ۸ میں ارشاد ہوا ہے کہ:

لوگوں کے ساتھ بھلائی کرو جس طرح اللہ نے تم پر احسان کیا ہے اور زمین میں طالبِ فساد نہ ہو۔

وَأَحْسِنْ كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفُسَادَ فِي الْأَرْضِ ۚ

(القصص - ۷۷)

مومنو! کوئی قوم کسی قوم کا مذاق نہ اڑائے ممکن ہے وہ لوگ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں عورتوں کا مذاق اڑائیں، ممکن ہے وہ ان سے اچھی ہوں اور (اپنے مومن بھائی کو) عیب نہ لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کا برا نام رکھو۔

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرُوا قَوْمًا مِّنْ قَوْمٍ عَسَىٰ أَن يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاءً مِّنْ نِّسَاءٍ عَسَىٰ أَن يَكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوا أَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِاللُّغَابِ ۚ“ (المحرات - ۱۱)

آگے ارشاد ہوا کہ:

اور ایک دوسرے کے عیب نہ ٹٹولو اور کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔

وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَبِ بَعْضُكُم بَعْضًا (المحرات - ۱۲)

اسی طرح حدیث میں ہے کہ ”الذین النصيحة“ (دین تو خیر خواہی کا نام ہے) مسلمان تو وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں (فقہان و اہلین)۔ مسلمان کبھی طعنے دینے والا، کینے والا نہیں ہو سکتا، وغیرہ۔ گویا اسلام معاشرے کی عام فضا کو حسنات سے بھر دینا چاہتا ہے۔ اور اس کی نظر میں زندگی تعاون، ہمدردی اور مواساة کا نام ہے۔

۵۔ افراد خاندان کی ذمہ داری اور باہمی تعلق

طور پر انجام دینا ضروری قرار دیا گیا ہے، اسی طرح اسلام ان میں اجتماعی ذمہ داری کا تصور بھی پیدا کرتا ہے اور پورے معاشرے میں یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ وہ نیکیوں کو قائم کرنے والا، برائیوں کو روکنے والا اور ایک دوسرے کی مدد کرنے والا ہو۔ ایسی افرادیت جس میں دوسروں کے حقوق کا خیال نہ رکھا جائے اور جو اجتماعی ذمہ داری کے تصور سے نا آشنا بھی ہو، اسلام کو مطلوب نہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق ”وہ مسلمان ہو لوگوں میں گھل مل کر رہے اور ان کی اذیتوں پر صبر کرتا رہے، اس سے بہتر ہے جو لوگوں سے (الگ بھٹک) گھل مل کر نہ رہے اور ان کی اذیتوں پر صبر نہ کرے“۔ ”تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور تم میں سے ہر ایک شخص سے اس کی رعیت کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ پس امام حاکم ہے

اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں ہاز پُرس کی جائے گی اور شہرِ خُص اپنے اہل و عیال کا حاکم ہے اور اس سے اس کی رعیت کے متعلق دریافت کیا جائے گا۔ اور عورت اپنے شوہر کے گھر کی نگراں ہے اور اس سے اس کی رعیت کے متعلق پوچھا جائے گا اور غلام اپنے مالک کے مال کا محافظ ہے اور اس سے اس کی رعیت کے متعلق باز پرس ہوگی۔“

ان عمومی ہدایات کے بعد اسلام نے انسانوں کے باہمی حقوق و فرائض کا ایک مکمل نظام بھی دیا ہے۔ جس میں بھائی بھائی کے حقوق، اہل خانہ کے حقوق، رشتہ داروں کے حقوق، اہل محلہ کے حقوق نیز غیر مسلموں اور عام انسانوں کے حقوق، حتیٰ کے جانوروں اور درختوں کے حقوق تک۔ کو واضح اور متعین کر دیا گیا ہے، تاکہ انسان محض جذبات کی رو میں بہہ کر نا انصافی کا مرتکب نہ ہو اور معاشرہ صحت مند بنیادوں پر قائم رہے اور ارتقاءِ مدارج طے کرتا رہے۔

اسلامی نظامِ معاشرت کی ان بنیادوں کو سمجھ لینے کے بعد مختصراً یہ دیکھنا ہے کہ وہ کیا اصول اور طریقے ہیں جو اسلام نے معاشرے میں یگانگت اور ہم رنگی پیدا کرنے اور انسانی اجتماع کی مختلف صورتوں کو ترقی دینے کے لئے مقرر کئے ہیں۔ اس سلسلے میں اسلام نے کچھ مستقل ادارے قائم کئے ہیں، جن کا اجمالی خاکہ درج ذیل ہے۔

(۱) **خاندان**۔ یہ انسانی معاشرت کا اولین اور بنیادی ادارہ ہے، اس لئے اسلام کے معاشرتی نظام میں خاندان کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ خاندان کی بنیاد ایک مرد اور عورت کی باہمی رفاقت سے وجود میں آتی ہے اور ان ہی دو انسانوں سے مل کر بننے والا چھوٹا سا اجتماعی دائرہ انسان کی تمدنی زندگی کی سب سے پہلی کڑی ہے۔ اسلام کے نزدیک مرد اور عورت کی یہ مستقل رفاقت ایک کھلے ہوئے مستحکم معاہدے (نکاح) کے ذریعے وجود میں آتی ہے۔ یہ نکاح ایک ایسا با حرمت رشتہ ہے جو دونوں کی مرضی سے اور پورے اعلان کے ساتھ جوڑا جاتا ہے۔ نکاح کے بغیر مرد و زن کا تعلق بدترین معصیت اور ایک ایسا جرم ہے جس کی سخت ترین سزا مقرر ہے۔ معاہدہ نکاح کے ذریعے دونوں (مرد و عورت) اپنے اپنے اوپر بھاری ذمہ داریاں عائد کر لیتے ہیں اور ہمیشہ کے لئے ان کے پابند ہو جاتے ہیں۔ اس رشتے کی وجہ سے جو ایک چھوٹی سی وحدت بنتی ہے، مرد اس کا نگران اور ناظم اعلیٰ ہوتا ہے اور اس حیثیت سے وہ اپنے اہل و عیال کی دنیوی ضرورتوں اور اُخروی فلاح دونوں کا خیال رکھنے والا ہے جس کے لئے وہ جواب دہ ہے اور بیوی اس کے زیر ہدایت گھر کا نظم و نسق چلاتی ہے اور اس حیثیت سے اس کی ذمہ داری

یہ ہے کہ نہ صرف گھر کے اندرونی نظم و نسق کو سنبھالے بلکہ شوہر کی حقیقی رفاقت کرے اور اپنی عفت کو پوری طرح محفوظ رکھے۔

عورت اور مرد کے اس ملاپ سے ایک نئی نسل وجود میں آتی ہے اس سے رشتے بننے اور برادری کے دوسرے تعلقات پیدا ہوتے ہیں اور بالآخر یہی رشتے پھیلنے پھیلنے ایک معاشرے تک جاپہنچتے ہیں۔ نیز خاندان ہی وہ ادارہ ہے جس میں ایک نسل اپنے بعد آنے والی نسل کو انسانی تمدن کی وسیع خدمات سنبھالنے کے لئے نہایت محنت، ایشاء و دل سوزی اور خیر خواہی کے ساتھ تیار کرتی ہے۔ گویا بار بار وہ ترمیمیت گاہ ہے جہاں سے اسلام اچھے انسان تیار کرنا چاہتا ہے۔ اور اخلاقی زندگی کی ابتدائی ترمیمیت اسی مقام پر دیتا ہے تاکہ شروع ہی سے بچہ میں اسلام کا اثر (برہنہ) ہو اور اس کی حیرت انگیز اسلامی سائنس میں ڈھل جائے۔

(دوسرا قریبی رشتہ)۔ خاندان کے بعد رشتہ داری کی سرحد ہے جس کا دائرہ کافی وسیع ہوتا ہے۔ لوگ ماں اور باپ کے تعلق سے بھائی بہنوں کے تعلق سے یا سسرالی تعلق سے ایک دوسرے کے رشتہ دار ہیں، اسلام ان سب کو ایک دوسرے کا ہمدرد، مددگار اور نعم گزار دیکھتا ہے۔ ہر تعلق قرآن میں جگہ جگہ رشتہ داروں سے نیک سلوک کا حکم دیا گیا ہے اور حدیث، روایات اور فقہاء کی بار بار تاکید کی گئی ہے اور اسے بڑی سنجیدگی سے شمار کیا گیا ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے خلاف یا ناجائز کاموں میں تعاون کیا جائے اور رشتے یا قبیلے کی عصبیت یا رشتہ داری سے کام لیا جائے۔ خون کے رشتوں کو اسلام نے قائم رکھا ہے اور وراثت کے قانون کے ذریعے انہیں ایک مستقل مقام دے کر صحت مند و فطری احساسات کو دوام عطا کیا ہے۔

(ج) محلہ۔ رشتہ داری (قرابت) کے بعد ہمسائیگی ہے۔ قرآن کی رو سے ہمسایوں کی تین قسمیں ہیں۔ ایک رشتہ دار ہمسایہ، دوسرا اجنبی ہمسایہ اور تیسرا عارضی ہمسایہ جس کے پاس بیٹھنے یا بیٹھنے یا ساتھ چلنے کا آدمی کو اتفاق ہو۔ یہ سب اسلامی احکام کی رو سے رفاقت، ہمدردی اور نیک سلوک کے مستحق ہیں۔ اس باب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے ارشادات ہیں، مثلاً ”مجھے ہمسایہ کے حقوق کی اتنی تاکید کی گئی کہ میں خیال کرنے لگا کہ شاید اب اسے (بھی) وراثت میں حصہ دار بنا دیا جائے گا“ ”وہ شخص ایمان نہیں رکھتا جو خود پیٹ بھر کر کھالے اور اس کا ہمسایہ اس کے پیلو میں بھوکا رہ جائے“ غرض اسلام ان سب لوگوں کو جو ایک دوسرے کے پڑوسی ہوں آپس میں ہمدرد، مددگار اور شریک رنج و راحت دیکھنا چاہتا ہے وہ ان کے درمیان ایسے تعلقات قائم کرنا چاہتا ہے کہ وہ سب ایک دوسرے پر بھروسہ کر سکیں

اور ایک دوسرے کے پہلو میں اپنی جان و مال اور آبرو کو محفوظ سمجھیں۔ اور ایسی معاشرت جس میں ایک دلواریچ رہنے والے باہم کوئی دلچسپی، کوئی ہمدردی اور کوئی اعتماد نہ رکھتے ہوں، اسلام کو مطلوب نہیں، وہ ہرچیز کے معاشرے کا ایک فعال اور موثر جزو بنانا ہے۔

(د) مسجد۔ معاشرتی تعلقات کو استوار کرنے کے لئے مسجد کی حیثیت ایک مستقل ادارے کی سی ہے، اور اسلام کا معاشرتی پروگرام مسجد ہی کے ذریعے زیادہ کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں مسجدوں کا صحیح تنظیم کوثری اہمیت حاصل ہے تاکہ طلبہ و تالیم پوری طرح حاصل ہو سکیں۔

(ه) احترام روایات۔ مسلم معاشرہ کی روایات مسجد (مفسد) کا احترام اور ان کا استحکام بھی معاشرتی بائیس کا ایک جزو ہے، کیونکہ اس کے ذریعے مسلم معاشرہ کبھی بھی اپنے بائیس سے نہیں نکلتا۔ اس کے مستحق نہیں ہیں کہ روایات میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ تہذیب کے ہمہ گیر اثرات کو اپنا کر ان میں تبدیلی ضرور ہوتی ہے، لیکن یہ تبدیلی مستقل اور خاموش ارتقاء کے ذریعے ہونی چاہیے۔

(و) نظام تعلیم۔ معاشرے کے سدھار اس میں اسلامی اقدار کے تحفظ اور اپنے نظام زندگی کو شرعی اصولوں پر مبنی بنانے میں نظام تعلیم بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ اور اسلامی روایات کا ایک بہت بڑا ستون ہے۔

(ز) حدود و تعزیرات۔ معاشرے کی اصلاح کے تمام ذرائع اختیار کرنے کے بعد حدود و تعزیرات کا بھی ایک مکمل نظام رکھا گیا ہے جن کے ذریعہ معاشرے کو ان افراد سے محفوظ کیا جاتا ہے جو تعلیمی، ترقیبی اور اخلاقی ذریعہ سے اصلاح نہ قبول کریں اور معاشرے کے قانون کی خلاف ورزی کریں۔ ایسے لوگوں کو اسلام قرار واقعی سزا دیتا ہے تاکہ معاشرہ ان کی فتنہ انگیزیوں سے امن میں رہے اور اس میں فساد و فحاشی نہ پائے۔ نیز سماجی جرائم کا انسداد کیا۔ گو کہ ایک اسلامی معاشرے میں یہ جرائم غیر معمولی طور پر بہت کم ہوں گے اس لئے ان سزاؤں کا نفاذ بھی شاذ و نادر ہی ہوگا۔ لیکن بہر حال قانون کی گرفت اسلام میں ناقابل شکست ہے۔ اسلام کی نظر میں قانون سے بالاتر کوئی نہیں ہوتا۔ امیر و غریب اور خواص و عوام کا یہاں کوئی امتیاز نہیں ہے۔ اونچے سے اونچا شخص حتیٰ کہ حکمران وقت بھی قانون کا اسی طرح محکوم ہے جس طرح ایک بے کس فقیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ قانون کی بالا دستی کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے کہ ”اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی چوری کرتی تو خدا کی قسم میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔“ (بخاری)

(اخلاق اور فلسفہ اخلاق مولانا حفظ الرحمن)

۶۔ نظام قانون و عدل

اسلامی حکومت کی پہلی بنیاد اسلامی مساوات پر رکھی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

”خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً (النساء - ۱)“

خدا نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور دونوں سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو دنیا میں پھیلا دیا۔

نیز فرمایا:

”وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ“ (بنی اسرائیل - ۷۰)

اور ہم نے اولادِ آدم کو صاحبِ عزت بنایا اور خشکی و تری میں ان کو سوار کیا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَرَبَّ كُلِّ شَيْءٍ اِنَّا شَهِدْنَا اَنَّ الْعِبَادَ كُلَّهُمْ اُخُوَّةٌ (مسند احمد ابو داؤد)“

(اے ہمارے اور ہر چیز کے رب میں گواہی دیتا ہوں کہ سب انسان بھائی بھائی ہیں)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

”غوب سن رکھو کہ فخر و ناز کا ہر سرمایہ خون اور مال کا ہر دعویٰ آج میرے قدموں کے نیچے ہے۔ اے اہل قرین! اللہ نے تمہاری جاہلیت و نخوت اور باپ دادا کی بزرگی کے ناز کو دور کر دیا۔ اے لوگو تم سب اولادِ آدم ہو اور آدم مٹی سے تھے نسب کی قابلِ غر چیز نہیں ہے عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی فخر نہیں تم میں سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔“

قانون کی نگاہ میں سب برابر ہیں۔ حاکم و محکوم اور آمر و مامور میں اسلام کوئی امتیاز روا نہیں رکھتا۔ قانون سب کے لئے ایک ہے۔ ایک بار ایک معزز خاقان کو چوری کے جرم میں ہاتھ کاٹنے کی سزا دی جانے والی تھی۔ کچھ صحابہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سفارش کی۔ آپ نے سفارش کو غصہ سے رد کر دیا۔

اس ذات کی قسم جس کی مٹھی میں محمد کی جان ہے اگر فاطمہ بنت محمد نے بھی چوری کی ہوتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا

”وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ لَوْ سَرَقَتْ فَاطِمَةُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ لَقَطَعْتُ يَدَهَا“ (صحیح مسلم)

یہ ہے وہ معیاری قانون اور معاشرتی مساوات جس کا تصور کیا جاسکتا ہے۔

چونکہ عدل و مساوات ہی تمام احکام کی بنیاد اور قانون سازی کا صحیح معیار ہے اس لئے خدا تعالیٰ

عدل و مساوات اور اسلام

نے کی اور مدنی سورتوں میں اس پر بہت زور دیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

بے شک اللہ تعالیٰ انصاف اور احسان کا حکم دیتا ہے۔

۱۔ اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ۔ (النحل۔ ۹۰)

بے شک خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ان کے مالکوں کے حوالے کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ کرو۔

۲۔ اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تُوَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلَىٰ اَهْلِهَا وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ (النساء۔ ۵۸)

ان آیات میں حکم دیا گیا ہے کہ احسان اور امانتوں کے معاملے میں انصاف اور مکمل مساوات اختیار کی جائے، خواہ اپنا معاملہ ہو یا دوسروں کا۔ قریب والوں کا ہو یا دور والوں کا، امیر کا ہو یا غریب کا۔ انسان ایسے معاملات میں اپنے آپ کو دشمنوں کے مساوی سمجھے، خواہ حقارت و عداوت کا دینی یا دنیوی کوئی سبب ہو، مگر انصاف کا دامن کسی حالت میں ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ اولاد آدم پر رحمۃ للعالمین کا یہ احسان رہتی دنیا تک باقی رہے گا، کہ آپ نے انسانوں کی خود ساختہ اونچ نیچ کی تمام تفریقوں کو پاؤں تلے روند کر رکھ دیا۔ انسانی مساوات کا یہ عقیدہ دراصل اللہ تعالیٰ کی وحدانیت میں یقین رکھنے کا منطقی نتیجہ ہے، دین اسلام سے پہلے یونانیوں ایرانیوں اور ہندوؤں نے اپنے آپ کو مختلف دیوتاؤں کی اولاد قرار دے کر دوسری قوموں سے بلند قرار دے رکھا تھا۔ تو حید کے عقیدے نے ان تمام خرافات کا تار پود بکھیر کر رکھ دیا۔

سرور کونین نے اسلامی معاشرے میں مساوات کی شان کو جس طرح قائم رکھا، وہ اسوۂ نبوی کا بے حد نمایاں پہلو ہے۔ قبائیں مسجد تعمیر ہو رہی ہو یا مدینہ میں آپ صحابہ کے ساتھ مزدوروں کی طرح کام کرتے نظر آتے ہیں۔ مدینہ کے محاصرے میں آپ دوسروں کے ساتھ خندق کھودتے اور قحط کے وقت پیٹ پر پتھر باندھتے نظر آتے ہیں۔

قرآن نے انسانی مساوات کا جو حکم دیا تھا یہ بھی اس کی عملی تفسیر جس نے اسلامی معاشرے سے رنگ نسل زبان ملک اور قوم کے تمام امتیازات جڑ سے اکھاڑ پھینکتے تھے۔ یہ اس بات کا صدقہ ہے کہ اسلام کے جھنڈے تلے خدمات انجام دینے والوں پر جب نگاہ پڑتی ہے تو ان میں بہت سے غیر عربی نظر آتے ہیں۔ علمی میدان میں نگاہ دوڑائی جائے، خواہ حکومت اور سیاست کے میدان میں ہر جگہ یہی رنگ نظر آتا ہے۔

دین اسلام نے نظریاتی طور پر انسانی مساوات کا جو درس دیا اسے عملاً برت کر بھی دکھایا۔ آج اس گئے گزے زمانہ میں جب کہ اسلامی تعلیمات و ہدایات کو پامال کیا جا رہا ہے۔ ہر سرفروخت و

منکرات کا دور دورہ ہے، جب ہم مسجد میں جاتے ہیں، تو دیکھتے ہیں کہ صدر پاکستان اور کارخانے کا ایک مزدور بلا فرق و امتیاز ایک ہی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہاں بندہ و آقا اور امیر و غریب یکساں نظر آتے ہیں۔ اسلام پر یہ طعن توڑا جاتا ہے کہ اس نے غلامی کا انسداد نہیں کیا۔ مگر یہ نہیں دیکھا جاتا کہ مغربی فکر کے باوا آدم افلاطون نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ”جمہوریہ“ میں معاشرتی درجہ بندی اور غلامی کی صریح تائید کی ہے۔ خود یورپ نے ہندیب و شائستگی کے دور میں داخل ہونے کے ملکوں بعد غلاموں کی بین الاقوامی تجارت کو فروغ دیا اور نئے دریافت شدہ ملکوں کو غلاموں ہی کی محنت سے آباد کیا۔

دوسری طرف اسلام ہی وہ دین تھا جس نے تحت الشری سے اٹھا کر غلاموں کو اوج ثریا پر فائز کر دیا۔ حضور جب اس دنیا سے رخصت ہوئے تو زبان پر یہ لفظ تھے۔
 ”الصَّلَاةُ وَمَا مَلَكَتْ يَمِينُكُمْ“ | (نماز پڑھتے رہنا اور غلاموں کا خیال رکھنا)
 حقیقت یہ ہے کہ دین اسلام نے انسانیت کو جس معاشرتی اور قانونی مساوات کا درس دیا، دنیا اس سے قطعاً نا آشنا تھی۔ سچ ہے۔

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
 تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے (اقبال)

تعلیم

۱۔ تعلیم کا تصور اور اس کی اہمیت

اسلام میں تعلیم کی اہمیت مسلم ہے۔ تاریخ انسانیت میں یہ منفرد مقام اسلام ہی کو حاصل ہے کہ وہ سرایا علم بن کر آیا اور تعلیمی دنیا میں ایک ہمہ گیر انقلاب کا پیام بر نہایت ہوا۔ اسلامی نقطہ نظر سے انسانیت نے اپنے سفر کا آغاز تاریکی اور جہالت سے نہیں بلکہ علم اور روشنی سے کیا ہے۔ تخلیق آدم کے بعد خالق نے انسان اول کو سب سے پہلے جس چیز سے سرفراز فرمایا وہ علم اشیاء تھا۔ یہ اشیاء کا علم ہی ہے جو انسان کو باقی مخلوق سے ممتاز کرتا ہے اور جو قرآن حکیم کے فرمان کے مطابق تمام دوسری مخلوقات پر اس کی برتری قائم کرتا ہے۔ علم قیادت کا ایک خاصہ اور ان اہم ترین عوامل میں سے ہے جو کسی تہذیب کے صحت مندار تھا اور ان نشوونما کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں دنیا کے دوسرے نظاموں نے تعلیم کو زیادہ سے زیادہ بہت سی ضرورتوں میں سے ایک ضرورت سمجھا وہاں اسلام نے اسے اولین ضرورت قرار دیا۔

اسلام کے سوا دنیا کا کوئی مذہب یا تمدن (CULTURE) ایسا نہیں ہے جس نے تمام انسانوں کی تعلیم کو ایک بنیادی ضرورت قرار دیا ہو۔ یونان اور چین نے غیر معمولی علمی اور تمدنی ترقی کی، لیکن وہ بھی تمام انسانوں کی تعلیم کے قائل نہ تھے، بلکہ اہل علم کے ایک طبقے پر ہی قانع ہو گئے تھے۔ افلاطون اپنی ”جمہوریہ“ (REPUBLIC) میں جو اونچے سے اونچا خواب دیکھ سکا اس میں بھی فلاسفہ اور اہل نظر کے ایک مخصوص طبقے ہی کو اس امتیاز سے نوازا گیا ہے۔ اسلام وہ واحد مذہب ہے جس نے تمام انسانوں پر تعلیم کو فرض قرار دیا اور اس فرض کی انجام دہی کو معاشرے کی ایک ذمہ داری بنایا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو پہلی وحی نازل ہوئی وہ علم کے مقام اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس میں تعلیم و تعلم کی ضرورت و اہمیت ہی کو واضح نہیں کیا گیا بلکہ ذرائع تعلیم پڑھنا اور لکھنا کی طرف بھی واضح اشارات موجود ہیں :-

”اقْرَأْ بِمَا تُسْحَرُ بِكَ الذِّیْ خَلَقَ“ | پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔

خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۚ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۚ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (سورۃ علق، ۱-۵)

انسان کو خون سے پیدا کیا۔ پڑھ اور تیرا رب کریم ہے۔ وہ جس نے قلم سے تعلیم دی۔ انسان کو ان چیزوں کی تعلیم دی جن کو وہ نہ جانتا تھا۔

قرآن کریم میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت کی جو ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں اور آپ کے جو وظائف مقرر کئے گئے ہیں ان میں تلاوت کتاب، تعلیم کتاب و حکمت یتیمین احکام و آیات، تزکیہ نفوس اور تبلیغ و دعوت کو ایک مرکزی مقام حاصل ہے اور یہی وجہ ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا:

إِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا (صحیح بخاری) | (میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں) علم اور تعلیم کی اسی مسلمہ اہمیت کے پیش نظر یہ انتہائی ضروری ہے کہ ہم تعلیم کی نوعیت اور اس کے اساسی اصولوں کا صحیح فہم حاصل کریں۔

تعلیم صرف تدریس عام ہی کا نام نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعے ایک قوم خود آگہی حاصل کرتی ہے۔ اور یہ عمل اس قوم کو تشکیل دینے والے افراد کے احساس و شعور کو نکھارنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ یہ نئی نسل کی وہ تعلیم و تربیت ہے جو اسے زندگی گزارنے کے طریقوں کا شعور دیتی ہے اور اس میں زندگی کے مقاصد و فرائض کا احساس پیدا کرتی ہے تعلیم ہی سے ایک قوم اپنے ثقافتی اور ذہنی ورثے کو آئندہ نسلوں تک پہنچاتی ہے اور ان میں زندگی کے ان مقاصد سے لگاؤ پیدا کرتی ہے جنہیں اس نے اختیار کیا ہے تعلیم ایک ذہنی، جسمانی اور اخلاقی تربیت ہے اور اس کا مقصد اونچے درجے کے ایسے تہذیب یافتہ مرد اور عورتیں پیدا کرنا ہے۔ جو اچھے انسانوں کی حیثیت سے اپنے فرائض کو انجام دینے کے اہل ہوں۔ ہر دور کے ممتاز ماہرین تعلیم کے نظریات کا مطالعہ اسی تصور تعلیم کا پتہ دیتا ہے۔

لغت کے اعتبار سے تعلیم کا مادہ علم (ع ل م) ہے۔ اس کے معنی ہیں کسی چیز کا ادراک کرنا۔ اس سے باب تفصیل میں ”تعلیم“ آتا ہے۔ تعلیم کے معنی بار بار اور کثرت کے ساتھ خبر دینے کے ہیں۔ حتیٰ کہ متعلم کے ذہن میں اس کا اثر پیدا ہو جائے۔

انگریزی زبان کا لفظ EDUCATION لاطینی لفظ EDEX بر معنی نکالنا اور

DUCER - DUC بر معنی رہنمائی سے ماخوذ ہے۔ لفظی طور پر اس کے معنی ”معلومات کا جمع کر دینا“ اور ”مخفی صلاحیتوں کو نکھارنا“ ہیں۔ بہر نوع اصلاً یہ لفظ معلومات فراہم کرنے اور متعلم کی مخفی صلاحیتوں کو نکھارنے کے لئے بولا جاتا ہے۔

جان اسٹورٹ مل مغرب کے ان مشاہیر میں سے ہے جنہوں نے تعلیم کے مفہوم کو وسعت دینے کی کوشش کی ہے وہ کہتا ہے :

”تعلیم صرف ان باتوں ہی کا احاطہ نہیں کرتی جو ہم اپنی فطرت کے کمال سے قریب تر ہونے کی بنا پر تحصیل مقصد کی خاطر اپنے لئے وضع کرتے ہیں یا دوسرے جملے لئے کرتے ہیں۔ اپنے وسیع تر مفہوم میں اس کی حدود بہت زیادہ ہیں۔ انسانی کردار اور صلاحیت پر پڑنے والے اُن چیزوں کے بالواسطہ اثرات بھی اس کے دائرہ کار میں شامل ہیں۔ جن کے فوری تعلیمی بالکل ہی دوسرے ہوتے ہیں“

جان ملٹن تعلیم کی تعریف یوں کرتا ہے :

”میرے نزدیک مکمل اور شریفانہ تعلیم وہ ہے جو انسان کو بحالت جنگ و امن اپنی اجتماعی و نجی زندگی کے فرائض دیانت و مہارت اور عظمت کے ساتھ ادا کرنے کے لئے تیار کرتی ہے“

تعلیم کا یہ وسیع ترین تصور ہے۔

امریکی فلاسفر جان ڈیوی کے نزدیک تعلیم افراد اور فطرت سے متعلق بنیادی طور پر عقلی اور جذباتی رویوں کے تشکیل پانے کا عمل ہے۔ ڈاکٹر پارک کا خیال ہے کہ تعلیم رہنمائی یا مطالعہ سے علم حاصل کرنے اور عادات اختیار کرنے کا عمل یا فن ہے۔ پس تعلیم وہ مسلسل عمل ہے جس کے ذریعے نئی نسلوں کی اخلاقی، ذہنی اور جسمانی نشوونما بھی ہوتی ہے اور وہ اپنے عقائد و تصورات اور تہذیب و ثقافت کی اقدار بھی اس سے اخذ کرتے ہیں۔ ماہرین تعلیم اس لفظ سے دو مفہوم لیتے ہیں۔

وسیع تر مفہوم میں حفظان تمام طبیعی و حیاتیاتی، اخلاقی و سماجی اثرات کا احاطہ کرتا ہے جو فرد اور قوم کے طرز زندگی کی تشکیل کرتے ہیں اور محدود مفہوم میں صرف ان اثرات پر حاوی ہے جو اساتذہ کے ذریعے اسکولوں کالجوں اور دوسری درسگاہوں میں مرتب ہوتے ہیں۔

بہر کیف تعلیم ایک ہمہ گیر عمل ہے اور شاگرد کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر اس کا گہرا اثر ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ ایک قوم کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر اس کا گہرا اثر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایک قوم کی زندگی کا انحصار ہی اس کی تعلیم پر ہے۔ ایک چینی کہادت اس بات کی کتنی صحیح عکاسی کرتی ہے۔

”تمہارا منصوبہ اگر سال بھر کے لئے ہے تو فصل کاشت کرو، دس سال کے لئے ہے تو درخت اُگاؤ، دائمی ہے تو افراد پیدا کرو“

۲۔ مقصدِ تعلیم

اگر ہم آزاد اور بے عقیدہ تعلیم کے نتائج کا جائزہ لیں تو مندرجہ ذیل چیزیں سامنے آتی ہیں۔

(الف) ”بے عقیدہ“ تعلیم طلبہ میں اجتماعی تصورات پیدا کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اور جب کوئی قوم ان اجتماعی تصورات کے شعور سے بے بہرہ ہو جائے جو اسے عمل اور قربانی پر ابھارتے ہیں تو تاریخ پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ ایسی اقوام جو کسی اجتماعی نظریے کے زندہ شعور سے عاری ہو جائیں اور جنہوں نے کسی اعلیٰ اور برتر نصب العین کے لئے جینا اور مرنا نہ سیکھا ہو وہ تاریخ عالم میں کوئی بڑا کارنامہ تو کیا انجام دے گی، اپنے وجود تک کو برقرار نہیں رکھ سکتیں۔ تاریخ میں ایسی مثالوں کی کمی نہیں ہے کہ جب کسی قوم نے اپنی منزل کا شعور کھو دیا تو وہ نقشِ پا کی طرح مٹا دی گئی۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے:

مرگِ فرد از خشکی رود حیات
مرگِ قوم از ترک مقصود حیات

(ب) بے عقیدہ تعلیم نئی نسل کے قلب و روح میں اخلاقی اقدار کو اجاگر کرنے میں ناکام رہتی ہے۔ اس کا تعلق صرف دماغ کے مطاببات سے ہوتا ہے۔ روح کے مطاببات سے یہ بیگانہ وار ہی گزر جاتی ہے۔ دونوں کی نشو و نما دو متضاد سمتوں میں ہوتی ہے جس کا نتیجہ ایک زبردست قومی نقصان کی صورت میں نکلتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علم اس وقت حقیقی دوست اور رہنما کا کام کر سکتا ہے جب اس کا محور دل ہو ورنہ صرف تن پرستی کے حکم میں یہ انسان کے لئے سانپ جیسا خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔

علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

(ج) تعلیم کے بارے میں اسی رحمان کا نتیجہ لامرکزیت اور علم کی شعبہ جاتی جزو پرستی کی صورت میں نکلا ہے۔ بے عقیدہ تعلیم علم کو ایک ہی محور پر مرکوز یا منظم کرنے میں ناکام رہی ہے۔ طلبہ اپنی زندگی اور ارد گرد کی دنیا کو پھوٹی پھوٹی غیر مربوط جزئیات کی شکل میں دیکھتے ہیں۔ وہ علم کی وحدت اور زندگی کی یک رنگی اور مرکزیت کے احساس سے محروم ہی رہ جاتے ہیں۔

(د) اور آخری بات یہ ہے کہ بے عقیدہ تعلیم ایسے افراد پیدا کرتی ہے جو زندگی کے بنیادی، حقیقی، واقعی اور زندہ مسائل پر کوئی عبور نہیں رکھتے۔ عملی زندگی کے بارے میں ان کا علم اس قدر سطحی سا رہ جاتا ہے کہ اس کی کوئی محسوس افادیت باقی نہیں رہتی۔ قومی

نقطہ نظر سے بھی یہ تعلیم مفید نتائج حاصل کرنے میں ناکام رہی ہے۔ ڈاکٹر فرینک ایڈلیوٹ نے امریکی تعلیم کے بارے میں کہا ہے :

”مقاصد کے بجائے تکنیک اور ذرائع سے وابستگی ادب، فلسفہ، تاریخ اور مذہب کے مطالعہ کو حقیقی آزادی سے محروم کر رہی ہے۔“

مشہور اہل قلم والٹر اپ مین نے ”اس مضطرب دنیا میں تعلیم کی کیفیت“ کے موضوع پر ایک تقریر میں کہا تھا :

”اسکول اور کالج دنیا میں ایسے افراد بھیجتے رہے ہیں جو اُس معاشرے کے تخلیقی اصولوں کو نہیں سمجھ پاتے جس میں انہیں رہنا ہے۔ اپنی ثقافتی روایت سے محروم نئے تعلیم یافتہ مغربی افراد اپنے ذہن و جذبات میں مغربی تہذیب کے تصورات، اصول اور بنیادوں کا اور اس کی منطق و استدلال کا کوئی احساس و شعور نہیں رکھتے۔ اگر یہی پنج رہی تو موجودہ تعلیم آخر کار مغربی تہذیب کو تباہ کر دے گی اور واقعہ یہ ہے کہ یہ تباہ کر رہی ہے۔“

امریکی تعلیم پر راک فیلر کی رپورٹ بھی اسی خامی کی نشان دہی کرتی ہے :

”طلبہ اپنی زندگی کا کوئی مقصد و مفہوم چاہتے ہیں۔ اگر ان کا زمانہ، ان کی ثقافت اور جب ان کے رہنا انہیں کوئی عظیم مفہوم، مقاصد و تصورات نہ دیں تو پھر وہ اپنے لئے حقیر اور فرومایہ مقاصد متعین کر لیتے ہیں۔“

سروالٹر موبرلے نے اپنی کتاب ”یونیورسٹی میں بحران“ میں، جو برطانیہ کے تعلیمی حالات کے مطالعے پر مشتمل ہے، لکھا ہے :

”ہم جس الجھن میں گرفتار ہیں وہ یہ ہے کہ ہماری یونیورسٹی میں زیادہ تر طلباء تعلیم سے فارغ ہو جاتے ہیں مگر اس کا کوئی موقع نہیں آتا ہے کہ وہ حقیقی اہمیت کے عظیم مسائل پر اپنا ذہن استعمال کریں۔ تعلیمی غیر جانبداری کے زیر اثر وہ موجودہ سیاسی اور سماجی ماحول کے آگے سپر ڈال دینے اور سوچ بچار کی زحمت نہ اٹھانے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح وہ لا دینیت کو بھی تسلیم کر لیتے ہیں اور یہ اس لئے کہ تعلیم کے مختلف اجزاء میں منقسم ہونے کی موجودہ صورت حال کی وجہ سے انہیں ذمہ دارانہ حیثیت مقصد زندگی کو متعین کرنے کا چیلنج ہی نہیں ملا۔ ساری تعلیم کے بعد بھی وہ بنیادی طور پر غیر تعلیم یافتہ ہی رہتے ہیں۔“

تعلیم کے پس منظر کے مکمل جائزے کے بعد پروفیسر میرڈیچ ٹیٹس لکھتے ہیں :-

”تعلیم نے اپنے آپ کو ماضی کے روحانی ورثے سے الگ کر لیا ہے مگر اس کا کوئی مناسب متبادل دینے میں ناکام رہی ہے۔ نتیجتاً پڑھے لکھے افراد بھی ایقانِ ایمان سے زندگی کی اقدار کے صحیح احساس سے اور دنیا کے بارے میں کسی ناقتِ ابل شکست ہمہ گیر نقطہ نظر سے عاری ہیں۔“

ان نئے خیالات سے پتہ چلتا ہے کہ مغرب میں بھی بے عقیدہ اور غیر جانبدارانہ تعلیم کا نظریہ دم توڑ رہا ہے اور مغرب کے اکثر ماہرینِ تعلیم اور علمائے عمرانیات یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ تہذیب و تمدن کی ترقی اور ثقافت کے تحفظ کی راہ میں یہ نظریہ کس قدر نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔

۳۔ تعلیم کے اسلامی اصول | (۱) تصورِ علم۔ اسلام نے جو تصورِ علم دیا ہے اس میں سب سے بنیادی چیز یہ ہے کہ علم کا سرچشمہ

ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ علم اشیاء اسی کا دیا ہوا ہے اور انسان کی ہدایت کا علم بھی اسی کی طرف سے ہے۔ جو اس اور عقل و تجربہ بڑے اہم ذرائعِ علم ہیں لیکن وحی سب سے اعلیٰ ذریعہِ علم ہے۔ نیز یہ کہ علم کا تعلق محض لوازماتِ حیات ہی سے نہیں، مقاصدِ حیات سے بھی ہے اور اول الذکر کو ثانی الذکر کے تابع ہونا چاہیئے۔ یہی وہ تصور ہے جس سے ہمارے نظامِ تعلیم کا پورا مزاج بنتا ہے۔

اسلام نے علم کا جو تصور دیا ہے اس میں علم اور تربیت دونوں کو یکساں اہمیت دی گئی ہے اور ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیہ نفس دونوں کو ساتھ ساتھ انجام دینا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے مخصوص نظامِ تعلیم میں تعلیم اور تربیت سازی ایک ہی حقیقت کے دو پہلوئے ہیں اور اس کا اظہار علم و فضل کی اصطلاح سے بھی ہوتا ہے جو علم اور نیکی اور اخلاقِ حسنہ میں بڑھے ہوئے ہونے کے مفہوم کو ادا کرتی ہے۔

(ب) مقصدِ تعلیم۔ تعلیم بجائے خود منزل نہیں، منزل کے حصول کے لئے ایک ذریعہ ہے۔ حقیقی منزل ان لوگوں کا نظریہ حیات اور تمدن و ثقافت ہے جن کی خدمت اسے کرنی ہے۔ لے۔ این۔ دایٹ بیڈن نے یہ کہہ کر اس نکتے پر بہت زور دیا ہے کہ ”تعلیم کی روح یہ ہے کہ وہ مذہبی ہو۔“ اقبال کا خیال بھی یہی تھا کہ اسلام ہماری زندگی اور تعلیم کا مقصد ہونا چاہیئے۔ انہوں نے خواجہ غلام الہی دین کو ایک خط میں لکھا تھا:

”علم سے میری مراد وہ علم ہے جس کا دار و مدار جو اس پر ہو۔ عام طور پر میں نے علم کا لفظ انہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس علم سے وہ طبعی قوت ماخذ آتی ہے جس کو دین کے ماتحت رہنا چاہیے۔ اگر یہ دین کے تحت نہ رہے تو محض شیطنت

ہے۔ مسلمان کے لئے لازم ہے کہ علم کو مسلمان کرے۔

بوہب را جیدر کرار کن

اگر یہ بوہب جیدر کرار بن جائے یا یوں کہیے کہ اس کی قوت دین کے تابع ہو جائے تو نوع انسان کے لئے سراپا رحمت ہے۔

پس تعلیم کا اولین مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ طلبہ میں ان کے مذہب اور نظریہ حیات کی تفہیم و آگہی پیدا کرے۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ زندگی کا مفہوم اور مقصد دنیا میں انسان کی حیثیت توحید رسالت، آخرت اور انفرادی اور اجتماعی زندگی پر ان کے اثرات، اخلاقیات کے اسلامی اصول، اسلامی ثقافت کی نوعیت اور ایک مسلمان کے فرائض اور اس کا مشن اتہیں سمجھایا جائے۔ انہیں بتایا جانا چاہیئے کہ وہ کس طرح اعلیٰ مقاصد کے لئے دنیا کی تمام قوتوں کو استعمال کریں۔ تعلیم کو ایسے افراد پیدا کرنے چاہئیں جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے بارے میں اسلامی نظریات پر بھرپور یقین کے حامل ہوں۔ اور اسے ان کے اندر ایک ایسا اسلامی نقطہ نظر پیدا کرنا چاہیئے کہ وہ زندگی کے ہر میدان میں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اپنا راستہ خود بنا سکیں۔

قرآن حکیم کا فرمان ہے کہ اہل علم حق اور سچائی کے گواہ ہیں وہ تعلیم جن کا مقصد اہل علم پیدا کرنا ہو اسے اولین طور پر اسلام کا علم پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ قرآن میں فرمایا گیا ہے:

”شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ“
وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُو الْعِلْمِ ؕ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ عِلْمًا یُّنْفَعُ لِخَلْقٍ مُّکَثِّرٍ وَیَعِیْزُ لِحُجَّتِیْ یَوْمَ الْحُجَّةِ الْاٰخِرَةِ

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

”لوگوں میں سے درجہ نبوت کے قریب تہذیب علم اور اہل جہاد ہیں۔ اہل علم اس درجہ

سے کہ انہوں نے لوگوں کو وہ باتیں بتائیں جو رسول لائے تھے اور اہل جہاد

اس وجہ سے کہ انہوں نے پیغمبروں کی لائی ہوئی شریعت پر اپنی تلواروں سے

جہاد کیا“

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سا مشن ہے جس کے لئے انبیاء و مبعوث کئے گئے ہیں۔ ایک ایسا مشن جو صاحبان علم کو مقام نبوت سے قریب کرتا ہے۔ قرآن حکیم کے مطابق اسلام کے پیغام کی اشاعت و تبلیغ اور ایک عادلانہ اور صحت مند اجتماعی نظام کا قیام ہے۔ قرآن کہتا ہے:

هُوَ الَّذِیْ یُعِثُّ فِی الْاُمَمِیْنَ
رُسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِہٖ

وہ (خدا) وہی تو ہے جس نے امتوں میں انہی میں سے (محمد کو) پیغمبر بنا کر بھیجا جو ان کے

سامنے اس کی آیتیں پڑھنے اور ان کو پاک کرتے اور (خدا کی) کتاب اور دانائی سکھاتے ہیں اور اس سے پہلے تو یہ لوگ صریح کفر میں مبتلا تھے۔
ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی ہوئی نشانیاں دے کر بھیجا اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب اور میزان (عدل) نازل کی تاکہ لوگ اعتدال پر قائم رہیں۔

وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ۝ (جمہ - ۲)
”لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ“
(الحديد - ۲۵)

پس اسلامی تہذیب و ثقافت کے پس منظر میں تعلیم کا بنیادی مقصد ان پیغمبرانہ فرائض کی بجا آوری اور انسانوں کو اس مشن اور مقصد کی تعلیم دینا، ان میں اس مذہب کی سچی روح پیدا کرنا اور انہیں ایک مکمل اور صحت مند زندگی کے لئے تیار کرنا ہے۔
یہ مقصد تعلیم کے ہر گوشے میں اسلامی نظریہ حیات کی روح جاری و ساری کرنے سے حاصل ہوگا۔ نئی کتابوں کی ترتیب و تدوین بھی اسی نقطہ نظر سے کی جانی ہوگی۔ اس کے لئے تمام تعلیمی سرگرمیوں کی تشکیل تو اور ایک ایسے ماحول کی تخلیق بھی کرنا ہوگی جو ان مقاصد کے حصول میں مدد و معاون ثابت ہو۔

(ج) **انفرادیت اور اجتماعیت میں توازن** تعلیم کا ایک بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ طالب علم کی انفرادیت کے ارتقاء کو کیا اہمیت دی جائے۔ اس پر ہمارے سامنے متضاد نظریات ہیں بعض کے نزدیک فرد کا ارتقاء بنیادی قدر ہے۔ وہ اجتماعی یا مشترک ذمہ داری کے تصور کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ اس کے برعکس ایسے نظریات بھی ہیں جن میں معاشرے کے معیارات سے مطابقت کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے اور فرد کی اپنی شخصیت کے نشو و نما پر کوئی زور نہیں دیا گیا۔ یہ دونوں حدیں غلط اور غیر حقیقت پسندانہ ہیں۔ اسلام کی ایک منفرد خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ انفرادیت اور اجتماعیت میں ایک توازن پیدا کرتا ہے۔ اسلام فرد کی اپنی ذاتی شخصیت میں یقین رکھتا ہے اور ذاتی طور پر ہی ہر ایک کو خدا کے سامنے ذمہ دار اور جواب دہ ٹھہراتا ہے۔ اسلام فرد کے بنیادی حقوق کی ضمانت دیتا ہے اور کسی کو ان میں مداخلت کی اجازت نہیں دیتا۔ اس کی تعلیمی پالیسی میں فرد کی شخصیت کا مناسب ارتقاء اہم ترین مقاصد میں سے ایک ہے۔ یہ اس خیال کا حامی نہیں کہ فرد کو اجتماع یا ریاست میں اپنی انفرادیت کھود دینی چاہیے۔ قرآن کریم کے مطابق:

وَأَنْ تَكُونُوا لِلنَّاسِ الْإِمَامَ سَعًى ۝ (انجم - ۳۹)

اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔

”إِنَّ اللَّهَ لَا يَغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ“

(الرعد - ۱۱)

”لَا يَكْفُ اللَّهُ نَفْسًا لِّهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ“

(البقرہ - ۲۸۶)

بیشک اللہ کسی قوم کی (اچھی) حالت بدل نہیں دیتا جب تک وہ لوگ خود اپنے میں تبدیلی پیدا نہیں کر لیتے۔

اللہ کسی متنفس پر اس کی مقدرت سے بڑھ کر ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتا۔ ہر شخص نے جو نیکی کمائی ہے اس کا پھل اس کے لئے ہے اور جو بدی سمیٹی ہے اس کا وبال اسی پر ہے۔

اور ہم کو ہمارے اعمال (کا بدلہ ملے گا) اور تم کو تمہارے اعمال (کا)

”وَلَنَّا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ“

(البقرہ - ۱۳۹)

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام ایک طالب علم کی انفرادی شخصیت کو نشو و ارتقا دینا چاہتا ہے اور اس کی تمام خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرنا چاہتا ہے تاکہ وہ اجتماعی زندگی کے وظائف کو بہ حسن و خوبی انجام دے سکے۔

(د) علم کی وحدت اور ہم آہنگی۔ تعلیم کا ایک اور اصول یہ ہے کہ طالب علم کو متوازن اور ہم آہنگ تعلیم حاصل ہو۔ اس میں اتنی قابلیت پیدا ہو جانی چاہیئے کہ وہ دنیا کی رنگارنگ بوقلمونیوں کے درمیان زندگی اور کائنات کی وحدت کو دیکھ سکے۔ اسلام راہ وسط کا داعی ہے اور اس کا نصب العین متوازن شخصیت کی تعمیر و ارتقا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق فکر اور عمل کا توازن نبوت کی خصوصیات میں سے ایک ہے۔ اس لئے تعلیم میں یہ بات لازماً پیش نظر رہنا چاہیئے کہ اختصاص کے مرحلے میں داخل ہونے سے پہلے طالب علم کو علم کے وسیع پس منظر سے واقفیت حاصل ہو جائے اور زندگی اور اس کے مسائل کے بارے میں وہ ایک متوازن رویہ متعین کر لے۔

اسلام کی نظر میں علم ایک ہم آہنگ اور باہم مربوط کل ہے۔ یہ اس حقیقت سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ قرآن تمام علوم کا سرچشمہ ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جو علم کے ہر مشاخی کا ذہن تشکیل کرے گی اور اس کا سوچنے کا انداز متعین کرے گی خواہ ان کے حصول علم کا میدان کچھ بھی کیوں نہ ہو۔ یہ چیز قدرتاً ہم آہنگ علم کے تصور کی طرف لے جاتی ہے۔ اس بنیادی نقطہ کا نتیجہ یہ ہو گا کہ مسلمان نفس علم کو چھوٹے چھوٹے غیر مربوط جزئیات میں تقسیم نہیں کریں گے، بلکہ کثرت میں وحدت کا رنگ رونما ہو جائے گا۔ اس سے جز و پرستی اور حد سے بڑھی ہوئی شعبہ جاتیت کی خامیاں بھی دور ہو جائیں گی۔ غالباً یہ تصور تعلیم کے اعلیٰ مرحلے پر ہی اختصاصی تعلیم شروع کرنے کے نقطہ نظر سے زیادہ قریب

ہے۔ ابتدائی مرحلوں میں تعلیم کو غیر اختصاصی رہنا چاہیئے۔ یہ طریقہ نوجوانوں میں وسعت نظر اور علمی دیانت و رواداری کی خوبیاں پیدا کرنے میں بہت اہم حصہ ادا کرے گا۔

(ھ) تعمیر کردار۔ تعلیم میں سب سے زیادہ اہمیت طالب علم کے کردار کی تشکیل کو حاصل ہونا چاہیئے۔ تعلیم جب تک اچھے کردار تعمیر نہ کرے گی، اپنا حقیقی مقصد کبھی حاصل نہ کر پائے گی۔ اسلام میں نیک اعمال اولین اہمیت کے حامل ہیں۔ قرآن پاک میں ایمان اور عمل صالح کی ہر ایک وقت تلقین کی گئی ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بنیادی مشن میں تزکیہ، یعنی انسانی زندگی اور روح کی تطہیر شامل ہے اور اسے اولیت حاصل ہے۔

یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ کردار کے بنیادی رجحانات کی اساس زندگی کے ابتدائی دور ہی میں پڑ جاتی ہے اور اسکول اور کالج ایک انسان کے کردار کی تعمیر میں اہم حصہ ادا کر سکتے ہیں۔ یہ کام تعلیم کا ہے کہ وہ انسانی کردار کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دے امام غزالی لکھتے ہیں:

”تعلیم کا مقصد یہی نہیں ہونا چاہیئے کہ نوجوان ذہن کے علم کی پیاس بجھا دے بلکہ اس کے ساتھ ہی اسے اخلاقی کردار اور اجتماعی زندگی کے اوصاف نکھارنے کا اساس بھی پیدا کرنا چاہیئے۔“

ہمارے سامنے انسانی زندگی کا مثالی نمونہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک ہے جیسا کہ قرآن کریم میں بھی ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۱۱۱ خزاب - ۲۱)

رسول اللہ کا ایک عمدہ نمونہ موجود ہے تمہارے لئے۔

تعلیم کے تمام مراحل پر طلبہ کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ کی مثالی زندگیاں پڑھائی جانی چاہئیں۔ استاد کو خود اپنی زندگی اور اپنے کردار اور عمل سے طالب علم میں ایک نیک زندگی اختیار کرنے کا جذبہ پیدا کرنا چاہیئے اور درس گاہوں کا ماحول بھی ایسا ہونا چاہیئے کہ اس سلسلے میں مدد و معاون ہو سکے۔

(و) تکمیل حیات۔ اسلام زندگی اور اس کی مشرتوں کو ترک کرنے کا نام نہیں بلکہ وہ ان کی تکمیل کا داعی ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہماری تعلیم کو ہمارے نوجوانوں کو زندگی اور اس کے مطالبات کی تکمیل کے لئے تیار کرنا چاہیئے۔ انہیں زندگی گزارنے کے طریقوں کی تربیت دینی چاہیئے اور معاشرے کی گونا گوں ضروریات کو پورا کرنے کے لائق بنانا چاہیئے۔ اسلام رہبانیت کا مخالف ہے اور چاہتا ہے کہ انسان زندگی کی کشمکش کے درمیان

حق و انصاف کے ساتھ اپنی زندگی گزار دے۔ قرآن ہمیں دنیا اور آخرت دونوں کے بہترین حصول کی تعلیم دیتا ہے۔ قرآن کریم میں ان لوگوں کو سختی سے خبردار کیا گیا ہے جو اس کی عنایات سے لطف اندوز ہونے سے انکار کرتے ہیں:

”ان سے کہو کہ کس کے حکم سے تم نے ان نعمتوں سے منہ پھیرا ہے جو اللہ نے اپنے بندوں کے لئے تخلیق کی ہیں۔ کھانے پینے کی اور استعمال کی ان چیزوں سے جو اس نے ان کے لئے بنائیں۔“ (الاعراف - ۳۳)

اسلام کا رویہ اس قرآنی آیت سے بالکل ظاہر ہے:

”كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا“ (الاعراف - ۳۱)

(کھاؤ پیو مگر حد سے زیادہ اسراف نہ کرو)

اسلام کی نظر میں انسانی محنت اور مشقت نہایت ہی قابل قدر ہے۔ اسلام ہر فرد کو اپنی روزی خود کمانے کے قابل بناتا ہے۔ پس تعلیم کو دیانت دارانہ، منصفانہ اور معقول معاش کے حصول میں مدد و معاون ہونا چاہیئے۔ علاوہ ازیں تعلیم کو معاشرے کی اقتصادی، سماجی، سائنسی اور فنی ضروریات پوری کرنی چاہئیں۔ ان ضروریات کو نہ صرف یہ کہ نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے بلکہ تعلیم کو ان کی تکمیل کے لئے مثبت طور پر کام کرنا چاہیئے۔ پھر تعلیم میں اتنا عملی عنصر ضرور ہونا چاہیئے کہ ہر فرد معاشی استحکام حاصل کر سکے۔

ان مقاصد سے ہم آہنگ نظام تعلیم اسلامی ترجیحات کا ترجمان ہوگا اور نبی آدم کے لئے رحمت ثابت ہوگا۔

(احیاء علوم الدین امام غزالی)

۴۔ مسلمانوں کی تعلیمی روایات

ہم نے مندرجہ بالا صفحات میں علم اور تعلیم کے بارے میں اسلام کے بنیادی نقطہ نظر

کی وضاحت کی ہے۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں مسلمانوں کا پورا نظام تعلیم اپنی بنیادی اقدار کے حصول کی جدوجہد سے عبارت ہے۔ طریقے مختلف رہے ہیں۔ اصول تنظیم میں تنوع نظر آتا ہے، اداروں کی ہیئت بھی بدلتی رہی ہے، لیکن بنیادی مقصد اور مزاج ایک ہی رہا ہے۔

دور نبوی میں تعلیمی روایت

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ملت اسلامیہ کے سب سے پہلے معلم تھے۔ آپ ہی نے پہلی منظم تعلیم گاہ مدینہ منورہ میں قائم فرمائی۔ صفحہ نامی چوترا پہلا مدرسہ تھا اور اصحاب صفہ اس کے معلم تھے۔ اس مدرسے میں ۴۰ یا ۸۰ تک طالب علم تھے جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کے علاوہ دوسرے صحابہ کبار بھی یہاں معلم کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے تھے۔ اصحاب صفہ میں سے ایک یعنی حضرت معاذ بن جبل مالی امور کے نگران تھے اور عطیات کی تقسیم کا کام ان ہی کے سپرد تھا۔ ان متعلمین میں سے مختلف افراد اسلامی حکومت کی مختلف خدمات کے لئے مامور کر دیئے جاتے تھے اور تعلیم و تبلیغ کے لئے تو خصوصیت سے انہیں اصحاب کو بھیجا جاتا تھا۔ اپنی مالی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے یہ طلبہ خود بھی محنت کرتے اور کماتے۔ دوسرے اہل ثروت مسلمان بھی ان طلبا اور ان کے متعلمین کی مقدور بھر مدد کرتے اور خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی براہ راست ان کی مدد فرماتے۔ اس مدرسے نے اسلامی قلمرو میں تعلیم کی نہج قائم کی اور جو روایت اس میں پڑی وہی ہماری تعلیمی روایت بن گئی اور وہ روایت یہ تھی :

(۱) اولین چیز دینی تعلیم ہے۔ قرآن اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو نصاب تعلیم کا مرکز و محور ہونا چاہیئے۔

(ب) تعلیم کا مقصد (۱) اچھا مسلمان اور داعی الی الحق بنانا (۲) اور مسلم معاشرے کی ہمہ ضروریات کو پورا کرنا ہے۔

(ج) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم اور مسجد کا تعلق قائم کیا۔ مسجد دینی محور سیاسی مرکز اور تعلیم گاہ بنی اور اس کے ذریعے طالب علم ایک مخصوص ثقافتی ورثے کے امین بنے۔

(د) متعلمین کے لئے اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے خود محنت مزدوری کرنا اور مختلف حرفتوں کو سیکھنا اور ان سے وابستہ ہونا اچھا اور پسندیدہ قرار پایا۔

(ه) تعلیم کی آخری ذمہ داری مسلمان معاشرے اور اسلامی ریاست پر عائد ہوتی ہے اور اسے اس مقصد کے لئے اپنے وسائل استعمال کرنے چاہئیں مسلمانوں کی قومی آمدنی اور بیت المال پر اولین حق زیر تعلیم طلبہ اور ان پر ہونے والے جملہ مصارف کا ہے۔

ادوار ما بعد

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ بنیادی نہج پڑی اور ان ہی خطوط پر بعد میں ارتقاء ہوا۔ مساجد تعلیم کا مرکز بن گئیں۔ ہر جگہ حلقہ ہائے درس قرآن و حدیث قائم ہوئے۔ ایک ایک مسجد میں کئی کئی حلقے بنے اور ایک ایک حلقے میں ہزاروں طلبہ شریک ہونے لگے۔ جو اساتذہ متمول تھے وہ اپنی کفالت آپ کرتے لیکن جو ضرورت مند تھے ان کی کفالت بیت المال کرتا۔ خلفائے راشدین نے باقاعدہ تنخواہیں اور وظیفے مقرر فرمائے اور ہر مسجد ایک مکتب اور

ہر میدان ایک تعلیم گاہ بن گیا۔ پہلی چار صدیوں میں تعلیم کا یہی نظام رائج تھا۔ اصطلاحی مدارس نہ ہونے کے باوجود یہ نظام اتنا مستحکم اور سہمہ گیر تھا کہ گھر گھر تعلیم پھیل رہی تھی اور ایک قسم کی ہمہ رس اور ہمہ گیر تعلیم موجود تھی۔ اسماء الرجال کی کتابوں میں اس دور کے ۵ لاکھ علماء کے مفصل حالات ملتے ہیں۔ اس زمانے کے تعلیمی اداروں میں مرکزی حیثیت مساجد ہی کو حاصل تھی۔ اور مساجد کے فن تعمیر پر ان کے اس تعلیمی رول کا خاصا اثر پڑا ہے۔ تینوں سمتوں میں دالانوں کا ہونا اور بڑی تعداد میں حجروں کی موجودگی اس کا ثبوت ہیں۔ اس دور کی اہم تعلیم گاہوں میں سے جو قابل ذکر ہیں اور جو آج بھی موجود ہیں وہ تیونس کی جامعہ زیتون اور مصر کی جامعہ ازہر ہیں۔ مساجد کے علاوہ خاںقاہیں، علماء کے مکانات اور کھلے میدان بھی تعلیم گاہ کی حیثیت رکھتے تھے اور ہر علاقے میں لاکھوں طلبہ کو مفت تعلیم دی جاتی تھی۔

یہ مسلمانوں کے تعلیمی نظام کا پہلا دور ہے۔ دوسرے دور کا آغاز پانچویں صدی کے اوائل سے ہوتا ہے۔ اس میں مساجد کے علاوہ باقاعدہ مدارس بھی قائم ہوئے اور بڑے وسیع پیمانے پر ہوئے۔ غالباً سب سے پہلا مدرسہ جس کی اپنی عمارت، سرکاری گرانٹ اور وقف املاک برائے عام اخراجات اور مرتبہ نصاب تعلیم وغیرہ تھے، سلطان محمود غزنوی نے اپنے پایہ تخت غزنی میں شاہکھ (بمطابق سلسلہ) میں قائم کیا۔ بقول ابوالقاسم فرشتہ ”مسجد سے ملتی ایک عظیم الشان مدرسہ قائم کیا اور اس کے کتب خانے کو نادر الوجود کتب سے آراستہ کیا اور مسجد و مدرسہ کے اخراجات کے لئے بہت سے دیہات وقف کئے“ محمود غزنوی نے اپنی پوری مملکت میں بے شمار مدرسے قائم کئے اور اس کے زیر اثر دوسرے امرا اور ارکان دولت نے بھی یہ خدمت انجام دی۔ تاریخ نے محمود غزنوی کو اس کے عسکری حملوں کی وجہ سے تو یاد رکھا ہے لیکن علم کی دنیا میں جو انقلاب آفرین اقدام اس نے کیا اس کا قرار واقعی اعتراف نہیں کیا گیا۔ اسے تاریخ کی ستم ظریفی نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے۔

دوسرا اہم مدرسہ جس نے تاریخ میں اپنا نام پیدا کیا دولت سلجوقیہ کے مشہور وزیر اعظم نظام الملک طوسی (المتوفی ۴۸۵ھ) کا قائم کردہ مدرسہ نظامیہ بغداد ہے جسے امام الحرمین اور امام غزالی جیسے صدر مدرسین حاصل ہوئے اور جس نے تاریخ پر اپنے اثاثے نفوش چھوڑے۔

اس کے بعد مدارس کی ایک روچل پڑی اور ساری اسلامی قلمروں میں ان کا جال بکھ گیا۔ ان میں ایسے عظیم الشان مدارس بھی تھے جن کے تحت متعدد مدارس کام کرتے تھے اور ان کی حیثیت آج کی اصطلاح میں یونیورسٹی کی سی تھی۔ ان تمام مدارس میں وہی اصول کار فرما تھے جن کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔ مفت عوامی تعلیم کا یہ ایک ایسا نظام تھا جس کی نظیر کسی دوسرے

تمدن میں نہیں ملتی۔ (تاریخ فرشتہ جلد-۱)

۵۔ برعظیم میں تعلیمی روایت کا ارتقاء | برعظیم پاک و ہند میں اسلام کی دعوت دور رسالت اور عہد خلافت

راشدہ میں پہنچ چکی تھی۔ پھر بنو امیہ کے دور میں محمد بن قاسم کے ہاتھوں ایک بڑا علاقہ فتح ہوا اور اسلامی ریاست قائم ہوئی۔ اس زمانہ میں علوم کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ اس دور کے انٹ اثرات یہاں کی تاریخ اور تمدن پر پڑے۔ لیکن برصغیر سے دولت اسلامیہ کا یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ پھر محمود غزنوی کے حملوں نے خیبر سے سونمات تک ایک بار پھر اسلام کا غلغلہ بلند کر دیا۔ لیکن مسلمانوں کی حکومت کا باقاعدہ آغاز معز الدین محمد بن سام کے ہاتھوں ہوا۔ قطب الدین سے بہادر شاہ ظفر تک تقریباً ساڑھے سات سو سال مسلمان یہاں حکمران رہے اور اس زمانے میں مسلمانوں نے اپنے نظام تعلیم کو نشو و نما دینے کی پوری کوشش کی۔ اس دور کے تعلیمی نظام اور علمی سرگرمیوں کے مطالعے سے جو اہم چیزیں سامنے آتی ہیں، ہم یہاں ان کا مختصر تذکرہ کریں گے۔

(۱) تعلیم کا جو مزاج قرون اولیٰ میں تشکیل پایا تھا یہاں بھی اس کو بڑی حد تک قائم رکھا گیا۔ تعلیم کا مرکز دین اسلام رہا اور تمام تعلیمی سرگرمیاں اسی محور کے گرد گھومتی رہیں۔ تعلیم کو ایک عبادت تصور کیا گیا۔ اور اہل علم کا طریقہ یہ تھا کہ وہ کسی باقاعدہ مدرسے سے وابستہ ہوں یا نہ ہوں، علم کی اشاعت کے ذریعہ اس کی ”زکوٰۃ“ برابر نکالتے رہے۔

(۲) برعظیم میں شروع ہی سے باقاعدہ مدارس کا نظام قائم ہوا، لیکن تعلیم کا ذریعہ صرف مدارس ہی نہ تھے۔ ابتدائی تعلیم گھروں پر ہوتی تھی، لڑکیوں کی تعلیم کا انتظام بھی گھروں پر ہی تھا۔ پھر قدیم اسلامی روایت کے مطابق مساجد تعلیم کا بہت بڑا مرکز رہیں۔ اہل علم کے مکانات بھی مستقل تعلیمی مراکز کی حیثیت رکھتے تھے۔ کتب خانے محض لائبریری کی حیثیت نہ رکھتے تھے۔ بلکہ اعلیٰ تعلیم کا ایک اہم مرکز تھے۔ بڑے پیمانے پر تعلیمی مجالس کا ذکر بھی تذکروں اور تاریخ کی کتابوں میں ملتا ہے۔

۳۔ ایک اور بڑی اہم چیز یہ ہے کہ گودینی تعلیم پورے نظام کا مرکز و محور تھی، لیکن دوسری ضرورتوں سے کسی زمانے میں بھی اور کسی سطح پر بھی صرف نظر نہیں کیا گیا۔ صنعتی تعلیم کا انتظام کارخانوں میں تھا۔ تجارتی تعلیم کے لئے ہاجتی اسکول تھے۔ جہاں تجارتی ہندسہ اور تجارت کے اصولوں کی ابتدائی تعلیم دی جاتی تھی۔ فنون سپہ گری کی تعلیم کے لئے بے شمار ادارے اور اکیڈمیاں تھیں۔ کتابت، خطاطی، طبری نویسی، فن کوزہ گری، فن تعمیر، غرض ہر ایک اہل فن کے گرد طالبان علم کا ہجوم رہتا اور وہ اپنے اپنے فن میں کینٹے روزگار فن کا تیار کرتے۔ ان

کے لئے باقاعدہ مدارس اور اکیڈمیوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اس سے نظام تعلیم کی وسعت اور ہمہ گیری کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

تعلیم کے اس ہمہ گیر تصور اور انتظام کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جاسکتا ہے۔ کہ مدارس میں جو نظام تعلیم رائج تھا، اور جس پر ہم بعد میں گفتگو کریں گے اس میں اگر ایک طرف قرآن فقہ، منطق اور کلام کو اہمیت دی گئی تھی تو دوسری طرف تاریخ اور طبیعیات اور علم ہندسہ اور جغرافیہ کو ایک بنیادی مقام دیا گیا تھا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ اس نصاب کا مقصد مسلمان حکومت کی سول سروس تیار کرنا تھا، خصوصیت سے قضاء و عدالت کی ضروریات کی تکمیل مسلمان اپنے نظام تعلیم کے مسائل پر جس ذہن سے غور کرتے تھے اس میں جہاں یہ فکر تھی کہ ہر چیز دین کے رنگ میں رنگی ہوئی ہو وہاں انہیں اس کا بھی خیال تھا کہ اپنے زمانے کے تقاضوں کو وہ پورا کر رہی ہو اور جس کام کے لئے جو علم و جہارت درکار ہے وہ فراہم کر رہی ہو۔ اس کا اندازہ اور رنگ زیب عالمگیر کی اس گفتگو سے ہو سکتا ہے جس میں مخاطب ملا صالح تھے جو شاہی خاندان کی تعلیم پر مامور تھے۔:-

”کیا میرے معلم کا یہ فرض نہ تھا کہ وہ مجھے روئے زمین کی ہر قوم کے امتیازی خصائص سے روشناس کراتا۔ مجھے علم ہونا چاہیئے کہ ان اقوام کے وسائل اور ان کی طاقت کیا ہے، ان کے آداب و اطوار، مذاہب و طرز حکومت طریق جنگ وغیرہ کیا ہیں اور وہ کون سے امور ہیں جن میں یہ دلچسپی رکھتی ہیں۔ اور پھر یہ بھی ضروری ہے کہ باقاعدہ تعلیمی نصاب کے ذریعے بتایا جائے کہ ریاست کا آغاز کیسے ہوا قوموں کے عروج و زوال کے اسباب کیا ہیں، اور وہ کون کون سے اسباب و عوامل اور حوادث ہیں جن کی بناء پر عظیم تبدیلیاں اور مہتمم بالشان انقلابات رونما ہوتے رہے ہیں“

(۴) اس دور میں جس پیمانے پر تعلیم پھیلی ہوئی تھی آج اس کا اندازہ کرنا بھی ہمارے لئے مشکل ہے۔ ابھی مسلمانوں کو ہندوستان میں آئے ہوئے ایک صدی بھی نہ گزری تھی کہ اس ملک میں جس میں تعلیم صرف پنڈتوں کا اجارہ تھی اور جہاں اگر شورور کے کان میں مذہبی کتب کے الفاظ پڑ جاتے تو اس کی پاداش میں ان کانوں میں پگھلا ہوا گرم سیسہ ڈالا جاتا تھا۔ ہر طرف تعلیم و تعلم کا چرچا تھا اور پورا ملک علوم و فنون کا گہوارہ بن گیا تھا۔ سلطان محمد تغلق (۷۲۵ھ تا ۷۵۲ھ بمطابق ۱۳۲۳ء تا ۱۳۵۱ء) کے زمانے کے بارے میں

مقرری کی روایت ہے :

”سلطان محمد تغلق کے عہد میں دہلی کے اندر ایک ہزار اسلامی مدارس قائم تھے جن میں شوافع کا بھی ایک مدرسہ تھا۔ مدرسین کے لئے شاہی خزانے سے تنخواہیں مقرر تھیں۔ تعلیم اس قدر عام تھی کہ کنیزی تک حافظ قرآن اور عالم ہوتیں۔ مدارس میں علوم دینیہ کے ساتھ معقولات اور ریاضی کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔

صحیح الاعتقادی کا مصنف بھی اس کی شہادت دیتا ہے کہ ہندوستان کے پایہ تخت دہلی میں اس وقت ایک ہزار مدارس جاری تھے۔ پھر یہ مدارس معمولی قسم کے مدارس نہ تھے بلکہ ان میں ایسے ایسے مدارس بھی تھے جو آج کی یونیورسٹیوں سے بھی زیادہ عظیم الشان تھے۔ مدرسہ فیروز شاہی کے بارے میں مشہور مؤرخ ضیاء الدین برنی کا یہ قول قابل نقل ہے کہ :

”دہلی کا یہ مدرسہ اپنی شان و شوکت، خوبی عمارت، محل وقوع، حسن انتظام اور تعلیم کی عمدگی کے لحاظ سے اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ مضاف کے لئے شاہی خائف مقرر ہیں۔ پایہ تخت دہلی کی کوئی عمارت حسن تعمیر اور موقع و محل کے لحاظ سے مدرسہ فیروز شاہی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ مدرسے کی عمارت بہت وسیع ہے اور ایک بہت بڑے باغ کے اندر نالاب کے کنارے واقع ہے۔ ہر وقت سینکڑوں طلبہ اور علماء و فضلاء یہاں موجود رہتے ہیں۔ طلبہ و اساتذہ کے مکانات بنے ہوئے ہیں اور دواغ کے کنجوں میں سنگ مرمر کے فرش پر نہایت آزادی کے ساتھ اپنے شاغل میں منہمک نظر آتے ہیں“

عہد عالمگیری کا مشہور مغربی کپتان الیگزینڈر ہملٹن اپنے سفر نامہ سندھ میں صرف ایک شہر ٹھٹھہ کے بارے میں لکھتا ہے کہ وہاں مختلف علوم و فنون کے چار سو مدرسے تھے۔ یہ کیفیت ایک شہر کی نہیں، ہر شہر کی تھی، ایک علاقے کی نہیں ہر علاقے کی تھی اور ایک دور کی نہیں مسلمانوں کے پورے دور حکمرانی کی تھی۔ مسلمانوں کے پورے دور حکومت میں خواندگی ہی نہیں تعلیم کا معیار بھی بہت بلند تھا۔ اس کی سہولتیں شہر شہر، قصبہ قصبہ، دیہات دیہات، محلہ محلہ، گھر گھر پہنچی ہوئی تھیں۔ اور اس سے بدرجہا بہتر حالت تھی جسے آج کے ماہرین ہمہ رس تعلیم (UNIVERSAL EDUCATION) کہتے ہیں۔

(۵) مسلمانوں کے نظام تعلیم کی ایک خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ وہ خالص عوامی تھا۔ حکومتیں تعلیم کے فروغ کے لئے کثیر روپیہ خرچ کرتی تھیں اور ہر طرح کی سہولتیں فراہم کرتی تھیں لیکن کسی زمانے میں بھی تعلیم کا نظام حکومت کے تابع نہ تھا۔ کوئی ایک حکمہ ایسا نہ

تھا جو تعلیمی ادارہ کی حکومت کی طرف سے نگرانی رکھتا ہو۔ سلاطین دہلی اور شاہان مغلیہ کے دور میں ”صدرالصدور“ کے ایک عہدے کا نام ضرور ملتا ہے۔ اس کا کام تعلیمی اور اخلاقی امور کی نگرانی تھا لیکن صرف اس حد تک کہ تعلیمی ضروریات پوری ہوں۔ مدرسہ کی آزاد قضا پر اس کا کوئی اثر نہ تھا اور نہ یہ نصاب تعلیم کو اپنی گرفت میں رکھتا تھا۔ اس شعبے کا ایک کام یہ بھی تھا کہ جو اچھے باصلاحیت نوجوان نظر آئیں ان کو فتاویٰ اور قضاء کی ذمہ داریوں کے لئے منتخب کرے مسلمانوں نے پورے دور حکومت میں کبھی بھی نصاب تعلیم کو حکومت کے تابع نہیں کیا۔ ہر مدرسہ اپنا نظام چلانے کے لئے آزاد تھا، حتیٰ کہ وہ مدارس جو صرف سرکاری خزانے سے قائم ہوتے تھے وہاں بھی اساتذہ آزاد تھے۔ اگر کسی بڑے عالم نے نصاب میں کوئی تبدیلی کی تو اسے اس کی صحت اور علمی برتری کی بناء پر تو قبول عام حاصل ہوا لیکن ریاست کی قوت کے ذریعے اسے مسلط نہیں کیا گیا تعجب یہ ہے کہ اس کے بغیر بھی پورے نظام میں غیر معمولی ہم آہنگی اور مطابقت پائی جاتی ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ہماری ثقافتی قوتوں کی گرفت معاشرے پر اتنی مضبوط تھی کہ بالکل فطری انداز میں تعلیم میں یکانگت اور یک رنگی پیدا ہوئی۔ اس آزادی کے باوجود اس طرح کی فطری یکانگت کی مثال بھی دنیا کے کسی دوسرے تمدن میں نہیں ملتی۔

(مسلمانوں کی قدیم درس گاہیں)

یونانیوں میں آزادی تھی مگر انہوں نے تعلیم کو ایک ذہنی ورزش بنا دیا تھا۔ چین میں تعلیم پر خاندان اور حکومت دونوں کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ ہندو تہذیب میں عمومی تعلیم کا تصور ہی نہ تھا۔ لیکن مسلمانوں نے ریاست کی طرف سے تعلیم کی حوصلہ افزائی اور غیر معمولی مالی اعانت کے باوجود ایک بالکل آزاد تعلیمی نظام قائم کیا، جس میں تعلیم کا محور استاد تھا اور نظم و ضبط کو قائم رکھنے والی قوت اخلاق کی قوت تھی۔ یہ ایک عجیب و غریب تجربہ تھا، جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ ہماری نگاہ میں اس کی وجہ اسلام کا مخصوص مزاج، اکرام انسانیت اور فرد کی آزادی کا اسلامی تصور، آخرت کی جواب دہی کا احساس اور اسلام کی قائم کردہ معاشرتی جمہوریت ہے۔ جس سے دنیا کے دوسرے نظام آشنا نہیں۔

(۶) ایک طرف یہ آزادی تھی اور دوسری طرف حکومت کی سرپرستی کا عالم یہ تھا کہ وہ تعلیم کو اپنے تمام کاموں سے زیادہ اہم سمجھتی تھی۔ اس کا اندازہ اس ایک جملے سے کیجئے جو نظام الملک ٹپوسی نے ملک شاہ سلجوقی کے جواب میں کہا تھا۔ ہوا یوں کہ شاہ کو ایک موقع پر تعلیم پر غیر معمولی اخراجات سے کچھ تشویش ہوئی اس نے کہا کہ اس زرکشیر سے تو ایک لشکر جبار تیار ہو سکتا ہے۔ نظام الملک نے کہا کہ ”اے بادشاہ تیری فوج کے تیر تو فقط چند قدم پر کام لے سکتے

ہیں لیکن میں جو فوج تیار کر رہا ہوں اس کے تیر زلمنے کے سارے طول و عرض میں موثر ہیں اور اس کی دعاؤں اور حسنت کے تیر تو آسمان کی سپر سے بھی نہیں رک سکتے، "ارباب حکومت تعلیم کو ایک تجارت نہ سمجھتے تھے اور نہ خزانے پر اسے ایک بار تصور کرتے تھے بلکہ انہیں یقین تھا کہ یہ دنیا و آخرت دونوں کو بنانے کے لئے ایک موثر ترین ذریعہ ہے۔

قطب الدین ایک سے بلبن تک جو حکمران گزرے ہیں انہوں نے بڑے پیمانے پر مدارس قائم کئے اور مساجد تعمیر کرائیں۔ فیروز تغلق کے بجٹ میں ۱۳۶ لاکھ تنکہ (جو روپے کے برابر تھا) وظائف وغیرہ کے لئے تھا لیکن اس کا تقریباً ۲۵ فی صد یعنی ۳۶ لاکھ تنکہ صرف تعلیم کے فروغ کے لئے استعمال ہوتا تھا اس نے ۳۰ کالج اور ایک یونیورسٹی دہلی میں قائم کی جس کا سارا خرچ سرکاری خزانے سے پورا کیا جاتا تھا۔

بہمنی اور دکن کی حکومتیں بھی تعلیم پر کثیر رقم خرچ کر رہی تھیں مغل بادشاہوں میں علم کی سپرستی میں ایک سے ایک بڑھا ہوا تھا۔ جہانگیر کا ذوق اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ بقول مشنف تاریخ جان جہان "اس نے اُن مدارس کو از سر نو تعمیر کروایا جو تیس تیس سال سے پڑے تھے اور پرندوں اور جانوروں کی رہائش بن چکے تھے اور ان کو دوبارہ طلبہ اور اساتذہ سے بھر دیا۔" جہانگیر نے تعلیم پر دل کھول کر خرچ کیا اور بقول ایچ۔ جی کین (H. G. KEANE) "اس نے لاتعداد اسکول اور کالج قائم کئے،" محمد شاہ بھی جسے تاریخ "رنگیلا" کے نام سے جانتی ہے تعلیم پر بے دریغ خرچ کرتا تھا اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کا مشہور دارالعلوم اسی کی علمی فیاضیوں کا مہربون منت تھا۔

یہ تھا مسلمان حکومتوں کا حال۔ اسی روش پر مسلمان امراء، اعیان حکومت، زمیندار، جاگیردار اور دوسرے اہل ثروت عمل کرتے تھے۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی اسی صوبہ اودھ کا حال لکھتے ہوئے رقم طراز ہیں :

"پورے صوبہ اودھ اور صوبہ آباد کے بڑے حصے میں پانچ پانچ کوس، زیادہ سے زیادہ دس دس کوس کے فاصلہ پر شرفا اور عالی خاندان لوگوں کی آبادی ہے جو سلاطین و حکام کی طرف سے تنخواہ و جاگیر مدد معاش کے طور پر رکھتے ہیں۔ انہوں نے مساجد، مدارس اور خانقاہیں تعمیر کر رکھی ہیں، اور اساتذہ و مدرسین ہر جگہ علمی فیض رسانی میں مشغول ہیں۔ انہوں نے طلب علم کا ایک جذبہ

لے واضح رہے کہ اُس زمانے کے تنکہ کی قوت خرید موجودہ روپیہ کی قوت خرید سے تقریباً تیس گن بلکہ اس سے بھی زیادہ تھی۔

دولور پیدا کر رکھا ہے۔ طلبہ گروہ درگروہ اور فوج در فوج ایک شہر سے دوسرے شہر جا رہے ہیں اور جہاں موقعہ دیکھتے ہیں تحصیل علم میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ ہر بستی کے اہل توفیق ان طلبہ کا خیال رکھتے ہیں اور اس جماعت کی خدمت کو سعادت عظمیٰ شمار کرتے ہیں۔ صاحب قرآن ثانی شاہ جہاں انار اللہ برمانہ کا قول تھا کہ ”پورب شیراز مملکت ماست“

(۷) ایک اور قابل ذکر چیز یہ ہے کہ تعلیم ہمیشہ مفت رہی۔

پاک و ہند کے نظام تعلیم میں نہ صرف یہ کہ تعلیم مفت تھی بلکہ طلبہ کے بود و باش اور خورد و نوش کا بھی پورا انتظام کیا جاتا تھا اور چھپ خرچ کے لئے غریب طلبہ کو سرکاری ذرائع سے اور امراء کی طرف سے وظائف دیئے جاتے ہیں۔ کچھ مدرسے تو ایسے تھے جو نہایت شان و شوکت کے ساتھ یہ ضروریات پوری کرتے تھے۔ مدرسوں اور مساجد میں بڑی تعداد میں حجرے ہوتے تھے جو طالب علموں کی رہائش کے کام آتے تھے۔

(۸) اس نظام کی ایک اور خصوصیت استاد و شاگرد کا قلبی تعلق تھا۔ تعلیم کے محور استاد تھے اور ان کی حیثیت معلم اور مربی کی تھی۔ اساتذہ کا کردار مثالی ہوتا تھا۔ ان کے ایشیا و قربانی اور اخلاص اور تعلیمی انہماک کا حال پڑھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اسلام کیسے کیسے نمونے تیار کر سکتا ہے اور کتنی کثیر تعداد میں کر سکتا ہے۔ اساتذہ کا تعلق اپنے شاگردوں سے کیسا تھا اس کا اندازہ مشہور مدرس حکیم علی گیلانی کے بارے میں ”تذکرہ علمائے ہند کے اس فقرہ سے کیجئے :

”پیوستہ طلبہ را درس گفتے و بے ایشاں طعام نہ خوردے“

(ہمیشہ طلبہ کو درس دیتے اور ان کے بغیر کھانا نہ کھاتے۔)

اپنے طلبہ کا ان کو کتنا خیال تھا اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ جب ملک العلماء مولانا عبدالعلی بھرا العلوم کو منشی صدر الدین نے بہار (بردوان) آنے کی تکلیف دی اور گراں قدر تنخواہ کی پیش کش کی تو مولانا نے عذر فرمایا کہ میرے ساتھ ۱۰۰ طلبہ ہیں جب تک ان کے قیام و طعام کا انتظام نہ ہو میں نہیں آسکتا۔ پھر طلبہ کا حال بھی یہ تھا کہ اپنے اساتذہ سے بے صحبت کرتے تھے اور سعادت مندی، روحانی انبساط اور قلبی وابستگی کی آخری حدوں کو چھو جاتے تھے۔

(۹) اس نظام میں صرف استاد اور شاگرد میں قلبی تعلق ہی نہ تھا بلکہ استاد و طلبہ کے تزکیہ نفس اور اصلاح باطن کی فکر بھی کرتے تھے۔ اور انہیں ہر وقت یہ خیال دامن گیر رہتا تھا کہ طلبہ کا معیار علم ہی بلند نہ ہو ان کا معیار اخلاق بھی بلند ہو اور وہ اچھے انسان

اور اچھے مسلمان بن کر نکلیں۔ اگر اس معاشرے میں تقویٰ، ایفائے عہد، عصمت و عفت، ایثار و قربانی، صلہ رحمی، اخلاق و مروت اور ہمدردی و اخوت کا دور دورہ تھا تو اس کی وجہ یہی تھی کہ تعلیم ایک اخلاق ساز قوت کا کردار ادا کرتی تھی۔

(۱۰) اس دور کے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تعلیمی نظام میں مجہود نہ تھا۔ یہ نظام نئی نئی پیدا ہونے والی ضرورتوں کو پورا کر رہا تھا اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس نظام کے تیار کردہ افراد محض حجروں کی زینت نہ تھے، بلکہ نظام حکومت کو بھی چلا رہے تھے اور حکمت و دانش مندی کے ساتھ چلا رہے تھے۔ اگر درخت کو اس کے پھل سے پہچانا جاتا ہے تو اس نظام کو ان شخصیات سے پرکھا جاسکتا ہے جنہیں اس نے تیار کیا اور جنہوں نے زندگی کے ہر شعبے میں نام پیدا کیا۔

(مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت)
(مولانا مناظر احسن گیلانی)

سوالات متعلقہ باب چہارم

- (۱) قرآن کریم کی جمع و تدوین اور حفاظت پر ایک جامع مقالہ قلمبند کیجئے۔
- (۲) حدیث نبوی کی حجیت و اہمیت دلائل و براہین کی روشنی میں ثابت کیجئے۔
- (۳) اخلاق و ایمان کے باہمی تعلق پر ایک شذرہ تحریر کیجئے۔
- (۴) تعمیر سیرت کے اسلامی اصول کیا ہیں اور رسول کریمؐ نے کس طرح صحابہ کی تربیت فرمائی۔
- (۵) اسلام کے نظام معاشرت پر ایک جامع مقالہ تحریر کیجئے۔
- (۶) اسلام کا نظام قانون و عدل کیا ہے دلائل کی روشنی میں واضح کیجئے۔
- (۷) اسلام کے نظریہ تعلیم پر مفصل بحث کیجئے۔
- (۸) تعلیم کے اسلامی اصول کیا ہیں؟ تفصیلاً تحریر کیجئے۔
- (۹) مسلمانوں کی تعلیمی روایات پر ایک جامع مقالہ لکھئے۔
- (۱۰) تعلیم کا مقصد کیا ہے اور بے مقصد تعلیم سے کیا نقصان پہنچتا ہے۔

بابِ نَحْم

①۔ اسلام کے معاشی اصول

②۔ کفالت عامہ

③۔ اُمتِ مُسلمہ

④۔ اسلامی ریاست کی ضرورت

⑤۔ اسلام کے اصولِ حکمرانی

⑥۔ قیامِ پاکستان کے محرکات

⑦۔ تیاریں تحریکِ پاکستان

۱۔ اسلام کے معاشی اصول

۱۔ تصورِ معیشت | آج کی دنیا میں معاشیات کی اہمیت ناقابل انکار ہے۔ یہ اہمیت صرف اس احساس کی پیداوار نہیں ہے کہ ایک فرد کے لئے معاشی آزادی کے بغیر سیاسی اور معاشرتی آزادی بے معنی ہو جاتی ہے، معاشرے کے لئے معاشی انصاف کے بغیر سکون، سلامتی اور یک جہتی کا حصول ناممکن رہتا ہے اور قوموں کے لئے معاشی استحکام کے بغیر سیاسی آزادی کو بھی برقرار رکھنا محال ہو جاتا ہے۔ بلکہ انسان اس حقیقت کے شعور پر بھی بے چین اور مضطرب ہے کہ دنیا میں دولت کی فراوانی، وسائل پیداوار کی غیر العقول ترقی اور بے مثال معاشی ارتقاء کے باوجود غربت، افلاس، بے روزگاری اور معاشی اور معاشرتی ظلم کا دور دورہ ہے۔ آج بھی انسانی آبادی کا ساٹھ فیصدی حصہ نان شبینہ کا محتاج ہے۔ افلاس و کمیت اس کا اڈرھنا کچھ نا ہے۔ اس کے پاس نہ پیٹ بھرنے کو روٹی ہے نہ بدن کو چھپانے کو لباس، اور نہ سر ڈھانپنے کو معقول مسکن!۔ ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ اور تمام ترقی کے باوجود ہم مجموعی خوش حالی سے کیوں محروم ہیں؟ معاشی ترقی انسان کیسے فروغ و فلاح کا باعث کیوں نہیں ہوتی؟ جب ہم ان مسائل پر غور کرتے ہیں تو ہمیں لازماً معاشی نظام کے مسئلہ پر اور ان اصولوں پر جن کی بنیاد پر معاشی زندگی کو مرتب کیا جاتا ہے، غور کرنا پڑتا ہے۔ یہ مسئلہ ہمیں بحیثیت ایک ملک کے درپیش ہے، مسلمانوں کو پوری دنیا میں بحیثیت ایک ملت کے بھی اس سے سابقہ ہے اور پھر پوری انسانیت بھی اس مسئلے سے دوچار ہے۔ اس لئے ہم مسلمان دنیا کی جو معاشی اعتبار سے پس ماندہ ہے، مثال کو سامنے رکھ کر پہلے تو نوعیت مسئلہ کو واضح کریں گے اور پھر اسلام کے اصولوں پر گفتگو کریں گے۔

یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ آج کے انسان کا اصل مسئلہ محض صنعتی ترقی کا حصول یا پیداوار میں اضافہ ہے۔ بلاشبہ صنعتی ترقی اور معاشی پیداوار میں اضافہ بڑی ضروری چیزیں ہیں لیکن ان سے بھی زیادہ ضروری مسئلہ پورے معاشی نظام کا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ خود معاشی ترقی کا انحصار بھی اس مجموعی نظام پر ہے جس کی خوش میں یہ پروان چڑھتی ہے۔ نظام سے ہٹ کر ترقی کا کوئی تصور مشکل ہے۔

معاشی ترقی اور خوش حالی کا مفہوم ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ محض پیداوار میں اضافہ ہو جائے۔ معاشی خوش حالی کا اصل مفہوم ایک بہتر اور خوشحال معاشرے کی تشکیل و تعمیر ہے۔ پروفیسر دی۔ اے۔ ڈیمینٹ کے الفاظ میں ”صنعتی ترقی اُسی معاشرے کی خوش حالی کا باعث بن سکتی ہے جس کی زرعی بنیادیں مستحکم ہوں، بنیادی اور گھریلو حرفت مضبوط ہو اور جس میں روحانی قوت بھی پائی جاتی ہو۔ اس کے باوجود ایک خاص مرحلے سے آگے بڑھ کر خوش حالی کی رو مانڈ پڑ جاتی ہے، افراد کے فطری تعلقات میں ضعف پیدا ہو جاتا ہے اور معیار زندگی بڑھنے کے بجائے گھٹنے لگتا ہے۔“ ایک صحت مند نظام کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ معاشی سرگرمیوں کو مناسب حدود اور تعمیری انداز میں رو بہ عمل آنے کا موقع دے لیکن اس امر پر بھی نگاہ رکھے کہ یہ سرگرمیاں زندگی کے اعلیٰ مقاصد اور اقدار کے لئے نقصان دہ نہ بننے پائیں۔

یہ بات ہمیشہ سامنے رہنی چاہیے کہ ”حقیقی معاشی ترقی ایک ایسا ہمہ پہلو، انفرادی اور سماجی عمل ہے جس کے تحت افراد کے رویے اور اعتقادات اس طور پر نئے سانچوں میں ڈھالے جاتے ہیں کہ وہ اپنی روزمرہ کی کثیر تعداد سرگرمیوں میں بھی ایک نئی آزادی محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اور ان میں سے کئی سرگرمیاں ایسی ہوتی ہیں جنہیں کسی بھی معاشی یا مالی اصطلاح سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا ہے۔“ اور نہ ہی انہیں پیداوار کے اعداد و شمار سے ظاہر کیا جاسکتا ہے۔ پس ہمارا اصل کام یہ نہیں ہے کہ ہم چند جزوی اور نامکمل تبدیلیاں عمل میں لے آئیں۔ ہمارا اصل کام پورے نظام کی اصلاح و تبدیلی ہے۔ اس مسئلے کے بارے میں ہمارا رویہ حقیقت پسندانہ، انقلابی اور تخلیقی ہونا چاہیے۔ اور اسی طرح ہم کامیاب بھی ہو سکتے ہیں۔ ای۔ ڈی۔ ڈومر کے الفاظ ہیں ”معاشی ترقی کا انحصار معاشرے کی روح پر ہوتا ہے اور ترقی کے کسی بھی تشریحی نظریے کو اپنے اندر معاشرے کے طبعی ماحول، سیاسی ڈھانچے، توفیقات تعلیمی نظام اور قانونی نظام کو جگہ دینی چاہیے نیز اس کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اس معاشرے کے افراد کا سائنس، معاشرتی تبدیلیوں اور ارتکاز دولت کے بارے میں رویہ کیا ہے؟“

یہ سمجھنا کسی پہلو سے بھی دانشمندانہ نہیں ہے کہ ہمارا اصل مسئلہ محض صنعتی ترقی یا اس طرح کی کوئی اور چیز ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ایسی معاشی ترقی حاصل کی جائے جو صحیح سمت ہو نیز رفتار ہو، صحیح طریقوں سے حاصل کی جائے اور صحیح نتائج بھی نکالے۔ اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ پورے نظام میں بنیادی نوعیت کی تبدیلیاں نہ لائی جائیں۔ سامراجی دور کے فرمودہ معاشرتی اور اخلاقی تصورات کے مقابلے میں صحت مند تصورات ملک کے سامنے نہ رکھے جائیں، معاشی پالیسیوں کو بنیادی انسانی اقدار کی اساس پر استوار نہ کیا جائے۔ آج اور

مستاجر، محنت اور سرمائے، اور زمیندار اور کاشت کار کے درمیان اُن اقدار کی روشنی میں از سر نو تعلقات قائم نہ کئے جائیں جو ہمارے بنیادی نظریۂ حیات کا عطیہ ہیں۔ مندرجہ بالا تجربے سے جو نتائج ہمارے سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں :

(ا) معاشی ترقی صرف بہتر معاشی نظام ہی میں ممکن ہے۔

(ب) پس ماندہ ممالک کا موجودہ نظام ناقص ہے اور ترقی کا باعث بننے کے بجائے ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ اس لئے جب تک اسے تبدیل نہ کیا جائے۔ حقیقی معاشی ترقی کی توقع غیث ہے۔

(ج) اس طرح ہمارا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم اس معاشی نظام کو تبدیل کر کے ایک ایسے نظام کی بنیادیں جو ہماری ضروریات کو پورا کر سکے اور جو ہمارے تمدن، ہماری اقدار حیات اور ہمارے نظریۂ زندگی کے مطابق ہو۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ نیا نظام کیسا ہو؟ ہماری یہ ضرورت اسلامی نظام معیشت ہی پوری کر سکتا ہے اور ہم آئندہ صفحات میں اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کریں گے اور یہ بتائیں گے کہ اسلام نے معاشی زندگی کی ترتیب و تہذیب کے لئے کیا اصول دیئے ہیں۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ ان اصولوں کو عام فہم انداز میں بیان کریں۔ ان کو معاشیات کی اصطلاحی زبان میں بھی ادا کیا جاسکتا ہے لیکن عام قارئین کی سہولت کے لئے اصطلاحی زبان کے مقابلے میں عام انداز بیان اختیار کیا گیا ہے۔

۲۔ پیدائش اور صرف دولت کے اصول

اسلام جو معاشی نظام پیش کرتا ہے وہ مختصراً مندرجہ ذیل اصولوں پر مشتمل ہے۔

۱۔ معاشیات اور اخلاق و مذہب :- سب سے پہلے وہ فرد اور جماعت دونوں کے ذہن سے اس باطل نظریہ کو ختم کرتا ہے کہ اخلاق اور مذہب کا تعلق معاشی زندگی سے نہیں اور ”تجارت تو بس تجارت ہے!“ قرآن پاک بڑے بلیغ انداز میں معیشت اور اخلاق کا تعلق بیان کرتا ہے :

مسلمانو! جب جمعہ کے دن نماز کے لئے اذان دی جائے تو تم اللہ کی یاد کی طرف دوڑو اور لین دین چھوڑ دو۔ اگر تم جانتے ہو تو یہی تمہارے لئے بہتر ہے۔ پھر جب مناسخ ختم ہو جائے تو تم زمین پر پھیل جاؤ اور

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ
لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا
إِلَى ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذَٰلِكُمْ
خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ فَإِذَا
قُضِيََتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ

وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ وَاذْكُرُوا
اللَّهُ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝
(المجموعہ - ۹ - ۱۰)

اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کا ذکر
کثرت کے ساتھ کرتے رہو تاکہ تم صلاح
پاؤ۔

قرآن پاک میں متعدد مقامات پر معاش کو ”فضل اللہ“ کہا گیا ہے اور اس سے
ذہن میں یہ بات ڈالی گئی ہے کہ یہ سب خدا کی عنایت سے ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ
معاشی زندگی کو بھی انسان اسی طرح خدا کی حدود کا پابند بنائے جس طرح باقی تمام زندگی
کو اور ان مقاصد کی تحصیل کے لئے استیصال کرے جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لئے
اسلام نے مقرر کئے ہیں، مسلمان اپنی معاشی زندگی میں بھی حدود اللہ کا پابند اور ان اخلاقی
ضابطوں کا احترام کرنے والا ہوتا ہے جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے عائد
کئے ہیں۔ اس لئے مسلمانوں کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ :

”رَجَالٌ لَا تُلْهِهِمْ مَجَارِدُهُمْ وَلَا
بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ“ (النور - ۳۷)

وہ لوگ جنہیں خرید و فروخت اور تجارت خدا
کی یاد سے غافل نہیں کرتی۔

خدا کے ذکر کا بڑا وسیع مفہوم ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر حال میں وہ خدا کو یاد رکھتے
ہیں اور اس کی رضا جوئی کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ اسی طرح معاہدہ لکھنے اور صحیح گوایہ دینے
کو تقویٰ قرار دیا گیا اور ناپ تول میں کمی کو ایسا عظیم گناہ کہ اس کی وجہ سے ایک پوری قوم
کا تختہ الٹ دیا گیا۔ یہ وہ بنیادی نقطہ نظر ہے جو اسلام دیتا ہے اور جس کی بنیاد معاشیات
اور اخلاق کہ ہم آہنگی پر ہے۔ اس طرح اسلامی معاشیات کا انداز (APPROACH) اخلاقیاتی اور
قدر شناسانہ (NORMATIVE) ہے۔

۲۔ معاشی جدوجہد اور اس کا مقصد و مقام :- اسلام نے ساری
زمین بلکہ پوری کائنات کو انسان کے لئے میدان عمل قرار دیا ہے اور انسان کو ترغیب دی
ہے کہ وہ اپنی معاش کے حصول اور خلق خدا کے لئے فارغ البالی کے حصول کے لئے زیادہ سے
زیادہ جدوجہد کرے معاشیات کی اصطلاح میں اسے پیداوار کو بڑھانے (MAXIMISATION
OF PRODUCTION) پالیسی کہہ سکتے ہیں۔ سہ ماہیہ دارانہ معیشت میں اصل اہمیت نفع کی تکثیر
اور خدا کے بندوں کے لئے سامان معاش کی زیادہ سے زیادہ فراوانی کا حصول بنیادی اہمیت کا
حالیہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

”وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا
لَكُمْ فِيهَا مَعَالِيشًا“ (الاعراف - ۱۰)

اور بے شک ہم ہی نے تم کو زمین پر رہنے کی جگہ
دی اور اس میں تمہارے لئے سامان معاش پیدا کئے۔

کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے جو کچھ آسمانوں میں
ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اسے تمہارے لئے
مسخر کر دیا ہے اور اس نے تم پر اپنی ظاہری
اور باطنی نعمتیں پوری کر دی ہیں۔

”الْمُتَرَدَّوْنَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا
فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ
عَلَيْكُمْ نِعْمَهُ ظَاهِرَةً وَبَاطِنَةً“
(لقمان - ۲۰)

اس بنیادی حقیقت کے انبار کے بعد اسلام نے انسانوں کو مختلف طریقوں سے محنت
معاشی جدوجہد اور حصولِ رزق کی کوشش پر اکسایا ہے اور اس طرح ہر شخص کو فردِ غنی و پیدوار
کے لئے سرگرم عمل کر دیا ہے۔

(۱) بے عملی، بے روزگاری اور گدگری کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا اور اس پر سخت وعید
سنائی گئی۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کسی کو زیب
نہیں دیتا کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے، اور رزق کی تلاش نہ کرے اور یہ کہتا رہے کہ
”اللہ مجھے رزق عطا فرما“ تم کو (دعا کے ساتھ) اس کے لئے جدوجہد بھی کرنی چاہیے کیوں کہ تم
جانتے ہو کہ آسمان تو سونا چاندی برساتا نہیں۔ (المدينة والسلام بہ حوالہ اساس تہذیب)

ایک اور حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے لئے کام کرنا بہتر ہے
سے بہ نسبت اس کے کہ قیامت کے دن تم اپنے چہرے پر سوال کا داغ لئے ہوئے آؤ۔ (ابوداؤد)
(ب) پھر مثبت طور پر رزق کی جدوجہد کی ترغیب دی اور اسے ہر مسلمان پر فرض کیا۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم فجر کی نماز پڑھ لو تو اپنی روزی کی تلاش سے
غافل ہو کر سوتے نہ رہو (کنز العمال) ایک اور حدیث میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
کہ دنیا کی شرافت غنا، اور فراغ دستی ہے اور آخرت کی شرافت تقویٰ و پرہیزگاری ہے۔
(کنز العمال الحقائق)

اور خود قرآن پاک میں اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

وَلَا تَأْسَ فَتَصِیْبْكَ مِنَ الدِّیْنِ
(القصص - ۷۷)

بنی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ”کسب حلال“ کو فریضہ بعد الفریضہ، یعنی نماز کے بعد سب
سے بڑا فرض قرار دیا ہے۔ اسلام کے نقطہ نظر پر ایک واقعہ سے بڑی روشنی پڑتی ہے۔ حضور اکرم
صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو دیکھا جو خستہ حال تھے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اُن سے
پوچھا ”تمہارے پاس کچھ ہے؟“ انہوں نے بتایا دو درہم ہیں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان میں
سے ایک درہم کی کلہاڑی خریدی اور کلڑیاں کاٹنے پر لگا دیا۔ اس طرح آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے

محنت کے رزق حاصل کرنے کی ترغیب دی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

”سنت و حرمت کے ذریعہ روزی کی تکمیل انسان پر فرض (کفایہ) ہے“

”بعض گناہوں کا کفارہ روزی کمانے میں مغموم و متفکر رہنا ہے“

اور پھر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا:

”جو شخص دنیا کو جائز طریقے سے حاصل کرتا ہے تاکہ سوال سے بچے اور اہل و

عیال کی کفالت کرے اور ہمسائے کی مدد کرے تو قیامت کے دن جب وہ

اٹھے گا تو اس کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن ہوگا۔“

(ابو نعیم فی الحلیۃ بحوالہ اساس تہذیب)

ان آیات و احادیث سے محنت اور معاشی جدوجہد کی اہمیت ہمارے سامنے آتی

ہے اور انہی کی روشنی میں پیداوار کو بڑھانے اور معیشت کو تقویت دینے کی پالیسی اسلام کے معاشی نظام کا ایک اہم جزو قرار پاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی فقہ میں معاشی جدوجہد کو فرض عین اور پیداوار کو فروغ دینے

کی کوشش کو فرض کفایہ (ایسا فرضی بول لازم تو ہر شخص پر ہو البتہ اگر کچھ لوگ اسے ادا کر دیں تو سب پر سے ذمہ داری ساقط ہو جاتی ہے، اور اگر کوئی بھی ادا نہ کرے تو مواخذہ ہر فرد سے ہوگا)

قرار دیا ہے۔ رد المختار میں ہے کہ

ومن فروض الکفایۃ الصناعۃ | ضروری صنعتوں کا قیام فرض کفایہ میں سے
المحتاج الیہا (رد المختار ج ۳ ص ۳۲) | ہے۔

اسی طرح المنہاج میں یہ اصول بیان کیا گیا ہے کہ:

ومن فروض الکفایۃ المحرف | فرض کفایہ میں صنعت و حرمت اور وہ تمام
والصنائع وما یتم بہ المعاش | چیزیں جو معاش کی تکمیل کے لئے درکار ہیں
(المنہاج ج ۴ ص ۱۹۴) | شامل ہیں۔

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں مختلف فقہاء کا ہر نقطہ نظر بیان کیا ہے اس کا خلاصہ المحبۃ فی الاسلام میں اس طرح بیان کیا ہے کہ

قال غیر واحد من الفقہاء ومن | بہت سے فقہاء نے جن کا تعلق شافعی، حنبلی
اصحاب الشافعی واحمد بن حنبل | فکر سے ہے نیز دوسرے فقہاء جیسے امام
وغیرہم کا بی حامد الغزالی وابی | غزالی اور امام جوزی وغیرہ نے
الفرج الجوزی وغیرہم ان ہذا | اس امر کا اظہار کیا ہے کہ ان

اب من اصاب من عیسیٰ علیہ السلام
فانما من عیسیٰ علیہ السلام
کما ان الہدایہ فیہ علی
الکفایہ

مستند کا قیام فرض کفایہ میں سے ہے
اس لئے کہ معاش کی تکمیل ان کے بغیر ممکن نہیں
ہے اور فرض کفایہ کی حیثیت (ایسی ہی ہے جیسے)
جہاد کی جو فرض کفایہ ہے۔

امام ابن قیمؒ کی دی ہوئی یہ مثال بڑی اہم ہے۔ معاش کی تکمیل کی تکمیل کے
لئے ضروری ہے اور انہیں طرح انسانیت کی روحانی اور اخلاقی ضرورتوں کو پورا کرنے اور اسے منکر
سے بچانے اور اغوت کے غلبے سے نجات دلانے اور حقیقی رہنمائی سے مستفید ہونے کا موقع فراہم
کرنے کے لئے۔ یعنی انسانیت کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ جہاد کیا جائے اسی طرح
انسانیت کی جہاد اور مادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے صنعت و حرفت کا قیام اور وسائل
معاش کی فراہمی ضروری ہے۔ اور ان دونوں کی حیثیت فرض کفایہ کی ہے۔

یہ وہ اہمیت ہے جو اسلام معاشی جدوجہد کو دیتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسلامی معاشیات
کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ تمام انسانوں کے لئے معاشی سہولتیں فراہم کی جائیں، قدرت نے
جو وسائل و ذلیلت کئے ہیں ان کو ترقی دی جائے، پیداوار کو امکانی حد تک بڑھایا جائے
اور رزق کے خزانوں کو چند ہاتھوں میں اس طرح مرکوز نہ ہونے دیا جائے کہ دوسروں پر اس
کے دروازے بند ہو جائیں۔ اسے علم معاشیات کی اصطلاح میں پیداوار کی تکثیر اور وسائل
پیداوار کی بہترین تقسیم کہا جاسکتا ہے۔

غربت کے انسداد کا مسئلہ بھی اسلام کی معاشی پالیسی میں ایک اہم مقام رکھتا ہے
بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اسلام کے معاشی نظام کے مثبت معاشی مقاصد میں غربت کا انسداد
اور تمام انسانوں کو معاشی جدوجہد کے مساوی مواقع فراہم کرنا بھی شامل ہے۔ اسلام کا
سب سے اہم مقصد کفر کا استیصال ہے اور چون کہ فقرہ فاقہ انسان کو کفر کی طرف لے
جاتے ہیں اس لئے اسلام ان کو اپنا بنیادی ہدف سمجھتا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

”ابن آدم کا بنیادی حق یہ ہے کہ اس کے لئے ایک گھر ہو جس میں وہ رہ سکے،
کپڑا ہو جس سے وہ اپنے جسم کو ڈھانپ سکے، اور کھانے کے لئے روٹی اور پینے
کے لئے پانی ہو۔“ (ترمذی)

اسلام اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ سب کو حصول رزق کے مواقع دیے اور پھر
مثبت طور پر ایسی پالیسیاں بنائے جن سے غربت و افلاس ختم ہوں اور انسانوں کو ان کی

بنیادی ضرورتیں لازماً حاصل ہوں۔

اسلام تنگی کو دور کرنے کا طریقہ حصول رزق کی کوشش اور پیداوار بڑھانے کے ذرائع کی طرف رجوع قرار دیتا ہے اور محض غربت، افلاس، معیار زندگی کے گرنے کے خطرے اور قلت وسائل کے واویلے سے انسان کشی اور نسل کشی کی پالیسی کی اجازت نہیں دیتا۔ معاشی مسئلے کا اصل حل معیشت کو فروغ دینا ہے، انسان کی قطع و برید نہیں۔ قرآن کا ارشاد ہے:

”وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ حَسْبَةَ
إِمْلَاقٍ مِّنْهُمْ نَزْدُكُمْ وَأَبَاكُمْ
إِن قَتَلْتُمْ كَانَتْ خَطَاً كَبِيراً“

اور تم اپنی اولاد کو افلاس کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ ہم ہی ان کو رزق دیتے ہیں اور تم کو بھی۔ ان کو مار ڈالنا بڑی خطا ہے۔

(نبی اسرائیل - ۳۱)

اسلام آبادی کے حقیقی مسئلے کا حل اضافہ پیداوار کی شکل میں تجویز کرتا ہے۔

حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

”رزق کا دروازہ عرش تک کھلا ہوا ہے اور اسباب معیشت غیر محدود ہیں“
(کنوز الحقائق)

”عورت کو گھر میں خالی بیٹھے رہنے کی جگہ چرخہ کا تنا اچھی کمائی کا مشغلہ ہے“
(کنوز الحقائق)

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مال داروں کو حکم دیا کہ بکریاں پالیں اور غریبوں کو حکم دیا کہ مرغیاں پالیں تاکہ فراغت حاصل کریں“ (ابن ماجہ)

اس طرح اسلام ہر فرد اور پوری قوم کی توجہ کو معاشی وسائل کی ترقی اور پیداواری امکانات سے پورا پورا فائدہ اٹھانے پر مرکوز کرتا ہے۔ وہ ایک طرف معاشرے میں انصاف اور آزادی کو قائم کرتا ہے اور دوسری طرف غربت و افلاس کا خاتمے کر کے بہتر معاشی زندگی کا قیام ممکن بناتا ہے۔ یہاں بھی اس کا مزاج مغرب کی تمام معاشی تحریکات سے مختلف ہے۔

۳۔ حلال و حرام کی تمیز: اسلام پیداوار کے اضافے اور معیشت کے ہمہ جہتی فروغ کی پالیسی اختیار کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی شرط بھی لگاتا ہے کہ آمدنی جائز ذرائع سے حاصل کی جائے گی۔ ہر نفع کو جو حرام ذرائع سے حاصل ہو وہ دوسرے کی آگ قرار دیتا ہے۔ قرآن و حدیث میں رزق حلال کی جتنی اہمیت بیان کی گئی ہے۔ وہ اس امر کو ثابت کرتی ہے کہ اسلام کے معاشی نظام میں صرف جائز اور حلال رزق کے فروغ کی کوشش ہوگی اور ان تمام ذرائع کا کٹاؤ اس قدر کیا جائے گا جو حرام ہیں اور

جن کو شریعت ناروا اور ناجائز قرار دیتی ہے۔

لے لوگو! جو چیزیں زمین میں موجود ہیں ان میں سے حلال اور پاک چیزیں کھاؤ۔

”يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي
الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا۔ (البقرہ- ۱۶۸)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”بہترین عمل حلال روزی کمانا ہے۔“ (المدينة والاسلام)

”حلال روزی کا طلب کرنا ایسا ہے جیسے خدا کی راہ میں بہادری سے لڑنا اور

جو شخص حلال روزی حاصل کرنے کی کوشش کرے گتھک کر سوجائے تو خدا اس

سے راضی ہے۔“ (المدينة والاسلام)

اور حرام سے کمائی ہوئی روزی کے متعلق فرمایا:

”حرام روزی سے پرورش پایا ہوا گوشت اس کا زیادہ مستحق ہے کہ آگ میں ڈالا جائے۔“

یہ ایک ایسا اصول ہے جس سے آج کے دور کی معاشیات بالکل نا آشنا ہے چوں کہ

اسلام کا اصل مقصد صرف وسائل معاش کی فراوانی نہیں بلکہ ان کا منصفانہ اور مصلحانہ استعمال

ہے اس لئے اس نے معاشی جدوجہد کو حلال و حرام کا پابند کیا ہے۔ خالص معاشی نقطہ

نظر سے یہ وہ چیز ہے جو معاشیات کو محض افادی سطح سے بلند کر کے اصلاحی اور فلاحی

سطح پر لے آتی ہے اور اس طرح ایک کی معاشی جدوجہد دوسرے کے لئے معاشی تکلیف

یا معاشرہ کے لئے ظلم فساد کا ذریعہ نہیں بن پاتی۔ اسلام نے جن چیزوں کو حرام کیا ہے، اگر

ان کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ وہ چیزیں ہیں جو یا تو فرد یا

معاشرے کی جسمانی اور اخلاقی زندگی کو مجروح کرتی ہیں اور یا انسانوں کے درمیان حقیقی معاشی

تعاون، مساوات، آزادی جدوجہد، عدل و انصاف اور قسط و توازن کا قیام مشکل کر دیتی

ہیں۔ خالص معاشی اصطلاح میں اس کا فائدہ یہ ہے کہ اسلامی معیشت میں صرف کی تکثیر

(MAXIMISATION OF CONSUMPTION) کی جگہ اس کی بہترین سطح کا حصول

(OPTIMISATION) پیش نظر رہتا ہے اور ایک حقیقی فلاحی معیشت ظہور میں

آتی ہے۔

۴۔ حُرمت سود :- اسلام کے بنیادی معاشی اصولوں میں سے ایک حرمت

سود ہے۔ جو معاشی ظلم کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

اسلام نے سود کو اس کی ہر شکل میں حرام قرار دیا ہے۔ سود مفرد ہو یا مرکب، ذاتی

قرضوں پر لیا جائے یا تجارتی اور پیداواری قرضوں پر، حرام ہے، اور اس کے لینے والے کو

خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اعلان جنگ قرار دیا گیا ہے۔

قرآن پاک میں ہے :

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُضَاعَفَةً وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ“ (آل عمران - ۱۳۰)

اے ایمان والو! سود کے کئی کئی حصے بڑھا چڑھا کر نہ کھاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم فلاح پا جاؤ۔

ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے پر، سود کا کاغذ لکھنے والے پر اور سود کے گواہوں پر لعنت بھیجی ہے اور ان سب کو برا بر قرار دیا ہے۔ (صحیح مسلم)

اسلام میں سود کی ممانعت محض اخلاقی بنیادوں ہی پر نہیں بلکہ اس کے خطرناک اقتصادی سماجی اور سیاسی مضمرات کی بنا پر بھی ہے۔ سود کی لعنت متعدد قدیم معاشروں کی تباہی کا باعث بنی ہے اور آج بھی جدید سرمایہ دارانہ معاشرے کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہی ہے اس کی بنیاد استحصال اور ظلم پر ہے اور اس کی وجہ سے ملک کی معیشت پر چند سرمایہ داروں کا اقتدار مسلط ہو جاتا ہے جو صحت مند معاشی جدوجہد کو ختم کر دیتا ہے اور معیشت میں عدم استحکام کا باعث ہوتا ہے۔

۵۔ تجارتی اخلاقیات کا ضابطہ۔ اسلام نے تجارتی اخلاقیات کا ایک ضابطہ

پیش کیا ہے تاکہ اہل تجارت اس کا اتباع کریں۔ یہ ضابطہ اخلاق تجارتی لین دین میں دیانت داری اور خدا ترسی کے جذبات کو فروغ دیتا ہے۔ تجارت کے معاملے میں قرآن کی اصولی ہدایت یہ ہے کہ

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ وَحَقًّا“ (النساء - ۲۹)

اے ایمان والو! اپنے اموال کو آپس میں باطل کی راہ سے نہ کھاؤ بلکہ باہمی رضامندی کے ساتھ تجارت کی راہ سے نفع حاصل کرو۔

اس آیت ربانی کے ذریعے قرآن کریم نے معیشت کے ان تمام ذرائع کو ممنوع قرار دیا ہے جو ظلم و زیادتی اور دوسروں کی حق تلفی پر مبنی ہوں۔ معیشت اور تجارت کا دائرہ وہ دائرہ ہے جس میں انسان نے نت نئے ظلم کئے ہیں اور خصوصیت سے اہل سرمایہ اور اہل قوت نے دوسرے فریق پر جو کمزور اور غریب ہو اکثر اپنی مرضی مسلط کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انتفاع (EXPLOITATION) کے یہ سارے دروازے بند کر دیئے اور فرمایا کہ معاشی معاملات کی بنیاد باہمی رضامندی اور تجارت کے حصول پر ہونی چاہیئے۔ تجارت میں امانت و دیانت

کی اہمیت واضح کرتے ہوئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

” امانت دار تاجروں کا حشر صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا“ (ترمذی)

مختصر اسلام کے اصول تجارت حسب ذیل ہیں :-

(ا) باہمی رضا مندی: تجارت باہمی رضا مندی سے ہونی چاہیئے۔ دونوں فریق اپنی آزاد مرضی سے کسی جبر یا زبردستی کے بغیر اپنے معاملات کو طے کریں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام میں تجارت کی بنیاد ”تعاون باہمی“ پر ہے اور تجارت کی وہ تمام شکلیں جن میں دوسرے فریق کی کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر کچھ خاص شرائط یا معاملات اس پر غھوپ دیئے جاتے ہیں، وہ ناجائز ہیں۔ اس سے بھی یہ مستنبط ہو سکتا ہے کہ ایسی اشتہار بازی یا نفسیاتی حربوں کا ایسا استعمال جو عقل و فکر کو معطل کر دے اور ایک شخص اپنی مرضی کے خلاف محض نفسیاتی شعبہ بازی کی وجہ سے کسی چیز کی خرید پر مجبور ہو جائے، اسلام کے مطابق نہیں۔ اسی طرح آزاد مندی کو کمزور یا مفجوج کرنے والی وہ تمام قوتیں بھی اسلامی معیشت میں کوئی راہ نہیں پاتیں جن کی وجہ سے جدید دنیا کا مندی کا نظام درہم برہم ہے اور شدید قسم کی دقتوں اور خامیوں میں مبتلا ہو گیا ہے۔

(ب) دیانت: دوسرا اصول یہ ہے کہ تجارت دیانت کے ساتھ ہو۔ اس میں کسی قسم کا دھوکہ یا بد معاملگی نہ ہو۔ مال کی اصل کیفیت لوگوں کے سامنے رکھ دی جائے۔ اور ان کو غلط فہمی میں رکھ کر خرید پر مجبور نہ کیا۔ اسی طرح جان بوجھ کر دوسرے کو نقصان پہنچانا، معاملے پر معاملہ کرنا، خیانت یا وعدہ خلافی کرنا، یہ سب اسلام کی نگاہ میں ممنوع ہیں۔ اسی طرح تاپ تول میں درست ہونا تجارتی دیانت کا ایک اہم پہلو ہے۔

(ج) جائز اور مباح کی تجارت: تیسرا اصول یہ ہے کہ تجارت صرف ان اشیاء میں کی جائے جو جائز یا مباح ہوں۔ وہ تمام اشیاء جن کا استعمال معصیت کی تعریف میں آتا ہے، یعنی شراب، بت، اصنام، خنزیر، وغیرہ، ان کی تجارت بھی اسلام میں ممنوع ہے۔

(د) ذخیرہ اندوزی کی ممانعت :- پھر اسلام میں اس بات کی بھی ممانعت ہے کہ ضروریات زندگی کو روک رکھا جائے تاکہ ان کے دام بڑھ جائیں اور اس طرح سے منافع میں اضافہ ہو۔ ذخیرہ اندوزی اور احتکار کو اسلام نے سختی سے منع کیا ہے اور ایسا کرنے والے پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت بھیجی ہے۔

(ه) جو آ اور سٹہ وغیرہ کی ممانعت: اسلام نے تجارت کی وہ تمام

تشکیلیں بھی بند کر دی ہیں جن میں کسی دوسرے سے ناجائز فائدہ اٹھایا جا رہا ہو یا جن میں مناسب محنت کے بغیر دولت ہاتھ آرہی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ سسٹم، لائٹری اور جوئے کی ساری صورتیں اسلام میں ممنوع ہیں۔

(د) اہل تجارت کا ذاتی اخلاق: اسلام کی تمام تعلیمات کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اہل تجارت میں اعلیٰ اخلاقی کردار ہونا چاہیئے تاکہ وہ تجارت کا حق ادا کر سکیں اور اسلام کے سچے سفیر بن سکیں۔ ان میں خصوصیت سے دیانت اور خوش اخلاقی ہونی چاہیئے تاکہ یہ کیفیت نہ ہو کہ:

طے کی جس سے بات اُس نے شکایت ضرور کی

انہیں قوم اور خصوصیت سے اپنے صارفین کی خدمت کے جذبے سے کام کرنا چاہیئے اور اپنے کاروبار میں پوری محنت اور دل جمعی سے کام کرنا چاہیئے تاکہ وہ اپنی قوتوں کو زیادہ سے زیادہ مفید مقاصد کے لئے استعمال کر سکیں پھر سب سے بڑھ کر وہ مستقل مزاجی اور اعتدال کے ساتھ کام کریں اور بہت جلدی دولت جمع کرنے کی ہوس سے بچے رہیں۔

معاش اور اخلاق میں یہی وہ حین توازن ہے جو اسلام کے معاشی نظام کا امتیاز ہے۔

۶۔ اسراف کی بندش: طلب حلال کے ساتھ ساتھ اسلام انسان کو جائز مصارف پر دولت خرچ کرنے کی ترغیب بھی دیتا ہے لیکن اسراف سے روکتا ہے اس وجہ سے دولت کا بے جا استعمال اور اس کا ضیاع رک جاتا ہے اور وہ تعمیری اور پیداواری مقاصد میں استعمال ہونے لگتی ہے۔

کُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا (الاعراف-۳۱) | کھاؤ اور پیو مگر اسراف نہ کرو۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو جائز ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے محنت کرتا ہے وہ اللہ کی راہ میں کام کرتا ہے اور جو محض آن بان دکھانے کے لئے دولت کماتا ہے وہ شیطان کی راہ میں کام کرتا ہے۔

۷۔ ارتکاز دولت کی ممانعت: پھر اسلام نے دولت کے ارتکاز (ایک یا چند مقامات پر اس کا جمع ہونا) کو بھی پسند نہیں کیا ہے اور اس بات کا انتظام کیا ہے کہ مختلف معاشرتی اداراتی، قانونی اور اخلاقی تدابیر سے دولت کی تقسیم زیادہ سے زیادہ منصفانہ ہو اور پورے معاشرے میں گردش کرے۔

کَيِّ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ | ایسا نہ ہو کہ یہ (مال و دولت) تمہارے و متمتعوں ہی میں گردش کرتا رہے۔ (المشر-۷)

حضور کا ارشاد ہے کہ :

اقسموا المال بين الفرائض | اللہ تعالیٰ کی کتاب کے مطابق اچھا مال ان لوگوں
على كتاب الله (ابوداؤد) | میں تقسیم کرو جن کا حق مقرر کیا گیا ہے۔

دولت کی تقسیم کے لئے مندرجہ ذیل صورتیں تجویز کی گئی ہیں :

(الف) زکوٰۃ :- زکوٰۃ ہر صاحب نصاب مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے یہ کوئی خیرات
نہیں بلکہ فقراء و مساکین کا ”حق“ ہے۔

زکوٰۃ جہاں حبیب مال کو کم کرتی اور خدا کی راہ میں خرچ کرنے اور مال قربان کرنے کا جذبہ پیدا
کرتی ہے۔ وہیں معاشی نقطہ نظر سے یہ سماجی فلاح کی ایک ہمہ گیر اسکیم ہے۔ جس کے ذریعے ملک و
ملت کے غریب اور نادار افراد کی مدد کی جاتی ہے اور انہیں زندگی کی جدوجہد میں برابر کی شرکت
کے لائق بنایا جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ ذہنیت یہ بات پیدا کرتی ہے کہ ہر شخص کی دولت صرف
اسی ہی کے لئے ہے اور معاشی دوڑ میں جو پیچھے رہ جائے اور جو گرجائے اُسے فنا ہو جانا چاہیئے۔
کشمکش حیات میں زندہ رہنے کا حق صرف اس کو ہے جو مسابقت میں دوسروں سے آگے
بڑھ جائے۔ اسلام اس ذہنیت کی نفی کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جو کچھ دولت تم کماتے ہو
وہ صرف تمہاری محنتوں کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس میں فطرت کی بے شمار قوتیں شریک کار ہیں۔
نیز پورا معاشرہ ہزاروں طریقے سے تمہارا معاون و مددگار ہے۔ اس لئے تمہارے مال میں
تمہارے علاوہ دوسروں کا بھی حق ہے۔ اہل ثروت کی ذمہ داری ہے کہ معاشی دوڑ میں جو
پیچھے رہ جائے اُسے سہارا دیں اور آگے بڑھائیں۔ جو معاشرہ کمزوروں کی مدد نہ کرے ناداروں
کو سہارا نہ دے اور گرتوں کو ہٹام نہ لے وہ انسانی معاشرہ کہے جانے کا مستحق نہیں۔
اسلام نظام زکوٰۃ کے ذریعے معیشت کو صحت مند بنیادوں پر استوار کرتا ہے۔ اور اس میں
امداد باہمی کی روح کو جاری و ساری کر دیتا ہے۔

جدید علم معیشت میں سماجی فلاح کا تصور بہت نیا ہے۔ لیکن اسلام نے پہلے ہی دین
سے فلاحی اور خدمتی ریاست کا تصور پیش کیا اور زکوٰۃ کی شکل میں معاشرے کے کمزور اور مجبور
انسانوں کی ضروریات کی فراہمی کی ضمانت دی۔ اسلامی حکومت نے ابتداء ہی سے اس نظام کو
عملاً قائم کیا، آبادی کی مردم شماری کی، ناداروں کے رجسٹر بنائے، ضرورت مندوں کو سرکاری
وظیفے دیئے اور تھوڑے ہی عرصے میں یہ حال ہو گیا کہ بقول مورخ طبری زکوٰۃ دینے والے تو
سیکڑوں تھے، مگر زکوٰۃ لینے والے نہ ملتے تھے۔

پھر زکوٰۃ دولت کی تقسیم میں غیر فطری عدم مساوات کو ختم کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اس

کے ذریعے امیروں کی دولت غریبوں کی طرف منتقل ہوتی ہے۔ معاشی بحران کے جس چکر میں سڑاؤ اڑا دینا گرفتار ہے اس کو دور کرنے میں بھی زکوٰۃ بڑی مفید و معاون ہو سکتی ہے۔ تجارتی چکر، سرمایہ کاری اور قوت صرفہ میں عدم توازن کی بناء پر رونما ہوتا ہے لیکن زکوٰۃ جہاں ایک طرف پیداواری عمل کو تیز کرتی ہے وہیں دوسری طرف عوام میں قوت خرید کا اضافہ بھی کرتی ہے اس طرح یہ معیشت میں معاشی توازن قائم کرنے کا آلہ بن جاتی ہے۔

(ب) صدقات واجبہ: بہت سے ایسے صدقات مقرر کئے گئے ہیں جو مختلف مواقع پر ہر صاحب حیثیت مسلمان کو ادا کرنے ہوتے ہیں جیسے صدقہ فطر وغیرہ۔ یہ بھی مندرجہ بالا مقصد پورا کرتے ہیں۔

(ج) انفاق: اسلام ہر مسلمان میں انفاق فی سبیل اللہ کا جذبہ پیدا کرتا ہے، مال سے محبت کو کم کرتا ہے اور خدا کی راہ میں خرچ کر کے دنیا اور آخرت کی کامیابی حاصل کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

(د) قانون وراثت: اسلام نے وراثت کا جو قانون تجویز کیا ہے وہ اس طرح کا ہے کہ متوفی کا ترکہ پورے خاندان میں ایک مناسب ترتیب کے ساتھ تقسیم ہو جاتا ہے اور ساری جائیداد مغربی ممالک کی طرح کسی ایک وارث کو نہیں ملتی۔ اس طرح دولت کے ارتکاز کے بجائے اس کی منصفانہ تقسیم رونما ہوتی ہے۔

(ذ) حق سوئی الزکوٰۃ: زکوٰۃ اور صدقات واجبہ کے علاوہ بھی اگر ضرورت محسوس ہو تو حکومت کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ لوگوں سے مزید مال بطور ٹیکس لے اور اسے استحکام رہائش، قیام انصاف، اور فلاح عامہ کے لئے صرف کرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”یہ مال میں زکوٰۃ کے سوا اور بھی حق ہے؟“ (ترمذی)

(ح) التمسک: اسلام نے انسان کو صرف انفاق ہی کی ترغیب نہیں دی بلکہ اس میں یہ جذبہ بھی پیدا کیا کہ اس کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ جو بھی ہو اسے خدا کی راہ میں اور دوسروں کی بہتری کے لئے خرچ کر دے۔

یہ سب باتیں قرآن مجید میں مذکور ہیں۔ (البقرہ: ۱۱۰) قرآن مجید میں بھی یہ باتیں مذکور ہیں۔ (البقرہ: ۱۱۰)

اس طرح اسلام پورے معاشرے میں دولت کی منصفانہ تقسیم اور غریبوں کی بہتری کے لئے ایک جامع نظام پیش کرتا ہے۔ اس کے ذریعے ہی ایک نیا معاشرہ بنایا جاسکتا ہے جس میں ہر شخص کی اپنی جگہ ہو اور ہر شخص کی اپنی ذمہ داری ہو۔

۸۔ **ملکیت و تصرف کا حق** :- اسلام تمام زمین اور وسائل فطرت کو اصلاً خدا کی دین اور اس کی ملکیت قرار دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تمام معاشی معاملات میں انسان کو اس عظیم تر ملکیت کے تصور کے تحت، انفرادی ملکیت و تصور کا حق دیتا ہے یہ وہ شکل ہے جس میں انسان کی معاشی آزادی محفوظ رہ سکتی ہے اور اچھے اخلاق پر وہان چڑھ سکتے ہیں۔ لیکن یہ حق غیر محدود نہیں ہے یعنی اگر ملکیت آلہ ظلم بن جائے یا دوسروں کے حقوق پر اس کا غلط اثر پڑ رہا ہو تو ریاست کو مداخلت کا بھی حق ہے۔ دراصل اسلام ملکیت کے اس محدود حق کو ایک امانت کی شکل دیتا ہے اور اس میں تصرف کے اختیار کو بہت سی قانونی اور اخلاقی پابندیوں سے محدود کرتا ہے۔

۹۔ **عدل اجتماعی کی ضمانت**۔ اسلام ریاست کے معاشی وظائف کا بھی ایک مثبت تصور پیش کرتا ہے اور سماجی فلاح اور معاشی انصاف کے قیام کو اس کی اولین ذمہ داری قرار دیتا ہے۔ زکوٰۃ سماجی فلاح کی ایک اسکیم ہے جس کے نظام کو ریاست کے ہاتھوں قائم کیا جاتا ہے۔ معاشی قانون سازی اور عدلیہ کی طاقتوں کے ذریعہ ریاست عدل اجتماعی قائم کرتی ہے۔ جس کا کوئی وارث نہیں اس کی ریاست وارث ہے اور جس کا کوئی ولی نہیں، اس کی ریاست ولی ہے۔ ناداروں، یتیموں اور محتاجوں کی مدد ریاست کا فرض ہے اور یہ بھی اس کی ذمہ داری ہے کہ تمام شہریوں کو ان کی بنیادی ضرورتیں فراہم کرے۔

السلطان ولی من لا ولی له | حکومت ہر اشخاص کی ولی و دست گیر و مددگار جس کا کوئی ولی نہ ہو۔ (بخاری)

ایک اور حدیث میں ہے، من ترک کلا فالینا (بخاری: مسلم) یعنی جس مرنے والے نے ذمہ داریوں کا کوئی بار (مثلاً قرض یا بے سہارا کنبہ) چھوڑا تو وہ ہمارے ذمے ہے۔

ایک خلیفہ راشد نے اس کی وضاحت ان الفاظ میں فرمائی ہے:

”خدا کی قسم اگر میں زندہ رہا تو صفا کی پہاڑیوں میں جو چرواہا اپنی بکریاں چراتا ہے اس کو اس مال میں حصہ پہنچے گا اور اس کے لئے اس کو کوئی زحمت نہیں اٹھانی پڑے گی“

اور یہ کہا:

”خدا کی قسم اگر اہل عراق کی بیواؤں کی خدمت کے لئے زندہ رہ گیا تو ان کو اس حال میں چھوڑ جاؤں گا کہ میرے بعد ان کو کسی اور امر کی احتیاج باقی نہ رہے گی“

حضرت علیؓ نے اس بات کو اس طرح ادا کیا ہے :

” اللہ تعالیٰ نے دولت مند لوگوں پر ان کے اموال میں اتنی مقدار مقرر کی ہے جو غربا کے لئے کافی ہو سکے۔ اس کے باوجود اگر وہ بھوکے، تنگے اور تنگ دست ہوں تو یہ صرف دولت مندوں کی عدم توجہی اور غفلت کی وجہ سے ہو سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے ضروری قرار دیا ہے کہ ان اُمراء سے قیامت کے دن محاسبہ کرے گا۔“

ان احکام کے مطابق جو نظام قائم ہوتا ہے اس میں زمین اپنے خزانے اُگل دیتی ہے اور آسمان اپنی نعمتوں کی بارش کرنے لگتا ہے اور افلاس و تنگدستی ختم ہو جاتی ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

” اے لوگو! صدقہ دو کیوں کہ تم پر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ آدمی صدقہ لئے لئے پھرے گا مگر وہ کسی ایسے شخص کو نہ پائے گا جو اسے قبول کرے۔“ (یعنی اس کا حاجت مند ہو۔)

یہ ہے اسلام کا معاشی نظام۔ اور درحقیقت انسانیت کی نجات انہی اصولوں میں مضمر ہے۔ اس کی اصل خصوصیت یہ ہے کہ اس کا مرکزی تصور انسان اور اس کی معاشی اور اخلاقی فلاح ہے۔ وہ معاشی ترقی کو اعلیٰ ترین مدارج تک پہنچانے کے ساتھ ساتھ سماجی انصاف، آزادی اور اخلاقی ترقی کو اولیں اہمیت دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا معاشی نظام سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں سے اپنے مقصد اپنے مزاج اور اپنے اصولوں کے اعتبار سے مختلف ہے اور ہر حیثیت سے ان سے اعلیٰ اور برتر ہے۔

۲۔ کفالت عامہ

اسلامی ریاست کی معاشی ذمہ داریاں | اسلامی ریاست کی معاشی ذمہ داریاں
 بین کفالت عامہ، معاشی ترقی کا

اہتمام اور تقسیم دولت کے اندر پائے جانے والے تفاوت کو کم کرنا شامل ہے۔ اب مختصراً
 ان موضوعات پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

۱۔ کفالت عامہ | کفالت عامہ سے مراد یہ ہے کہ دارالاسلام کے حدود کے اندر بسنے
 والے ہر انسان کی بنیادی ضروریات زندگی کی تکمیل کا اہتمام کیا جائے
 یہ اہتمام اس درجہ تک ہونا چاہیے کہ کوئی فرد ان ضروریات سے محروم نہ رہے۔ ان بنیادی ضروریات
 میں غذا، لباس، مکان اور علاج لازماً شامل ہیں۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلامی ریاست اس بات کی ذمہ دار ہے کہ ہر فرد کو ان ضروریات
 کی تکمیل کرنے والی اشیاء اور خدمات کی مطلوبہ یا ضروری مقداریں بہم پہنچاتی رہے، بلکہ اس
 کے کہ وہ خود اپنے مال سے، یا اپنی محنت کے ذریعے مال کمائے کہ ان ضروریات کو پورا کر سکتا ہے یا نہیں۔
 جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے عام حالات میں عام افراد ان ضروریات کو خود اپنے بل
 بوتے پر پورا کرتے رہیں گے، بقدر ضرورت، مال حاصل کر سکنے والے افراد کو اپنے خاندان یا عام
 افراد اجتماع سے اتنی مدد مل سکے گی کہ وہ اپنی ضروریات پوری کر سکیں۔ صنعتی کارخانوں میں کام کرنے
 والے مزدوروں کو عارضی بنے روزگاری، مرض، بڑھاپے یا کسی حادثہ کے سبب معذور ہو جا۔ ان کی
 حالت میں کارخانہ یا متعلقہ صنعت سے امدادی وظیفہ دلوانے کا اصول بنایا جاسکتا ہے جو ان
 کی ضروریات کے لئے کافی ہو۔

سماجی تحفظ (SOCIAL SECURITY) کے انتظامات کو سامنے رکھتے ہوئے
 اس اصول کا منشا یہ ہے کہ اگر کسی وجہ سے کوئی فرد ان انتظامات کے باوجود اس حال میں پایا
 جائے کہ وہ اپنی بنیادی ضروریات کی تکمیل سے قاصر ہو تو بالآخر اسلامی ریاست اس بات کی
 ذمہ دار ہے کہ وہ فرد ان سماجی حیثیات سے محروم نہ رہے جو ضروریات زندگی کی تکمیل کے
 لئے درکار ہیں۔ ریاست کو ایسا نظم قائم کرنا پڑے گا کہ محروم افراد اپنی محرومی کا ثبوت فراہم

کر کے بآسانی اور بلاتناخیر سرکاری خزانے سے بقدر ضرورت مال حاصل کر سکیں اور دارالاسلام کا کوئی باشندہ بھوکا، پیاسا، ننگا، بے گھر اور مرض کی حالت میں بے علاج نہ رہے۔

رسول کریمؐ کے ارشادات: بنی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اصول واضح فرمادیا ہے کہ اصحاب امر محروم افراد کی ضروریات کی تکمیل کے ذمہ دار ہیں۔
آپؐ نے فرمایا:

”جسے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے بعض امور کا نگران بنایا ہے اور وہ ان کی ضروریات اور فقر سے بے پروا ہو کر بیٹھ رہا، اللہ تعالیٰ بھی اُس کی ضروریات اور فقر سے بے نیاز ہو جائے گا۔“ راوی کہتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث سن کر ایک آدمی کو عوام کی ضروریات پوری کرنے پر مامور کر دیا۔ (ابوداؤد کتاب الخراج والفتی)

عمر بن مہرہ نے حضرت معاویہؓ سے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ ”جو حاکم ضرورت مندوں، فقراء اور مسکین پر اپنے دروازے بند کر لیتا ہے۔ اللہ اُس کی ضروریات، فقر اور مسکینی پر آسمان کے دروازے بند کر لیتا ہے۔“ (ترمذی کتاب الاحکام)

اس حدیث سے واضح ہوا کہ اگر حاکم ضرورت مند افراد کی ضروریات پوری کرنے کا اہتمام نہ کرے گا تو اللہ کی سخت ناراضگی مول لے گا۔ یہ وعید اس بات کے لئے کافی ہے کہ تکمیل ضروریات کو اسلامی ریاست کی ذمہ داری قرار دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو اس فرمان نبوی کے ذریعہ اُن کی ذمہ داری یاد دلائی گئی تو انہوں نے ہزدی بھیجا کہ اس کو پورا کرنے کا اہتمام کریں۔ اسلامی ریاست کی اس ذمہ داری کی اہمیت کا اندازہ، خلافت کی اس تعریف سے بھی کیا جاسکتا ہے جو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے کی ہے۔ جسے سن کر کعب اُجبار رضی اللہ عنہ نے اس کی تصویب فرمائی:

”حضرت سلمان فارسیؓ فرماتے ہیں کہ خلیفہ وہ ہے جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرے اور رعایا پر اس طرح شفقت کرے جس طرح آدمی اپنے اہل و عیال پر شفقت کرتا ہے۔ یہ سن کر کعب بن اُجبار رضی اللہ عنہ نے کہا درست ہے۔“ (کتاب الاموال ابو عبیدہ ص ۶)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”جس بندہ کو خدا نے کسی رعایا کا حکمران بنایا اور اس نے اُس کی مساکین پوری

غیر خواہی نہ برتی وہ جنت کی خوشبو بھی نہ پاسکے گا۔“ (صحیح بخاری کتاب الاحکام)

شریعت نے اسلامی ریاست کو اپنے تمام شہریوں کا سرپرست قرار دیا ہے۔ اس کی ہر چھٹی تک ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ ان افراد کی بنیادی ضروریات کی تکمیل کا اہتمام کیا جائے۔ (ابو جعفر نے فرمایا:

(جس کا کوئی سرپرست نہ ہو اس کا سرپرست اللہ اور اس کا رسول ہے۔

اللَّهُ وَرَسُولُهُ مَوْلَى مَنْ لَا مَوْلَى لَهُ۔ (ترمذی۔ ابواب انفراد)

نیز فرمایا:

(جس کا کوئی سرپرست نہ ہو اُس کا سرپرست سلطان ہے)

”السُّلْطَانُ قَرِیٌّ مَنْ لَا وَلِيَ لَهُ“ (ترمذی باب النکاح)

۲۔ خلفاء کا طرز عمل | رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو اکابر اسلامی ریاست کی صدارت کے منصب پر فائز ہوئے انہیں اپنی ان وسیع ذمہ داریوں کا پورا احساس تھا۔ اس حقیقت پر خلافت راشدہ کی پوری تاریخ گواہ ہے۔ جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنی ذمہ داریاں گنا تے ہوئے ایک عام خطبہ میں فرمایا تھا:

لوگو! اللہ نے مجھ پر یہ ذمہ داری عائد کی ہے کہ میں اُس کے حضور جانے والی دعاؤں کو روکوں

”أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ اللَّهَ كَلَّفَنِي أَنْ أَصْرِفَ عَنْهُ الدُّعَاءَ“

(قواعد الاحکام فی مصالح الانام ج ۱ ص ۱۸۱)

حضرت عمرؓ کے اس ارشاد کی تشریح کرتے ہوئے مشہور شافعی فقیہ ابو محمد عمر الدین بن عبد العزیز لکھتے ہیں:-

”اس کا مطلب یہ ہے کہ حاکم ظالموں کے مقابلہ میں مظلوموں کے ساتھ انصاف کرے اور ان کو اس بات کی ضرورت نہ پڑنے دے کہ وہ اللہ سے انصاف کے طالب نہ ہوں۔ اسی طرح وہ لوگوں کی ضروریات پوری کرے تاکہ اُن کو اس کی ضرورت باقی نہ رہے کہ رب العالمین سے اُن کی تکمیل کے طالب ہوں“ (حوالہ مذکورہ بالا)

عوام کی معاشی ضروریات کی تکمیل کا حضرت عمرؓ کو کتنا خیال تھا اس کا اندازہ اس خطبہ سے بھی کیا جاسکتا ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ قادسیہ کی فتح کی خوشخبری سنانے کے بعد عوام کے سامنے دیا تھا۔ اس میں آپ نے فرمایا:-

”مجھے اس بات کی بڑی فکر رہتی ہے کہ جہاں بھی کوئی ضرورت دیکھوں اسے پورا کر دوں جب تک ہم سب مل کر اُسے پورا کرنے کی کوشش رکھتے ہوں۔ جب ہمارے اندر اتنی گنجائش نہ رہ جائے تو ہم باہمی امداد کے ذریعے گذر اوقات کریں گے۔ یہاں تک کہ سب کا معیار زندگی ایک سا ہو جائے۔ کاش تم جان سکتے کہ میرے دل میں تمہارا کتنا خیال ہے۔ لیکن میں یہ بات تمہیں عمل کے ذریعہ ہی سمجھا سکتا ہوں۔ خدا کی قسم میں بادشاہ نہیں ہوں کہ تم کو اپنا غلام بنا کر رکھوں۔ میں اللہ کا بندہ ہوں۔ حکومت کی یہ امانت میرے سپرد کی گئی ہے۔ اب اگر میں اس کو اپنی ذاتی ملکیت نہ سمجھوں بلکہ تمہاری

چیز سمجھ کر تمہاری طرف واپس کر دوں اور تمہاری خدمت کے لئے تمہارے پیچھے پیچھے چلوں یہاں تک کہ تم اپنے گھروں میں سیر ہو کر کھانی سکو تو میں تمہارے ذریعہ فلاح پاؤں گا۔ اور اگر میں اسے اپنا بنا لوں اور تمہیں اپنے پیچھے پیچھے چلتے اور اپنے گھر آنے پر مجبور کر دوں تو تمہارے ذریعہ میرا انجام خراب ہوگا۔ میں دنیا میں کچھ عرصہ خوشی منا لوں گا، مگر آخرت میں عرصہ دراز تک عذابی رہوں گا۔ میرا یہ حال ہوگا کہ نہ کوئی مجھ سے کچھ کہنے والا ہوگا، نہ کوئی میری بات کا جواب دے گا کہ میں اپنا عذر بیان کر کے معافی حاصل کر سکوں؟ (البدایہ والنہایہ ابن کثیر ج ۷ ص ۲۶)

جب عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے تو آپ کفالت عامہ کی ذمہ داری محسوس کر کے رونے لگے۔ ان کی بیوی فاطمہ کہتی ہیں کہ میں ایک بار آپ کے پاس گئی۔ آپ جائے نماز پر بٹھے اور آنسوؤں سے آپ کی دائرہی تر تھی۔ میں نے پوچھا کیا کوئی نئی بات ہو گئی ہے؟ آپ نے فرمایا میں نے پوری امت محمدیہ کی ذمہ داری لے لی ہے۔ لہذا میں بھوکے فقیروں، بے سہارا یرغیوں، مجاہدین، مظلوم اور ستم رسیدہ افراد بہت بوڑھے افراد اور ان تمام لوگوں کے بارے میں سوچ رہا تھا جو کثیر العیال ہیں مگر والدین نہیں ہیں مجھے احساس ہوا کہ عنقریب قیامت کے دن اللہ مجھ سے ان کے بارے میں پوچھے گا اور اللہ کے حضور میرے مقابلے میں ان لوگوں کے وکیل محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے۔ مجھے ڈر لگا کہ جرح میں میری بات ثابت نہ ہو سکے گی تو میں اپنی جان پر ترس کھا کر رونے لگا۔

(کتاب الخراج ص ۱۰۔ سیرت عمر بن عبدالعزیز بن جوزی ج ۱)

حضرت عمر فاروق نے اعلان فرمایا:

”وَمَنْ اسْرَادَ اَنْ لِّسْلُ عَنْ الْعَمَالِ فِلْيَا تَنِي
فَاِنَّ اللّٰهَ جَعَلَنِي خَا زِنًا وَّقَاسِمًا“
(سیرت عمر بن الخطاب ابن جوزی ص ۱۰۱)

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عہد میں ایک زبردست قحط پڑا تو عرب سے کچھ لوگ ایک وفد کی شکل میں آپ کے پاس آئے۔ انہوں نے کہا اے امیر المومنین! ہم ایک شدید ضرورت کی بناء پر آپ کے پاس آئے ہیں۔ ہمارے جسم کی چمڑی سٹوکھ گئی ہے کیوں کہ اب ہڈیاں بھی کھانے کے لئے میسر نہیں آتیں اور ہماری مشکل کا حل صرف بیت المال کے ذریعہ ممکن ہے۔ اس مال کی حیثیت تین میں سے ایک ہو سکتی ہے۔ یا تو یہ اللہ کے لئے ہے یا بندگانِ خدا کے لئے، یا آپ کے لئے، اگر یہ اللہ کیلئے ہے تو اللہ کو اس کی ضرورت نہیں۔ اگر بندگانِ خدا کے لئے ہے تو اسے انہیں دے دیجئے۔ اور اگر آپ کا ہے تو صدقہ کے طور پر ہمیں دے دیجئے۔ اللہ صدقہ کرنے والوں کو جزائے نیر دے گا۔ یہ سن کر عمر بن عبدالعزیز رونے لگے۔ فرمایا مال کی حیثیت وہی ہے جس کا

تم نے ذکر کیا اور حکم دے دیا کہ ان لوگوں کی ضروریات بیت المال سے پوری کی جائیں۔

(التبر المسبوك فی نصاب الملوك للغزالی ص ۶۱-۶۲)

کفالت عامہ کی ذمہ داری کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تصور اتنا وسیع اور ہنگامہ تھا کہ آپ فرماتے تھے اگر دارالاسلام کے حدود کے اندر کوئی جانور بھی بھوک سے مر گیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ اللہ کے حضور مجھے اس کے لئے جوابدہ ہونا پڑے گا۔ فرمایا:

اگر ساحل فرات پر کوئی اونٹ بے سہارا مر جائے تو مجھے ڈر ہے کہ اللہ مجھ سے اس کے بارے میں جواب طلب کرے گا۔

”لومات جمل علی شط الفرات
لخشيت ان یسلني الله عنه“
(تاریخ طبری ص ۲۴۳۸)

حضرت عمر فرمایا کرتے تھے:-

”اگر کسی نہر کے کنارے کوئی خارشہ بکری اس حال میں چھوڑ دی جائے کہ اس کے علاج کے لئے تیل کی مالش نہ کی جائے تو مجھے اندیشہ ہے کہ قیامت کے دن مجھ سے اس کے بارے میں جواب طلب کیا جائے گا“ (التبر المسبوك امام غزالی ص ۱۷)

مدینہ میں اہل حاجت کا پتہ لگانے اور ان کی حاجت روائی کا اہتمام کرنے کے لئے راتوں میں گشت لگاتے تھے کئی بار ایسا ہوا کہ آپ کو کسی کی کسی ضرورت کا پتہ اسی گشت کے دوران لگا اور آپ نے فوراً ضرورت پوری کی۔ (تاریخ طبری ص ۲۷۴۳)

کفالت عامہ کی ذمہ داری صرف مسلمان شہریوں تک محدود نہ تھی بلکہ غیر مسلم رعایا کو بھی اس سلسلہ میں وہی حیثیت حاصل تھی جو مسلمانوں کو تھی۔ حضرت عمرؓ نے بیت المال کے گران کو ہر پتہ کی جتنی کہ ضرورت مند اہل ذمہ کا پتہ لگا کر ان کی ضروریات کی تکمیل کا اہتمام کیا جائے۔ حضرت عمرؓ کا گذر کسی کے دروازہ پر ہوا جہاں ایک بوڑھا آدمی جس کی مصارت نازل ہو چکی تھی بھیک مانگ رہا تھا۔ آپ نے پیچھے سے اس کے بازو کو تھپکا اور پوچھا ”تم کس مذہب کے اہل کتاب ہو؟“ اس نے جواب دیا کہ یہودی ہوں۔ آپ نے پوچھا ”تمہیں کس چیز نے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا؟“ اس نے جواب دیا کہ میری ضرورت مندی اور ہزیہ کی وجہ سے بھیک مانگ رہا ہوں۔ حضرت عمرؓ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے گھر لے گئے اور گھر میں سے راکھ اسے کچھ دیا۔ پھر اپنے بیت المال کے کرائی کو نوازا اور فرمایا ”اُس کا اور اُس جیسے دوسرے افراد کا یہاں رکھو۔ خدا کی قسم یہ بات سن کر میرے دل میں اتنی ہمت آئی کہ میں ان سے ہزیہ وصول کر کے کھانا لے کر انہیں بے سہارا نہ چھوڑ دوں۔“ (تاریخ طبری ص ۱۵۰)

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص بیمار ہو جائے تو اس کے لئے ہزیہ مانگ کر لے کر آئے۔ اگر کوئی شخص بیمار ہو جائے تو اس کے لئے ہزیہ مانگ کر لے کر آئے۔ اگر کوئی شخص بیمار ہو جائے تو اس کے لئے ہزیہ مانگ کر لے کر آئے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص بیمار ہو جائے تو اس کے لئے ہزیہ مانگ کر لے کر آئے۔

اہلِ جبر کے ساتھ جو عیسائی تھے، معاہدہ کیا۔ تو اس میں ایک دفعہ یہ رکھی کہ :
 ”میں نے اُن کا یہ حق قرار دیا ہے کہ ایسا بوڑھا آدمی جو محنت کرنے سے معذور ہو جائے،
 یا جس پر کوئی مرض یا مصیبت آپڑے، یا جو آدمی پہلے مالدار رہا ہو اور اب ایسا غریب ہو جائے
 کہ اُس کے ہم مذہب اسے خیرات دینے لگیں اس کا جزیہ ساقط کر دیا جائے گا اور جب تک وہ
 دارالہجرت اور دارالاسلام میں مقیم رہے گا اس کے اور اُس کے اہل و عیال کی کفالت مسلمانوں
 کے بیت المال سے کی جائے گی۔

ان دوسری ضروریات میں سے ایک اہم ضرورت عام تعلیم کی ہے۔ اسلامی ریاست اپنے
 شہریوں کو لکھنا اور پڑھنا سکھانے کا اہتمام کرتی تھی۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کا اہتمام کرتے
 تھے کہ لوگ لکھنا اور پڑھنا سیکھیں۔ آپ ہی کے حکم سے حضرت زید بن ثابتؓ نے یہود کی زبان عبرانی
 لکھنا اور پڑھنا سیکھی تھی۔ بدر کے موقع پر متعدد قیدیوں کا فدیہ قرار دیا گیا کہ ان میں سے ہر ایک
 مدینہ کے دس بچوں کو لکھنا سکھا دے۔ حقیقت کی اسلامی درس گاہ میں شریک ہونے والے قرآن کریم
 اور تعلیمات دینی کے ساتھ لکھنا اور پڑھنا بھی سیکھتے تھے۔ چنانچہ حضرت عبادہ بن صامت
 رضی اللہ عنہ نے بعض لوگوں کو لکھنا بھی سکھا یا تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے حضرت سعید
 بن العاص کو اس بات پر مامور کیا تھا کہ مدینہ کے لوگوں کو لکھنا سکھائیں۔

(ابوداؤد کتاب العلم، طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۲۲۲)

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے محکام کو ایسے مسافر خانے بنوانے کا حکم دیا تھا جہاں مسافروں
 کو قیام و طعام مفت فراہم کیا جائے بعض آثار سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غیر شادی شدہ افراد کو
 شادی کرنے کے لئے بیت المال سے امداد دی جاتی۔ حضرت عمرو بن عبدالعزیز نے گورنر زید بن
 عبدالرحمن بن عمر بن الخطاب کو لکھا کہ بیت المال کے فائز مال میں سے ایسے لوگوں کی مدد کی جائے
 جنہوں نے شادی کی ہو اور اُن کے پاس نقدی نہ ہو۔ (کتاب الاموال ص ۲۵۱)

غذا، لباس، مکان اور تعلیم کی جن بنیادی ضروریات کی تکمیل کو ہم نے اسلامی ریاست کی
 ذمہ داری قرار دیا ہے۔ اُن کے سلسلہ میں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اُن کی وہ کم از کم مقداریں
 کیا ہیں جن کی فراہمی اس ذمہ داری کی ادائیگی کے لئے ضروری سمجھی جائے گی۔ اس سوال کا اصولی
 جواب یہ ہے کہ غذا، لباس اور مکان کی ضرورتیں کم سے کم اس حد تک پوری کی جانی چاہئیں کہ
 بھوک پیاس سردی یا گرمی کی شدت اور بارش وغیرہ کے نتیجے میں فرد کی جان جانے کا اندیشہ
 باقی نہ رہے اور اس کے اندر اتنی طاقت بحال رہے کہ وہ کسبِ معاش کی جدوجہد کر سکے۔ اس
 اصولی بات سے آگے بڑھ کر اثباتِ مطلوبہ کی کیفیت کے بارے میں کوئی صراحت کرنا دشوار ہے۔

ان کی تعین اس حال و ظروف پر مبنی ہوگی۔ ایسا انتظام کیا جانا چاہیئے کہ محروم افراد ملک کی عام معاشی سطح کے مطابق ضروری طبی خدمات اور دوائیں مفت حاصل کر سکیں۔ تعلیم کم از کم اتنی ہونی چاہیئے کہ ہر فرد لکھنا اور پڑھنا سیکھے۔ قرآن کریم کا ناظرہ پڑھنا، اسلام کی بنیادی تعلیمات سے واقفیت، جاہلیت اور اسلام کے درمیان تمیز کی صلاحیت اور عبادات کے طریقوں اور عام معاملات زندگی میں اسلامی حدود سے آگاہی ابتدائی اسلامی تعلیم کے لازمی معیار میں شامل ہیں۔

۳۔ معاشی ترقی کا اہتمام

ملک کی فوجی طاقت اور دفاعی قوت کی بنیاد اور اس کے سیاسی استحکام کی لازمی شرط ہے۔ آج کل دفاعی قوت براہ راست صنعتی ترقی سے وابستہ ہے۔ محفوظ دفاعی پالیسی کا ایک مسئلہ اصول یہ ہے کہ ملک اہم دفاعی سامانوں کے لئے دوسرے ممالک کا محتاج نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ جدید آلات حرب اور دفاعی سامان کبھی ملک میں اُسی وقت تیار کئے جاسکتے ہیں جب وہ صنعتی ترقی کے ایک اونچے معیار پر پہنچ چکا ہو۔ یہ بات محتاج دلیل نہیں کہ کتاب و سنت میں دارالاسلام کی فوجی طاقت اور دفاعی قوت کے استحکام پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ

”وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ“ (الانفال-۶۱) | اور اُن دشمنوں کے لئے جتنی قوت تم سے ممکن ہو سکے فراہم کر رکھو۔

اسلمہ جنگ : رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے زمانہ کی مختلف فوجی تیاریوں، تیراندازی، اور گھوڑ سوار کی مشق اور اسلمہ اور گھوڑے فراہم کر رکھنے پر صحابہ کرام کو برابر ابھارتے رہتے تھے۔ آج کی فوجی تیاریاں اور قوت کے ذرائع مختلف ہیں۔ آج اسی حکم اور انہی ارشادات نبوی کا منشا یہ ہے کہ زمانہ کے معیار کے مطابق فوجی تیاریاں کی جائیں اور دفاعی قوت پیدا کی جائے۔ چونکہ مقصد صنعتی ترقی اور فولاد، اچی توانائی اور بجلی کی طاقت جیسی بنیادی صنعتوں کے فروغ کے بغیر نہیں حاصل کیا جاسکتا۔ اس لئے ان چیزوں کا اہتمام بھی لازم قرار پائے گا۔

اسلامی مفکرین نے ملک کی خوشحالی کے اہتمام کو اسلامی ریاست کے صدر کی ذمہ داری قرار دیا ہے۔ علامہ ماوردی نے امام کے فرائض گناتے ہوئے لکھا ہے کہ :

”تیسری ذمہ داری یہ ہے کہ اپنے زیر تسلط ممالک کے جملہ مصالح کے تحفظ اور اُن کے شاہراہوں اور دوسرے ذرائع نقل و حمل کو بہتر بنا کر اُن ممالک کو آباد و خوشحال رکھے۔ ماوردی نے ایک حدیث بھی نقل کی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں ملک کو آباد و خوشحال رکھنے کی قدر و قیمت کیا تھی۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے سامنے اہل عجم کو بُرا کہا گیا تو پیوپ نے ایسا کرنے سے منہ کیا اور فرمایا ”اُن کو بُرا نہ کہو کیوں کہ ان لوگوں نے اللہ کے ملکوں کو آباد اور خوشحال بنایا تو ان میں اللہ کے بندوں نے زندگی گزاری“

(ادب الدین والدنیا للمارودی ص ۸۲)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر بیٹھا دیا اور فرمایا ”آپ نے یمن کی طرف نظر اٹھائی اور فرمایا اللہ ان کے دل اسلام کی طرف مائل کر دے۔ آپ نے عراق کی طرف دیکھا اور یہی فرمایا۔ پھر آپ نے چاروں طرف دیکھا اور یہی جملہ دہرایا اور فرمایا ”اے اللہ ہمیں زمین کی وراثت عطا فرمایا اور ہمارے مُد و صاع میں برکت دے“

(ادب المفرد للبخاری ص ۷۰)

نہروں کی کھودنا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں اسلامی مملکت کے مختلف صوبوں میں متعدد نہریں تعمیر کی گئیں جن کا تاریخ کی کتابوں میں تفصیل ذکر ملتا ہے۔ بصرہ کے والی حضرت ابوموسیٰ اشعری نے آپ کے حکم سے ایک نہر کھدوائی تھی جو نہر اُبد کے نام سے مشہور ہوئی۔ انبار کے کے زمینداروں کی فرمائش پر حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ کے زیر اہتمام ایک نہر کی تعمیر شروع ہوئی جسے حجاج بن یوسف نے مکمل کر لیا۔ دریائے دجلہ سے نہر معقل نکالی گئی۔ عمر بن عبدالعزیز نے نہر ابن عمر کھدوائی۔ نہروں کی تعمیر کا جو سلسلہ عہد فاروقی سے شروع ہوا تھا وہ بعد میں جاری ہوا۔ نہروں کی تعمیر کے علاوہ حسب ضرورت سیلاب کی روک تھام کے لئے بند بھی تعمیر کرائے گئے چنانچہ حضرت عمرؓ نے مکہ میں اس مقصد کے لئے ایک بند تعمیر کرایا۔ عراق میں دجلہ کے قریب ایک نشیبی علاقہ پانی کی کثرت سے دلدل میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایک بڑے علاقہ کو بند باندھ کر محفوظ کر لیا گیا۔ اس علاقہ سے ریاست کو پچاس لاکھ درہم بطور خراج وصول ہونے لگے۔ (فتوح البلدان للبلاذری ص ۳۵۲، ۳۶۴)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ریاست کے زیر اہتمام متعدد بڑے بڑے شہر بسائے گئے۔ ان کا محل وقوع اور ان کی آبادی کا منصوبہ مقامی حکام کے مشورہ سے طے کرتے تھے۔ کوفہ، بصرہ، موصل، حیرہ اور مصر میں فسطاط جیسے مرکزی شہر اسی طرح آباد ہوئے۔ قرن اول کی معیشت زراعت اور تجارت پر مبنی تھی۔ زرعی اور تجارتی معیشت کے لئے نہروں کی تعمیر، سیلاب کی روک تھام، سڑکوں کی تعمیر اور منصوبہ بندی کے ساتھ مرکزی شہروں کی آباد کاری، معاشی تعمیر و ترقی کے لئے جو اہمیت رکھتی ہے اس کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے

خلفاء کو اس بات کی بڑی فکر رہتی تھی کہ اشیائے ضرورت کے نرخ ارزاں رہیں۔ چنانچہ وہ مختلف علاقوں کے نرخ طے کرتے رہتے تھے اور جب انہیں یہ خبر ملتی تھی کہ نرخ ارزاں ہیں تو اطمینان

کا اظہار کرتے تھے۔ سلمہ بن قیس اشجعی کا قاصد حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے دریافت کیا کہ اشیاء کے نرخ کیسے ہیں۔ قاصد نے جواب دیا کہ بہت ارزاں نہیں۔ آپ نے دریافت کیا کہ گوشت کا نرخ کیا ہے کیوں کہ یہی اہل عرب کا اصل سہارا ہے۔ قاصد نے آپ کو گائے اور بکری کے گوشت کے نرخ الگ الگ بتائے۔ (تاریخ طبری ص ۲۷۱۹)

حضرت عمر بن عبدالعزیز اپنے والیوں کو تاکید کرتے تھے کہ بنجر زمینوں کو قابل کاشت بنانے کی تدابیر اختیار کریں۔ آپ نے عراق کے گورنر کو یہ بھی لکھا تھا کہ بیت المال کے فاضل مال میں سے کاشت کاروں کو زرعی اغراض کے لئے قرض دیئے جائیں۔ (کتاب الاموال ابو جعید ص ۲۵۱)

ان امور کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی ریاست کو ملک کے قدرتی وسائل سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے ترقی کی تمام ممکن تدابیر اختیار کرنی چاہئیں، ذرائع نقل و حمل کی توسیع، زراعت کی ترقی کے لئے موزوں اقدامات، معدنی وسائل کو ترقی دے کر کام میں لانا دیراؤں کے پانی سے بجلی حاصل کرنا اور آبپاشی کے لئے نہریں تعمیر کرنا ایک اسلامی ریاست کے پرگرام میں لازماً شامل ہونا چاہیئے۔

۴۔ تقسیم دولت میں پائے جانے والے تفاوت کو کم کرنا | قرآن و سنت اور خلافت راشدہ

کے نظائر سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اسلامی ریاست کی معاشی پالیسی کا ایک رہنما اصول یہ بھی ہے کہ معاشرہ میں تقسیم دولت کے اندر جو فرق پایا جاتا ہو وہ کم ہو اور سماجی دولت کسی ایک طبقہ کے اندر مرکوز ہو کر زردہ جائے۔

کئی دور میں ہی مسلمانوں پر یہ بات واضح کر دی گئی تھی کہ دولت مند افراد کے مال میں دولت سے محروم افراد اور ضرورت سے محروم ہو کر دست سوال دراز کرنے والوں کا بھی حصہ ہے۔

وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ | اور ان کے اموال میں سائل اور محروم افراد کا بھی حق ہے۔ (ذاریات : ۱۹)

پھر مدنی دور میں جب بنو ہبشیر نامی یہودی قبیلہ کو ان کی بد عہدی اور اسلام دشمنی کے سبب جلا وطن کیا گیا اور ان سے حاصل ہونے والے اموال کی تقسیم کا مسئلہ سامنے آیا تو یہ حکم دیا گیا کہ یہ اموال ضرورت مندوں کے لئے ہیں۔ اس حکم کی مصلحت یہ بتائی گئی کہ سماج کے مال کو دولت مند افراد کے درمیان مرکوز نہیں ہونا چاہیئے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں تقسیم دولت کے اندر پائے جانے والے تفاوت کو کم کرنے کا مقصد اسلامی ریاست نے تین طریقوں سے حاصل کیا۔ ہر سال زکوٰۃ اور عشر کے ذریعہ دولت مندوں

کے مال کا ایک حصہ غریبوں کی طرف منتقل کیا جاتا رہا ہے۔ فتنے کے مال کو غریبوں کے درمیان تقسیم کیا گیا اور اصحاب دولت کو ترغیب و تلقین کے ذریعہ اس بات پر ابھارا گیا کہ وہ اہل حاجت کی مالی امداد کریں۔

جب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے اور فتنے کا مال آیا تو آپ نے اسے عوام کے درمیان مساوی طور پر تقسیم کیا، اور چھوٹے بڑے، آزاد، غلام، مرد اور عورت سب کو برابر حصہ دیا۔ جب بعض لوگوں نے آپ سے یہ کہا کہ خدمت اسلام اور اسلام لانے میں سبقت کی بنا پر بعض افراد کو بعض سے زیادہ حصہ دینا چاہیئے تو آپ نے اس کا یہ جواب دیا کہ :

تم نے جو سابقیت، اولیت اور فضیلت کا ذکر کیا ہے تو میں اس سے بہت اچھی طرح واقف ہوں لیکن یہ ایسی چیزیں ہیں جن کا ثواب اللہ جلّ ثناء اللہ کے ذمہ ہے مگر یہ معاملہ معاش کا ہے۔ اس میں مساوات کا بڑا ذریعہ صحیح سلوک سے بہتر ہے۔

اما ما ذکرتم من السوابق والقدم والفضل فما اعرفني بذلك وانما ذلك شيئي ثوابه على الله جلّ ثنائه وهذا معاش فالاسوة فيه خير من الاثارة (ابو یوسف کتاب الخراج ص ۵۰)

ایک دوسری روایت یہ ہے کہ :

ابو بکرؓ سے کہا گیا کہ وہ (فتنے کی) تقسیم میں بعض لوگوں کو بعض پر ترجیح دیں تو آپ نے فرمایا : ان کے فضائل کا اعتبار اللہ کے یہاں ہوگا جہاں تک اس معاشی زندگی کا سوال ہے اس میں برابر سلوک کرنا بہتر ہے۔

ان ابا بکرؓ في ان يفضل بين الناس في القسمة فقال : فضائلهم عند الله فاما هذا المعاش فالتسوية فيه خير (الربيع كتاب الاموال ص ۲۶۳)

خلیفہ اول کا یہ ارشاد اگرچہ فتنے کی تقسیم سے متعلق ہے لیکن آخری جملہ میں آپ نے ایک اصولی حقیقت کا اظہار فرمایا ہے جس سے اسلامی ریاست کی معاشی پالیسی کا عام رُحمان اخذ کیا جاسکتا ہے۔ یہ عام رُحمان یہ ہے کہ وسائل معاش کی تقسیم میں تفاوت کے بجائے مساوات کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

تقسیم دولت کے اندر پائے جانے والے تفاوت کو کم کرنے کے باقی دو طریقے جو عہد نبوی میں اختیار کئے گئے تھے عہد صدیقی میں بھی نافذ رہے جب بعض قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تو ریاست نے ان کے خلاف فوجی کارروائی کر کے ان کو اس حق کی ادائیگی پر مجبور کیا۔

جب حضرت عمرؓ نے مفتوحہ ممالک کی اراضی کو تقسیم کرنے کے بارے میں مشورہ کیا تو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے زمینوں کی تقسیم کے خلاف رائے دیتے وقت جو بات فرمائی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود حضرت عمرؓ کو سماج میں دولت کا مرکز بننا پسند تھا۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ زمین کی ملکیت ایک محدود طبقہ میں بکھر کر رہ جائے اور باقی افراد اس سے محروم رہیں۔ حضرت معاذ کی رائے یہ تھی کہ زمین کے بڑے بڑے رقبوں کا چند افراد کے ہاتھوں میں آجانا بُرا ہے۔ اس سے آئندہ آنے والوں کی حق تلفی اور ہمت شکنی ہوتی ہے۔ حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت طلحہ اور حضرت عبداللہ ابن عمر رضوان اللہ علیہم نے بھی زمین کو تقسیم نہ کرنے کے رائے دی تھی۔ حضرت عمرؓ کا ان دلائل کو وزن دینا اور ان کی روشنی میں ایک اہم فیصلہ کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ کے نزدیک سماج کو دولت کے مرکز بننے سے بچانا اسلام کی معاشی پالیسی کا ایک رہنما اصول ہے۔ (کتاب الخراج یحییٰ بن آدم ص ۴۲)

جب مصرف ہو آؤ تو وہاں کی زمینوں اور عمارتوں کے بارے میں بھی حضرت عمرؓ کے حکم سے یہی پالیسی اختیار کی گئی۔

فئے کے مال کی تقسیم کے بارے میں ابتداءً عمر رضی اللہ عنہ نے بھی مساوی تقسیم کی اسی پالیسی پر عمل کیا جو حضرت ابوبکرؓ نے اختیار کی تھی۔ لیکن سلسلہ میں جب عراق و شام کی فتح سے بہت سا مال خمس اور فئے کے طور پر حاصل ہوا تو آپ نے اپنی پالیسی تبدیل کر دی۔ آپ نے اسلام لانے میں سبقت کرنے والوں کو اور اسلام کی نمایاں خدمات انجام دینے والوں کو عام افراد سے زیادہ حصہ دیئے۔ جن افراد نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ میں طرح طرح کے مصائب برداشت کئے تھے۔ اسلام کی خاطر اپنا گھر بار چھوڑ کر ہجرت کی تھی اور مدینہ کے ابتدائی دور میں آپ کے ساتھ مل کر جنگیں کی تھیں ان کو آپ نے بعد میں ایمان والوں سے زیادہ حصہ کا مستحق قرار دیا۔

تقسیم فئے میں مساوی سلوک کی جگہ ترجیحی سلوک کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ آپ کو یہ کسی طرح گوارا نہیں تھا کہ جن لوگوں نے اسلام میں داخل ہونے سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگیں لڑی تھیں۔ ان کو ان لوگوں کے برابر حصے دیئے جائیں جنہوں نے ابتداءً ہی سے رسول اللہ کے شانہ بشانہ کفار سے جنگ کی تھی۔

فرمایا: جن لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ کی تھی ان کو میں (تقسیم فئے میں) ان کے برابر نہیں کر سکتا جنہوں نے آپ کے ساتھ ہو کر جنگ کی تھی۔

قال: لا اجعل من قاتل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کم من قاتل معہ۔ (کتاب الخراج ص ۵۰)

اس نئے طریق کار کے حق میں جو سیاسی، معاشرتی، نفسیاتی اور دینی دلائل دیئے جاسکتے ہیں وہ واضح ہیں۔ لیکن معاشی طور پر اس کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ سماج کے اندر تقسیم دولت میں مزید ناہمواری پیدا ہو۔ چنانچہ آٹھ سال تک اس پالیسی پر عمل کے بعد اپنے دور خلافت کے آخری سال میں حضرت عمرؓ نے اپنی رائے پھر تبدیل کی اور آئندہ تقسیم فتنے میں مساوات برتنے کا ارادہ ظاہر کیا۔

ابن سعد کہتے ہیں:-

میں نے عمر بن الخطاب کو یہ کہتے سنا ہے کہ خدا کی قسم اگر میں اگلے سال اس موقع پر زندہ رہا تو (فنے کے رجسٹر میں درج) آخر کے لوگوں کو شروع کے لوگوں سے ملا دوں گا اور ان سب کو حصے کے اعتبار سے) ایک آدمی جیسا کر دوں گا۔

سمعت عمر بن الخطاب يقول:
والله لئن بقیت الى هذا العام
المقبل لالحقن آخر الناس
يا قلوبهم ولا جعلتهم رجلاً واحداً.
(الطبقات الكبرى ج ۳ ص ۱-۳)

زید بن اسلم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے عمر بن الخطاب کو یہ کہتے سنا ہے کہ: اگر میں ایک سال اور زندہ رہا تو دفتے میں حصے کے اعتبار سے) سب سے نیچے کے لوگوں کو سب سے اوپر کے لوگوں سے ملا دوں گا۔

عن زید بن اسلم عن ابيه
انه سمع عمر بن الخطاب يقول:
لئن بقیت الى الحول لالحقن
اسفل الناس باعلاهم.
(طبقات الكبرى ج ۳ ص ۱-۳)

ان روایات سے یہ بات تو قطعی طور پر ثابت ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے تقسیم فتنے میں عدم مساوات برتنے کی پالیسی سے رجوع کر کے مساوات برتنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لیکن یہ واضح نہ ہو سکا کہ آپ نے یہ فیصلہ کس وجہ سے کیا تھا۔ کتاب الخراج کی مذکورہ بالا روایت سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ مال فنے کی کثرت اس فیصلہ کا سبب بنی تھی۔ لیکن ہمیں یہ توجیہ کافی نہیں نظر آتی۔ سابقین اولین اور اسلام کی نمایاں خدمات انجام دینے والوں کا امتیاز برقرار رکھنے کا جو مقصد حضرت عمرؓ کے پیش نظر تھا وہ اُسی وقت پورا ہو سکتا تھا۔ جب مال فنے کی کثرت کے باوجود ان افراد کے حصے دوسرے افراد سے زیادہ رکھے جلتے۔ صرف مال فنے کی کثرت اس بات کے لئے کافی وجہ نہیں بن سکتی کہ ان کے امتیازی مقام کو نظر انداز کر دیا جائے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ سب کے حصوں میں اضافہ کر دیا جاتا اور ممتاز لوگوں کو پھر بھی عام افراد سے زیادہ حصے ملتے۔ مساوی تقسیم کے اس نئے فیصلہ کے لئے ضروری ہے کہ حضرت عمرؓ کے سامنے کوئی ایسی مصلحت آتی ہو جس کو ان مصالح پر ترجیح دینے لگے ہوں جو امتیازی سلوک

اور غیر مساوی تقسیم کے وقت ان کے سامنے تھی اور آٹھ برس تک برابر سامنے رہی۔ ہمارے نزدیک یہ نئی مصلحت ان مفاسد کے ازالہ کی ضرورت تھی جو سماج کے اندر تقسیم دولت میں بڑھتے ہوئے تفاوت سے پیدا ہو رہے تھے یا آئندہ پیدا ہو سکتے تھے۔ امتیازی حصے کچھ لوگوں کو دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ مال دار بنا رہے تھے۔ زیادہ مالدار لوگوں کے اندر معیار زندگی کو حد اعتدال سے زیادہ بلند کرنے، جائیدادیں خریدنے اور جہاد فی سبیل اللہ میں کچھ سستی کے رجحانات پیدا ہوتے دیکھ کر آپ کی بصیرت نے یہ پہچان لیا ہو گا کہ ان رجحانات کو غیر مساوی تقسیم کو مزید تقویت حاصل ہوگی۔ دوسری طرف یہ بھی ممکن ہے کہ آٹھ سال تک امتیازی سلوک کرنے کے بعد اب آپ کے نزدیک اس طریقہ کو باقی رکھنا اتنا ضروری نہ رہ گیا ہو۔ کیونکہ جن افراد کو آپ ممتاز کرنا چاہتے تھے ان کو اس طویل عرصہ میں خاصا موقع مل چکا تھا۔

نئے فیصلہ کے مطابق جن لوگوں کو زیادہ حصہ مل رہا تھا ان کے حصہ میں کمی نہیں ہوتی بلکہ جو لوگ پہلے کم حصہ پاتے تھے ان کے حصہ میں اتنا اضافہ پیش نظر تھا کہ سب کے حصے برابر ہو جائیں۔ ایسا کرنا اسی وجہ سے ممکن ہو سکا تھا کہ فتنے کا مال اب پہنے سے زیادہ تھا۔ کتاب الخراج کی مذکورہ بالا توجیہ ہمارے نزدیک فیصلہ کے صرف اس پہلو پر منطبق ہوتی ہے۔

ایک دوسری روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کا ارادہ تھا کہ مالدار لوگوں کی فاضل دولت لے کر غریبوں کے درمیان تقسیم کر دی جائے۔

<p>عن ابی وائل قال قال عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: جو امور میں پہلے طے کر چکا اگر انہیں مجھے آئندہ بھی طے کرنے کا موقع ملتا تو میں مالداروں سے ان کی فاضل دولت لے کر اُسے فقرا بٹے مہاجرین کے درمیان تقسیم کر دیتا۔</p>	<p>عن ابی وائل قال قال عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ لو استقبلت من امری ما استقبلت لا اخذت فضول اموال الاغنیاء فقسمتها علی فقراء المهاجرین۔</p>
--	--

(المحلی لابن حزم ج ۶ ص ۱۵۸)

اپنے دور خلافت کے آخری سال میں عمر فاروقؓ کا یہ ارشاد واضح طور پر یہ بتاتا ہے کہ آپ سماج میں دولت کی تقسیم میں بڑھتی ہوئی ناہمواری سے پریشان رہنے لگے تھے۔ اس صورت حال کی روشنی میں اپنے بعض گذشتہ فیصلوں پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔

اور ایک راست اقدام کے ذریعہ تقسیم دولت کے اندر پائے جانے والے تفاوت کو کم کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ یہ روایت ہماری اس رائے کی بھی تائید کرتی ہے کہ تقسیم فئے کے بارے میں آپ کے نئے فیصلہ کی اصل وجہ گذشتہ پالیسی کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی ناہمواری اور بڑھتی ہوئی عدم مساوات تھی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اموال فئے کی تقسیم میں مساوات کی پالیسی پر عمل نہیں کیا۔ مزید برآں آپ نے عراق و شام کی زمینوں کو جن کا مالیہ اب تک براہ راست کاشت کاروں سے وصول کیا جاتا تھا، متعینہ خراج پر درمیانی افراد کو دینے کا طریقہ اختیار کیا۔ یہ بھیکہ دار کاشتکاروں اور ریاست کے درمیان آگئے۔ ریاست کو متعینہ رقم ادا کرتے اور کاشت کاروں سے مختلف مشوروں کے مطابق لگان وصول کرتے یا پیداوار میں شرکت کا معاملہ طے کر لیتے اور اس طرح خود دفعہ کماتے۔ اسی چیز نے آگے چل کر زمینداری اور جاگیرداری کی شکل اختیار کر لی جس کو ناگوں مفساد رونما ہوئے۔ ابتداً یہ طریقہ اس لئے اختیار کیا گیا تھا کہ ریاست کو مالیہ وصول کرنے میں سہولت ہو اور وہ انتظامی زحمتوں سے بچ سکے جو لاکھوں چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں سے خراج وصول کرنے میں اُسے اٹھانی پڑتی تھی۔ اس طریقہ کو اختیار کرنے سے ریاست کی آمدنی بھی بڑھ گئی تھی لیکن یہ درمیانی افراد کاشتکاروں پر زیادہ دباؤ ڈالنے لگے اور اپنا نفع بڑھانے لگے۔ (الاحکام السلطانیہ للماوردی ص ۱۸۳)

مقررہ سالانہ وظیفوں کے علاوہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے متعدد افراد کو ان کی خدمات پر فراخ دلی کے ساتھ مزید رقمیں بھی عطا کیں۔ پھر مروان بن حکم کے بعض تصرفات کے نتیجہ میں ایک خاص طبقہ، بنو امیہ کو بیش از بیش مالی فوائد حاصل ہونے لگے۔

ان پالیسیوں کے نتیجہ میں اسلامی معاشرہ کے اندر تقسیم دولت میں پایا جانے والا تفاوت بڑھنے لگا۔ متعدد اکابر صحابہ کو ان میں سے بعض پالیسیوں پر اعتراض تھا، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آخری دنوں میں آپ نے ان حضرات سے یہ کہا تھا کہ اگر ان کی رائے آپ کی پالیسی کے خلاف ہے تو وہ اس کو تبدیل کرنے کے لئے اور بعض سابق احکام کو واپس لینے کے لئے تیار ہیں۔ ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اُس کے ایماء سے آپ کی جانب سے یہ اعلان کیا تھا کہ آئندہ تقسیم مال میں مساوات برقی جائے گی۔ (تاریخ طبری ص ۲۹۴۸۔ انساب الاشراف ج ۵ ص ۹۳)

حضرت علی رضی اللہ عنہ تقسیم فئے کے بارے میں وہی رائے رکھتے تھے جو حضرت ابو بکرؓ کی تھی، لیکن آپ کا دور خلافت اضطراب کے عالم میں گزرا اور اس کے بعد سلاطین بنو امیہ نے نہ صرف یہ کہ معاشرہ میں دولت اور آمدنی کی تقسیم میں بڑھتی ہوئی ناہمواری کو کم کرنے کی کوشش نہیں

کی بلکہ ان کی مالی پالیسی کے نتیجے میں یہ تفاوت بڑھتا ہی گیا۔ جب حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے اور آپ نے زندگی کے مختلف شعبوں کو اسلام کی اصل تعلیمات کے مطابق از سر نو منظم کرنے کی کوشش کی تو معاشی نظام میں بھی متعدد اصلاحات عمل میں لائی گئیں۔ بے جا طور پر دی گئی جاگیریں واپس لے کر ان کے اصل مالکوں کو دی گئیں۔ جن سرکاری زمینوں کو لوگوں نے ذاتی ملکیت بنالیا تھا۔ ان کی سابقہ حیثیت بحال کی گئی اور آئندہ کے لئے ایسی زمینوں کی خرید و فروخت ممنوع قرار دے دی گئی۔

(کتاب الاموال لابن عبید ص ۳۶۴)

بعد میں آنے والے حکمرانوں نے ان اصلاحات کو ترک کر دیا اور حکومت کی معاشی پالیسی میں دوبارہ اسلام کے اصولوں سے انحراف کی مختلف شکلیں رونما ہونے لگیں۔

اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن و سنت کی تعلیمات کا صحیح مفہوم وہ ہے جو خلافت راشدہ کے عمل سے ہمارے سامنے آتا ہے۔ اسلام کسی فرد پر کسب دولت کے سلسلہ میں کوئی اصولی اور دائمی پابندی عائد نہیں کرتا لیکن اسے یہ بات پسند نہیں ہے کہ دولت سماج کے ایک طبقہ میں مرکوز ہو کر رہ جائے۔ قرآن، سنت نبوی، اور خلافت راشدہ کے نظائر کی روشنی میں ہم اطمینان کے ساتھ یہ رائے قائم کر سکتے ہیں کہ دولت اور آمدنی کی تقسیم کے اندر تفاوت کو کم کرنا اسلامی ریاست کی معاشی پالیسی کا ایک رہنما اصول ہے۔

اس رائے کی مزید تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ اسلام کو معاشرہ میں عیش پرستوں اور مترفین کے طبقہ کا ظہور سخت ناپسند ہے۔ ہم قبیل اہل بیت پہلے باب میں یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ قرآن کریم کے فلسفہ تاریخ کی روشنی میں کسی معاشرہ میں عیش کوئی اور عیش پرستی کرنے والے طبقہ کا ظہور اور غلبہ اس معاشرہ کی ہلاکت اور بربادی کا پیش خیمہ ہے۔ تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ تقسیم دولت میں بڑھتا ہوا تفاوت اس طبقہ کے ظہور اور غلبہ کے لئے راہیں ہموار کرتا ہے۔ اس بناء پر بھی یہ ضروری ہے کہ اسلامی ریاست اس بات کا اہتمام کرے کہ دولت اور آمدنی کی تقسیم میں روز افزوں تفاوت کا رجحان نہ جڑ پکڑ سکے۔

معاشی پالیسی کے اس رہنما اصول کی روشنی میں دور جدید کی ایک اسلامی ریاست کی ذمہ داری ظاہر ہے۔ اس ریاست کو اس بات کی بھی فکر کرنی ہوگی کہ صدیوں کے غیر اسلامی نظام معیشت کی وجہ سے جو خرابیاں جڑ پکڑ چکی ہیں ان کا بہت درجہ ازالہ کیا جائے۔ اصلاح حال کے لئے پہلا قدم یہ ہوگا کہ عشر و زکوٰۃ کے شرعی محاصل کو وصول کرنے اور متعینہ مددات میں صرف کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ عام اخلاقی تربیت کے ذریعہ ایک ایسی فضا بنانی ہوگی کہ اصحاب دولت زکوٰۃ کے علاوہ بھی اپنے مال میں اہل حاجت کا حق تسلیم کریں اور اسے رضا کارانہ

طور پر ادا کریں۔ اسلام کے قانون وراثت کا پوری طرح نفاذ بھی اس اصول کے بعض تقاضوں کو پورا کرے گا۔ پھر سود کی حرمت بے جا استحصال کے بُرے دروازہ کو بند کر دے گی۔

ان اقدامات کے ساتھ اس طرف بھی توجہ کی جانی چاہیے کہ غیر اسلامی زمیندارانہ اور جاگیردارانہ نظام کی وجہ سے زمین کی ملکیت کا ایک طبقہ میں جو مرکز وجود میں آ گیا ہے اس کو ختم کیا جائے۔ پھر اس بات کا بھی اہتمام ہونا چاہیے کہ ریاست کے تعمیری اور ترقیاتی کاموں، یارفاہ عامہ سے امور اور تعلیم، صحت و صفائی اور حمل و نقل کی سہولتوں وغیرہ خدمات کی فراہمی کا جو انتظام ریاست کی جانب سے کیا جائے، اس کے بیشتر فوائد بڑے کاروباریوں، یا مال دار لوگوں ہی تک محدود نہ ہو جائیں۔ موجودہ عدم توازن کو دور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان خدمات سے زیادہ تر فائدہ غریبوں اور کم آمدنی والے طبقوں کو پہنچے۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ ریاست اس رہنما اصول کے تقاضوں کی تکمیل کے لئے اہل ثروت پر شرعی محاصل کے ماسوا مزید محاصل عائد کرنے کا طریقہ بھی اختیار کر سکتی ہے۔

۳۔ اُمتِ مُسْلِمہ

ان وضاحتوں کے بعد کہ صرف ”اسلام“ ہی ہر حیثیت سے جامع، کامل، سارے انسانوں کے لئے، اور آخری دین ہے نیز نجات کے لئے اس کی پیروی شرط ہے، عقل کہتی ہے کہ اسلام کو اگر یہ مخصوص حیثیت دی گئی ہے تو اس مخصوص حیثیت کا ایک مخصوص تقاضا بھی ہوگا۔ اور وہ یہ کہ اسے دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچنا چاہیئے اور برابر پہنچتے ہی رہنا چاہیئے۔ قوم قوم کے سامنے اس کی وضاحت ہونی چاہیئے اور پیہم ہوتی رہنی چاہیئے۔ فرد فرد کو اس کا پیغام دیا جانا چاہیئے اور مسلسل دیا جاتا رہنا چاہیئے۔ ورنہ دنیا اسے جان پہچان نہ سکے گی۔ اور جب جان ہی نہ سکے گی تو اس پر ایمان کس طرح لا سکے گی، حالانکہ وہ اس پر ایمان لانے کی مکلف قرار دی گئی ہے۔ اور اگر ایمان نہیں لاتی تو بدبختی کا شکار ہوتی ہے۔ یہ تو کوئی انصاف کی بات نہ ہوگی کہ لوگوں کے لئے ان کے مالک کی بھیجی ہوئی شریعت ایک راز بنی رہے اور انہیں بے خبری میں پکڑا جائے۔ اس لئے اگر انسانیت کا یہ فرض ہے کہ وہ اسلام ہی کی پیروی کرے۔ تو اس فرض سے پہلے اس کا یہ حق ہے کہ اسے دین سے واقف کرایا جائے۔ اگر یہ نہیں ہوتا تو خود اسلام پر بھی ظلم ہے کہ وہ بڑی حد تک بے مصرف بن کر رہ جاتا ہے اور انسانیت پر بھی ظلم ہے کیوں کہ اس طرح وہ اس نعمت سے لازماً محروم رہ جاتی ہے۔ جس پر اس کا مقدر موقوف ہے۔

ملتِ اسلامیہ کا مقصد اور منصب | جب تک اسلام کا لانے والا رسول دنیا میں موجود تھا بلاشبہ

اس نے بہترین طریقے سے انسانیت کا یہ حق ادا کیا مگر اس کے چلے جانے کے بعد بھی تو یہ حق اپنے ادا کئے جانے کا مطالبہ کر رہا ہے اور تاقیامت کرتا رہے گا۔ اب تو کوئی نبی بھی آنے والا نہیں ہے کہ یہ حق اس کا انتظار کرے۔ بہر حال اگر اب اسلام کی اس مخصوص حیثیت کے ضروری تقاضے کا کسی طرح انکار نہیں کیا جاسکتا تو ضروری ہے کہ وہ پورا ہو۔ کیسے پورا ہو؟ یہ ایک عظیم اہمیت کا مسئلہ ہے جس کا کوئی عملی حل ہونا چاہیئے اور صرف اسلام کی زبان سے ہونا چاہیئے کیوں کہ اگر اسلام خدا کا بھیجا ہوا دین ہے اور اسے فی الواقع ساری دنیا کے لئے اور ہمیشہ کے واسطے بھیجا گیا ہے تو ضروری ہے کہ

اس مسئلے کا کوئی مقررہ حل اس کے پاس موجود ہو۔

اس ضرورت کے پیش نظر قرآن اس عظیم مسئلے کا عظیم نشان حل ان الفاظ میں پیش کرتا ہے:-

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا
لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ
الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ۝۱۲

(البقرہ - ۱۲۳)

رسول ہمارے لئے شاہد بنے۔

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے اس حل کی عملی شکل یہ قرار پاتی ہے کہ:

(۱) اسلام کو اللہ کے بندوں تک پہنچانے کا جو کام رسول اپنی زندگی میں کرتا رہا ہے

اُس کے چلے جانے کے بعد وہ اُس کے پیروؤں کے ذمے ہو گیا ہے۔ اور اب یہ لوگ اس وقت تک کے لئے اس کام کے ذمہ دار ہیں جب تک وہ اس زمین پر موجود ہیں۔

(۲) اسلام کو دوسروں تک پہنچانے کا مطلب محض عام طرز کی تبلیغ و اشاعت نہیں ہے بلکہ ایسی تبلیغ و اشاعت ہے جسے ”شہادت“ (گواہی) کہہ سکیں۔

(۳) ”اسلام کی شہادت“ دینے کا بھی ایک متعین مفہوم ہے جس کا تعین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل کرتا ہے یعنی اسلام کو لوگوں تک پہنچانے کا کام مسلمان ہر ممکن حد تک ٹھیک اسی طرح کریں جس طرح کہ خود حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان (صحابہ) تک اس کے پہنچانے کا انتظام کیا تھا۔

معلوم ہوا کہ کچھلی امتیں اگر صرف ایک ذمہ داری رکھتی رہی ہیں کہ اپنے دین کی غلصانہ پیروی کرتی رہیں تو امت مسلمہ ایک عام ذمہ داری کے ساتھ ایک اور ذمہ داری بھی رکھتی ہے اور وہ یہ کہ بیرونی دنیا کے سامنے اسلام کی اس طرح گواہی دیتی رہے جس طرح گواہی دینے کا حق ہے اور جس کا عملی نمونہ اس کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سامنے رکھا گیا ہے۔ مختصراً یہ امت اپنے مجموعی وجود میں اپنے پیغمبر کی قائم مقام ہے۔ اور بحیثیت امت اس کی زندگی کا مشن ٹھیک وہی ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا تھا۔

امت مسلمہ کی یہ ذمہ داری کوئی معمولی ذمہ داری نہیں ہے۔ بلکہ اتنی بڑی اور ہمہ گیر ذمہ داری ہے کہ وہی اس کے باوجود کامل مقصد بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کہ ”ہم نے تمہیں ایک بہتر امت (یا امت وسط) بنایا ہے تاکہ تم باقی سارے انسانوں کے لئے دین حق کے گواہ رہو“ اس امت کی حیثیت صاف طور سے یہی مقرر کر رہا ہے۔ مزید صراحت اس ارشاد میں ہے ”کنتم خیر امۃ اخرجت للناس“ (الآیۃ) (تم ایک بہتر امت ہو جو سارے

انسانوں (کی اصلاح) کے لئے وجود میں لائی گئی ہے۔ ان لفظوں میں صاف نظر آ جاتا ہے کہ یہ امت صرف اس طرح کی ایک امت نہیں ہے جس طرح کی امتیں اب تک وجود میں آتی رہی ہیں۔ بلکہ ایسی امت ہے جو باقی ساری نوع انسانی کی مادی اور پوری انسانیت کی پاسبان بنائی گئی ہے اور یہی اس کے وجود کا پہلا اور آخری مقصد ہے۔ اُمتِ مُسْلِمہ کی اصل قدر و قیمت بھی اسی شہادت پر موقوف ہے۔ وہ امت وسط اور ”خیر امت“ فی الواقع اسی وقت تک ہے جب تک کہ دنیا کے سامنے حق کی گواہ بن کر کھڑی رہتی ہے، ورنہ ان خطابات کے استحقاق سے محروم ہو جائے گی۔ کیوں کہ اس کا یہ نام صفاتی نام ہے اور اسے مخصوص طور پر صرف اس لئے ملا ہے کہ اس کی اسلامی ذمہ داریاں دوسری امتوں کے مقابلے میں دوہری تھیں۔ سورہ حج کے الفاظ قابل غور ہیں:

”اس نے تمہیں منتخب کیا ہے اور تمہارے لئے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی ہے۔ اپنے باپ ابراہیم کے راستے کی پیروی کرو۔ اس نے پہلے ہی سے تمہارا نام ”مسلم“ رکھا ہے تاکہ رسول تمہارے لئے (دین حق کا) شاہد ہو اور تم دوسرے تمام لوگوں کے شاہد بنو۔ (الحج ۷۸)

اس آیت میں جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ امتِ مسلمہ کا نام اور مقام کیا ہے۔ وہیں اسے اور ساری دنیا کو یہ حقیقت بھی سمجھا دی گئی ہے کہ اس نام اور کام کی وجہ سے اس کا وہ مشن ہے جو اس کے سپرد کیا گیا ہے۔ اگر وہ اس کام کو انجام دیتی ہے تو یقیناً ”امتِ مسلمہ“ ہے اور اس سلسلے میں وہ خدا کے حضور جواب دہ بھی ہوگی۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے جہاں ایک ایک مسلمان کو اپنی انفرادی ذمہ داریوں کے بارے میں جواب دہی کرنی ہوگی وہیں پوری امت کو ایک امت کی حیثیت سے اپنی اجتماعی جواب دہی بھی کرنی پڑے گی۔ یہ کوئی معمولی جوابدہی نہ ہوگی بلکہ کچھ اس طرح کی ہوگی جس طرح کی انبیاء علیہم السلام کی اپنی اپنی پیغمبرانہ حیثیتوں میں ہوگی۔ کیونکہ اگرچہ امتِ مسلمہ اصطلاحی طور پر پیغمبر نہیں مگر پیغمبری کا فریضہ ضرور رکھتی ہے۔

سورہ اعراف میں ہے:

فَلَنَسْأَلَنَّ الَّذِينَ أُرْسِلَ إِلَيْهِمْ
وَلَنَسْأَلَنَّ الْمُرْسَلِينَ ۝

(الاعراف - ۶)

پس ہم ضرور حساب لیں گے ان لوگوں سے
جن کے پاس پیغمبر بھیجے گئے اور ان پیغمبروں
سے بھی حساب لیں گے

شہادتِ حق | اسلام کی یہ شہادت کیا چیز ہے؟ اس کا مفہوم اور اس کی عملی شکل کیا ہے؟ یہ ایک بہت اہم سوال ہے جو یہاں پہنچ کر لازماً پیدا ہوتا ہے اور

جس کا جواب ملنا خود اسلام کو سمجھنے کے لئے بہت ضروری ہے۔

اس سلسلے میں اصولی طور پر اور عملاً آتنا تو معلوم ہو چکا ہے کہ جس طرح اسلام اور دین حق ایک متعین چیز ہے اسی طرح دین حق کی اس شہادت کا مفہوم اور اس کی عملی شکل بھی متعین ہے اور یہ تعین رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ کرتا ہے۔

”شہادت“ یا گواہی عرف عام میں اس بات کو کہتے ہیں کہ آدمی کسی واقعے یا کسی چیز کے بارے میں جو کچھ یقین کے ساتھ جانتا ہو دوسروں کو ٹھیک ٹھیک بتا دے۔ اس لئے دین حق کی شہادت کا لغوی اور عرفی مفہوم یہ ہے کہ لوگوں پر اسلام کو جیسا کچھ وہ ہے پوری طرح واضح کر دیا جائے۔ اب رہا قرآن کا اصطلاحی مفہوم تو اگرچہ یہ مفہوم بھی بنیادی طور پر یہی ہے مگر اس میں بڑی وسعت اور بلندی آگئی ہے جس کی وضاحت نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اسون کی روشنی میں یہ ہے کہ شہادت حق کے دو پہلو ہیں۔

(۱) **قولی شہادت** : قولی شہادت یہ ہے کہ اسلام کے بنیادی عقائد سے لے کر اس کے تفصیلی احکام تک پوری دنیا کے سامنے موزوں ترین الفاظ اور عبارات میں پیش کئے جائیں، یہاں تک کہ یہ دین ان کے لئے بالکل کھلی کتاب بن جائے اور غیر مسلموں کے سامنے ان کے اپنے مسلک کی غلطی اور اسلام کی صداقت پالینے میں کوئی معقول رکاوٹ باقی نہ رہ جائے۔ لیکن اس کام کو صحیح طریقے سے انجام دینے کے لئے چند باتیں ضروری ہیں:

(۱) اسلام کے بنیادی عقائد پر علم و عقل کی ایسی دلیلیں اور فطرت و وجدان کی ایسی شہادتیں جیسا کی جائیں، جن سے ان کی سچائی بالکل آشکارا ہو جائے۔ قرآن نے توحید و رسالت، آخرت وغیرہ پر جس زور و قوت کے ساتھ اور جس ہمہ گیر انداز میں دلائل پیش کئے ہیں، اس کا اتباع بنیادی ضرورت ہے۔ نیز زندگی کے مختلف شعبوں میں اسلام کے احکام اور ان کی تفصیل پیش کی جائے اور یہ بتایا جائے کہ وہ زندگی کے مسائل کس حسن و خوبی سے حل کر دیتا ہے۔

(۲) غیر اسلام پر سنجیدہ اور مدلل تنقید کی جائے۔ اس تنقید کے لئے قدرتی طور پر ضروری ہے کہ پہلے ان افکار و نظریات سے گہری واقفیت حاصل کی جائے جن کی غیر مسلم دنیا پیروی کر رہی ہے، اور جو اس وقت کے مذہب، تہذیب اور فلسفوں اور نظاموں کی بنیاد ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان نظریات کے پیدا کئے ہوئے عملی نتائج کو بھی بتایا جائے جنہیں کسی طرح بھی انسانیت کے لئے خوش آئند نہیں کہا جاسکتا۔ غیر اسلام کی یہ مدلل تردید شہادت اسلام کی راہ کا ایک ناگزیر مرحلہ ہے۔

(۳) اسلام کو حق اور غیر اسلام کو باطل ثابت کرنے کا یہ کام دل نشیں اور جدید ترین انداز میں انجام دیا جائے۔ اس زبان میں ہو جس سے وقت کا انسان مانوس ہے، اس طرز کا ہو جو آجکل کے ذہنوں کو اپنی طرف مائل کر سکے، اس طریقے کا ہو جسے سائنس کا یہ دور بحث و استدلال کا طریقہ تسلیم کرتا ہو کیوں کہ اسلام کو حق اور غیر اسلام کو باطل ثابت کرنے کی یہ کوشش محض ایک علمی مناظرے کی خاطر نہیں ہے بلکہ دین حق کی تبلیغ اور توضیح کی خاطر ہے۔ قرآن نے بھی اپنی دعوت پیش کرنے کے لئے زبان، انداز، اسلوب اور طرز استدلال انتہائی مناسب مانوس، معیاری اور واضح اختیار کیا ہے جو مخاطب کے لئے سب سے زیادہ مؤثر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حق کی دعوت دینے کے بارے میں یہ ہدایت کی تھی کہ دنیا کو اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعے بلاؤ اور ضرورت کے وقت بہترین انداز سے بحث و مباحثہ کرو۔ (ادع الی سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی ہی احسن)

(۴) اس تبلیغ و دعوت کے پیچھے کوئی قومی غرور، کوئی حریفانہ جذبہ، اور کوئی مناظرانہ ذوق ہرگز کارفرما نہ ہو۔ بلکہ زبان و قلب سے جو کچھ نکلے اخلاص و للہیت کے ساتھ نکلے۔ اور محض اپنے فرض کے احساس اور بنی آدم کی محبت اور خیر خواہی کی بناء پر نکلے۔

(ب) عملی شہادت: عملی شہادت یہ ہے کہ اسلام کی جو تصویر الفاظ میں پیش کی جائے وہ پیش کرنے والے کی اپنی زندگی میں بھی دکھائی جائے۔ امت کے افراد اپنی انفرادی حیثیتوں میں اور پوری امت اپنی اجتماعی حیثیت میں سب کے سب اسلام کے عملی ترجمان ہوں۔ ان میں توحید، آخرت، رسالت اور دوسرے عقائد پر گہرا یقین ہو اور یہ یقین ان کی ایک ایک ادا سے ٹپک رہا ہو۔ ان کے اخلاق و آداب، معیشت و معاشرت، سیاست و معاملات غرض ان کی زندگی کا پورا نظام اور اس نظام کا ایک ایک شعبہ الہی نقشے کے مطابق تعمیر ہو۔ ”عملی شہادت“ کا مرتبہ ”قوی شہادت“ سے مقدم ہے۔ اس لئے جب تک کوئی شخص یا گروہ خود ہی کسی دین کی پیروی نہ کر رہا ہو اسے کسی طرح زیب نہیں دیتا کہ وہ دوسروں کو اس کی دعوت دے۔ کیوں کہ نتیجہ کے اعتبار سے بھی اس کی کوشش زیادہ بار آور نہ ہوگی۔

اس سلسلے میں نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اسوۂ حسنہ کے متعلق کچھ عرض کرنا بالکل غیر ضروری ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جب بھی ایمان کی دعوت دی تو اس حالت میں کہ پہلے خود ایمان و یقین کے پیکر بن چکے تھے اور جب دوسروں کو اللہ کا حکم سنایا تو اس طرح کہ سر مبارک اس کے آگے پہلے جھک چکا تھا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ارشادات ”انا اول المؤمنین“ (میں

سب سے پہلا ایمان لانے والا ہوں) اور ”انا اول المسلمین“ (میں سب سے پہلا اطاعت اطاعت کرنے والا اور سر تسلیم خم کرنے والا ہوں) اس پر دلالت کرتے ہیں۔

انسان کی ذہنیت ایسی ہے کہ وہ پست، در ماندہ اور محکوم اقوام کے طریقہ زندگی، فلسفہ اور دین کی طرف راغب نہیں ہوتا۔ لہذا مسلمانوں کا فرض ہے کہ علمی اور اقتصادی میدانوں میں دوسروں کے پیچھے نہ رہ جائیں۔ اس وقت مسلمانوں کی در ماندگی کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ان میں جوش عمل اور محنت کی عادت کا فقدان ہے اور سہل انگاری، کاہلی اور کم ہمتی ان کی خصلت میں شامل ہو گئی ہیں۔ جب تک مسلمان ان خرابیوں میں گرفتار رہیں گے نہ ان کا اخلاقی معیار بلند ہوگا اور نہ دنیوی فلاح انہیں حاصل ہوگی؛ وہ پست اور در ماندہ رہیں گے اور ان کی وجہ سے اسلام بدنام رہے گا اور دوسری اقوام کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے گا، بلکہ خود مسلمانوں کے ذہن اسلام سے ہٹ کر اور راستے تلاش کریں گے۔ یہ ایک ایسی لعنت ہے جس کے زہر آلود اثرات اس وقت بھی اسلامی معاشرے کو بربادی کی طرف لئے جا رہے ہیں۔ مسلمان اسلام کا شاہد اس وقت ہو سکتا ہے۔ جب وہ اپنی کوشش، ایشار اور محنت سے اپنے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کرنے کے قابل ہو۔

۴۔ اسلامی ریاست کی ضرورت

انسان نے اپنی اجتماعی زندگی کی ترتیب و تہذیب کے لئے جو ادارے قائم کئے ہیں ان میں ریاست کا ادارہ سب سے زیادہ اہم اور بنیادی ہے۔ ریاست وہ ہیئت سیاسی ہے جس کے ذریعے ایک ملک کے باشندے ایک باقاعدہ حکومت کی شکل میں اپنا اجتماعی نظام قائم کرتے کرتے ہیں اور اسے قوت قاہرہ اور قوت نافذہ کا امین قرار دیتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں:

”ریاست ایک منظم سلع کا نام ہے۔ یہ اس وقت وجود پذیر ہوتی ہے۔ جب کہ ایک طرف افراد پر اقتدار قائم کرنے اور دوسری طرف افراد کی جانب سے اطاعت کرنے کا دو گونہ رابطہ عمل میں آجائے۔ اطاعت کے امر واقع کا ہونا اس بات کو کافی ہے کہ ریاست موجود ہو گئی۔“

اجتماعی زندگی کے لئے ریاست کا وجود ناگزیر ہے۔ انسان جب دوسروں سے معاملات کرتا ہے تو ان معاملات کی ضابطہ بندی کے لئے قانون کی اور اس قانون کو نافذ کرنے والے ادارے کی ضرورت پہلے ہی قدم پر محسوس ہوتی ہے۔ ریاست وہ ادارہ ہے جو معاشرتی تعلقات معاشری بین دین اور تمدنی معاملات کی استواری کا نگراں و محافظ ہے۔ فرد کو اپنے نشو و ارتقاء کے لئے ایک ایسے ماحول کی ضرورت ہے جس میں ایک طرف امن و امان قائم ہو اور دوسری طرف وہ فرد کو ایسی تمام سہولتیں فراہم کر دے جو وہ خود حاصل نہیں کر سکتا۔ دفاع، قیام نظم و قانون، حصول عدل، تعلیم وہ چیزیں ہیں جو ریاست کے ذریعے انسان کو حاصل ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی زندگی کی تشکیل میں ریاست کا حصہ بڑا اہم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان نے اپنی تہذیبی زندگی کے آغاز سفر ہی میں اس ادارے کی ضرورت کو محسوس کر لیا تھا اور پوری انسانی تاریخ ریاست کے استحکام، اس کی تنظیم و تہذیب اور اس کے فروغ و ارتقاء کی تاریخ ہے۔ اور دور جدید میں عملی طریقوں کی ترقی اور اجتماعی زندگی میں نئی پیچیدگیوں کے راہ پا جانے کی وجہ سے ریاست کا دائرہ کار برابر بڑھ رہا ہے، اس کے اثر و نفوذ میں اضافہ ہو رہا ہے اور اس کی قوت اور وسائل میں ترقی ہو رہی ہے۔ دنیا کے تقریباً تمام ہی ممالک میں ریاست کا کام محض امن و امان اور نظم و ضبط قائم رکھنا ہی نہیں بلکہ اجتماعی عدل

اور سماجی فلاح کا قیام بھی ہے۔ ریاست کا ادارہ ایک مثبت ادارہ ہے جو زندگی کے سب ہی شعبوں کو متاثر کرتا ہے، اس کے قیام و ارتقاء میں انسان کی اخلاقی حس اور تصورِ عدل کا غیر معمولی دخل رہا ہے۔ انصاف وہ محور ہے جس کے گرد سیاسی نظم کا ہر پرزہ حرکت کرتا ہے۔ چنانچہ ریاست اگر معاشی تعلقات کو ترتیب دیتی ہے تو اس لئے کہ عدل قائم ہو تو انین بنائی یا بدلتی ہے تو اس لئے کہ وہ اصول انصاف سے زیادہ مطابقت اختیار کر سکیں۔ اخلاقی احساس کا غلبہ اس درجہ ہے کہ اگر خود غرض عن صراپنے مفاد کی بناء پر قانون بناتے ہیں تو ان پر بھی اصول اخلاق و انصاف ہی کا جامہ پہنا کر قوم کے سامنے پیش کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی آئین مملکت نے کوئی ایسی شکل اختیار کی ہے جو قوم کی چشم اخلاق میں کھٹکتی ہو تو جاہل یا بدیر انقلاب واقع ہوا اور ریاست کی بنیاد ہل گئی، نیز یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ استحکام اور صحت مندر ارتقا اس وقت حاصل ہوا ہے جب آئین و قانون قوم کے اصول اخلاق اور ان کے اجتماعی ضمیر کے مطابق تھے۔

اسلام اخلاق و سیاست کے اس فطری تعلق کو ایک بنیادی حقیقت کی حیثیت سے پیش کرتا ہے اس کے نظام فکر و عمل میں اس جاہلانہ تصور کے لئے کوئی گنجائش نہیں کہ دین و سیاست دو جدا چیزیں ہیں۔ ریاست کا مقصد انصاف قائم کرنا ہے اور یہ کام دین کا ہے کہ وہ ان اصول انصاف اور ضابطہ اخلاق کو فراہم کرے جسے ریاست قائم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے اور وہ حیات انسانی کے ہر پہلو کے لئے ہدایت دیتا ہے۔ اس ہمہ گیر ہدایت کا نام شریعت ہے۔ قرآن میں ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم پوری شریعت کا اتباع کریں اور اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جائیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً - (البقرہ - ۲۰۸)

اے ایمان والو! اسلام میں، پورے پورے داخل ہو جاؤ۔

اہل کتاب جن احکام خداوندی کو اپنی خواہش و پسند کے مطابق پاتے، ان پر تو عمل پیرا ہو جاتے لیکن جو احکام الہی ان کی خواہش و پسند کے مطابق نہ ہوتے ان سے کئی کترا جاتے، اس بنا پر ان کو خدا کی جانب سے تہدید کی گئی کہ

أَفْتَوْهُمُ مِنْ بَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ - (البقرہ - ۸۵)

کیا تم کتاب الہی کے بعض حصوں کو تو ماننے ہو اور بعض کا انکار کرتے ہو۔

پھر اس روش کی بابت اس ہلاکت خیز سزا کا اعلان فرمایا:

پس تم میں سے جو شخص ایسا کرے گا اس کی سزا دنیا کی زندگی میں سوائے ذلت و نامرادی کے اور کیا ہو سکتی ہے اور قیامت کے دن ایسے کو سخت عذاب کی طرف لوٹایا جائے گا۔

فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ مِنْكُمْ
إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ
الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ
الْعَذَابِ (البقرہ - ۸۵)

ان احکام کے بعد زندگی کے کسی بھی حصے کو اسلام کے دائرہ سے باہر رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسلام نے اپنی پوری تاریخ میں ریاست کی اہمیت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ انبیائے کرام وقت کی اجتماعی قوت کو اسلام کے تابع کرنے کی جدوجہد کرتے رہے۔ ان کی دعوت کا مرکزی تخیل ہی یہ تھا کہ اقتدار خدا اور صرف خدا کے لئے ہو جائے اور شرک کی اپنی ہر جلی اور خفی شکل میں ختم کر دیا جائے۔ ان میں سے ہر ایک کی بیکار یہی تھی۔

يَقُومُوا عِبَادَ اللَّهِ مَا لَكُمْ مِنْ
إِلَهِ غَيْرِهِ (الاعراف - ۶۵)
إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ (يوسف - ۴۰)
أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ (الاعراف - ۵۴)

لے برا دران قوم! اللہ ہی کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے۔
(اس رکھو) قانون اور حکم خدا کے سوا کسی کیلئے نہیں۔
خبردار! تخلیق (کی کار فرمائی) اسی کی ہے اور حکم بھی اسی کے لئے ہے۔

اور ان میں سے ہر ایک نے خدا کی حاکمیت کے نمائندے کی حیثیت سے اپنی قوم سے مطالبہ کیا :

فَاتَّقُوا اللَّهَ وَآطِيعُوا أَمْرَهُ (الشعرا - ۳۳)

اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

خدا کے ان فرستادہ بندوں نے زندگی کے ہر شعبہ کی اصلاح کی جدوجہد کی تاکہ خدا کی زمین پر خدا کا دین اور اسی کا قانون جاری و ساری ہو۔ ان کی یہ جدوجہد پوری زندگی کی اصلاح کے لئے تھی اور ریاست و سیاست کی اصلاح اس کے ذرائع میں سے ایک اہم ترین ذریعہ تھی۔ قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام، اور حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے باقاعدہ اسلامی ریاست قائم کی اور اسے معیاری شکل میں چلایا۔

فکر اسلامی میں ریاست کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ خود خالق ارض و

سموات اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعا سکھاتا ہے کہ :

وَقُلْ رَبِّ أَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ
وَأَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَاجْعَلْ
لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا

اور (اے نبی) دعا کرو : اے پروردگار! مجھ کو جہاں بھی تو لے جا سچائی کے ساتھ لے جا، اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال اور اپنی طرف سے

(نبی اسرائیل - ۳۸) ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے۔

یہ آیت ہجرت نبوی سے کچھ پہلے نازل ہوئی تھی۔ اس تاریخی پس منظر میں اس کی اہمیت اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ اے اللہ! یا تو مجھے خود اقتدار عطا کر یا کسی حکومت کو میرا مددگار بنا دے تاکہ اس طاقت سے میں دنیا کے بگاڑ کو درست کر سکوں، برائیوں کے سیلاب کو روک سکوں، نیکیوں کو قائم کر سکوں اور تیرے قانون عدل کو جاری کر سکوں۔ اس آیت کی یہی تفسیر حسن بصری اور قتادہ نے کی ہے اور اسی کو ابن جریر اور ابن کثیر جیسے جلیل القدر مفسرین نے اختیار کیا ہے۔ اس کی تائید ان احادیث سے بھی ہوتی ہے:

ان الله ليزع بالسلطان مالا	اللہ تعالیٰ حکومت کی طاقت سے ان چیزوں کا
يزع بالقرآن (تفسیر ابن کثیر)	سد باب کر دیتا ہے جن کا سد باب قرآن سے نہیں کرتا
الاسلام والسلطان اخوان	اسلام اور حکومت و ریاست دو جڑواں
تو امان لا يصلح واحد منهما	بھائی ہیں۔ دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کے
الا لصاحبه فالاسلام اسس	بغیر درست نہیں ہو سکتا پس اسلام کی مثال ایک
والسلطان حارس ومالا	عمارت کی ہے اور حکومت گویا اس کی نگہبان
اسس له ليهدم وما حارس	ہے۔ جس عمارت کی بنیاد نہ ہو وہ گر جاتی ہے
له ضائع - (کنز العمال)	اور جس کا نگہبان نہ ہو وہ لوٹ لیا جاتا ہے۔

اسلام ایک قانون شہادت دیتا ہے۔ اس کا اپنا خود جہاد اور دیوانی قانون ہے۔

وہ تجارت اور معاملات کے لئے قانونی ہدایت دیتا ہے۔ وہ نکاح و طلاق، وراثت و وصیت، بیع و ہبہ کے لئے قوانین دیتا ہے۔ اگر حکومت و اقتدار اس کو حاصل نہ ہو تو اس کی شریعت کا ایک حصہ معطل، بے کار اور ناقابل عمل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسلام اور حکومت دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کے بغیر درست نہیں ہو سکتا۔

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دنیا میں ایک بہت بڑا کام اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ایک اہم مقصد حکومت الہی کا قائم کرنا اور دنیا میں آسمانی نظام سیاست و اخلاق و معاشرت کا جاری کرنا تھا۔ یہ نکتہ اچھی طرح سمجھنے کے لائق ہے کہ حکومت الہی کے قیام اور اسلامی نظام و قوانین و حدود کے اجراء اور ماحول کی تبدیلی کے بغیر اصلاح کی سب کوششیں کوہ کندن و کاہ بر آوردن ثابت ہوں گی۔ صرف چند خاص لوگوں کی اصلاح ہوگی، لیکن ضرورت فضا بدینے اور جبر مضبوط کرنے کی ہے۔ یہی وہ نقشہ ہے جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

علیہ وسلم نے کام کیا اور تجربہ یہ ہے کہ سب سے زیادہ اور پائدار کامیابی اسی کو ہوئی اور قیامت تک اسلام کی ترقی کا ضامن یہی نظام عمل ہو سکتا ہے۔

اسلام صرف خواص کا مذہب نہیں اور چند منتخب لوگوں کا اس پر عمل کرنا کافی نہیں۔ وہ زندگی کا نظام ہے۔ وہ زمانے کی فضا، طبیعت بشری کا مذاق اور سواد اعظم کا رنگ بدلنا چاہتا ہے اور عقائد کے ساتھ ساتھ اخلاق و معاشرت زندگی کے مقصد و معیار، زاویہ نظر اور انسانی ذہنیت کو بھی اپنے قالب میں ڈھالنا چاہتا ہے۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ اس کو مادی و سیاسی اقتدار حاصل ہو، صرف اسی کو قانون سازی اور تنفیذ کا حق ہو، اسی کے صحیح نمائندے دنیا کے لئے نمونہ ہوں۔ اسلام کے مادی اقتدار کا لازمی نتیجہ اس کا روحانی اقتدار اور صاحب اقتدار جماعت کے اخلاق و اعمال کی اشاعت ہے اس حقیقت کو قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے :

یہ مسلمان وہ ہیں کہ اگر ہم نے انہیں زمین میں صاحب اقتدار کر دیا (یعنی ان کا حکم چلنے لگا) تو وہ نماز قائم کریں گے، ادائے زکوٰۃ میں سرگرم ہوں گے، نیکیوں کا حکم دیں گے، براہیوں سے روکیں گے اور تمام باتوں کا انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ ہے۔

الَّذِينَ اِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوْا الزَّكَاةَ وَآمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ اُولَٰئِكَ عَاقِبَةُ الْاُمُورِ (الحج - ۴۱)

امر بالمعروف ونہی عن المنکر اسلام میں جس قدر اہم فریضہ ہے وہ اس سے ظاہر ہے کہ امت مسلمہ کے برپا کرنے کا مقصد یہی بتایا گیا کہ :

تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی اصلاح) کے لئے میدان میں لائی گئی ہے، تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران - ۱۱۰)

اور قیامت تک کے لئے مسلمانوں کا یہی فرض قرار دیا گیا ہے :

تمہیں ایک ایسی امت بننی چاہیے جو بھلائی کی طرف دعوت دیتی ہے، نیکی کا حکم کرتی رہے اور برائی سے روکتی رہے۔

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ اُمَّةٌ يَدْعُونَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران - ۱۰۴)

لیکن یہ یاد رہے کہ اس کے لئے امر (حکم) اور نہی (دھمکت) کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ اہل علم جانتے ہیں کہ امر و نہی کے لفظ میں اقتدار اور حکم کی شان ہے۔ یہ نہیں فرمایا گیا کہ وہ بھلائی اختیار کرنے کی درخواست و عرض کریں گے اور برائی سے باز رہنے کی التجا

کریں گے۔ پس امر وہی کے لئے سیاسی اقتدار اور مادی قوت کی ضرورت ہے اور امت کا فریضہ ہے کہ وہ اس کا انتظام کرے صحیحین کی مشہور حدیث ہے:

من رأى منكم منكراً فليغيره بيده فان لم يستطع فليسانه فان لم يستطع فليقلبه و ذلك اضعف الایمان۔

(صحیح بخاری و مسلم)

ظاہر ہے کہ ”تغییر باید“ (ہاتھ سے بدل دینے اور عملی اصلاح) کے لئے قوت و اختیار کی ضرورت ہے۔ زبان سے روکنے کے لئے بھی کچھ قدرت اور آزادی کی ضرورت ہے۔ اگر یہ کچھ نہیں تو میرے درجے پر قناعت کرنی پڑے گی جو ایمان کا آخری درجہ ہے اور جس کے بعد بعض روایات کے مطابق ”ایک ذرہ برابر بھی ایمان نہیں رہ جاتا“ مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ غلامی میں بدی کو دل سے پراسمھنا اور زشت و نیک کا بھی احساس بھی جاتا رہتا ہے۔

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا

کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی فطرت اس بات کا مطالبہ کرتی ہے اور قرآن و حدیث کے نصوص اس امر کا تقاضا کرتے ہیں کہ اسلام کی سر بلندی کے لئے آزاد فضا حاصل کی جائے اور ریاست اور حکومت کو دین کے فروغ اور اسلام کے بتائے ہوئے مقاصد حیات کے لئے ان حدود میں رہ کر استعمال کیا جائے جو قرآن و سنت نے متعین کر دی ہیں۔ جو ریاست ان مقاصد کے حصول کے لئے کوشش کرے وہ اسلامی ریاست ہے اور ایسی ریاست کے قیام کے بغیر اسلام کا نصب العین نامکمل رہے گا۔ خود پاکستان کے قیام کی جدوجہد بھی مسلمانوں کے اسی احساس کا نتیجہ تھی کہ ان کی ایسی ریاست ہوئی چاہیے جہاں وہ اپنے عقائد و تصورات اور اپنے قانون حیات کے مطابق اپنی زندگی گزار سکیں۔

فقہ کے ایک بنیادی مسئلہ سے بھی اس پر روشنی پڑتی ہے۔ اسلامی فکر کے تمام مکاتب فکر اس امر پر متفق ہیں کہ ملت اسلامیہ کے لئے منصب امامت لازمی ہے۔ خلیفہ اور امام کا تقرر واجب ہے کیوں کہ نظم ملت، قیام امن، حصول نفع و دفع ضرر اور نفاذ احکام شریعت، امامت و خلافت کے قیام کے بغیر ممکن نہیں۔ علامہ ابن حزم اپنی کتاب ”الفصل بین الملک والخل“ میں لکھتے ہیں :-

کل اہل سنت، مرجئہ، شیعہ، خوارج سب کا اتفاق ہے کہ نصب امام واجب ہے اور یہ کہ امت پر ایسے امام عادل کی احکام واجب ہے جو اللہ تعالیٰ کے احکام قائم کرے اور ان احکام شریعت کے مطابق ان کا سیاسی نظام قائم کرے جو بنی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کرائے ہیں۔

اتفق جميع اهل السنة وجميع الموحية وجميع الشيعة وجميع الخوارج على وجوب الامامة وان الامة واجب عليها الانقياد لامام عادل يقيم احكام الله و يسوسهم باحكام الشريعة التي اتى بها رسول الله صلى الله عليه وسلم (الفصل ابن حزم ج ۴ ص ۸۷)

اور شاہ ولی اللہ رقمطراز ہیں:

”مسلمانوں پر جامع شرائط خلیفہ کا مقرر کرنا واجب بالکفایہ ہے اور یہ حکم قیامت تک کے لئے ہے“ (ازالۃ الخفاء فصل اول)

یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر پوری امت کا اجماع ہے۔ تمام فرقے اس پر متفق ہیں۔ اختلاف اگر ہے تو تقرر و انتخاب کی تفصیل و جزئیات میں یا اس کے طریق و شرائط میں ہے لیکن نصب امامت کے وجوب پر کوئی اختلاف نہیں۔ یہ سب کی نگاہ میں لازمی اور ضروری ہے۔

ہماری اب تک کی بحث سے یہ نتائج نکلتے ہیں:

(۱) ریاست کا ادارہ انسانی سماج کی ایک بنیادی ضرورت ہے اور اس کے بغیر منظم اجتماعی زندگی کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

(۲) اسلام انسان کی پوری زندگی کے لئے ہدایت ہے اور اس نے اجتماعی زندگی کے لئے بھی واضح رہنمائی دی ہے۔

(۳) اسلام دین و سیاست میں کسی تفریق کا روادار نہیں۔ وہ پوری زندگی کو خدا کے قانون کے تابع کرنا چاہتا ہے اور اس مقصد کے لئے سیاست کو بھی اسلامی اصولوں پر مرتب کرتا ہے اور ریاست کو اسلام کے قیام اور اس کے استحکام کے لئے استعمال کرتا ہے۔

(۴) یہ روش دنیا و آخرت دونوں میں عتاب الہی کی موجب ہے کہ کچھ احکام الہی کو تسلیم کر کے اس پر عمل کیا جائے اور کچھ دوسرے اسلامی احکام سے صرف نظر اور روگردانی اختیار کی جائے، خواہ خواہش نفس کی اندرونی وحشت کی بناء پر یا کسی

بیرونی دباؤ یا مرعوبیت کی بناء پر۔

(۵) اسلام اور ریاست و حکومت کا اتنا قریبی تعلق ہے اور یہ ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہیں کہ اگر ریاست و حکومت اسلام کے بغیر ہوں تو وہ ظلم اور بے انصافی کا ذریعہ بن جاتی ہیں اور ان کے نتیجے میں ”چنگیزی“ رونما ہوتی ہے۔ اور اگر اسلام ریاست و حکومت کے بغیر ہو تو اس کے ایک حصہ پر عمل ہی ممکن نہیں رہتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ ریاست کو اسلامی بنیادوں پر قائم کیا جائے اور حکومت اسلام کی پابند ہو اور اس کے قیام کے لئے سرگرم عمل رہے۔

۵۔ اسلام کے اصولِ عمرانی

۱۔ اصولی اور نظریاتی ریاست

اسلامی ریاست کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک اصولی اور نظریاتی ریاست ہے۔ اس ریاست کی بنیاد نہ نسل پرستی اور نہ رنگ پرستی اور نہ زبان پرستی اور نہ وطن پرستی نہ محض معاشی مفاد کا اشتراک اس کی اساس ہے اور نہ محض سیاسی الحاق۔ اس ریاست کی اصل بنیاد یہ ہے کہ یہ اسلامی نظریہٴ حیات کی علمبردار، اس کی تابع اور اس کو قائم کرنے والی ہے۔ جو ریاست خدا کی سیاسی حاکمیت کا اعلان کرے اور اس کے قانون کو نافذ کرنے والی بنے وہ اسلامی ریاست ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہر ریاست کی طرح اسلامی ریاست کے لئے بھی ایک متعین علاقہ اور آبادی ہونا ضروری ہے، اور اس سرزمین کی حفاظت اس کے رہنے والوں کی فلاح و بہبود ہر لمحہ اس کے سامنے رہتی ہے لیکن اسلامی ریاست کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک نظریاتی ریاست ہے اور ایک ایسے اصول کی داعی ہے جو تمام انسانوں کے لئے یکساں ہے۔

سورہ حج اس آیت پر مشتمل ہے جس میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

یہ مسلمان وہ ہیں کہ اگر تم نے انہیں زمین میں صاحب اقتدار کر دیا تو وہ نماز قائم کریں گے، ادائے زکوٰۃ میں سرگرم رہیں گے، نیکیوں کا حکم دیں گے
برائیوں سے روکیں گے اور تمام باتوں کا انجام کار خدا کے ہاتھ میں ہے (الحج - ۴۱)

اور ایک دوسری جگہ ارشاد الہی ہے کہ

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ
وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ
لِيَقُومُوا لِلنَّاسِ بِالْقِسْطِ ۚ وَأَنزَلْنَا
الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ
لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ
وَرُسُلَهُ بِالْغَيْبِ (الحديد - ۲۵)

ہم نے اپنے رسول واضح نشانیاں دے کر بھیجیں اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان (عدل) اتاری تاکہ انسان انصاف پر قائم رہیں اور ہم نے اُتار لوہا (ریاست کی قوت و جبروت) جس میں سخت خطرہ ہے اور لوگوں کے لئے بہت فوائد بھی ہیں تاکہ اللہ جان لے کہ کون اس (کے دین) کی اور اس رسولوں کی بن دیکھے

مدد کرتا ہے۔

اسی طرح سورۃ النور میں ارشاد ہوا ہے کہ:

تم میں جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو زمین میں حکومت عطا فرمائے گا، جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی تھی اور جس دین کو اس نے ان کیلئے پسند کیا ہے اس کو ان کیلئے قوت دے گا اور خوف و ہراس کے بعد ان کو امن بخشنے گا۔ وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کریں گے اور جو اس کے بعد نافرمانی کی روش اختیار کریں گے وہ وہ فاسق ہیں اور (مے مسلمانوں) نماز قائم کرو، اور زکوٰۃ کی ادائیگی کرتے رہو اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۖ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا ۚ يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا ۚ وَمَن كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ۝ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاطِيعُوا الرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ۝

(النور - ۵۵-۵۶)

ان آیات سے معلوم ہوا کہ اسلام میں حکومت کا مقصد دین کو قائم کرنا، خدا کی کتاب کے مطابق انصاف قائم کرنا، نیکیوں کا حکم دینا اور برائیوں سے روکنا ہے۔ یہ ریاست ایک نظریاتی اور مقصدی ریاست ہے اور اس کی اصل ذمہ داری اس اصول کی سر بلندی ہے جیسے قائم کرنے کے لئے یہ وجود میں لائی جاتی ہے۔

اسلام میں قانون حکومت و ریاست پر فوقیت رکھتا ہے اور خود حکومت خدا کے قانون کی پابند اور اس کے تابع ہوتی ہے۔ ریاست کئی اختیارات کی حامل نہیں بلکہ یہ اپنے اختیارات خدا کے قانون سے حاصل کرتی ہے اور اس کی پابند و ماتحت ہے۔ اس میں اصول اطاعت یہ ہے کہ خدا اور اس کے رسول کی اطاعت ہر اطاعت پر بلند و بالا ہے۔ بشرط خاص کی بنیادی و فاداری شریعت سے ہے۔ ریاست کی وفاداری اسی وقت تک ہے جب تک وہ خدا اور اس کے رسول کی وفادار ہے اور اگر وہ ان کی بے وفائی کرے تو مسلمان ہرگز اس کی اطاعت کے پابند نہیں ہیں۔ اس اصول کو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

لے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی، اور اطاعت کرو رسول کی، اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں، پھر اگر تمہارے درمیان

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِيَ الْأَمْرِ مِنكُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ

إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ
بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ
(النساء - ۵۹)

کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف پھیر دو، اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔

اس آیت ربانی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ:
۱۔ اصل اطاعت اللہ اور اس کے رسول کی ہے۔ مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا مرکز و محور خدا اور اس کے رسول کی فرماں برداری اور وفاداری ہے۔ دوسری اطاعتیں صرف اس صورت میں قابل قبول ہوں گی جب وہ خدا اور رسول کی اطاعت کے تحت اور تابع ہوں۔ خدا اور رسول کے احکام کے علی الرغم کسی کی اطاعت جائز نہیں۔ اسی حقیقت کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح واضح فرمایا ہے کہ:
لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کے لئے کوئی اطاعت نہیں۔

۲۔ مسلمانوں کے اولی الامر یعنی وہ اصحاب اقتدار جنہیں فیصلہ کن اختیارات حاصل ہوں اور جو ریاست کی بنیادی پالیسی بنائیں، مسلمانوں ہی میں سے ہونے چاہئیں۔ ”مَنْكُم“ (تم میں سے) کا اشارہ اسی حقیقت کی طرف ہے۔ اس لئے اسلامی ریاست کے کلیدی مناصب انہی افراد کے پاس ہونے چاہئیں جو مسلمان ہیں۔

۳۔ اولی الامر کی اطاعت اور ان کی فرماں برداری مسلمانوں کے لئے ضروری کی گئی ہے تاکہ زندگی کا نظام بحسن و خوبی چلے اور بے وجہ اس میں اختلال واقع نہ ہو۔ لیکن اولی الامر کی یہ اطاعت خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کے تابع ہے اگر وہ کوئی ایسا حکم دیں جو قرآن و سنت کے خلاف ہو تو اس کی اطاعت نہیں کی جاسکتی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

”مسلمان کو لازم ہے کہ اپنے اولی الامر کی بات سنے اور مانے خواہ اسے پسند ہو یا ناپسند ہو۔ تاوقتیکہ اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے۔ اور جب اسے معصیت کا حکم دیا جائے تو پھر اسے نہ سنا چاہیئے اور نہ ماننا چاہیئے“

(بخاری و مسلم)

۴۔ اولی الامر سے بحث و مذاکرہ، ان سے اختلاف اور ان پر تنقید و محاسبہ کی اجازت اور ضمانت بھی یہ آیت دیتی ہے، ہمیں حق دیا گیا ہے کہ ان سے اختلاف کریں اور بالآخر فیصلہ صرف خدا اور اس کے رسول کے احکام کے مطابق ہو، لیکن یہ تنقید

اور اختلاف حدود قانون میں رہتے ہوئے ہونا چاہیئے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

”تم پر ایسے لوگ بھی حکومت کریں گے جن کی بعض باتوں کو تم معروف پاؤ گے اور بعض کو منکر۔ تو جس نے ان کے منکرات پر اظہار ناراضگی کیا وہ بری اللہ ہوگا اور جس نے ان کو ناپسند کیا وہ بھی پچ گیا مگر جو ان پر راضی ہوگا اور پیروی کرنے لگا وہ ماخوذ ہوگا۔“ (مسلم)

یہ اصول وفاداری اس بات کو بالکل واضح کر دیتا ہے کہ اسلامی ریاست ایک اصولی اور نظریاتی ریاست ہے۔ اس کا مقصد ایک نظریئے کو سر بلند کرنا ہے اور اس میں اطاعت ایک اصول کی ہے محض اقتدار کی نہیں۔

اسلامی ریاست کے اصولی اور نظریاتی ہونے سے چند امور پر مزید روشنی پڑتی ہے: د اول اسلام میں ریاست خود ایک مقصد نہیں بلکہ ایک اعلیٰ تر مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اس طرح یہ فاسشت ریاست سے بالکل مختلف ہے، جہاں ریاست خود مقصد بن جاتی ہے اور فرد کی کوئی مستقل بالذات حیثیت نہیں رہتی۔ اسلامی ریاست کا مقصد افراد کو وہ مواقع فراہم کرنا ہے جن کے ذریعے وہ خدا اور اس کے رسول کے احکام کو پورا کر سکیں۔ یہ ریاست خود اس بالاتر قانون کی تابع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ”انا اول المسلمین“ (میں اطاعت الہی کرنے والوں میں سب سے پہلا ہوں) اور اسلام کا قانون سربراہ مملکت پر بھی اسی طرح لاگو ہوتا ہے جس طرح ایک عام شہری پر۔

(ب) اسلامی ریاست ایک لادینی قومی ریاست سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ لادینی ریاست وہ ریاست ہے جو اپنے معاملات اور مسلک کو مذہب اور الہامی ہدایت پر مبنی کرنے کے بجائے محض عقل و مصالحت سے اپنا کام چلاتی ہے اور کسی بالاتر قانون کی پابند نہیں ہوتی۔ ایسی ریاست مذہب کے معاملے میں غیر جانبدار بھی ہو سکتی ہے اور اجتماعی معاملات میں اس کی مخالف بھی۔ ایسی ریاست اسلام کی بالکل ضد ہے۔ اسلام دنیاوی معاملات کی اصلاح چاہتا ہے لیکن خدا کی ہدایت سے بے نیاز ہو کر نہیں بلکہ اس کی روشنی میں۔

۲۔ شُرانی اور جمہوری ریاست | اسلامی ریاست کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک شُرانی اور جمہوری ریاست

ہے، اس میں تمام انسان برابر ہیں اور رنگ، نسل، نسب کسی کی بنیاد پر کسی خاص گروہ کو کوئی تفوق حاصل نہیں۔ وحدت آدم اور انسانی مساوات اس کے بنیادی اصول ہیں قیادت کی ذمہ داری ان لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو پوری ملت کے معتمد علیہ ہوں۔ ارباب امر تمام امور سلطنت میں بنیادی پالیسی یا ہم مشورہ سے طے کرتے ہیں اور نظام حکومت کو جمہور کی مرضی کے مطابق چلاتے ہیں۔ نیز تمام شہریوں کے بنیادی حقوق اور ان کی ذمہ داریاں متعین ہیں حکومت خدا اور اس کے رسول کی طرف سے ان حقوق کی ادائیگی کی ذمہ دار ہے اور ان میں کوئی دخل اندازی نہیں کر سکتی۔ اسلامی ریاست کا مزاج نہ آمریت کو گوارا کر سکتا ہے اور نہ موروٹی شہنشاہیت کو۔ اس کا مزاج خالص جمہوری اور شورائی مزاج ہے۔

اسلامی جمہوریت کی پہلی بنیاد انسانی مساوات ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

خدا نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور دونوں سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو دنیا میں پھیلادیا۔ لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو گروہ و قبائل بنا دیا تاکہ تم آپس میں پہچانے جاؤ۔ مگر درحقیقت معزز تو تم میں وہی ہیں جو زیادہ پرہیزگار ہے۔ اور ہم نے اولاد آدم کو صاحب عزت بنا دیا۔

خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً۔ (النساء - ۱)
يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ۔ (الحجرات - ۱۳)
وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ (بنی اسرائیل - ۸۰)

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

اے ہمارے اور ہر چیز کے رب! میں گواہی دیتا ہوں کہ سارے انسان بھائی بھائی ہیں۔

اللھم ربنا ورب کل شیء
انا شہید ان العباد کلھم اخوة
(داحمد اور ابو داؤد)

فتح مکہ کے بعد جو خطبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا، وہ یہ تھا :

”خوب سن رکھو کہ فخر و ناز کا ہر سرمایہ، خون اور مال کا ہر دعویٰ آج میرے قدموں کے نیچے ہے۔ اے اہل قریش! اللہ نے تمہاری جاہلیت و نخوت اور باپ دادا کی بزرگی کے ناز کو دور کر دیا۔ اے لوگو! تم سب

آدم (علیہ السلام) سے ہو اور آدم مٹی سے تھے۔ نسب کے لئے کوئی فخر نہیں ہے۔
عربی کو عجمی پر عجمی کو عربی پر کوئی فخر نہیں۔ تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے
جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔“

قانون کی نگاہ میں سب برابر ہیں اور حاکم اور محکوم، صاحبِ امر اور مامور میں
اسلام کوئی تمیز نہیں کرتا۔ قانون سب کے لئے ایک ہی ہے۔ ایک بار ایک معزز خاتون
کو چوری کی سزا میں قطعِ يد کی سزا دی جانے والی تھی۔ کچھ صحابہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم
سے سفارش کی۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سفارش کو غصہ سے رد کر دیا اور فرمایا:
والذی نفس محمد بیدہ لو | اس ذات کی قسم جس کی مٹھی میں محمد کی جان
سرقتِ فاطمہ بنت محمد | ہے اگر فاطمہ بنت محمد نے بھی چوری کی ہوتی تو
لقطعت یدھا۔ (مسلم) | میں اس کا بھی ہاتھ ضرور کاٹ دیتا۔

یہ ہے وہ معیاری قانون اور معاشرتی مساوات جس کا تصور کیا جاسکتا ہے۔
اسلامی جمہوریت کی دوسری بنیاد ارباب اختیار کا معتمد علیہ ہونا ہے یعنی یہ کہ
ریاست کی ذمہ داریاں ان کو سونپی جائیں جو اس کام کے اہل ہوں اور جن پر لوگوں کو
اعتماد ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

”تمہارے بہترین امام اور قائد وہ ہیں جن کو تم چاہتے ہو اور وہ تم کو
چاہتے ہو اور تم ان کو دعائیں دیتے ہو اور وہ تم کو دعائیں دیتے ہوں۔
اور تم میں بدترین رہنما وہ ہیں جن کو تم ناپسند کرتے ہو اور وہ تم کو
ناپسند کرتے ہوں اور وہ تم پر رحمت بھیجتے ہوں اور تم ان پر لعنت
بھیجتے ہو۔“ (مسلم)

اربابِ امر کے معتمد علیہ ہونے پر مسلمانوں کے تمام مکاتب و فکری متفق ہیں، البتہ
ان کا انتخاب کیوں کر ہو، خصوصیت سے امیر یا خلیفہ کا، اس پر اختلاف رائے پایا جاتا
ہے۔ شیعہ نظریۂ خلافت یہ ہے کہ خاندانِ نبوت کے سوا کوئی شخص خلافت کا اہل نہیں اور
امامت و خلافت اللہ کی طرف سے مخصوص ہوتی ہیں اس لئے انتخاب کا سوال نہیں۔ قرعہ
زید یہ انتخاب کے اصول کو مانتا ہے لیکن دائرہ استحقاق کو محدود رکھتا ہے۔ خوارج کا
خیال تھا کہ ہر پاک سیرت مسلمان خلافت کا اہل ہے۔ البتہ عام حالات میں خلیفہ کو معزول
کرنا جائز نہیں۔ معتزلہ ہر فرد کو خلافت کا اہل سمجھتے تھے۔ اہل سنت عمومی خلافت کے

قائل ہیں البتہ خلیفہ کے لئے علم و اجتہاد، اخلاق فاضلہ، سیاسی تدبیر، فنون حرب میں مہارت وغیرہ کی شرائط مقرر کرتے ہیں۔ طریق انتخاب پر اختلاف کے باوجود تمام مکاتب فکر کے سیاسی نظریات میں ارباب امر کا معتمد علیہ ہونا مشترک نظر آتا ہے۔

(الاحکام السلطانیہ للمارودی)

اسلامی جمہوریت کی تیسری بنیاد شوریٰ ہے یعنی مسلمانوں کے یہ معتمد علیہ افراد تمام امور سلطنت کو خدا اور اس کے رسول کے احکام کے مطابق مسلمانوں کے مشورہ کی روشنی میں طے کریں، اللہ تعالیٰ خود اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے فرماتا ہے:

وَسَأَوْدُهُمْ فِي الْأُمُورِ (آل عمران - ۱۵۹) (اور ان سے معاملات میں مشورہ کرو)

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ شہادت دیتے ہیں کہ

ما رأيت أحداً أكثر مشورة
لأصحابه من النبي صلى الله عليه
وسلم - (بخاری و مسلم)

میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر
کسی کو اپنے اصحاب سے مشورہ کرنے والا
کوئی نہیں دیکھا۔

عام اولی الامر کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ (الشوری - ۳۸) (اور ان کے امور آپ کے مشورہ سے طے ہوتے ہیں)

خطیب بغدادی حضرت علیؑ سے یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ:

”میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ کے بعد کوئی معاملہ ایسا پیش آجائے جس کے متعلق نہ قرآن میں کچھ اترا ہو اور نہ آپ سے کوئی بات سنی گئی ہو تو ہم کیا کریں؟ آپ نے فرمایا میری امت میں سے عبادت گزار اور اعانت شعار لوگوں کو جمع کرو اور اسے آپس کے مشورہ کے لئے رکھ دو، اور کسی ایک شخص کی رائے پر فیصلہ نہ کرو“ (روح المعانی)

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ایک دوسری حدیث میں اسلامی معاشرے کی صحیح حالت کا نقشہ اس طرح بیان فرمایا گیا ہے:

”جب تمہارے حکام تم میں نیک اور صالح ہوں، تمہارے اہل ثروت تم میں فیاض ہوں اور تمہارے امور باہم مشورے سے طے ہوں“ (صحاح بیہق)

اس نے علمائے قانون نے یہ کہا ہے کہ شوریٰ اسلامی نظام کی روح اور اس کا ایک لازمی جزو ہے۔ چھٹی صدی ہجری کے مشہور عالم قانون عبدالحق بن غالب بن عطیہ لکھتے ہیں:

ان الشوریٰ ہی من قواعد الشریعہ | شوریٰ شریعت کے قوانین اور محکم احکام
وعنائم الاحکام۔ (بسانی۔ جلد اول) | میں سے ہے۔

مشاورت کا یہ حکم ہر اہم معاملے اور اس کی ہر منزل کے لئے ہے۔ اس کی شکل کیا ہو؟
اس کا تعین ہر زمانے کے حالات کے مطابق کیا جائے گا۔ لیکن اس کی روح یہ ہے کہ مشورہ
ان لوگوں سے کیا جائے جو اہل حل و عقد ہوں، فہم و بصیرت رکھتے ہوں اور لوگوں کے معتد
علیہ ہوں۔ مسلمانوں کے تمام اجتماعی کام مشورے سے طے ہوں اور کوئی شخص اپنی من مانی
نہ کرے۔ کوئی اجتماعی کام جتنے لوگوں سے متعلق ہو مشورہ میں ان سب کو یا ان کے نمائندوں
کو شریک کیا جائے اور مشورہ آزادانہ، بے لاگ اور مخلصانہ ہو، اگر یہ چیزیں موجود ہوں
تو شوریٰ کا حق ادا ہو جاتا ہے خواہ اس کی شکل کوئی بھی تجویز کی جائے۔

اسلامی جمہوریت کی آخری بنیاد شہریوں کے حقوق و فرائض کا تعین ہے اور ان
حقوق میں در اندازی کا حق کسی کو نہیں ہے۔ یہ تمام حقوق خدا اور اس کے رسول صلی اللہ
علیہ وسلم کے عطا کردہ ہیں اور کسی شرعی دلیل یا حق کے بغیر ان میں سے کسی پر کوئی
پابندی نہیں لگائی جاسکتی یا ان میں کوئی رد و بدل نہیں ہو سکتا۔

اسلامی ریاست اپنے شہریوں کی دو قسمیں کرتی ہے: مسلمان شہری اور غیر مسلم شہری۔
غیر مسلم شہریوں کو تمام بنیادی انسانی حقوق حاصل ہیں، انہیں مکمل مذہبی اور ثقافتی آزادی
حاصل ہے۔ البتہ انہیں یہ حق حاصل نہیں کہ نظریاتی مملکت کے کلیدی مناصب پر فائز
ہو سکیں، اور اسی کی مناسبت سے ان کی ذمہ داریاں بھی کم ہیں۔

اسلامی ریاست کے شہریوں کو یہ حقوق حاصل ہیں:-

(۱) جان و مال اور ناموس کی حفاظت۔ یعنی ریاست ضمانت دیتی ہے
کہ اپنے شہریوں کے جان و مال اور ناموس پر نہ خود ہاتھ ڈالے گی اور نہ کسی اور کو
ڈالنے دے گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

فذلک المسلم الذی لہ ذمۃ | پس یہ وہ مسلم ہے جس کی جان و مال کی
اللہ ورسولہ فلا تخفروا اللہ | حفاظت کا ذمہ اللہ نے لیا ہے۔ تو خبردار
فی ذمۃ (بخاری) | اللہ کیساتھ اس کی دی ہوئی ضمانت میں
غدری نہ کرو۔

کل المسلم علی المسلم حرام دمہ | مسلمان کی ہر چیز مسلمان پر حرام ہے، اس کا خون
ومالہ وعرضہ (مسلم) | بھی، اس کا مال بھی اور اس کی آبرو بھی۔

اسی طرح غیر مسلم شہریوں کے باب میں بھی اصول یہ ہے: جو کوئی ہمارا ذمی ہو اس کا خون ہمارے خون کی طرح اور اس کی دیت ہماری دیت کی طرح اور ان کا مال ہمارے مال کی طرح ہوں گے۔

اسی طرح تمام شہریوں کی ذاتی ملکیت کی ضمانت دی گئی ہے اور بقول فتاویٰ ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ اصول یہ ہے کہ:

ولیس للامام ان ینخرج شیئاً من احدی الا بحق ثابت معروف۔ (کتاب الخراج - صفحہ ۳۷)	امام (حکومت) کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی ثابت شدہ قانونی حق کے بغیر کسی شخص کے قصہ سے اس کی کوئی شے نکالے
--	---

(۲) شخصی آزادی۔ ہر شخص کی انفرادی آزادی محفوظ ہوگی اور اسے یہ ضمانت اس وقت تک حاصل رہے گی جب تک وہ اپنی آزادی کو دوسروں کی آزادی کے سلب کرنے یا جماعت کے کسی حقیقی مفاد کو نقصان پہنچانے یا خطرے میں ڈالنے کے لئے استعمال نہیں کرتا۔

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبے کے دوران ایک شخص نے اپنے ہمسایوں کے بارے میں پوچھا جو شے کی بنا پر گرفتار کر لئے گئے تھے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دو مرتبہ سوال سن کر سکوت فرمایا تاکہ اگر گرفتاری کی کوئی معقول وجہ ہو تو معلوم ہو جائے اور جب کوئی چیز سامنے نہ آئی تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا:

خلوا له جيرانه۔ (ابوداؤد)	اس کے ہمسایوں کو رہا کر دو۔
---------------------------	-----------------------------

اسلام کا یہ اصول ہے کہ

لا یوسر رجل فی الاسلام بغیر عدل (موطأ)	اسلام میں کوئی شخص بغیر عدل کے قید نہیں کیا جاسکتا۔
---	--

(۳) رائے اور مسلک کی آزادی۔ اسلام ہر شخص کو اپنی آزاد رائے رکھنے کی اجازت دیتا ہے بشرطیکہ وہ اختلاف رائے کو خون ریزی اور فتنہ و فساد کا ذریعہ نہ بنا لے۔ اس کی بہترین مثال وہ رویہ ہے جو حضرت علیؑ نے خوارج کے مقابلے میں اختیار فرمایا جو ریاست کے وجود ہی کی نفی کرتے تھے۔

حضرت علیؑ نے ان کو پیغام بھیجا کہ:

”تم جہاں چاہو رہو، اور ہمارے اور تمہارے درمیان شرط یہ ہے کہ تم خون ریزی اور رہزنی نہ اختیار کرو اور ظلم سے باز رہو“ (نسب الاوطار جلد ۲ صفحہ ۱۳۹)

اسلام ہرگز پسند نہیں کرتا کہ دین کے معاملہ میں جبر و اکراہ سے کام لیا جائے۔

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ (البقرہ-۲۵۶) | دین کے معاملہ میں زبردستی نہیں۔

(۴) قانونی مساوات۔ یعنی تمام شہری خواہ امیر ہوں یا غریب، سیاہ ہوں، یا سفید، صاحب امر ہوں یا مامور قانون کی نگاہ میں برابر ہوں گے اور سب پر ایک ہی قانون لاگو ہوگا۔

(۵) معاشرتی مساوات۔ یعنی خون، رنگ، نسب، زبان، پیشہ، معاشی مقام وغیرہ کی بنا پر شہریوں کے درمیان کوئی امتیاز نہیں برتا جائے گا۔ سب برابر ہیں۔ عزت و شرف اگر ہے تو صرف علم و تقویٰ کی بنا پر۔

(۶) بے لاگ اور بے معاوضہ انصاف۔ یعنی اسلامی ریاست ہر شہری کو ہر قسم کے ظلم و زیادتی سے بچائے گی اور حصول انصاف کا انتظام بلا کسی معاوضہ کے کرے گی۔

(۷) فریاد، اعتراض اور تنقید کا حق۔ تمام شہریوں کو یہ حق حاصل ہوگا کہ پوری آزادی کے ساتھ اپنی بات ارباب اختیار تک پہنچائیں، اپنی مجبوریاں اور مسائل ان کو بتائیں ان کی پالیسیوں پر اعتراض اور تنقید کریں۔ ان کی بات سنیں اور انہیں اپنی بات سنائیں۔

(۸) اجتماع، تنظیم بندی اور نقل و حرکت کی آزادی۔ انہیں یہ حق بھی حاصل ہوگا کہ منظم و مجتمع ہو کر کام کریں اور ملازمت لوگ ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہوں۔

ان حقوق کے مقابلے میں شہریوں کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ہر صحیح بات کو قبول کریں اور اطاعت کریں۔ معروف میں عدم اطاعت کی روش اسلامی کے مزاج کے منافی ہے۔ اسی طرح ان پر ذمہ داری ہے کہ وہ ریاست کی خیر خواہی کریں۔ یعنی دیدہ و دانستہ ایسا کام نہ کریں جو ریاست کو نقصان پہنچانے والا ہو۔ تنہائی سرگرمیوں سے خود بھی کلی طور پر محترزمیں اور دوسروں کو بھی نہ کرنے دیں نیز یہ بھی خیر خواہی ہی کا ایک پہلو ہے کہ امور ریاست پر نگاہ رکھیں اور حکومت یا اس کے کارکنوں کو خدا کے راستے سے ہٹنے نہ دیں، اور اگر کوئی انحراف واقع ہو تو اس کو روکیں، ہاتھ اور زبان دونوں سے۔ اسلامی ریاست کے شہریوں پر یہ بھی حق ہے کہ وہ اس سے تعاون کریں اور اس کی خاطر مالی اور اگر ضرورت ہو تو خود جان کی قربانی پیش کریں۔

مندرجہ بالا چار بنیادوں پر اسلام کا جمہوری نظام قائم ہے۔

۳۔ فلاحی ریاست | اسلامی ریاست کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک فلاحی اور خادم خلق ریاست ہے۔ اسلام کی نگاہ میں حکومت کا کام

صرف یہ نہیں ہے کہ امن و امان قائم کرے اور ملکی دفاع کی خدمات انجام دے، بلکہ اس کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں حقیقی اور فطری مساوات قائم کرے، ان تمام

رکا و ٹور، کو دور کرے جو سعی و جہد کی مساوات کی راہ میں حائل ہیں اور اپنے تمام شہریوں کی خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، بنیادی ضروریات کی فراہمی کی ضمانت دے۔ اگر اسلامی ریاست کی حدود میں کہیں بھی فقر و فاقہ، غربت و افلاس ہے، ظلم و جور ہے، تو اس کا قلع قمع کرے اور اپنی تمام قوتیں ان انسانی مسائل کو حل کرنے کے لئے وقف کر دے۔ اسلام ریاست کا محض ایک منفی تصور نہیں رکھتا۔ اس کی قائم کردہ ریاست ایک مثبت ریاست ہے جو قیام انصاف اور ادائیگی حقوق کے ایجابی کام انجام دیتی ہے۔

معاشی زندگی کے بارے میں اسلام نے یہ اصولی ہدایت دی ہے کہ اسلامی معاشرے اور حکومت کا فرض ہے کہ وہ افلاس اور غربت کو مٹانے میں اس طرح سرگرم رہیں جس طرح کفر کی ظلمتوں کو دور کرنے میں ہوں۔ بنی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ”فقر انسان کو کفر کی طرف لے جاسکتا ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی کہ ”اے اللہ! مجھے کفر اور فقر دونوں سے محفوظ رکھ“

اسلام ہر فرد میں معاشی جدوجہد کا جذبہ پیدا کرتا ہے اور اسے دعوت دیتا ہے کہ اپنی محنت سے روزی حاصل کرے۔ محنت کی روزی اور پاک اور طیب کمائی پر قرآن و حدیث میں غیر معمولی زور دیا گیا ہے۔

اسلام نے انفرادی ملکیت کا حق دیا ہے اور انفرادی سعی و جہد کے دروازے سب کے لئے کھول دیئے ہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرنے کا اہتمام بھی کیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ تصور بھی پیدا کیا ہے کہ یہ ملکیت ایک امانت کی طرح ہے، جسے جائز اور صحیح راستوں ہی پر صرف کرنے کا اختیار ہے۔ اگر غلط اور حرام طریقوں سے خرچ کیا جائے گا تو امانت میں خیانت ہوگی۔ فرد کا اختیار محدود ہے غیر محدود نہیں۔ نیز ہر شخص کی دولت میں اس کے اپنے حق کے علاوہ خدا اور اس کے بندوں کا حق بھی ہے۔ ضروری ہے کہ ہر شخص اپنی جائز ضرورتوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ ریاست اور دوسرے انسانوں کے حقوق کو بھی ادا کرے اور اپنے وسائل کو ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے صرف کرے۔ جو دولت کو جمع کرتے ہیں اور انسانی بہبود کے لئے اسے خرچ نہیں کرتے یا اس میں سے دوسروں کے حقوق نہیں نکالتے، ان کے لئے سخت ترین وعید آئی ہے۔ ہر صاحب نصاب مسلمان پر زکوٰۃ فرض کی گئی ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ:

تَوَخَّذْ مِنْ أَغْنِيَاءِ هَرَقْدِ عَلٰی
فَقْرَاءِ هُمْ۔ (بخاری و مسلم)

ان کے مالداروں سے لی جائے گی اور ان کے
غناہوں میں تقسیم کر دی جائے گی۔

پھر اسے محض ایک خیرات نہیں بلکہ ”حق“ قرار دیا گیا ہے۔
 وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ | ان کے مالوں میں حق ہے مدد مانگنے والے کے
 (الزّاریات - ۱۹) | لئے اور رزق سے محروم رہ جانے والے کے لئے۔

یہ حق حکومت کو وصول کرنا ہے اور حقداروں تک پہنچانا ہے۔
 خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً | (لے نبی) ان کے مالوں سے صدقہ وصول کیجئے۔
 (التوبہ - ۱۰۳)

اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ ان تمام افراد کی کفالت کا بندوبست کرے جو مجبور ہوں، اپاہج ہوں، لاچار ہوں، یا رزق سے محروم رہ گئے ہوں۔
 حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

بُشْخَص مَرَجَائِهِ اور اس کے ذمہ فرض ہو اور
 وہ اسے ادا کرنے کے قابل مال نہ چھوڑے تو اس
 کا ادا کرنا میرے (اسلامی ریاست کے) ذمہ ہے اور جو
 مال چھوڑے تو اس کے وارثوں کا حق ہے۔
 (البوداؤن)

بُشْخَص قَرْضٍ چھوڑے یا ایسے بن ماندگان چھوڑے
 جن کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو وہ میرے
 پاس آئے۔ میں اس کا سرپرست ہوں۔
 (البوداؤن)

جو مال چھوڑے تو وہ اس کے وارثوں کا حق
 ہے اور جو ذمہ داریوں کا بار چھوڑ جائے تو وہ
 ہمارے (یعنی حکومت کے) ذمے ہے۔
 (بخاری و مسلم)

امام ابو یوسف ”کتاب الخراج“ میں ایک جلیل القدر صحابی کی زبان سے یہ اصول بیان فرماتے ہیں کہ

”خدا کی قسم ہم نے اس سے انصاف نہیں کیا اگر جوانی میں اس سے فائدہ اٹھایا
 اور بڑھاپے میں اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا“ (کتاب الخراج ص ۷۲)

حضرت خالد بن ولیدؓ نے حیرہ کے غیر مسلموں سے جو معاہدہ کیا تھا اس میں یہ صراحت یہ موجود تھا
 کہ جو شخص بوڑھا ہو جائے گا جو کسی آفت کا شکار ہوگا یا جو مفلس ہو جائے گا اس سے جزیہ
 وصول کرنے کے بجائے مسلمانوں کے بیت المال سے اس کی اور اس کے کہنے کی کفالت کی جائے گی۔
 (کتاب الخراج ص ۸۵)

بھی وجہ ہے کہ علامہ ابن قیم ان تمام آیات و احادیث و آثار کی روشنی میں علماء کا یہ اصول بیان فرماتے ہیں کہ

” اور علماء نے کہا ہے کہ حکومت جس طرح اس شخص کی وارث ہوتی ہے جس نے کوئی اثر نہ چھوڑا ہو اسی طرح وہ اس کا قرض ادا کرنے کی بھی ذمہ دار ہے جب کہ وہ قرض کی ادائیگی کے لئے کوئی شے چھوڑے بغیر مر جائے۔ نیز وہ اس کی زندگی میں اس کی کفالت کے لئے بھی ذمہ دار ہوگی جب کہ کوئی اس کی کفالت کرنے والا نہ ہو“

(زاد المعارج ۱ ص ۵۷)

علامہ ابن حزم یہ اصول بیان فرماتے ہیں کہ :

” اور ہر بستی کے ارباب دولت کا فرض ہے کہ وہ فقراء اور غرباء کی معاشی زندگی کے کفیل ہوں اور اگر مال فٹے (بیت المال کی آمدنی) سے ان غرباء کی معاشی کفالت پوری نہ ہوتی ہو تو سلطان (امیر) ان ارباب دولت کو اس کفالت کے لئے مجبور کر سکتا ہے اور ان کی زندگی کے اسباب کے لئے کم از کم یہ انتظام ضروری ہے کہ ان کی ضروری حاجات کے مطابق روٹی مہیا ہو، پہننے کے لئے گرمی اور سردی دونوں لحاظ سے لباس فراہم ہو اور رہنے کے لئے ایک ایسا مکان ہو جو ان کو بارش، گرمی، دھوپ اور سیلاب جیسے حوادث سے محفوظ رکھ سکے“

علامہ ابن حزم محلی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی نقل کرتے ہیں :

” اللہ تعالیٰ نے اہل دولت کے اموال پر ان کے غریب بھائیوں کی معاشی حاجت کو بدرجہ کفایت پورا کرنا فرض کر دیا ہے۔ پس اگر وہ بھوکے، تنگے یا معاشی مصائب میں مبتلا ہوں گے، محض اس بناء پر کہ اہل ثروت اپنا حق ادا نہیں کرتے، تو اللہ تعالیٰ ان سے قیامت کے دن اس کی باز پرس کرے گا اور اس کو تا ہی پران کو عذاب دے گا“ (محلی صفحہ ۱۵۷)

اسلامی ریاست کی یہ حیثیت محض نظری دلائل ہی سے ثابت نہیں ہے بلکہ قرن اول میں مسلمانوں نے اس نظام کو من و عن قیام کیا تھا اور دنیا کی پہلی فلا جی اور خادم خلقی ریاست بنائی تھی۔ مشہور مورخ مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں :

” اس بات کا سخت اہتمام کیا کہ ممالک محروسہ میں کوئی شخص فقر و فاقہ میں مبتلا نہ ہونے پاوے۔ یہ عام حکم تھا اور اس کی ہمیشہ تعمیل ہوتی تھی کہ ملک میں جس قدر

اپاچ، ازار رفتہ، مفلوج وغیرہ ہوں سب کی تنخواہیں بیت المال سے مقرر کر دی جائیں۔ لاکھوں سے متجاوز آدمی فوجی دفتر میں داخل تھے جن کو گھڑ بیٹھے خوراک ملتی تھی۔ ایک آدمی کو چھینے بھر کی خوراک کے لئے دو جریب آٹا کافی ہوتا تھا، اس لئے ہر شخص کے لئے اسی قدر آٹا مقرر تھا غربا و مساکین کے لئے بلا تخصیص مذہب حکم تھا کہ بیت المال سے ان کے روزیئے مقرر کر دیئے جائیں۔ یہ نظام اپنی معیاری شکل میں مسلمانوں نے قائم کیا۔ اور یہ چیز اسلامی ریاست کی تیسری خصوصیت کو متعین کرتی ہے۔

یہاں بھی اسلامی ریاست دنیا کی دوسری ریاستوں سے بڑی مختلف ہے۔ برابرہ دارانہ نظام عوام کی کفالت کی کوئی ذمہ داری نہیں لیتا۔ اس کا اصول یہ ہے کہ جو بڑھ کر خود اٹھالے

ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

معاشی دوڑ میں جو پیچھے رہ جائے اس کے لئے کوئی سہارا نہیں کشمکش حیات میں اس کے لئے مٹ جانا ہی مقدر ہے۔ سعی و جہد اور مواقع کی مساوات بھی اس نظام میں معدوم ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ امیر کے امیر تر ہونے کے امکانات تو ہر طرف موجود ہیں لیکن غریب کے لئے غربت کے چکر سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں۔ اس نظام میں ظلم اور استحصال کے نئے نئے طریقے اختیار کئے جاتے ہیں اور غیر منصوبہ بند معاشی دوڑ پوری سوسائٹی کو عدم استحکام اور افراط و تفریط کے چکر میں گرفتار کر دیتی ہے۔ اسلامی ریاست ایک منصفاانہ معاشی اصول پر عمل کرتی ہے اور وہ سب کو مساوی مواقع دینے کے ساتھ ساتھ ایک ہمگیر پیمانے پر گرتوں کو تھامنے کا کام بھی انجام دیتی ہے۔

یہ فلاحی ریاست اشتراکیت سے بھی مختلف ہے اس لئے کہ یہ کفالت کی نعمانت تو دیتی ہے لیکن آزادی اور انفرادیت کی قیمت وصول کر کے نہیں۔ مگر قومی ملکیت اسلام کے مزاج کے منافی ہے۔ وہ مالکانہ حقوق اور آزادی جہد دینے کے بعد توازن اور انصاف قائم کرتی ہے۔

نیز جدید طرز کی ایک مخلوط اور فلاحی ریاست سے بھی یہ مختلف ہے کہ اس میں سماجی خدمات اور بنیادی کفالت ایک حق کے طور پر کی جاتی ہے محض سیاسی احتجاج کا منہ بند کرنے کے لئے نہیں۔ یہاں اس کا اصول مطالبات اور احتجاجات پر منحصر نہیں ہے بلکہ یہ ایک بنیادی اصول ہے جسے ہر قیمت پر اور ہر حال میں پورا کرنا ہے۔ یہ سارا کام جبر اور رسد کشی

کے ساتھ نہیں بلکہ دلی تعاون اور جذبہ عبادت کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہاں سرف معیار زندگی ہی کو بلند نہیں کیا جاتا بلکہ معیار اخلاق کو بھی بلند کیا جاتا ہے۔ یہ ایک انقلابی تصور ہے جو موجودہ دور کے تمام معاشی تصورات سے کہیں زیادہ اعلیٰ اور بہتر ہے اور اخلاقی اور دنیاوی حیثیتوں سے بہت اونچا ہے۔

۴۔ معلم اور داعی ریاست | اسلامی ریاست کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے سپرد محض معاشی کفالت کی ذمہ داریاں

ہی نہیں ہیں بلکہ اخلاقی تعلیم اور تہذیب و تمدن کی ترویج بھی اس کے ذمے ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں، ”وہ ریاست جو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نیابت کرتی ہے اپنے شہریوں کی بالخصوص اور تمام انسانوں کی بالعموم تعلیم و تربیت کا بندوبست بھی کرتی ہے، اور پوری دنیا کے لئے حق کی شاہد اور اسلام کی علم بردار کی حیثیت رکھتی ہے۔“

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”طلب العلم فريضة على كل مسلم۔ (ابن ماجہ) | علم کا حصول ہر مسلمان پر فرض ہے۔“

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس فریضے کی بجا آوری کے لئے ہر ممکن سہولت فراہم کی۔ اس کام کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیجئے کہ غزوہ بدر میں کفار کے جو قیدی گرفتار ہوئے ان میں سے بعض تعلیم یافتہ قیدیوں کا فدیہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہی قرار دیا کہ مسلمانوں کے کچھ بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں بعض لوگوں کے لئے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دوسری قوموں کی زبانیں سیکھنے کا اہتمام کیا تاکہ بین الاقوامی معاملات کے سلسلے میں وہ حکومت کو اپنی خدمات سے فائدہ پہنچا سکیں۔ بالغ عوام میں تعلیم کو پھیلانے کے لئے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) مختلف مقامات پر وقتاً فوقتاً تعلیمی و تبلیغی وفود بھیجتے رہتے تھے۔ مسجد نبوی کے باہر ایک چبوترہ تھا۔ جسے ”صُفّہ“ کہتے ہیں اور جو اسلام کا پہلا مدرسہ بنا۔ یہاں سے تربیت دے کر لوگوں کو پورے عرب میں تعلیم کے لئے بھیجا جاتا تھا۔ مدینے سے باہر کے مسلمانوں کے لئے یہ قاعدہ تھا کہ ان میں سے ہر گروہ کے لوگ اپنے میں سے باصلاحیت افراد کو مدینہ بھیجتے جہاں وہ تعلیم حاصل کرتے اور واپس جا کر اپنے اپنے علاقے میں تعلیم پھیلاتے۔ باہر سے جو وفود آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس آتے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ان میں سے ذہین اور ذی صلاحیت لوگوں کو ان کی قوم کی تعلیم

پر مقرر کرتے۔ جن لوگوں کو سرکاری عہدوں پر مقرر فرماتے ان کو علم پھیلانے کی ہدایت دیتے۔ مثلاً جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے عمرو بن حزم کو مین کا گورنر بنایا تو سب سے پہلے ہدایت یہ دی کہ:

”وہ حق پر قائم رہیں جیسا کہ اللہ نے حکم دیا ہے، اور لوگوں کو بھلائی کی خوش خبری اور بھلائی کا حکم دیں۔ اور لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیں اور ان میں اس کی سمجھ پیدا کریں اور لوگوں کو ناپاکی کی حالت میں قرآن کو ہاتھ لگانے سے روکیں اور لوگوں کی دل داری کریں یہاں تک کہ لوگ دین کا فہم پیدا کرنے کی طرف مائل ہو جائیں۔“ (سیرت ابن ہشام ج ۳ ص ۲۴۱)

تعلیم کی اہمیت اور اس کی قدر و قیمت کو بڑھانے کے لئے سوسائٹی کے ہر شعبے میں شرف و اعزاز کا معیار علم کو قرار دیا گیا اور مسجد کی امامت سے لے کر اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ داروں تک کے تقرر میں جس چیز کو سب سے پہلے دیکھا جاتا تھا وہ قرآن و حدیث کا علم ہے۔ پوری اسلامی قلم و میں بے شمار افراد کو اس کام پر مقرر کر دیا گیا تھا، کہ لوگوں میں پھیل جائیں اور ان کی تعلیم کا کام انجام دیں۔ اور یہ اسی تعلیم کا فیض تھا کہ ایک طرف دین کا علم شہر شہر، قریہ قریہ، محلہ محلہ اور گوشے گوشے میں پہنچ گیا۔ اور دوسری طرف اسلامی ریاست کو ہر موقع پر ایسے باصلاحیت اور سمجھدار کارکن میسر آنے لگے جو زندگی کے ہر شعبے کی قیادت کر سکیں۔

مسلمانوں کی پوری تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ

۱۔ تعلیم کو ہمیشہ غیر معمولی اہمیت دی گئی اور حکومت اور اہل ثروت نے اس کی دل کھول کر سرپرستی کی۔ یہ ریاست کی ذمہ داری تھی کہ تمام شہریوں کے لئے ضروری اور بنیادی تعلیم کا انتظام کرے۔

۲۔ تعلیم کے نظام میں اولین اہمیت علوم دین کو دی گئی اور اس کے ساتھ ساتھ ان تمام علوم کی ترویج کی گئی جو دفاع دین اور قیام حیات کے لئے ضروری ہیں۔ نیز فضول اور لغو مضامین سے اجتناب کی کوشش کی گئی۔

۳۔ تعلیم ہر دور میں مفت رہی مسلمانوں نے ایک دن کے لئے بھی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کو بھی فیس کے ساتھ وابستہ نہیں کیا۔ علم اور اونچے سے اونچے درجے کے علم کے دروازے ہر شخص کے لئے بلا فیس کھلے رہے۔

۴۔ تعلیم کے ساتھ کردار سازی اور اخلاقی تربیت ایک جزو لاینفک کی طرح موجود رہی۔

بھریہ ریاست صرف اپنے شہریوں ہی کی تعلیم کا بندوبست کر کے مطمئن نہیں ہو جاتی بلکہ پوری دنیا کے سامنے اسلام کی دعوت کو اپنے قول و عمل اور مثال سے پیش کرتی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے۔

کُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ
تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ
الْمُنْكَرِ ۚ تَذُكِّرُونَ بِاللَّهِ (آل عمران - ۱۱۰)

اور امت کا یہ فرض مقرر کیا گیا ہے کہ
وَلَسَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى
الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ
عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران - ۱۰۴)

اور اس امت کے ذمے شہادت حق کا وہی فریضہ عائد ہوا ہے جو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد تھا۔

لَيَكُونَنَّ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ
وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ ۚ (الحج - ۷۸)

یہ بحث اسلامی ریاست کی ایک اور بنیادی خصوصیت پر روشنی ڈالتی ہے یہ ریاست ایک معلم کی طرح ہے اسے اپنے تمام شہریوں کی تعلیم و تربیت کا بندوبست بھی کرنا ہے اور دنیا کے سامنے اسلام کی دعوت کو پیش بھی کرنا ہے۔ اس طرح یہ ریاست ایک طرف لوگوں کے معیار علم و اخلاق کو بلند کرتی ہے اور دوسری طرف ایک عالمگیر پیغام کی داعی ہے۔ یہ قومیت کے کسی تنگ نقطہ نظر سے وابستہ نہیں۔ اس کی دعوت تمام انسانوں کے لئے ہے۔ اس پہلو سے یہ ریاست بالکل منفرد ہے۔

۶۔ قیام پاکستان کے محرکات

جدوجہد پاکستان کی غرض | پاکستان کا وجود و قیام ایک طویل تاریخی عمل کا مہمونت

مسلمان اپنے ساتھ ایک منظم اور منفرد ضابطہ حیات لائے۔ چودہ صدیاں پہلے معرض ظہور میں آنے والے مسلمانوں کا رومانی، معاشرتی اور اقتصادی نظام جنوبی ایشیا میں رائج نظام کی ضد تھا۔ برصغیر پر قدیم زمانے سے کفر، بت پرستی اور انسانوں کے درمیان چھوٹ چھات کا رواج قائم تھا ہندو غالب اکثریت میں تھے اور ان کی تہذیب و معاشرت یہاں چھائی ہوئی تھی۔ ان میں ذات پات کی اونچ نیچ پائی جاتی تھی۔ ایک شوہر اونچی ذات کے ہندو کو چھو نہیں سکتا تھا۔ ان کے کھانا کھانے کے چبوترے پر نہیں چڑھ سکتا تھا تعلیم صرف اونچی ذات کے ہندوؤں تک محدود تھی۔ چھوٹی ذات کا ہندو تعلیم حاصل کرنا چاہتا تو اس کا مجاز نہ تھا۔

مسلمان پہلی صدی ہجری ہی میں عرب ممالک سے آکر بحر ہند کے آس پاس اور سندھ کے علاقہ میں بسنا شروع ہو گئے تھے۔ مسلمان تنہا نہ آئے تھے بلکہ اپنے ساتھ عقیدہ توحید، انسانی اخوت رحمت و شفقت اور مساوات و مساوات کی اعلیٰ انسانی اقدار بھی لائے تھے۔ اسلام چون کہ دعوتی دین ہے اس لئے روز بروز مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ جس کے نتیجے میں برصغیر میں جلد ہی ان کی ایک خاصی بڑی تعداد ہو گئی، جس نے ہندوؤں کے مقابلہ میں ایک الگ کنشک قائم کر لیا۔ مسلمانوں سے پہلے جو اقوام جنوبی ایشیا میں آئیں، یہاں کی ہندو تہذیب میں ضم ہو کر رہ گئیں۔ البتہ مسلمان چونکہ ایک بہتر اور کامل نظام حیات ہمراہ لائے تھے اس لئے انہوں نے اپنا جدا معاشرہ قائم کر لیا۔ معاشرتی فرق و امتیاز کی بنا پر شروع ہی سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایک کش مکش جاری رہی، جس میں ہندوؤں نے مسلمانوں کی بدگمانہ حیثیت ختم کرنے کی مسلسل کوششیں کیں۔ مگر مسلم معاشرہ اپنی بدگمانہ حیثیت برابر منواتا رہا۔ جنوبی ایشیا میں ہندو مسلم کش مکش کے کئی دور آئے۔ اس کش مکش کا آخری دور انگریزوں کی آمد سے شروع ہوا، اس کے نتیجے میں مسلمانوں کو اپنے لئے ایک علیحدہ وطن قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور ایک تحریک کا میاب تکمیل پر انہیں یہ وطن پاکستان حاصل ہوا۔

پاکستان کے لئے جدوجہد کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ ہندو مسلم شکمش کے آخری دور میں مغربی جمہوریت کے آجانے کے بعد یہ خطرہ تھا کہ مسلمانوں کو اس برصغیر میں بنیادی انسانی حقوق بھی حاصل ہو سکیں گے کیونکہ مغربی طرز حکومت غالب اکثریت والی آبادی کو کئی اختیارات سونپ دیتا ہے۔ جنوبی ایشیا کی ہندو اکثریتی آبادی ذات پات اور چھوت چھات کے علاوہ غیر ہندو اقوام کے خلاف انتہائی متعصبانہ رویہ رکھتی تھی۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ مسلمان انفرادی طور پر برابر کے شہری کی حیثیت سے اور اجتماعی طور پر جنوبی ایشیا میں ایک قوم کی حیثیت سے مٹ جاتے۔ مسلم قوم کا طرہ امتیاز، عقیدہ توحید اور آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر مبنی ضابطہ حیات ہے مسلم معاشرے میں سب افراد بلا تفریق رنگ و نسل، مساوی حقوق اور مساوی مرتبہ و مقام کے حقدار ہیں۔ زندگی کے بارے میں جداگانہ عقائد کے ساتھ مسلم قوم اپنی جداگانہ حیثیت کے بارے میں بھی ایک مخصوص احساس رکھتی ہے۔ یہ مسلم قوم ”خَيْرَ اُمَّةٍ“ کی جداگانہ حیثیت کو کسی قیمت پر چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتی۔ لہذا پاکستان کے لئے کی جانے والی جدوجہد درحقیقت اپنی جداگانہ حیثیت برقرار رکھنے اور اپنے اسلامی تشخص کو پروان چڑھانے کے لئے کی گئی تھی۔

جنوبی ایشیا کے مسلمان اس لئے بھی آزاد وطن اور اپنی حکومت کا قیام چاہتے تھے کہ انگریزوں نے یہاں کی حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی، جب کہ اپنے قیام کے دوران وہ یہاں ایسا نظام سیاست رائج کر چکے تھے، جس کے ذریعے ایک تنگ نظر اکثریت ہمیشہ کے لئے مسلمانوں پر مسلط ہو جاتی مسلمان تیسرے درجے کے شہری بن کر معاشرتی ناہمواری کے غار میں دفن ہو جاتے حالانکہ اسلامیان ہند کی جداگانہ مسلم قومیت تاریخی اعتبار سے حکم تھی۔ جغرافیائی اعتبار سے وسیع علاقوں میں ان کی اپنی اکثریت تھی۔ انگریزی عہد حکومت میں مسلمانوں کو حکمرانی کا حق صرف انہی علاقوں میں مل سکتا تھا جہاں وہ اکثریت میں تھے۔ بنا بریں پاکستان کا مطالبہ ہر لحاظ سے جائز اور درست تھا۔

پاکستان کی اساس | مسلمانان برصغیر کی جداگانہ تاریخی اور تہذیبی حیثیت اُن کی ایک قدیم آرزو پر منحصر تھی۔ یہ آرزو تھی مسلم معاشرے کا قیام۔ چنانچہ اسی آرزو نے ایک اساس کا کام دیا اور مسلمانوں نے اسے اپنا نصب العین بنا لیا۔ پاکستان کی یہ اساس خود اس کے بانیوں نے قائم کی ہے۔ علامہ محمد اقبال اور محترم محمد علی جناح اس کے معمار ہیں۔ پاکستان کی اصل اساس کو جاننے کے لئے انہی کے خیالات کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔

مفکر پاکستان علامہ محمد اقبال نے خطبہ الہ آباد ۱۹۳۱ء میں مسلمانانِ برصغیر کے جداگانہ وجود اور ان کی معاشرتی، معاشی اور سیاسی حالت سدھارنے کے لئے ایک اسلامی ریاست کے قیام کی اہمیت پر زور دیا۔ ان کے یہ الفاظ نہ صرف اس وقت کے مسلم ہندوستان کے مسائل کا حل بنے ہوئے ہیں بلکہ پاکستان کی اساس کی واضح نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا:

” اسلامی قانون کے طویل و عمیق مطالعہ کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر اس قانون کو اچھی طرح نافذ کیا جائے تو شیرخص کے لئے کم از کم حق معاش محفوظ ہو جاتا ہے۔ لیکن شریعت کا نفاذ اور ارتقاء ایک آزاد مسلم ریاست کے بغیر اس ملک میں ممکن نہیں“

محترم محمد علی جناح نے پاکستان کے اس تصور اور اس کی اساس کو تحریک پاکستان کے دوران اور قیام پاکستان کے بعد بھی متعدد بار واضح کیا۔ ان کی تقاریر کے مندرجہ ذیل دو اقتباسات قیام پاکستان سے پہلے کے ہیں اور تیسرا بعد کا۔ ان سے اساس پاکستان کی منظر کشی ہو جاتی ہے۔ آپ نے فرمایا:

۱۔ ”مسلمان پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں، جہاں وہ خود اپنے ضابطہٴ حیات، اپنے تہذیبی ارتقاء، اپنی روایات اور اسلامی قانون کے مطابق حکمرانی کر سکیں۔“

(اجلاس مسلم لیگ پشاور منعقدہ ۲۱ نومبر ۱۹۴۷ء)

۲۔ ”ہر مسلمان جانتا ہے کہ قرآنی تعلیمات محض عبادات اور اخلاقیات تک محدود نہیں بلکہ قرآن کریم مسلمانوں کا دین، ایمان اور قانونِ حیات ہے یعنی مذہبی، معاشرتی، تجارتی، تمدنی، عسکری اور تعزیری احکام کا مجموعہ ہے۔ ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمیں یہ حکم ہے کہ اس کا بغور مطالعہ کریں تاکہ مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی ہدایت کا باعث ہو۔“

۳۔ قیام پاکستان کے بعد اپنے نصب العین کی وضاحت کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

”ہمارا نصب العین یہ تھا کہ ہم ایک ایسی مملکت کی تخلیق کریں جہاں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں، جو ہماری تہذیب و تمدن کی روشنی میں پچھلے بھولے اور جہاں معاشرتی انصاف کے اسلامی تصور کو پوری طرح پینے کا موقع ملے۔“

(حکومت پاکستان کے افسران سے خطاب، اکتوبر ۱۹۴۷ء)

قرارداد مقاصد | قیام پاکستان کے فوراً بعد جب بانیانِ پاکستان اس آزاد مملکت کا دستوری خاکہ مرتب کرنے لگے تو ابتدائی مرحلے (مارچ ۱۹۴۹ء)

میں قریب و اجوف مقاصد منظور ہوئی۔ یہ قرارداد مقاصد پاکستان کے دستور کا دیباچہ بھی ہے، اور اس اقرار کی تفسیر بھی جو اس مملکت کے باشندوں نے اپنے آپ سے اور اپنی آنے والی نسلوں سے کیا ہے۔ قرارداد مقاصد اس کائنات پر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت تسلیم کرتی ہے اور باشندگان پاکستان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو کتاب و سنت کی تعلیمات کے مطابقت ڈھالنے کے عزم کا اعلان ہے۔ بعد ازاں وضع کئے جانے والے ملکی دساتیر کی متعدد دفعات نہ صرف اسلامی نظریہ حیات سے مطابقت رکھتی ہیں، بلکہ ان میں پاکستان کو ایک اسلامی ملک کی حیثیت سے اُجاگر کیا گیا ہے۔ پاکستان کے دستور میں حکومت کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ پاکستان کے مسلمانوں کو اپنی زندگیاں انفرادی اور اجتماعی طور پر ہر لحاظ سے اسلام کے ان اصول و تصورات کے مطابق ڈھالنے کی ترغیب دے جو کتاب و سنت میں متعین ہوں۔

قرارداد مقاصد کا متن | بانیان پاکستان نے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو ایک باضابطہ قرارداد مقاصد منظور کی۔ یہ قرارداد پاکستان کی نظریاتی اور عملی سمت متعین کرتی ہے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر اس کا مکمل متن ذیل میں درج کیا جاتا ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

- ★ ہر گاہ کہ تمام کائنات پر اقدار اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے اور ذات باری تعالیٰ نے ریاست پاکستان کو اس کے باشندوں کے ذریعے جو اقتدار اپنی مقرر کردہ حدود کے اندر دلالت کیا ہے، وہ ایک مقدس امانت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے یہ دستور ساز اسمبلی عوام پاکستان کی نمائندگی کرتے ہوئے پاکستان کی آزاد اور خود مختار ریاست کیلئے دستور مرتب کرنے کا عہدہ کرتی ہے۔
- ★ ہر گاہ کہ ریاست اپنے اقتدار و اختیارات کا استعمال عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعے کرے گی جس میں جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور معاشرتی انصاف کے اصولوں کی اسلامی تصریحات کے مطابق مکمل تعمیل ہوگی۔
- ★ جس میں مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی شعبوں میں اپنی زندگی قرآن و سنت کی روشنی میں اسلامی تعلیمات و مقتضیات کے مطابق بسر کرنے کے قابل بنایا جائے گا۔
- ★ جس میں اقلیتوں کے لئے اس امر کا مناسب و موزوں اہتمام کیا جائے گا کہ وہ اپنے مذہب و عقیدے پر آزادی سے کار بندہ سکیں اور اپنی ثقافت کو ترقی دے سکیں۔
- ★ جس (دستور) کے ذریعے پاکستان میں شامل یا اس سے الحاق شدہ علاقہ یا وہ علاقے

جو بعد میں پاکستان میں شامل ہوں گے یا اس سے ملحق ہوں گے وہ ایک وفاق کی تشکیل کریں گے، جس میں وحدتوں کو خود مختاری حاصل ہوگی اور ان کی سرحدوں اور کے اقتدار و اختیارات کی حدود کا تعین کیا جائے گا۔

☆ - جس میں قانون اور اخلاق عامہ کی حدود کے اندر بنیادی حقوق بشمول مساوات، حیثیت و مساوی مواقع، قانون کی نظر میں مساوات اور سماجی اقتصادی اور سیاسی انصاف، آزادی فکرو اظہار اور آزادی عقیدہ و اعتقاد اور عبادت اور تنظیم سازی کی آزادی حاصل ہوگی۔

☆ - جس میں اقلیتوں اور سپماندہ طبقوں کے جائز حقوق کے تحفظ کے لئے مناسب دفعات کا اہتمام کیا جائے گا۔

☆ جس میں عدلیہ کی آزادی کا مکمل تحفظ ہوگا۔

☆ جس میں وفاق کے علاقوں کی سالمیت وفاق کی آزادی اور اس کے ان تمام حقوق کا، جن سے خشکی، سمندر اور فضا پر حاکمانہ اختیارات شامل ہیں، تحفظ کیا جائے گا۔

تاکہ اہل پاکستان کو خوشحالی نصیب ہو اور وہ اقوام عالم میں اپنا جائز اور باوقار مقام حاصل کر سکیں اور عالمی امن و ترقی اور تمام انسانیت کی خوشحالی کے لئے اپنا بھرپور کردار انجام دے سکیں۔

”نظریہ پاکستان“

نظریہ پاکستان کے چار مدارج ہیں جن سے گذر کر قوم نظریہ پاکستان نکلتی ہے۔ وہ یہ ہیں:-

(۱) مغربی سیاسی تصورات کا نفاذ برصغیر کے مسلمانوں کے لئے ایک نہایت کمٹن مرحلہ لایا۔ وہ یا تو برطانوی ہند کی دستوری اصلاحات کے نتیجے میں ہندو اکثریتی آبادی سے مغلوب ہو کر ہمیشہ کے لئے اپنا مستقبل تاریک بنا دینے پر راضی ہو جاتے، یا انگریز حکومت اور ہندو قوم کی ناراضی کی پروا کئے بغیر اپنے اسلامی تشخص کو برقرار رکھنے کے لئے جدوجہد کرتے۔

(۲) برصغیر کے مسلمانوں نے اپنے اسلامی تشخص کو برقرار رکھنے کے لئے نہ صرف جدوجہد کی راہ اپنائی، بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ اس تیز تر تحریک کا رخ ایک آزاد مسلم ریاست کی تشکیل کی جانب موڑ دیا۔

(۳) معمر و معمار پاکستان دونوں کے نزدیک برصغیر کے دستوری مسائل کا حل ایک ایسی مملکت کی تخلیق تھا جہاں ”ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں، جو ہماری تہذیب اور تمدن کی روشنی

میں پھیل چھوئے، اور جہاں معاشرتی انصاف کے اسلامی تصور کو پوری طرح پہنچنے کا موقع ملے؟

(۴) قیام پاکستان کے بعد قرار داد مقاصد اور اس مملکت کے دستور کی متعدد دفعات مسلمانوں کو اپنی زندگیاں انفرادی اور اجتماعی طور پر ہر لحاظ سے اسلام کے ان اصولوں اور تصورات کے مطابق ڈھلنے کی ترغیب دلانے سے متعلق ہیں، جو قرآن و سنت میں متعین ہیں۔

پاکستان کی اساس سے واقف ہو جانے کے بعد ہمارے لئے نظریہ پاکستان کو سمجھنا نہایت آسان ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ تعداد میں کم ہونے کے باوجود برصغیر کے مسلمان اپنا الگ تشخص ہر دور میں عزیز رکھتے تھے۔ ان کا یہ تشخص نہ تو ہندو اکثریت کے درمیان ہزار برس گزارنے سے مسخ ہوا، اور نہ انگریز کی حکمرانی کے دوران ہونے والے جبر و استبداد سے مٹ سکا۔ اس کے برعکس وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جداگانہ قومیت کا احساس وسیع تر اور واضح تر ہوتا گیا۔ جس کی بڑی وجہ مسلم نشاۃ ثانیہ کے لئے کوششیں تھیں۔ اس جداگانہ قومیت کی بنیاد پر مسلمانوں نے اپنا الگ آزاد وطن حاصل کیا۔ جہاں وہ اسلامی معاشرہ قائم کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ لہذا ہم نظریہ پاکستان کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

”نظریہ پاکستان کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ اس خطۂ ارض پر جسے مسلمانوں نے اپنے جداگانہ تشخص کے بھرپور اظہار کے لئے آزاد مملکت کے طور پر حاصل کیا ہے وہ اپنے عقیدے اور دین کی روشنی میں آزادی سے زندگی بسر کریں۔ جہاں وہ اپنی تہذیبی تمدن اور ملی ورثے کو پروان چڑھائیں۔ ان کی شناخت اسی نظریے سے ہو اور وہ اپنے لئے ایک اسلامی معاشرہ قائم کریں۔“

نظریہ پاکستان ایک طرف قوم کے وجود و بقا کا جواز ہے تو دوسری طرف افراد قوم کو اسلام پر بحیثیت اصول زندگی و ضابطہ حیات کا بند کرتا ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ برصغیر میں برطانوی حکومت کے اختتام پر یہاں کے مسلمانوں کی ایک فعال تحریک کے نتیجے میں پاکستان وجود میں آیا۔ اس تحریک کے دوران حاکم کی جانب سے جبر و تشدد بھی ہوا اور ہم وطنوں کی طرف سے مذہبی تعصبات سامنے آئے۔ ایک طرف مغربی تہذیبی اقدار سے ملکر ہوئی تو دوسری طرف اکھنڈ بھارت بنائے جانے کا غوغا سنائی دیا۔ اس طویل اور پر عزم تحریک کے ہر سوڑ پر برصغیر کے مسلمانوں کو صحیح سمت دکھانے والا ایک ہی نعرہ تھا ”لا الہ الا اللہ“ اور جب

مقامی آبادی کو حکمرانی سونپنے جانے کا چرچا ہونے لگا تو یہی پاکستان کا مطلب ٹھہرا۔
 مختصر یہ کہ پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے۔ یعنی ایک ایسی مملکت جس کا قیام اور وجود ایک
 نظریے سے منسلک ہے۔ اس نظریے کی بنیادی کڑی اسلامی ضابطہ حیات ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے
 جیسے سوویت یونین اشتراکی نظریہ اپنائے ہوئے ہے اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں آزاد معاشرہ
 اور سرمایہ داری کا نظریہ ہے۔ اسی طرح کے جداگانہ نظریات بعض دوسرے ممالک کے بھی ہیں۔
 پھر ایک ہی یا ملتے جلتے نظریے کو کئی ممالک نے اپنایا ہے یعنی بعض ممالک میں ایک ہی بنیادی
 نظریہ ان کے مخصوص تاریخی اور جغرافیائی پس منظر میں ڈھل گیا ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ نظریہ پاکستان کی اساس قومی جذبات کا اجتماع ہے، نظریہ پاکستان
 مسلمانان برصغیر کے مخصوص تاریخی رویے بتدریج ابھرا ہے۔ اس نظریہ کی ابتداء کسی ایک فرد
 مقام یا واقف سے نہیں ہوئی۔ آٹھ سو سادہ حکمرانی کے احساس زیاں، مستقبل کے لئے آزادی کی
 امنگ، اور برصغیر میں پھر سے اسلامی معاشرے کے قیام کی آرزو، اس نظریے کے سرچشمے ہیں
 اس اعتبار سے ہم آئندہ باب میں پاکستان کے تاریخی پس منظر کا ذکر کرتے ہیں، جو برصغیر میں
 اسلامی معاشرے کے قیام سے شروع ہوتا ہے۔

۱۔ تاریخ تحریک پاکستان

۱۔ تحریک پاکستان کی تاریخ | قائد اعظم نے ایک فرمایا تھا کہ پاکستان اسی روز قائم ہو گیا تھا جب پہلے مسلمان نے برصغیر کی سرزمین پر قدم رکھا تھا اور جب پہلے ہندو نے اسلام قبول کیا تھا۔ قائد اعظم کا اشارہ برصغیر کی ایک تاریخی حقیقت کی طرف تھا کیونکہ اس دن سے برصغیر کو ایک نئی حیثیت حاصل ہوئی۔ یہاں اسلامی معاشرہ قائم ہوا اور سینکڑوں سال تک مسلمانوں کا سیاسی اقتدار قائم رہا۔ اس دوران مسلمانوں نے برصغیر کے لوگوں کو امن دیا، انصاف دیا، خوشحالی دی، نیامندن اور نئی تہذیب دی ان سب کا سرچشمہ ان کا دین تھا۔ اسی دین کی تعلیمات کو پھر سے اُجاگر کرنے کے لئے مسلمانوں نے اب نئے اٹھانوں کے مطابق اپنا آزاد وطن پاکستان قائم کیا ہے۔ پاکستان کا تاریخی پس منظر اس باب کے نفس مضمون ہے۔

۲۔ اسلامی معاشرے کا قیام | جنوبی ایشیا کے ساتھ عربوں کے تعلقات بہت پرانے ہیں۔ دونوں خطوں کے درمیان بحیرہ عرب آندو رفت کا ایک آسان راستہ رہا ہے۔ جہاں ابتدا چھوٹے جہاز اور کشتیاں تجارتی مقاصد کے لئے استعمال ہوتی تھیں۔ زمانہ قدیم سے عرب تاجر جنوبی ایشیا سے تجارتی مال ان چھوٹے جہازوں کے ذریعے چین کی بندرگاہ عدن لے جاتے، وہاں سے خشکی کے راستے یہ مال شام، مصر اور یورپ کی منڈیوں میں پہنچایا۔ یہی عرب تاجر ظہور اسلام کے بعد جنوبی ایشیا میں اسلام کے اولین مبلغ بنے۔ ان کے اسلامی کردار سے متاثر ہو کر ساحلی علاقوں کے لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ ابتدائی دور میں جو علاقے اسلام سے متاثر ہوئے ان میں ساحل بکرات، مالابار، کارو منڈل کا ساحل، جزائر مال دیپ اور لنکا قابل ذکر ہیں۔ لنکا کا راجہ مسلمان حکمرانوں سے بڑے خوشگوار تعلقات رکھتا تھا۔ آٹھویں صدی کے آغاز میں لنکا سے کچھ جہاز جن پر عازمین حج اور ان مسلمانوں کی بیویاں اور بچے بھی تھے، جو لنکا میں وفات پا گئے تھے، عرب کی طرف جارہے تھے۔ بادِ مخالف کی وجہ سے وہ جہاز سندھ کی بندرگاہ دیبل کی طرف چلے گئے۔

سندھ کے لوگوں نے ان جہازوں کو لوٹ لیا اور عورتوں اور بچوں گرفتار کر لیا۔
۳۔ راجہ داہر کے مظالم | واقعے کی اطلاع ملی تو اس نے اپنا سفیر یہاں کے راجہ

داہر کے پاس اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ مسلمان قیدیوں کو رہا کیا جائے اور مال و اسباب واپس کیا جائے۔ داہر نے جواب دیا کہ یہ سب کام بحری ڈاکوؤں کا ہے اور ان پر اس کا کوئی زور نہیں ہے۔ اس واقعے سے پہلے بھی داہر کے خلاف اسلام دشمنی کی بعض شکایات تھیں۔ حجاج نے اب اسے قرار واقعی سزا دینے کا فیصلہ کیا اور محمد بن قاسم کی کمان میں مسلمانوں کی ایک فوج سندھ روانہ کی۔ اس زمانے میں سندھ کی سرحد میں جنوبی پنجاب، بلوچستان، کرمان کے مشرقی علاقے شامل تھے۔ انتظامی سہولت کے لئے انہیں چار صوبوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ یہ صوبے (۱) سہوان (۲) بہمن آباد (۳) اُچ اور (۴) ملتان تھے۔ موجودہ روتھڑی کے قریب اس سلطنت کا دار الحکومت اُور تھا۔ دو سال بعد محمد بن قاسم نے راجہ داہر اور اس کے جانشین کو شکست دے کر سندھ پر قبضہ کر لیا۔ یوں جنوبی ایشیا کا یہ علاقہ مسلمانوں کی عظیم سلطنت کا ایک اہم جز بن گیا۔ یہاں چند سو عرب مسلمانوں کو آباد بھی کیا گیا، اور ان کے حسن سلوک سے مقامی آبادی نے بھی اسلام قبول کر لیا اس طرح برصغیر میں اسلامی معاشرے کی بنیاد پڑ گئی۔

شمالی پنجاب میں مسلمانوں کی باقاعدہ آمد گیارھویں صدی عیسوی کے شروع میں ہوئی۔ ان دنوں سلطان محمود غزنوی کی سرحد لاہور کے ہندو حکمران راجہ جے پال کے علاقے سے ملتی تھی جو مسلسل سرحدی خلاف ورزیاں کرتا رہتا تھا۔ وہ مقامی مسلمان باشندوں پر بھی زیادتی کر رہا تھا۔ اس نے سلطان محمود سے کئی دفعہ وعدہ کیا کہ وہ نہ سرحدی خلاف ورزی کرے گا اور نہ ہی مقامی مسلمان باشندوں پر زیادتی کرے گا لیکن ہر بار خلاف ورزی کرتا رہا۔ جے پال کی مسلسل وعدہ خلافیوں سے تنگ آکر سلطان محمود نے شمال مغرب کی طرف سے پنجاب کی کئی حملے کئے اور آخر کار اس علاقے کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اسی زمانے میں جنوبی ایشیا کے شمال مغربی حصے میں شیخ علی ہجویریؒ (جنہیں عام طور پر داتا گنج بخشؒ کہتے ہیں) شیخ اسماعیل لاہوریؒ، سلطان سخی سرورؒ اور دیگر صوفیائے کرام کی کوششوں سے مقامی لوگوں نے خاصی تعداد میں اسلام قبول کر لیا۔ اس طرح خیبر سے لے کر کیمڑہ عرب کے ساحل تک تمام علاقے میں اسلامی معاشرہ قائم ہو گیا۔

۴۔ پہلا مسلم حکمران | جنوبی ایشیا کے شمالی اور وسطی علاقے میں مسلمان حکومت کے

قیام کا سہرا سلطان محمد غوری کے سر ہے۔ اس نے ترائی کے میدان میں ہندو حکمران پر تھوڑی راج کو شکست فاش دے کر شمالی حکومت کے دروازے مسلمانوں کے لئے کھول دیئے۔ اس کے ساتھ ہی دہلی اور اجمیر پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہو گئی۔ اسی دوران اس کے نائب قطب الدین ایبک نے گجرات اور گواڈیار اور اس کے ایک فوجی سردار بختیار خلجی نے بہار اور بنگالہ فتح کر کے اسلامی حکومت میں شامل کر دیئے۔ جنوبی ایشیا کا پہلا مسلمان حکمران قطب الدین ایبک تھا۔ جو ۱۲۰۶ء میں تخت نشین ہوا۔ اس نے دہلی کو اپنا دار الخلافہ مقرر کیا اور یہاں ایک بہت بڑی مسجد قوت الاسلام کی بنیاد رکھی جس کا ایک مینار آج تک قطب مینار کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے ساتھ ہی جنوبی ایشیا پر مسلمانوں کی براہ راست حکمرانی کا ایک طویل دور شروع ہوا جو ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر کی معزولی کے ساتھ ختم ہوا۔

۵۔ اشاعت اسلام اور صوفیاء

اگرچہ مسلمان حکمرانوں میں التمش جیسے صوفی اور ناصر الدین محمود جیسے درویش مزاج اور سادہ طبع افراد موجود تھے، مگر جنوبی ایشیا میں اسلام کی اشاعت کا کام صوفیائے کرام کی کوششوں کا مرہون منت ہے ان کے دروازے ہر ایک کے لئے خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، امیر ہو یا غریب، کھلے رہتے تھے۔

صوفیاء کا کام ہر ایک کی بہتری کے لئے ”رشد و ہدایت“ تھا۔ ایک ہندو کے قبول اسلام سے انہیں جتنی خوشی ہوتی اتنی ہی ایک مسلمان کے ترک گناہ سے ہوتی۔ وہ ہر ایک کو، خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، ایک بلند تر روحانی زندگی کا پیغام دیتے۔ صوفیاء کے اسی برتاؤ سے کفار اسلام کی طرف راغب ہوئے۔ اشاعت اسلام کے علاوہ صوفیائے کرام نے مسلمانوں کی روحانی اور اخلاقی اصلاح کے لئے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ان سے جنوبی ایشیا میں مسلمان معاشرہ مضبوط ہوتا گیا۔ اس طرح ایک طرف حکمرانوں نے مسلمان معاشرے کے قیام کی ظاہری ہیئت قائم کی تو دوسری طرف صوفیائے کرام کی تعلیمات نے اسے پختگی دی۔ جن بزرگان دین نے جنوبی ایشیا میں اسلام کی اشاعت اور مسلمان معاشرے کے قیام کے لئے گراں قدر خدمات سر انجام دیں، ان میں خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ، بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ اور خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ شیخ بہاؤ الدین ذکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ رکن الدین رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت رحمۃ اللہ علیہ نے ملتان، اچ و سندھ کے علاقوں میں اشاعت اسلام کی۔

۴۔ مسلمانوں کا سیاسی انحطاط | جب تک مسلمان سیاسی اور روحانی طور پر

جرات نہ ہوئی، مگر چودھویں صدی عیسوی کے آخر میں فیروز شاہ تغلق کی وفات کے بعد تخت کے دعویداروں میں جو خانہ جنگی شروع ہوئی، اس نے مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کو بہت نقصان پہنچایا۔ رہی سہی کسر تیمور کے حملے نے پوری کر دی۔ فیروز تغلق کی وفات سے لے کر اکبر کی تخت نشینی تک اندازاً ڈیڑھ سو سال کے عرصے میں سوائے سکندر لودھی کے اٹھائیس سالہ دور حکومت کے جنوبی ایشیا میں کوئی مستحکم حکومت قائم نہ ہو سکی۔ سیدوں کے دور حکومت میں مرکزی حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے صوبائی حکومتیں بہت طاقتور ہو گئیں اور ہندوؤں کو بھی سرائٹھانے کا موقع مل گیا۔ پنجاب میں کھوکھروں نے تباہی مچائی اور راجستھان اور رے نگر میں ہندوؤں نے سرائٹھایا۔ ڈیڑھ سو سال کا یہ عرصہ مسلمانوں کی اخلاقی پستی، روحانی تنزل، بے حسی، بے عمل زندگی اور بے راہ روی کا دور ہے۔ اس عرصے میں نہ تو خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے پلٹے کا کوئی صوفی پیدا ہوا، جو مسلمانوں کی روحانی تربیت کرتا اور نہ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ جیسا کوئی عالم پیدا ہوا، جو اپنی قوت تحریر سے ان کی سوچ بدلتا۔ ہندوؤں نے اس صورت حال سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔

ہندوؤں کے سیاسی غلبہ کو قائم کرنے کی تحریک کی قیادت جنگجو راجپوتوں نے سنبھالی۔ ایک طرف تو جنگی تحریک کی آڑ میں مسلمانوں کے روحانی نظام کو درہم برہم کر کے ہندومت میں ضم کرنے کی کوشش کی گئی، دوسری طرف مسلمانوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہندوؤں نے مسلمانوں کو مزید کمزور کرنا شروع کر دیا۔

ہندوؤں کے سیاسی غلبے کا خواب تو جنگ کنواہہ میں ظہیر الدین بابر کے ہاتھوں رانا سانگا کی شکست کے بعد ختم ہو گیا مگر ہندو مسلم بھائی بھائی کے نام پر مسلمانوں کے جداگانہ تشخص کو ختم کرنے کی کوشش کو اکبر کی لیرل پالیسی سے بڑی تقویت ملی۔ اکبر نے شیخ مبارک اور اس کے بیٹوں ابوالفضل اور فیضی کے زیر اثر ایسی مذہبی پالیسی اختیار کی جس سے مسلم تشخص کمزور ہوتا گیا۔ اس طرح ایشیا میں اسلام کو خطرہ لاحق ہو گیا۔ جن لوگوں نے اکبر کی مذہبی پالیسی کی مخالفت کی، ان کو یا تو شہید کر دیا گیا، یا پھر ملک کے مختلف حصوں میں منتشر کر دیا گیا۔ البتہ اکبر کے عہد میں ہندوؤں کے حوصلے بڑھ گئے تھے۔ وہ خوش تھے کہ مسلمانوں نے ان جیسی رسوم اور لباس اپنا لیا ہے خود بادشاہ وقت

اور حکومت کے عمال اس ظاہری تبدیلی میں پیش پیش تھے، جب کہ اکثریت اسلامی عبادات و معاملات سے غافل ہو چکی تھی۔

ان مایوس کن حالات میں کچھ ایسے باہمت اور باغیرت لوگ بھی تھے جو اچانک شریعت کی

۴۔ مجدد الف ثانی کی تحریک

خاطر سر پر کفن باندھ کر میدان میں نکلے۔ ان میں بونپور کے قاضی ملا محمد یزدی، قاضی بنگال میر یعقوب اور قاضی لان برنی کے نام قابل ذکر ہیں۔ شاہی دربار سے باہر حضرت خواجہ باقی باللہ اور حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ تحریک اچھائے دین کے روح رواں تھے۔ اکبر کی وفات کے بعد جہانگیر کی تخت نشینی سے گو اسلام کو سنبھالا مل گیا، مگر اکبر کا لگایا ہوا زخم اتنا کاری تھا کہ وہ جلدی مندمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس زخم کے لئے کسی مرد حق کی ضرورت تھی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہ کام حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی سے لیا اور ان کی اصلاحی تحریک سے جنوبی ایشیا میں اسلام کو ایک بار پھر عروج حاصل ہوا اور مسلمان معاشرے کو استحکام نصیب ہوا۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے جس دور میں آنکھیں کھولیں، اس دور میں وحدت ادیان کی تحریکیں زور پر تھیں۔ ایک طرف اکبر نے تمام ادیان کو ملا کر دین الہی بنایا تو دوسری طرف بھگت کبیر، بابا نانک اور بھگتی تحریک کے دوسرے راہنما اسلام اور کفر میں ہم آہنگی پیدا کر کے ایک نئے جلے مذہب کی تلقین کر رہے تھے۔ وہ عوام کو تاثر دے رہے تھے کہ رام اور رحیم ایک ہی ذات کے دو نام ہیں۔ ایسی تحریکوں کا لازمی نتیجہ جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کے ہندوؤں میں جذب ہونے کی صورت میں نکلتا۔ اسی طرح تصوف میں وحدت الوجود کے نظریے کے دور رس اثرات پیدا ہوئے۔ "وحدت الوجود" پر یقین رکھنے سے کفر و اسلام کی تمیز اٹھ جاتی ہے۔ بنیادی عقائد میں تبدیلی شرک کی طرف لے جاتی ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی مسلمانوں کو ایک الگ قوم دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ ہر ممکن طریقہ سے مسلمانوں کو ہندوؤں میں جذب ہونے سے بچانا چاہتے تھے۔ اس لئے آپ نے وحدت الوجود کی جگہ مسلمانوں کے سامنے "وحدت الشہود" کا نظریہ پیش کیا۔ جسے ماننے سے ان کا جدا گانہ وجود باقی رہا۔ اس کے ساتھ ہی صدیوں کا جمود اور تعطل ختم ہو کر ان میں عمل و سعی کا ایک نیا جذبہ پیدا ہو گیا۔ حضرت مجدد الف ثانی نے بھگت چوٹے علمائے سہوا اور صوفیائے خام کے خلاف جہاد کیا اور تصوف کو غیر شرعی رسوم سے پاک کر کے مسلمانوں کی روحانی تربیت اور ترقی کے لئے راہ ہموار کی۔ انہوں نے مسلمان معاشرے

میں غیر اسلامی عقائد، افکار اور اعمال کی نشاندہی کی اور انہیں بتایا کہ اگر وہ بحیثیت ایک قوم کے زندہ رہنا چاہتے ہیں تو انہیں کفر و شرک کی باتیں ترک کر کے کافروں سے میز، ہو کر رہنا ہوگا۔ ان مقاصد کے حصول کے لئے آپ نے سب سے پہلے اکبر کے با اثر درباریوں اور راسخ العقیدہ امراء سے تعلقات بڑھائے اور انہیں ترویج شریعت کی طرف توجہ دلائی۔ دوسری طرف آپ نے اسلامی ذہن رکھنے والے مریدوں کی جماعت تیار کی جو آپ کے مشن کی تکمیل کے لئے ملک کے طول و عرض میں پھیل گئی۔ حضرت مجدد الف ثانی نے ان کارکنوں سے رابطہ قائم رکھنے کے لئے خطوط نویسی کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ کسی امیر یا مرید کے نام ایک خط تحریر فرماتے تو آپ کے مرید مل کر اس کی سینکڑوں نقلیں تیار کر کے پورے ملک میں پھیلا دیتے۔ حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات کا جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے لٹریچر بڑا اہم مقام ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی کے علاوہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے مسلمان معاشرے کی تشکیل نو میں اہم کردار ادا کیا۔

۱۔ مسلم معاشرے کے دور ثانی کا عروج و زوال

حضرت مجدد الف ثانی اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی سعی و کوشش کا یہ نتیجہ نکلا کہ جہانگیر کے عہد حکومت میں جنوبی ایشیا میں ایک بار پھر اسلام کا بول بالا ہو گیا۔ شاہجہان کے زمانے میں اسے مزید تقویت حاصل ہوئی۔ شاہجہان خود نماز روزے کا پابند تھا اور شرع کے مطابق مقدمات کا فیصلہ کرتا۔

۲۔ اورنگ زیب عالمگیر کی تبلیغی ماساعی

پھر اورنگ زیب نے شاہی دربار سے آزاد خیال عناصر کو بالکل ختم کر دیا۔ اورنگ زیب نے ملک کا نظام شریعت کے اصولوں پر قائم کیا اور عدل و انصاف کا محکمہ علماء کے سپرد کر دیا۔ اس وقت اسلامی قوانین کے متعلق کوئی مستند اور جامع کتاب نہ تھی۔ اس نے تمام ملک کے قابل علماء کو جمع کر کے تدوین فقہ کا کام شروع کرایا۔ اس طرح فتاویٰ عالمگیری کے نام سے فقہ کی ضخیم کتاب مرتب ہوئی۔ اس کے عہد میں اسلامی مملکت کی سرحدیں دور دور تک پھیل گئیں۔ اس مملکت میں ابھی استحکام نہ آیا تھا۔ دکن میں مرہٹوں کا بڑا زور تھا جسے اورنگ زیب کے جانشین نہ روک سکے۔ ادھر جہانگیر کے زمانے میں یورپی تاجروں کی جماعتیں ملک میں اپنا کاروبار پھیلا کر با اثر ہو رہی تھیں۔ ابتداء میں تجارت کی غرض سے آنے والی کمپنیوں نے اب سیاسی اقتدار کا خواب دیکھنا

شروع کر دیا۔ اور نگ زیرب کی آنکھیں بند ہونے کی دیر تھی کہ خانہ جنگیوں اور امراء کی سازشوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پورا ملک سیاسی انتشار کا شکار ہو گیا۔ دور دراز علاقوں کے خود مختاری اختیار کی اور مرہٹے بڑھتے بڑھتے دہلی تک آپہنچے۔ ایسے میں اگر احمد شاہ ابدالی بروقت انہیں پانی پت کے میدان میں شکست نہ دے دیتا تو جنوبی ایشیا پر ہندو راج ایک حقیقت بن جاتا اور مسلمان ہمیشہ کے لئے ہندوؤں کی غلامی کا شکار ہو جاتے۔

۳۔ خانہ جنگی | اٹھارویں صدی جنوبی ایشیا کی تاریخ میں مسلم معاشرتی اقدار اور سیاسی زوال پر مبنی ہنگامہ خیز صدی گزری۔ اس صدی کے خاص واقعات کا خلاصہ یوں ہے۔

مرکزی حکومت کے ارکان ایرانی، تورانی یا شیعہ سنی گروپوں میں بٹ گئے اور خانہ جنگی کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ اس کے نتیجے میں صرف پچاس سال (۱۷۴۰ء تا ۱۷۸۴ء) کے عرصے میں تخت دہلی پر دس تاجدار بٹھائے ڈاٹارے گئے۔ صوبوں کے گورنر خود مختار ہو گئے۔ دکن میں مرہٹوں کی طاقت ایک مستقل طاقت بن گئی۔ دہلی کے شمال مشرق میں روہیلوں کی حکومت قائم ہو گئی اور اودھ کی وزارت نے شہنشاہیت کی شکل اختیار کرنی۔ دہلی کے جنوب مغرب میں جاٹوں کی طاقت ابھری اور شمال مغرب میں سکھ جواب تک ایک مذہبی گروہ تھے، سیاسی طاقت بن کر ابھرے۔ ادھر ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی فوجی طاقت بڑھانی شروع کی اور ہندوؤں کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے بنگال پر قبضہ کر لیا۔

۴۔ شاہ ولی اللہ اور مسلم معاشرے کی تشکیل نو | جزوی ایشیا میں مسلمانوں کی سیاسی گراؤ کا نتیجہ تھا جو مسلمان معاشرے میں پیدا ہو چکی تھی۔ اسے حیات نو دینے کے لئے ضروری تھا کہ معاشرے کا تجزیہ کیا جائے۔ اور ان عوامل کی نشان دہی کی جائے جو مسلمان معاشرے کے زوال کا اسباب بنے۔ پھر ان تدابیر کو وضع کیا جائے جن پر عمل کر بھارا معاشرہ صحت یاب ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس عظیم کام کے لئے اپنے بندے حضرت شاہ ولی اللہ کو منتخب کیا۔

حضرت شاہ ولی اللہ کے افکار

حضرت شاہ ولی اللہ بہت سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کے مسائل کا واحد حل "فکٹ کل نظام" ہے۔ یعنی ہمہ گیر اور مکمل انقلاب جو معاشرے کے معاشی، سیاسی، اقتصادی، غرض ہر ایک ڈھانچے کو بدل ڈالے۔ اصلاح کی کوئی ایک یا چند تدبیریں کارگر

نہ ہوں گی بلکہ پرانے فرسودہ نظام کو ختم کر کے اس کی جگہ نظام نو تعمیر کیا جائے۔ شاہ ولی اللہ کے افکار کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے۔

(الف) سیاسیات اور نظام حکومت کا بنیادی اصول اللہ تعالیٰ کی حاکمیت سے وابستہ ہے۔ سارے انسان برابر ہیں اور کسی حاکم کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنے آپ کو انسانوں کی گردنوں کا مالک تصور کرے۔

(ب) بنیادی حقوق میں ہر کسی کے لئے روٹی، کپڑا، مکان اور ایسی استطاعت کہ خاندان کی کفالت ہو سکے ضروری ہو۔ اسی طرح عدل و انصاف، جان و مال اور عزت و ناموس کی حفاظت، سخی ملکیت اور حقوق شریعت میں یکسانیت، ہر بابا شنیدہ ملک کا بنیادی حق ہے۔

(ج) اقتصادی اصول میں دولت کی اصل بنیاد محنت ہے۔ جب تک کوئی شخص ملک اور قوم کے لئے کام نہ کرے ملک کی دولت میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔ مزدور، کاشت کار اور جو لوگ ملک اور قوم کے لئے دفاعی کام کریں دولت کے اصل مستحق ہیں۔ جو پیداوار یا آمدنی باہمی تعاون کے اصول پر نہ ہو خلاف قانون ہے۔ ایسا کاروبار جو دولت کی گردش کو کسی خاص طبقے میں محدود کر دے ملک کے لئے تباہ کن ہے۔

(د) قرآن و حدیث کی تعلیم ہر کسی کے لئے عام کی جائے اور اسے لوگوں کی زبان میں سمجھایا جائے۔

جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کے دور حکومت میں دفتری اور تعلیمی زبان فارسی تھی۔ بہت کم لوگ عربی جانتے تھے۔ چنانچہ عام تعلیم یافتہ مسلمان بھی قرآن مجید سے جو ہدایت کا سرچشمہ ہے ناواقف ہوتے جا رہے تھے۔ شاہ صاحب نے لوگوں کو سمجھایا کہ کلام اللہ کے نازل ہونے کا مقصد یہ ہے کہ لوگ اسے پڑھیں اور اس پر عمل کریں۔ لہذا ضروری ہے کہ مقامی زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا جائے۔ اس مقصد کے پیش نظر آپ نے قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ پھر مقدمہ فی ترجمۃ القرآن میں قرآن مجید کے مترجموں کی رہنمائی کے لئے کارآمد ہدایتیں درج کیں۔ آپ نے حدیث کے بارے میں اہم کتابیں تصنیف کیں اور عوام کے لئے بھی مختصر احادیث کی کتابیں مرتب کیں جن میں ”جہل حدیث“ بہت مشہور ہے۔

مسلم اقتدار کا خاتمہ | جنوبی ایشیا کا مسلمان معاشرہ اس قدر تنزل پذیر ہو چکا تھا کہ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے پیروکاروں کی تدابیر بھی مسلمانوں کو خواب غفلت سے جگانے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ شاہ صاحب کے پیروکاروں نے

سید احمد رحمۃ اللہ اور شاہ اسماعیل رحمۃ اللہ علیہ کی سرکردگی میں سرحد میں سکھوں کے خلاف جہاد کیا اور بالا کوٹ کے مقام پر کفر کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ اسی طرح بنگال میں سراج الدولہ اور دکن میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی تمام ترکوششیں غداروں کی وجہ سے بار آور نہ ہو سکیں۔ انگریز بنگال میں اپنے قدم مضبوط کرنے کے بعد آہستہ آہستہ تخت دہلی کی طرف بڑھنے لگے۔ اور ایک وقت وہ آگیا جب منغل بادشاہ کی حکومت دہلی تک محدود ہو کر رہ گئی۔ سب کچھ جاتا دیکھ کر مسلمان انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے مگر اب نہ ان کے پاس قیادت تھی اور نہ انگریزوں کے خلاف لڑنے کے لئے طاقت۔ نتیجہ ظاہر تھا، جو غیر نڈھال تھے، لڑتے ہوئے مارے گئے، جو بچ گئے ان کی حالت مردوں سے بدتر تھی۔ اور یوں ۱۸۵۷ء میں جنوبی ایشیا کے مسلمان تقریباً اٹھ سو سال حکومت کرنے کے بعد خود محکوم ہو گئے۔

مسلمانوں کو سیاسی طور پر تباہ کرنے کے باوجود انگریز مسلمانوں سے خائف تھے وہ انہیں اپنی سلطنت کے لئے سب سے بڑا خطرہ سمجھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے ساتھ ہی مسلمانوں کو معاشی طور پر تباہ و برباد کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ان کی جائیدادیں اور جاگیریں ضبط کر لی گئیں، ملازمتوں کے دروازے ان پر بند کر دیئے گئے۔ جب کسی دفتر میں کوئی جگہ خالی ہوتی تو اشتہار میں کہا جاتا کہ مسلمان اس اسامی کے لئے درخواست نہیں دے سکتے۔ مسلمان زیادہ سے زیادہ چپڑاسی کی اسامی کی توقع کر سکتے تھے۔ فارسی کی جگہ انگریزی کو سرکاری زبان قرار دے کر تمام پڑھے لکھے مسلمانوں کو بے کار کر دیا گیا۔ سرولیم ہنٹر اپنی کتاب ”OUR INDIAN MUSALMANS“ میں لکھتا ہے کہ آج سے ایک سو ستر سال پہلے کسی عالی نسب مسلمان کے لئے ناممکن تھا کہ وہ کبھی مفلس اور بد حال ہو۔ لیکن اب ایسے شخص کے لئے ناممکن ہے کہ وہ خوشحال رہ سکے مسلمان گھرانوں میں فاقہ کشی کا دور دورہ ہے، وہ قرض کی دلدل میں بھنسے ہوئے ہیں، کوئی ہندو قرض خواہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے تو فوری طور پر ان کی جائیداد ضبط ہو جاتی ہے۔

۴۔ **مسلم ثقافت کی بربادی** | مسلمانوں کے ثقافتی مراکز کو انگریزوں نے جی بھر کر ٹوا۔ کتب خانوں کی نادر کتابیں انگلستان بھیج دیں۔ جن میں سے اکثر آج بھی انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہیں۔ کسی قوم کو تباہ کرنے کا سب سے ہلک طریقہ یہ ہے کہ اس کے نظام تعلیم اور تعلیمی اداروں کو تباہ کر دیا جائے۔

انگریزوں نے مسلمان مدرسوں کے ساتھ ملحقہ املاک ضبط کر لیں۔ یہ مدرسے معاشی بد حالی کا شکار ہو کر بند ہونے لگے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان جو کبھی معاشرے میں معزز و محترم تھے،

ذلیل و خوار ہو کر رہ گئے۔

مسلمانوں میں سے جنہوں نے انگریزوں کے خلاف زبان کھولی، انہیں عبرت ناک سزائیں دی گئیں۔ مختصر یہ کہ مسلمان بد دل ہو گئے، ان پر مایوسی کی گھٹا چھا گئی اور اس کے ساتھ ہندو، جنہیں انگریز کی سرپرستی حاصل تھی، دن دگنی رات چوگنی ترقی کرنے لگے۔ غرض مسلمان جو برصغیر میں فاتح کی حیثیت سے آئے تھے ایک طویل عرصے تک کامرانی کے ساتھ پھیلے پھولے لیکن پھر اپنی نادانی اور انگریز کی ہوشیاری سے سیاسی اقتدار بھی گنوا بیٹھے اور معاشرتی برتری بھی باقی نہ رہی۔

نوٹ :- چونکہ یہ کتاب فارغ التحصیل طلبہ کے لئے تحریر کی جا رہی ہے۔ اس لئے تحریک پاکستان کی باقی تفصیل اختصار کے پیش نظر قلم انداز کر دی گئی ہے۔

۱۔ نظریہ پاکستان اور اس کے تقاضے

سرزمین پاکستان کے لئے اقامتِ دین ایک فریضہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں دین کو بحیثیت مجموعی نافذ کرنے کی ضرورت ہے۔ انفرادی مسائل کافی نہیں ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے متحدہ ہندوستان میں سے پاکستان کے نام کا ایک الگ خطہ زمین کاٹ کر حاصل کرنے کے لئے بولٹائی لڑی تھی وہ تمام دنیا کے سامنے ڈنکے کی چوٹ یہ کہہ کر لڑی تھی کہ ہم ایک جداگانہ تہذیب و تمدن رکھنے والی قوم ہیں متحدہ ہندوستان میں غیر مسلم اکثریت کے ساتھ ایک مشترک نظام زندگی ہم نہیں بنا سکتے۔ ہمیں اپنے نظام زندگی کے مطابق کام کرنے کے لئے ایک علاقہ چاہیے۔ جہاں اپنی تہذیب اور اپنے تمدن اور اپنے قوانین حیات کے مطابق کام کر سکیں۔ اب ایک سخت لڑائی لڑنے کے بعد جب وہ پاکستان ہمیں حاصل ہو گیا جس کے لئے ہم نے یہ سارے پاڑے بیلے تھے تو یہ ایک عجیب حرکت ہو گی کہ ہم یہاں اسی تہذیب و تمدن اور نظام زندگی سے منہ موڑ لیں جس کا ہم نے نام لیا تھا۔ اور وہی سب کچھ کرنا شروع کر دیں جو متحدہ ہندوستان میں بھی بآسانی کیا جا سکتا تھا۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم تمام دنیا کے سامنے اپنے آپ کو ایک جھوٹی اور مکار قسم کی قوم کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ آخر دنیا یہ نہ کہے گی کہ یہ عجیب قوم ہے کہ جس مقصد کا نام لیکر یہ لڑائی لڑی تھی، اُس میں کامیاب ہو کر اسی مقصد کو فراموش کر بیٹھیں اور جو کام وہ لڑے بغیر کر

سکتی تھی وہی اس نے جان و مال اور آبرو کے بے شمار نقصانات اٹھانے کے بعد کرنا شروع کر دیا۔

۲۔ پاکستان کے بقاء و استحکام کے لئے اقامتِ دین کی اولین ضرورت و اہمیت یہ ہے کہ ہم مسلمان ہیں۔ اگر ایک مسلمان قوم کا نظریہ اسلامی نہ ہو تو اور کیا ہو سکتا ہے۔ مسلمان ہونے کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ ہمارے خیالات اسلامی ہوں۔ ہمارے سوچنے کا انداز اسلامی ہو۔ معاملات پر ہم اسلامی نقطہ نظر ہی سے نگاہ ڈالیں۔ اپنی تہذیب و تمدن سیاست و معیشت اور اپنے پورے نظام زندگی کو اسلام کے طریقے پر چلائیں۔ اگر ہم ایسا نہ کریں تو آخر کس بناء پر ہم اپنے آپ کو مسلمان کہنے کے حق دار ہو سکتے ہیں۔ مسلمان ہونے کا دعویٰ ابھی کرنا اور پھر اپنی زندگی کے مختلف گوشوں میں کسی غیر اسلامی نظریہ پر کام بھی کرتا یہ معنی رکھتا ہے کہ یا تو ہم منافق ہیں اور دل سے مسلمان نہیں ہیں۔ یا پھر ہم جاہل ہیں اور اتنا شعور بھی نہیں رکھتے کہ مسلمان ہونے کے کم سے کم تقاضے کیا ہیں۔

۳۔ تیسری چیز اس سلسلہ میں یہ ہے کہ پاکستان مختلف عناصر سے مرکب ہے اور جن عناصر سے یہ مرکب ہے ان کے درمیان آج تک اپنی جداگانہ خصوصیات نمایاں طور پر موجود ہیں۔ ان کے اندر حقیقت میں کوئی ایسا امتزاج نہیں ہو سکا۔ ۱۔ ہوا، عناصر کو بالکل یک جان اور یک رنگ کر چکا ہو ان کی زبانیں مختلف ہیں۔ لباس، عادات، طرز معاشرت مختلف ہے۔ نسلیں مختلف ہیں۔ ایک بڑی حد تک ان کے مفاد بھی نہ صرف مختلف بلکہ متضاد ہیں۔ ان کے اندر جدا جدا ہونے کا احساس نہ صرف موجود ہے بلکہ زندہ اور متحرک ہے اور ایک ذرا سے اشارے پر بہ آسانی ابھر آتا ہے۔ سب سے زیادہ یہ کہ پاکستان جغرافیائی حیثیت سے ایک وطن بھی نہیں ہے ان مختلف اجزاء کو جوڑنے والی طاقت صرف اسلامی نظریہ ہے۔ یہ طاقت کسی وقت بھی کمزور پڑ جائے تو اس کے حصے بخرے الگ الگ ہو سکتے ہیں۔

۴۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ مشرقی پاکستان جو مغربی پاکستان سے ایک ہزار میل کے فاصلے پر واقع تھا اسی رشتہ اتحاد کے کمزور پڑنے سے ۱۹۷۱ء میں ہم سے الگ ہو گیا اور اس کو دوبارہ جوڑنے کا کوئی ذریعہ بظاہر نظر نہیں آتا۔ یہ دونوں حصے الگ الگ تھے۔ ان میں بننے والی قومیں ایک دوسری سے بالکل الگ الگ تھیں۔ ان کی زبان طرز معاشرت تہذیب ثقافت ایک دوسرے سے مختلف تھی۔ دونوں کے درمیان وجہ اتصال اور ذریعہ اتحاد صرف یہ نظریہ تھا کہ وہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور مسلمان ہندوؤں سے

الگ ایک قوم ہے جس کی اپنی ایک تہذیب ہے اور جو ہندوؤں کے ساتھ مل کر نہیں رہ سکتی اسی کا نام نظریہ پاکستان ہے اور یہی نظریہ پاکستان کا موجب بنا۔

۵۔ بدقسمتی سے مشرقی و مغربی پاکستان کے مسلمانوں کو نظریہ پاکستان سے آگاہ نہیں کیا گیا۔ خصوصاً مشرقی پاکستان میں ہندو اساتذہ کے ذریعہ سے اس نظریہ کو مسلم نوہنوں کے ذہنوں سے بالکل نکال دیا گیا۔ چنانچہ ہندوؤں نے مغربی پاکستان سے علیحدگی کا نعرہ لگایا اور مسلمانوں نے جو نظریہ پاکستان کو فراموش کر چکے تھے ان کا ساتھ دیا۔ اس کے نتیجے میں تقریباً نصف ملک جس کی آبادی مغربی پاکستان سے بھی زیادہ تھی کٹ کر الگ ہو گیا اس لئے کہ پاکستان کو ایک وحدت بنا کر رکھنے والی قوت سوائے اسلام کے کوئی نہیں۔ محض سیاسی نظام کی وحدت کوئی چیز نہیں کیا اسی طرح کی وحدت آسٹریا اور ہنگری میں نہ تھی؟ کیا اسی طرح کی وحدت عثمانی سلطنت میں نہ تھی؟ کیا اسی طرح کی وحدت برطش ایمپائر میں نہ تھی؟ اس وحدت کے بل پر مختلف الجنس عناصر کو ایک ”بنیان مرصوص“ نہیں بنایا جاسکتا۔ اس کے لئے زبان کی وحدت مددگار ہو سکتی ہے۔ مگر اس کا یہاں کوئی امکان نہیں۔ اب سوائے ایک عقیدے اور دین کی وحدت اور اصول اخلاق و تہذیب کی وحدت کے اور کیا چیز ہے جو پاکستان کے مختلف عناصر کو جوڑ کر رکھ سکتی ہو؟

۶۔ بدقسمتی سے علیحدگی کے یہ رجحانات مشرقی پاکستان کی جدائی کے ساتھ ختم نہیں ہو گئے۔ بخلاف ازیں مشرقی پاکستان کی علیحدگی بے دین عناصر کے لئے زندہ مثال ہے اس امر کی پاکستان کے باقی صوبے بھی کیوں نہ اتحاد کے بندھنوں سے آزاد ہو جائیں۔ جب کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے جو اسباب تھے وہ یہاں بھی موجود ہیں۔ چنانچہ سندھ، بلوچستان، ماورسرح میں یہ سرگرمیاں پورے عروج پر ہیں۔ کہیں لسانی فتنہ کو ہوا دے کر علیحدگی کا جواز تلاش کیا جا رہا ہے تو کہیں پختونستان کا ڈھونگ رچایا جا رہا ہے۔ اس ذہن کے لیڈر باہم صلاح مشورے کر رہے ہیں۔ تفرقہ پسندی کی یہ تحریکات بڑی سازگار فضا میں پروان چڑھ رہی ہیں۔ اس لئے کہ پاکستان کے مختلف و متضاد عناصر کو جوڑنے والی قوت یعنی نظریہ پاکستان کے تحفظ و بقا کے لئے کچھ نہیں کیا جا رہا۔

۷۔ سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ ملک کی عظیم مسلم اکثریت جو دراصل پاکستان کی بانی ہے اور اس نظام سے بہتر دوسرا کوئی نظام نہیں ہے۔ جن لوگوں کا اصلی عقیدہ یہ نہیں ہے جو محض سمنان گھانوں میں پیدا ہو جانے کی وجہ سے مسلمان بنے ہوئے ہیں۔ مگر اپنے عقائد خیالات اور نظریات کے اعتبار سے غیر مسلم ہو چکے ہیں۔ ان کا معاملہ تو دوسرا ہے

وہ تو بلاشبہ یہی چاہیں گے کہ ہم اپنے ساتھ بس مسلمان کا نام لگائے رکھیں مگر کام کسی غیر اسلامی نظریہ پر کریں گے۔ لیکن ایسے لوگ آخر ہماری آبادی میں ہیں کتنے؟ بمشکل ان کا تناسب دس پانچ فی لاکھ ہو گا۔ آخر عقل و منطق یا جمہوریت کے کس قاعدے سے اس چھوٹی سی اقلیت کو یہ حق پہنچتا ہے کہ یہاں کوئی نظام زندگی اس کے نظریات کے مطابق اختیار کیا جائے۔

۸۔ اس میں شک نہیں کہ بے دین اور بے عمل لوگوں کی یہی چھوٹی سی اقلیت ہمارے ہاں بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہی ہے۔ لیکن یہ حالت خواہ کتنی ہی پریشان کن ہو بہر حال اسے کوئی حقیقی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ اس لئے کہ ملک میں ایسی اقلیت کے برسرِ اقتدار ہونے کی حیثیت ایک اجنبی قوم کے برسرِ اقتدار ہونے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ انگریز بھی جب اس ملک پر حکومت کر رہا تھا تو اس کے کارکنوں کی تعداد اس ملک میں اس سے زیادہ نہ تھی۔ اگر وہ اجنبی اقتدار یہاں مستحکم نہ ہو سکا تو یہ اجنبی اقتدار یہاں کیسے مسلط رہے گا۔ پاکستان کے باشندوں کی عظیم اکثریت کے جذبات و احساسات اس چھوٹی سی اقلیت کے منصوبوں سے ہمیشہ متصادم ہوتے رہیں گے۔ تصادم کی وجہ سے یہ ملک ایک پانچ بھی ترقی کے راستے پر آگے نہ بڑھ سکے گا۔ بلکہ جو کچھ پہلے کا بنا ہوا ہے وہ بھی بگڑتا چلا جائے گا۔ قوم کا دلی تعاون جس طرح باہمی اجنبیوں کو کبھی حاصل نہ ہو سکا اسی طرح ان دہی اجنبیوں کو کبھی کبھی حاصل نہ ہو سکے گا۔

۹۔ ان ہم وطن اجنبیوں کی حیثیت بالکل ایسی ہی رہے گی جیسے کوئی شخص ایک ایسے گھوڑے پر سوار ہو جو اسے سواری نہ دینا چاہتا ہو اور سواری اور سوار میں مسلسل کشمکش جاری رہے۔ اس حالت میں کسی نظریہ کے مطابق بھی ہماری زندگی کا کوئی مسئلہ حل نہ ہو سکے گا۔ نہ اسلامی نظریہ کے مطابق اور نہ غیر اسلامی نظریہ کے مطابق۔ جو کچھ حکمران چاہیں گے قوم کا عدم تعاون اس کو چلنے نہ دے گا۔ جو کچھ قوم بنانا چاہے گی حکمرانوں کی جبری اور بعض حالات میں مسلح مزاحمت اس کو نہ چلنے دے گی۔ اس کشمکش کو کسی کا جی چاہے تو جب تک چاہے طول دیتا رہے۔ آخر کار پاکستان کی تعمیر کے لئے اگر کوئی کام ہو سکے گا تو اسی وقت ہو سکے گا جب کہ قوم اور اس کے حکمرانوں کا مقصد ایک ہو اور وہ اسلام اور صرف اسلام ہی ہو۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
فیصل آباد

۱۹۸۴ء فروری



سوالات متعلقہ باب نجم

- (۱) اسلام کے تصورِ معیشت پر ایک مقالہ قلمبند کیجئے۔
- (۲) اسلامی ریاست کی معاشی ذمہ داریاں کیا ہیں تفصیلاً تحریر کیجئے۔
- (۳) کفالت عامہ سے کیا مراد ہے۔ دلائل کی روشنی میں تحریر کیجئے۔
- (۴) اسلامی ریاست کی ضرورت و اہمیت پر ایک فائنل مقالہ سپرد قلم کیجئے۔
- (۵) اسلام کے اصول حکمرانی دوسری حکومتوں سے کس حد تک مختلف ہیں تفصیلاً لکھئے۔
- (۶) قیام پاکستان کے محرکات کیا تھے تفصیلاً لکھئے۔
- (۷) تحریک پاکستان کی مختصر تاریخ بیان کیجئے۔
- (۸) نظریہ پاکستان اور اس کے تقاضے کیا ہیں مفصل لکھئے۔

www.KitaboSunnat.com



اور جو اس کے سہارے اردین پیش کر لیا اگ وہاں ہر قوم کی کیا کیا

پولیمیر پکیشیز اُردو بازار۔ لاہور فون: ۵۸۶۶۶

